

ولچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

دسمبر 2011

نگران اعلیٰ

معراج رسول

PDFBOOKSFREE.PK



اس شخص کا مہاجر جس نے حصول مقصد کے لیے طویل انتظار کیا تھا



اس شخص کا قصہ جس کی ذات انوا ہوں کی گہری دھند میں لپٹی ہوئی تھی



قتل کی ایک سنگین واردات قتل اور قاتل انوں مہاجرین چکے تھے



تھوڑی دیر کی آسمان کی جاہاز کی قند کا کھیل ملے انھوں نے اس کی کہانی



ایک سووے کی آڑ میں رونما ہونے والے خونی کھیل کا دلچسپ انجمن



ایک ہی لڑکی کی چاہت میں مبتلا ہو جانے والے دو دوستوں کی کیفیات



فتح اور شکست کے درمیان دو بڑی مہاجر تھی کہانی میں شہر کی راز پر پردہ تھے



اس لڑکی کے کہوتی کہانی جس کی زندگی مسلسل حادثہ کا شکار ہو رہی تھی



اس کلا کار کی داستان جو تہذیب آدم کو ایک نیا آہنگ دینا چاہتا تھا



تائین کی کر فیا سیکل کج ادائیں نلے جیہا آہستہ آہستہ ملے ہوئے تھیں



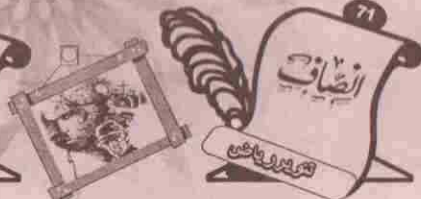
مختصر ہیرائے میں ایک سنگتی بڑھتی نا قابل فراموش تھا



ذہانت کا جواب استعمال کرنے والے شخص کا ارتقا کا لہجہ



ہر دفعہ کامیابی سے ہمارے ہونے والے چوروں کی دلچسپ کہانی



مغرب سے برآمد تازہ شاہکار جس میں مشرقی معاشرے کی جھلک نمایاں ہے



اپنا ایک حساسیت کے عہدہ میں کندھی ایک دل کا زخیر



جنگ کی دھواں میں جھلک رہی تھی اسے اپنے جھنڈے کی جھلک میں تھا

گزشتہ نمبر کی بھرپور پذیرائی اور قارئین کے اصرار پر

ماہنامہ سرگزشت

پراسراریت نمبر II

نئے سال کا نیارنگ - خاص نمبر خاص شمارہ

ہر کہانی خاص کہانی ہر واقعہ یاد رہ جانے والا
ہر تحریر اس معیار کی جو سرگزشت کا خاصہ ہے
ایسے حیران کن واقعات جو عقل کو ماؤف کر دیں
جن کا کوئی جواز ہو یا نہ ہو مگر جو زندگی کی اٹل حقیقتیں ہوں
سحر زدہ کردینے والی پراسرار، انوکھی اور محیر العقول سچے بیابیاں
سچے قصے، تاریخی شواہد

ایسا خاص شمارہ جو صرف ماہنامہ سرگزشت ہی پیش کر سکتا ہے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنی کاپی محفوظ کرالیں

عزیزانِ من... السلام علیکم!

2011ء کا بار ہواں کلاڑی... دیکھ آپ کے سامنے آچکنا... کچھ ہماری نقد بری ایسی ہے یا کہ تہہ... یا پھر ہماری ایسی کرنی ہے جو اب تک
بھرتی پڑ رہی ہے۔ ہر وقت قہر ہمارے ہی زور پر دنگ رہتا ہے۔ گھر گھر کے لیے ثابت کو سانس لیتا بھی محال ہے۔ ایک مسئلہ ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا چلا آتا
ہے... اس سے ختم نہیں ہوتا جس بات کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے... پاکستان کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے... ہر صبح پر ایک نہیں ہزاروں کے ایسے اُن گت
افسانے نہیں گئے کہ بس پڑتے جاگیا اور کڑتے جاگیا... اب یہی خط کا معاملہ دیکھ لیں... امریکی تاریخ کے مشہور ڈاکٹر فریڈ اسٹیلن کے وزن پر
ایم کیو ایٹ ایٹل لکھا اور کیا راجا جا رہا ہے۔ سفیر پاکستان اور پاکستانی ڈاکٹر اور امریکی سفیر کے درمیان ہونے والے سفیر راز و نیاز و کن میز کے اُچی پر ایک
اور سیاسی بے گنتی کے بادلوں کو مزید گہرا کرتے جا رہے ہیں... امریکا سے چل کر پاکستان تک پہنچنے والے اس افسانے کی حقیقت کیا ہے؟ ارباب اختیار
کہتے ہیں کہ حقیقتات ہوں گی تو پتا چلے گا۔ اب تک کئی مسامحات گزر چکی ہیں... سب کی حقیقتات ہوں گی مگر عوام کے کان مگر انوں کے من سے سچے سچے شکر
اُچی رہے... سچ جو ادھر سے بیچے چک، شاید تو کوئی بدلنا چاہتا ہے اور نہ ہی ہم سن حش القوم سننے کے خواہشمند ہیں۔ سچ بہت کڑا اور تکلیف دہ ہوتا ہے...
تاریخ بتاتی ہے کہ سحر لاج کا جرم ثابت ہونے پر زہر کا پیالہ پی گیا۔ کہتے ہیں کہ اس کے شاگردوں نے کہا تھا کہ تم نے کہا ہمارے چارے ہو۔ سحر لاج نے
تاریخ کو جواب دیا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں گناہ کار ہو کر مارا جاؤں۔ اُسی رات کی پہر پیرا لیس اس کے یوں کوچھو گیا...

تاریخ کا ایک اٹل اور لازوال باب... سچ جو ادھر کے لیے کر بلا کے میدان میں اُچی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے خانوادے نے سب کچھ
تربا کر دیا۔ نتیجہ... سچ آج بھی زندہ ہے۔ سچ کو گھر درکار ہے اور نہ ہی گشت اس کا مقدر ہے۔ سچ خود ہے اور گشت اس کے سامنے اُچی نہیں چلی۔
اسے تو صرف ایک شے درکار ہے اور وہ ہے سچ کہنے کی ہمت۔ یہی وہ ہمت ہے جو کر بلا کے میدان میں خاندانِ نبوت کے لوہے دین اسلام کو سحر خونی عطا
کرئی۔ اللہ تعالیٰ میرے دہس کے لوگوں میں سچ کہنے کی ہمت پیدا کرے اور سچ برداشت کرنے کا حوصلہ بھی کہیں خرم الحرام کا درس ہے۔
آج بھی چلتے ہیں آپ کی بزم میں اور دیکھتے ہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں باتوں کی مہک سے منہ لیے...

سموت راولپنڈی سے عاصر رسول کی چٹھی پڑھیں "جاسوسی کے ساتھ تعلق تو کافی پر اٹھ رہا لیکن خط لکھنے کی ہمت تیسری دفعہ کر رہا ہوں۔ دو دفعہ پہلے
ہمت سردیوں کے باوجود دفعہ انا معلوم مصلحتوں کی نذر ہوئی رہی لیکن پھر بھی ارادہ ہے کہ

عزم کھراگئیں گے چنانوں سے
سحر العتار ہو درمیاں چاہے

جہاں ماسٹروں کی طرح سو فیصد خالص اور ذاتی شعر ہے پسند کر لیجیے پلیر (کرلیا) کو میر کا شمارہ حسب معمول نین تاریخ کو بلا۔ سرورق پر
سنے ماڈل کی سلور کمر کا ڈی شعلوں کی نذر ہو رہی تھی اور مصنف بہت تاح میں مبتول تھا۔ متوجہ غفرت سے ختمنے کے چکروں میں بھی جگہ قریب ہی حسن کچھ
ایسی بے فکری اور بے ناز کی کے ساتھ جو خواب تھا کہ جیسے اس نے اپنے حصے کے تمام کام سر انجام دے ڈالے ہوں اور اب باقی سارے
دیکھ دو جائیں یا بے چارے مرد جائیں۔ تبصرے کا آغاز کرتے ہیں کہا نیوں کی ماں "لکار" سے۔ کیا جاوے ہے یہی غل صاحب کے لفظوں
میں۔ تمام کردار جیسے جانتے سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں زبردست، شاندار۔ اس ماہ سلطانہ تو سلطانہ ڈاکو نی رہی اور آفتاب خاں کی
کھوپڑی کی بھی خوب گرم رہی۔ جہاں خان بھائی کی کھوپڑی گرم ہوئی، وہاں میر سے خیال میں اسے کول ڈاکو کرنے کے لیے جنت کی
ہوا بڑی درکار ہوئی ہیں۔ (بڑا تجربہ ہے) لکار کے بعد سیدھے جا پہنچے گرداب میں کیونکہ عملی زندگی میں بھی اکثر ہلکار کے بعد کوئی نہ
کوئی گرداب جھنجھری پاتے ہیں مگر اس ماہ کے گرداب میں کناروں کا سا سمندر اور سکون محسوس ہوا کوئی خاص ہلچل نظر نہ آئی۔ نہ
جانے اپنے چہرہ صاحب کو ایک دم لڑک، پتھر اور درکاری مگر نہیں کہیں کی کہ پڑھنے والوں کو تھوڑا سوا دے گا۔ ماسٹر صاحب
اور کشور بھی غائب ہیں اور اسلم جو ایک نیک ڈاکو تھا بلکہ ہے عالم میں انتخاب ماہ بانو کے خوب صورت ساتھ کو فری میں خوشنوا ہی بلکہ
ایس ای ای ایچ کے رہا ہے۔ (آپ کیوں چل رہے ہیں؟) اولین صفحات پر ایچ اقبال کی مگر کا چراغ درمیانے درجے کی کہانی رہی
جبکہ ہماری سوچ بھی کہ کہانی نہایت اچھی ہوئی اور سنس سے بھر پور ہوئی مگر توجہ کے برعکس انتہائی سادگی سادگی کہانی ثابت ہوئی۔
شعروں اس حوالے سے خوش قسمت رہا کہ اسے سمیرا اور رفعت کی صورت میں دو دولہا نہیں۔ اس ناکہ ترین درویش سمیرا اور رفعت
نے ایک دوسرے کے لیے سگی بنوں سے بڑھ کر محبت کا اظہار کیا۔ اس قسم کی صورت حال کو ہم کرنے کے لیے انتہائی مضبوط لاکھ
زیر و زور اور پورے صدمہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ (آپ کے پاس تو موجود ہوگا؟) رنگ دونوں ہی خوب تھے۔ پہلا رنگ کاشت
زیر کی لئے شدہ محبت مردہ گئی۔ جو جی کی مصیبت کے پتھر پھر شیطان کے کمرولی کی پیداوار و الا حمادہ یا د آگیا۔ تیور اور شادی کی
ملاقات سے عید کی خوشیوں کا لطف دوبالا ہو گیا۔ دوسرا رنگ اُچی اچھی ہوئی تحریر بھی کہ اس کے اچھاؤ نے ہمیں ایسی انجمنوں



تجربہ تو ہے؟ ام ٹامہ جی! پلیر ریکارڈ آتی رہے گا۔ آپ کی سٹیجی ہوئی یا نہیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ یقیناً تم آپ سے بہت کچھ سیکھیں گے۔ آمد پھانی جی! سیدھی الدین اشتقاق جی! اسکرپٹ مبارک۔ جب تکیرا نام کونسل! بہت خوشی ہوئی آپ کی رہائی کا! سن کر میرا اس سب سے زبردستی لڑا! آتش صاحب بلیک لسٹ میں استراحت فرما رہے تھے۔ (گرتے جاتے خوش ہو رہی...) (کہانیوں میں پہلے گرواب پڑی... شکر ہے ماہانہ ٹول کی کسی نے انوکھا نہیں کیا۔ اور چور ان بھی اپنے انعام کو بھگت گئی حالانکہ وہاں سے خوشی بہت قلم تھے لیکن جس طرح اس کا انجام ہوا اور جو رے دن اس پر گزریں، نہ جانے کیوں میں یہ سب دیکھ کر خوشی نہیں ہوئی۔ چنانچہ میں انسان اتنا ظالم کیوں بن جاتا ہے؟ لگا رہی بہت زبردست جاری ہے۔ عموماً رات کی ساتھ بہت ہی اچھا لگ رہا ہے۔ ویلان غل اگل۔ پھلا رنگ کا شاف ذیر صاحب، بیورو اور شاہی کے ساتھ حاضر ہوئے۔ دونوں نے دو باقی دو لالوں کو ملایا اچھا لگا۔ یقیناً باقی کہانیاں بھی اچھی ہوں گی۔“

محمد اسحاق انجم کی نکلن پور سے لفظی جادوگری ”جینی کلن پور“ کی تو بات ہی چھوڑ دوئی۔ جب گھر کا چراغ ہی انعام کے لالچ میں سودا کرے اور وہ بھی بے باقی اور لگا کر اس کے ساتھ تو اس گھر کا اللہ ہی حافظ ہوگا... یہ بھی نہیں سکا کرو قادر، ہوگا وہ تو انعام، لے رہا ہے۔ ماہر ماسٹر نامہ کا جائزے گرواب کے قریب لے گیا اور بھی اس کا یوم تھا۔ قہر۔ دلہن، میں ڈوبا کیا کرے جب چاہ روز پیش ہو روز بعد صدقی صاحب کیوں باور کرانے کہ وہ خوش حال و خوش خصال ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کے کئی ناول ریکارڈ قائم کر چکے ہیں۔ پبلشرز کی تو کوشش ہوئی ہے ایسا انٹرنل کے ادارے سے شلک رہے۔ وہ منہ مانگے معاوضہ وصول تو کر رہے ہیں اور کیا چاہیے؟ اسی ہے تو کچھ لوگ کہتے ہیں گھر کا چراغ ہے کوئی بات نہیں۔ روزانہ اپنا لالہ اور پاکستان کہاں۔“

طلحہ چنیوٹ، بھوانی سے جعفر حسین کا تجزیہ ”ڈاکٹر اکل نو جوانی کی پانچوں کون سی خطا کا کفارہ“ آج تک منفرد نازک کہوش زبان پڑوں میں متعارف کروا کر رہے ہیں۔ فہرست کی تبدیلی پسند آئی۔ ادارے میں معاشرے میں روز بروز بدتر ہو رہی داریت پرستی کو لایا کر رہا تھا۔ آصف صاحب! آپ کو میری طرف سے مزے دار مبارکباد کہانیاں کی ابتدا شائستہ اسٹوری سے کی۔ انعام کچھ خاص نہیں لگی۔ باہمی مذاہب سے باب... کہانیاں انعام، محبت اور فطرت کے تین تین سفر کی میساری تحریر تھی۔ جانوروں کے لطیف احساسات کو زبان دیتی اور انسانوں سے غیر مشروط وقار کی کوئی انوار اور اس میں کی طرف مائل کرتی رہی۔ اندر مائل نہ ہوئی سی واقعاتی تبدیلی اور معمولی سے رد و بدل کے ساتھ ہم پہلے ہی شایعہ گزشتہ میں پڑھ چکے ہیں۔ انسانی ذہن کو کھلا دیتی اور اس میں کی طرف مائل کرتی رہی۔ اپنی سوچ اور عمل میں محدود ہیں۔ ہم نظیر الگ ڈگری منفرد تحریر لگی۔ اپنی حاکم کی وجہ سے بلیک لسٹ کے ہتھے لگ جانے والے فریبک کی داستان دلہن معاشرے کے ان ناوردوں کے متعلق بھی جیسی سے ایک دفعہ چٹ جائیں تو جو بک کی طرح خون کا آخری قطرہ تک چس کر جائیں پھوڑے ہیں۔ (بھانویا) ہمایوں اقبال کی گھر کا چراغ کا مایا کا کونی قادر تھا۔ مایا کے لحاظ سے انسانی فطرت کی پیچیدگیوں اور حالات و واقعات کے مطابق مخصوص ہر جزو کی کیفیت بھی نہیں تھی۔ سب کرداروں کا رویہ دیوہیت کے ساتھ تھا۔ رگوں میں 70 کے دہائی کے ایرانی انقلاب اور بڑی متاثرہ قوتوں کے مفادات کے گھروں میں پڑنا گوشوں سے پڑے ادھاتی چادر میں موضوع کے خوب کے لحاظ سے بہتر رہا۔ آپ سے پوچھنا تھا کہ کیا یہ کہانی باغی ہوگی؟ بلیک لسٹ کے لطیف حیرانے میں لکھنا کیا پھلا رنگ سے شہدہ محبت کے کافی محفوظ تھا۔ جہاں اس تحریر نے کیوں رہے پڑا نہ کسی ٹھکانہ کی وہیں پرانی قدروں اور اور داریت کی سلسلہ ایتھ اچا کر کے ساتھ ساتھ کسی نئی روشنی سے بھی گھلتا انداز میں چٹ کر گئی۔ قاری کی نفس پکڑ کر اس کے پہلو پر پہلو پکڑ کر لڑا کر پڑا کر دے گا۔ جاسوسی کی جھلک کچھ ساؤن میں بھج رہی ہے۔ حقیقت سے قریب تر بہت زیادہ ہو یا کردار نگاری، مغل صاحب کی پہلو پکڑ نہیں چھوڑے۔ لاہور میں ایک ڈیک نالے کی طرف سفر کرتے تالی کو جب سے لے کر ایسی ڈیڑی ڈیڑی کی جانب ظاہر اگلے کچھ نہیں بتایا۔ (انتظار) اس صاحبہ کی گرواب ہر لحاظ سے فضول کہانی ہے۔ مصنفہ دو تین کہانیاں کو ساتھ لے کر بیٹے کے باوجود کسی ایک کہانی سے بھی انصاف نہیں کر رہی ہیں۔ مکالمے طویل اور بے مقصد اور ان میں پس منظر اور پیش منظر زیادہ ہوتا ہے۔ کہانی کے بہت سے کردار اور مرکزی خیال بھی شاید گرواب کی نذر ہو گیا ہے۔ کہانی کی چٹنگ کے مانند کی ماہ سے (دھرا) کہ بہت مقصد دیتی پھر رہی ہے۔“

سید عبادت کاظمی کی ڈیرہ اسماعیل خان سے تعریف ”بلیک سٹیجک موسم کے ساتھ جاسوسی اس دفعہ خلاف معمول 3 تاریخ کو ملے۔ تاہم اس کا مائل اس بار بالکل پسند نہیں آیا۔ اس دفعہ کسی عبادت کی حق دار آصف عبادت ٹھہریں۔ ہماری طرف سے مبارک ہو۔ ماہانہ چوروں کی محفل کے تمام خاص ستارے غائب تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرواب پڑی، بہت مزہ آیا لیکن ماہانہ نو کی پریشانیاب کب ختم ہوں گی؟ لگتا ہے پھر چور کی کارندہ سے بانو کے پاس پہنچ چکے ہیں، خدا کرے۔ لگا رہے اس دفعہ میں بہت بڑا اچھا لگا دیا۔ آفتاب خاں چھاپٹر کا لگا اور یہ سلطانہ کو کیا ہوا؟ معاملہ خاصا سمجھ رہے لیکن اس سارے قصے میں عمران کی بہت گودا دیتی چاہیے۔ گھر کا چراغ آج اقبال نے بہت اچھا لکھا۔ دوات کی ہوں بھی انسان کو پاگل کر دیتی ہے۔ دوسرے رنگ نے کچھ خاص متاثر نہ کیا۔ البتہ شاف ذیر کی کہانی ہمیشہ کی طرح میٹھا لادوگی۔ مریم کے خان کی اسٹوری بہت اچھی ہوتی ہے۔ مریم کی ایش! آپ کا بہت بڑا فہم ہوں۔ پلیرز کوئی سلسلہ اور اسٹوری بھی لکھیں نا۔ اور آخر میں کہنا تھا کہ جاسوسی میں پلیر کوئی شر و خن کی محفل منتقد کریں پلیرز۔“ (فی الحال تو جاسوسی کو اس سے دور رہیں)

نیلسا سے وینین بلوچ کی بگلت ”نمبر 3 جاسوسی 3 تاریخ کو ملے۔ آصف عبادت شائستہ شاد و شوکت سے صدر بنی تھی۔ پیاری آصف نام کی پسندیدگی کا شکر ہے۔ میری سب فریڈ کو میرا نام پسند ہے۔ ہمایوں صاحب! کیوں ہر وقت مل سکے رہے رہے ہو؟ کسی کوئی تحریر کا جملہ ہی بول دیا کریں۔ اے کی دین! ام! آنے کی وجہ سے ہزاروں بالکسی۔ جب تکیرا عالم رہائی مبارک، مضامین کب کلاسیک کے خوشبو لگے۔ صاحب! کیوں آتش بنی ہوئی ہے۔ سید شکیل کاظمی! مان گئے ہم کہ آپ سے زیادہ نرم



دل کوئی لکھ۔ لیکن رسالے کی تلاش میں کہانیوں کو نہ کھانا شروع کر دیتا۔ ام ٹامہ! ہمارے بھانجے بھانجیاں کتے ہیں؟ محمد جاوید بلوچ! مغل میں آتے رہیں۔ کہانیاں میں سب سے پہلے لگا رہی۔ ہمیشہ کی طرح شاعرانہ دل بھر گیا! اچھوتی، منفرد، زبردست، جتنا زبردست، جاوید مغل صاحب، ہر ماہ اتنی شاعرانہ اسٹوری دینے پر شکر ہے۔ سلطانہ ڈاکو مغل رہے۔ خیراتی تو ہم دم سارے حالات و واقعات میں کھن ہیں، آگے آگے دیکھے ہوتا ہے کیا۔ ہادی کے ادب میں مغل میں آج اقبال ایک تیز رفتار اسٹوری لائے۔ گھر کا چراغ جس نے میں شروع سے آفریکان اپنے ساتھ دوڑانے رکھا کہانی ہمیشہ کی طرح بہت ہی اچھی تھی، خاص کر اقبال صاحب اتنی اچھی تحریر پر ہمارا کد کد حق دہا رہیں۔ تسلیم انور کی بے باقی ہتھ خاص نہ تھی، یونی فٹنل تحریر۔ ہائی ڈائجسٹ زبردست لگ رہا ہے۔“

کوئٹہ سے امین قرن کی تجزیاتی رپورٹ ”آٹھ مہینے موندے گہری نیند میں سینے دھچکتی خوب صورت لڑکی۔ گاڑی کا کھلا دروازہ ہاتھ میں مائل تھا۔ ہمارا سرد ٹیڑ سے داتوں کی فٹائل کی تھک۔ موئے حسوں کی چوڑی کتابوں والی ٹیک اس کی بصورتی میں اضافہ کرتی تھی۔“ (سید سے سید سے نام لکھ دے کہ آپ ہمایوں سعید راج کی تصویر کشی کر رہے ہیں) (آج اقبال کی تحریر گھر کا چراغ ایک ایسی تحریر تھی جسے قاری کو چھوڑنا چاہتا ہے مگر وہ قاری کو نہیں چھوڑتی۔ اتنی پوری نہیں کہ بندہ چھوڑ کر آگے بڑھ جائے۔ اتنی دلچسپ بھی نہیں کہ پڑھ سکے۔ خدا خدا کر کے کہانی ختم ہوئی۔ (شکر ہے) مگر انعام اس طرح کا ہوگا۔ عورت کی فطرت میں رقابت ہے اور خاص طور پر شوہروں کے معاملے میں تو خواتین بہت حساس ہوتی ہیں اور ہمارے معاشرے میں تو یہ حاشیہ عروج پر ہے۔ نہ جانے اقبال صاحب رفعت اور زکیرا کہاں سے ڈھونڈ لائے۔ (آپ بھی ڈھونڈیں...) مل جائیں گی دودو اور پھر مزے...) لے لے محبت کا شاف ذیر صاحب کی دلچسپ تحریر بتا ہے۔ بلاشبہ کارلوس کی پرائیوٹ ٹوک جھوک رہی ہے ان کے کرداروں کے درمیان۔ کہانی کے دوران ایک عظیم ہونٹوں پر غبر، پتا ہے۔ (شکر ہے) دوند نہ تو کچھ آپ لڑتے رہتے ہیں) کوچہ ظاہر جاوید مغل کی تو کیا بات ہے۔ اس مرتبہ عمران اور تابش کی کہانیوں کے درمیان ٹھہرتے پایا۔ (آپ کب لے لے پتے کیوں نہیں؟) چاہہاں میں نہیں؟ (چاہہاں میں نہیں؟) اس مرتبہ کی کہانی کی نئی نئی لکھی جگہ پیش تحریر تھی۔ پڑھتے پڑھتے کب آٹھ مہینے بند ہو گئیں معلوم ہی نہ ہوا۔ (آٹھ مہینے کچھ، یہ تو معلوم ہو گیا ہوگا...) (مگر امام صاحب کی نامہ سفر نامہ پڑی۔ اب یہ میری بددقتی ہے یا کیا ہے کچھ میرے سے مغل صاحب کی کہانیاں مجھے بالکل خوش نہیں کر پاتیں۔ اس مرتبہ کی کہانی نے بھی وقت کے زیاں کا احساس دلایا۔ میری آزادی کا انعام ایک بھڑکا کر تھی... داوند بتانا تھا کہ اس کی ہتھی سے صرف مرغن کہانی کر سکتا ہے۔ (اچھا) (اچھا) (اچھا) آپ سے انصاف کرتا ہے۔ اور نہ تو کچھ تھے...) (سودا میں جس اعزاز سے اس کی تعریف کی تھی، لیٹن کرڈ میں بیٹہ کریم کی طرف لگتے بتایا گیا تھا اور بعد میں جو کہانی پڑی تو بے اختیار منہ سے لگا، عموماً پھاڑ لگا چہا اور وہ بھی مرا ہوا۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ تنقید کا ہرگز مقصد کسی کی دل آزادی نہیں بلکہ تنقید کا کام لینا مقصود ہے۔ ایک عام تحریر لکھنا نہیں کتنے جو ہم کام کا ہے مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ میں اکثر غمخیز رہیں لکھتا رہتا ہوں۔“ (عالمیں ہی شکر ہے... آپ کو تو معلوم ہے کہ یہ کام آسان نہیں)

سارہ راجپوت کی معروفیت اور لیٹری سے ”جاسوسی حسب معمول 3 تاریخ کو ملے۔ اشتہارات کو کر اس کے چینی دان میں بیچیں۔ آہا... ہماری منفرد نازک کی ترجمان پیاری سی آصف عبادت کی کردار پر بڑی شان سے برابراں ہیں۔ سب کے تہرے ہر پور تھے۔ خود کو بلیک لسٹ میں دیکھ کر سخت صدمہ ہوا لیکن تنقیر عباس باجوہ کو میرا اپنے ساتھ پا کر دل کی ٹھوڑی ڈھارس بندھی۔ کہانیاں میں سب سے پہلے ظاہر جاوید مغل کے قلم کی لگا رہی۔ پوری قد ایک ہی منظر میں جیسے ٹھہر گئی۔ اور گرواب میں بھی صورت حال کچھ مختلف تھی۔ رگوں میں شاف ذیر کے قلم سے شاہی اور تیور کی شرارتوں بھری کہانی شہدہ محبت پڑی۔ دیکھیں جو جی سے تو ہماری منفرد نازک کی صوبی مغل منظر تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ خواتین مردوں سے زیادہ مغل مند ہوتی ہیں۔ باقی کہانیاں بھی زیر مطالعہ ہیں۔“

علیہ سے نعمان پیارے خوشبو لگے لکھتے ہیں ”اس مرتبہ کارل عید الاشی سے پانچ دن پہلے ملے۔ اس دفعہ کارل ورتق انتہائی شاندار تھا۔ تاہم اس کا مائل سید ایک آٹھ بندے ہوئے نظر آئی۔ اور اس کی دوسری آٹھ ڈاکٹر اگل جلد کی لوج سے بنانے کے... دل لگے۔ تاہم گرل کے نیچے ایک انتہائی خوب صورت کارل بھرے نمبر کے نظر آئی جس پر نمبر پلٹ توئی مگر غریب غائب تھا۔ ڈاکٹر اگل اس کی کوئی خاص وجہ؟ اور وہ بھی بالکل نئی۔ محفل میں پہلے نمبر پر آصف عبادت اپنے تلخ تہرے کے ساتھ حاضر تھیں۔ ہمایوں سعید صاحب! ایسا کیا ہے؟ جو آپ نے تم ہی دوستی کا ہاتھ دوسروں کی طرف بڑھا پایا ہے۔ دل لگے۔ طارق محمود جی! موٹ و تلم۔ سیدھی الدین صاحب! اسکرپٹ مبارک ہو۔ کتنے کتنے ہوئے ہیں آپ؟ اب لڑکیوں کی طرح محرمت چھپائے گا کہ اچھی تو ہیں کا ہوں۔ صاحب! اتنا غصہ کر میں! دماغ لگے۔ جاسوسی میں خط نہ پا کر سب کوئی دکھ ہوتا ہے اور میں خود اس سعادت سے کی بار مستفید ہو چکا ہوں۔ کہانیاں کی ابتدا خوب پڑی میں انعام سے ہوتی ہے بہت ہی دلچسپ تھی۔ بار بھم کی سودا ایک الجھاوے والی داستان کی میرے خیال میں۔ (اٹھ کر لاؤ) سب سے اچھی اور لاؤ کبھی ایسے ہی نہیں چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ بے باقی ایک ایسی کاوش تھی۔ لاہور کے سفر کی ماہاب کا رن ہے۔ آفتاب خاں اور سلطانہ نے جب کام شروع کیے ہوئے ہیں اور اوپر سے آفتاب، جادو کی بہن رابا کو بھی اٹھا لایا۔ سب ایک دوسرے سے انعام لینے پر تے ہوئے ہیں لڑائی، مار کاتی اور کٹکے کے بیچوں بیچ عمران کا حرا حید اور ہر نر مولانا کردار بھی ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں، خوشبو لگے۔ مریم کے خان کی وقادار ایک کتے کی وقادار سے لبریز ایک بھر پور داستان تھی۔ کتنی دیر دیمو نے بروقت اور شیک فیلر کے شیا کوتاہی سے بچایا۔ واقعی اگر ایک کتاب کی انسان کو لکھ کر دے تو اس کا



ہوں سے ہمایوں سعید راج کی یاد آوری اس دھندلے ورق پر تماشا کش کا حال تھا۔ (یوں؟) لڑکی جب خوباب ہوئی تو ہے تماشا معصوم اور خوب صورت لڑکی ہے کیونکہ خاموش ہوتی ہے۔ (تصور یوں سے دل بہلا یا کر یں... ہمیشہ خاموش رہتی ہیں...) لہذا اس بار ہم بار بار کہاں تار روکتے اور پلٹ کر ناٹل کو کیسے دیتے رہے۔ اگلے نے بھی ہماری محفل کا ایک صفحہ میڈیم کی قوم کو دے کر ہمیں ڈسٹرب کرنے کی کوشش کی۔ (معذرت چاہتے ہیں اس کے لیے...) یہ جان کے بے حد دکھ ہوا کہ معصوم عداوت کے ہاں کس حسد کے دل تک پہنچنے پر اس قدر کفر سے ہو کر گرتا ہے۔ کالمی صاحب آرزو نو پکڑوں اور اگلے ہاں سمیت یا گلوں کی طرح الماریوں میں سعید بہادری کے لیے جگہ ڈھونڈ رہے تھے اشتقاق میں! یہ لڑکے کے کاروبار والوں کا الیہ ہے کہ انہیں جتنے بھی الماری بہ صندوق اور سیف وغیرہ ہوتے ہیں۔ واہ اہم صاحب! کیا اسٹاک ہے تمہارا؟ فرسٹ و کیچر تیرہ ہلکے مار مار گوندل صاحب! ہماری طرف سے بہت بہت مبارک ہو۔ میں بیٹن باجر کل سے خوشخود و رام کل سے کیونکہ ز یادتی کسی چڑی کی انجی کی ہے۔ یہ بار قدرت اللہ بھٹی! اہم لڑکی کسی مڑھری بازی رہی ہوگی! یہ صرف ایک دوست کی بات ہے! یاد آجوا۔ یہ پتا ہوئے کسی سورج سے روشنی ہے، چاندنی ہے، فرحت ہے۔ چھوٹوں میں خوشبو ہے، ایسا بہت کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ (کمال ہے، کیا کیا انکشافات ہو رہے ہیں آج) ماسکل! شکر ہے کسی وجہ سے تو آپ نہیں۔ (حالانکہ آپ کا نام بھی کافی ہے) ورنہ پورے شمار نے آپ کو جوالا لکھی بنا دیا تھا۔ عداوت

محمد باال حیدر، ضلع خانیوال (کہانی ٹی ٹی ہے)۔ علی کاشف آفاقا، میر پور آزاد کشمیر۔ مونا گل، بنوں۔ صبا عمر، کراچی۔ اجمل شیخ، گوردھار۔ مہتاب شیرانی، حیدرآباد۔ محمد امین، کراچی۔ ثمرین شاہ، کراچی۔ شہناز خان، بہاولپور۔ عاصم خان، کوئٹہ۔ مہرین اختر، نواب شاہ۔

خود کردہ نثر بادی

مشہور کہاوت ہے ”خود کردہ را علاجے نیست“ اور یہ بات بار بار عمل کی کسوٹی سے گزر کر ثابت ہو چکی ہے۔ دو سوروں کی ہوئی ہوئی فصل کاٹنا آسان ہوتا ہے لیکن اپنا ہی بویا ہوا بیج جب ایک تناور درخت کا روپ دھار کر اپنے سائے میں آنے والے پر سبزے کو بہ رحمی سے نگلنا شروع کر دیتا ہے تو ہونے والا خود پر آسان ہو جاتا ہے۔ درخت ہی کاٹ دے یا سبزے کو اجڑنے دے، فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے... وہ بھی بہت محنت اور لگن سے اس کی آبیاری کرتا رہا۔ شاخیں تراش کر پتے سنوار کر اسے متفرد سانچے میں ڈھالنے کی کوششیں کرتا رہا... اپنی کاوشوں کا ثمر دیکھ کر اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنے خواب کی تعبیر پالے گا... پھر وہ ہوا جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

یوں تو کافرستان کی سرسبز و شاداب وادی، چترال سے زیادہ دور نہیں ہے لیکن پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے راستہ انتہائی خطرناک ہے۔ یہ راستہ صرف گھوڑوں اور چغروں ہی پر طے کیا جاسکتا ہے اور منزل تک پہنچنے والے مسکن سے چور چور ہو جاتے ہیں۔ یہی حالت اس قافلے کی بھی تھی جو اب وادی میں داخل ہونے والا تھا۔

عام طور پر لوگ یہ راستہ زیادہ سے زیادہ آرام کرتے ہوئے طے کرتے ہیں مگر خان و داراب نے کم سے کم آرام کرنے کی پالیسی پر اس لیے عمل کیا تھا کہ برف باری کا زمانہ سر پر آچکا تھا۔ کسی وقت بھی برف باری شروع ہو سکتی تھی۔ اس صورت میں ان سب کی زندگی کے لالے بڑ جاتے۔ پھر نہ تو لوٹنا ممکن ہوتا اور نہ آگے بڑھا جاسکتا تھا کسی مناسب جگہ خیمے گاڑ کر وہ لوگ خود کو کسی حد تک امان پاسکتے تھے مگر ان کے تمام چغروں اور قیدیوں گھوڑوں کی موت یقینی ہوتی۔

آخر اس موسم میں یہ سفر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟“ ارسلان نے پوچھا۔ ”یہ تو بڑے انداز میں کہا۔ وہ اور عالیہ اپنے اپنے گھوڑوں پر قافلے میں سب سے پیچھے چل رہے تھے۔

عالیہ نے مسکرا کر کہا۔ ”بادا جانی سے ہی پوچھو۔“

”ان سے بھی پوچھ سکتا ہوں۔“

”اسی لیے میں جس لیے میں سے پوچھا ہے؟“

”میں، لہجہ تو بدلنا ہی پڑے گا۔“ ارسلان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”اور اصل مجھے تمہارے پاؤں جانی کے غم سے زیادہ ان کے گلے چھوٹے سے ڈر لگتا ہے۔“

عالیہ ہنس تو دی لیکن ہنسنے کے بعد انداز میں۔ پھر یوں۔ ”تم جانتے ہو کہ بادا جانی فطرتاً ہی جو واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے کس سال، خطرناک درندوں سے بھرے ہوئے افریقی جنگلوں میں اور برف پوش پہاڑوں کی چوٹیوں میں گزارے ہیں۔ اگر ان کے بابائے زبردستی ان کی شادی نہ کر دی ہوتی تو غالباً وہ اب بھی اسی قسم کی زندگی گزار رہے ہوتے۔“

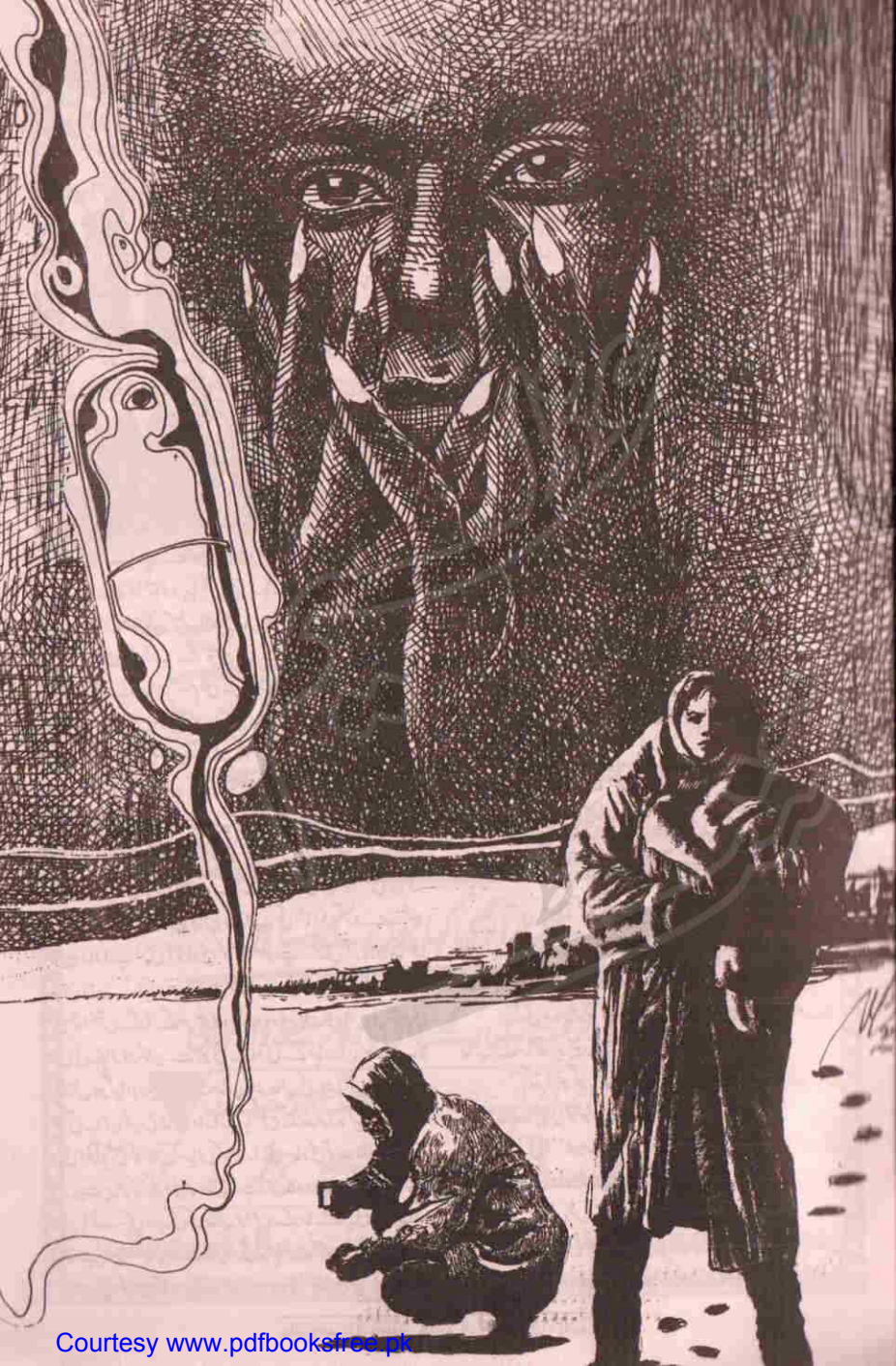
”اچھا ہوتا۔“ ارسلان نے منہ بنا کر کہا۔ ”نہ وہ شادی کرتے، نہ تم پیدا ہو، نہ تم سے میری قسمت پھوٹی اور نہ آج.....“

”اچھا۔“ عالیہ اس کی بات کا منہ ہونے منہ پھلا کر یوں۔ ”میرے ساتھ قسمت پھوٹی ہے تمہاری؟“

”اور میں تو کیا؟“ ارسلان نے غرا کر کہا لیکن دوسری طرف منہ پھیر کر اپنی مسکراہٹ چھپالی۔

”تو پھر توڑ دوں گی؟“ عالیہ نے کہا۔ ”ابھی شادی تو نہیں ہوئی ہے نا۔“

”کیسے توڑ دوں؟“ ارسلان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”ابھی تک ہمارے معاشرے میں ممکن توڑنے کا کوئی



مہذبانہ ہتھوڑا لپیٹا نہیں ہوا۔

”لیکن اس راستے میں پتھر بہت ہیں جن سے میں تنہا راستہ توڑ سکتی ہوں۔“

”توڑ دو تو سکون مل جائے۔ کم بخت درد کا پھوڑا بن گیا ہے، اس سفر میں۔“

ان دونوں میں وقتاً فوقتاً اس قسم کی چونچیں لڑا ہی کرتی تھیں اور ان دونوں کے خیال میں یہ ان دونوں کی شدید محبت کی علامت تھی۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی دوران میں ان کی محبت کا قد بڑھتا تھا مگر ان دونوں نے ملکی بھجوں ٹائپ کے مرکبوں میں کبھی گفتگو نہیں کی تھی۔

خان داراب چترالی ہونے کے باوجود اس زمانے کا فرد تھا جسے عرف عام میں ماڈرن زمانہ کہا جاتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نوجوانی ہی میں اپنی سوئٹلی ماں کے ناروا سلوک سے گھبرا کر چترال سے نکل گیا تھا۔ اس نے کئی سال امریکا اور یورپ میں تعلیم کے بہانے سے گزارے تھے۔ دس سال تک باپ سے صرف خط و کتابت رہی اور اخراجات کے لیے بے تحاشہ روپیہ بھی ملتا رہا۔ چترال میں اس کے باپ کی امارت ایک مسلمہ امر تھی۔

خان داراب نے بچپن ہی سے ہم جو یا نہ فطرت پائی تھی۔ اس نے زمانہ تعلیم ہی میں کوہ البرز کے سلسلے کی دو بڑی چوٹیوں سر کی تھیں اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد افریقا چلا گیا تھا۔ افریقا ہی میں خان داراب کو اپنی سوئٹلی ماں کے انتقال کی خبر ملی تھی لیکن اس نے واپسی کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا، تاہم جب اسے اپنے باپ کی شدید علالت کا علم ہوا تو اس نے تڑپ کر وطن کا رخ کیا۔ اس وقت باپ کی زندگی ختم ہونے میں چند دن رہ گئے تھے اور اس کی خواہش بھی کہ وہ اپنی زندگی ہی میں خان داراب کی شادی کر دے۔ خود خان داراب اپنی آزادی کو ”مصلوب“ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے ایک سعادت مند اولاد کی طرح لب گور باپ کی خواہش کے آگے سر جھکا دیا۔ دو دن بعد ہی اس کی شادی اس کی چچا زاد بہن سے ہوئی۔ شادی کے چار دن بعد باپ کا انتقال ہو گیا اور بیوی ایک سال بعد عالیہ کی پیدائش کے ساتھ مر گئی۔ اس طرح خان داراب بالکل بندھ کر رہ گیا۔ اس نے اپنی افتاد بیچ کو طاقی نسیاں کیا اور اپنی ساری توجہ عالیہ کی تعلیم و تربیت پر مرکوز کر دی۔ عالیہ سے اس کا رویہ ہمیشہ ہی دوستانہ سارا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عالیہ کو اس کے سامنے اپنی ”پند اور انتخاب“ کا اظہار کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔

”کہاں کا راز ہے والا ہے وہ؟“ خان داراب نے

ڈپٹ کر پوچھا تھا۔

عالیہ اس سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئی تھی۔ ”وہ گلگت میں پیدا ہوا تھا۔“ عالیہ اطمینان سے بولی۔ ”لیکن جب ایک سال کا تھا تب ہی اس کے باپ نے پنجاب جا کر تجارت شروع کر دی۔ اس کے انتقال کو پانچ سال گزر چکے ہیں اور اس کی تجارت ارسلان کے بڑے بھائی نے سنبھال رکھی ہے۔ بھائی اور بھانج ارسلان کو اپنی اولاد کی طرح چاہتے ہیں۔“

”وہ ہے کیسا؟“ خان داراب نے پوچھا اور پھر اپنی بائیں آنکھ دہائی۔ ”میرا مطلب ہے... خوب صورت ہے“

”ہاں آں! خوب صورت تو ہے لیکن مجھ سے ذرا کم ہے۔“ عالیہ نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا۔

”گڈ!“ خان داراب نے اپنے ہاتھ میں مستقل رہنے والی چھڑی سے عالیہ کی زلفیں بھرا لیں۔ ”اگر تجھ سے کم خوب صورت ہے تو ضرور چلے گا۔ ویسے بھی اگر وہ تیری پسند ہے تو میں کون سا طرم خاں ہوں کہ اڑنگا لگاؤں لیکن... مجھے بھی ایک نظر دکھا دے نا۔“

چنانچہ عالیہ کا ٹیلی گرام ملتے ہی ارسلان چترال پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر خان داراب کی آنکھوں میں حسنین کی چمک نظر آئی۔ ارسلان کسی طرح بھی عالیہ سے کم خوب صورت نہیں تھا۔

”چترالی زبان آتی ہے؟“ خان داراب نے اس سے انگریزی میں پوچھا۔

”جی ہاں۔“ ارسلان نے چترالی زبان میں جواب دیا۔

”وہ کیسے آگئی؟“ خان داراب بھی چترالی بولنے لگا۔ ”عالیہ بتا رہی تھی کہ تو ایک سال کی عمر میں پنجاب چلا گیا تھا۔“

”جی وہ کچھ تو بھائی بھانج کی وجہ سے آگئی اور کچھ عالیہ کے ساتھ یونیورسٹی میں رہ کر سیکھ لی۔“

”گڈ! تو گویا عالیہ تیری استانی ہوئی۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ بیوی کو شوہر سے کچھ بلند ہونا چاہیے۔“

”جی!“ ارسلان شیشا سا گیا اور عالیہ منہ دبا کر ہنسنے لگی۔ اس نے ارسلان کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا باپ اپنے چھوٹوں سے کس طرح بات کرتا ہے۔

”اس میں شینے کی کیا بات ہے گھاسڑ لڑکی۔“ خان داراب نے

”اور ہاں...“

عظمت

لڑکے!.. کیا نام ہے تیرا؟ ہاں... ارسلان... بٹو نے اس گھماڑی لڑکی کو پسند کر لیا ہے۔ گویا ٹوٹی ہوئی گھماڑی ہے۔ چل ٹھیک ہے۔ دو گھماڑی چلتی ہیں گے تو ابھی گزرے گی۔ منگنی کی انگوٹھی نکال جیب سے۔

”جی! ارسلان بھو بھوکارہ گیا۔“
”واپسی گھماڑی ہے۔ منگنی کی انگوٹھی بھی لے کر نہیں آیا۔ چل کوئی بات نہیں۔ عالیہ کی ماں کی ہیرے کی انگوٹھی میرے پاس محفوظ ہے۔ میں وہ لاکر تجھے دے دیتا ہوں۔ تو اسے پہنا دے۔“
”اے... لیکن...“

”ہاں آں۔“ خان داراب نے بڑا سامنے بنایا۔
”میں بھی جانتا ہوں کہ منگنی کی انگوٹھی لڑکے کی طرف سے آئی ہے لیکن عالیہ نے بتایا تھا کہ تیرا باپ مر چکا ہے لہذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج سے تو میرا بیٹا ہے۔ میں ایک باپ کی حیثیت سے دو انگوٹھی لاکر تجھے دے دیتا ہوں اور برادری کے لوگوں کو بھی بلوا لیتا ہوں۔ آج شام کو تیری منگنی ہو جانا چاہیے۔“

اور اس عجیب و غریب انداز میں ان کی منگنی ہو گئی۔ ارسلان وہاں ایک دن رک کر واپس چل گیا جہاں اس کا گھر تھا۔ اس کے بھائی اور بھانجے یہ سن کر بے حد خوش ہوئے کہ ارسلان کی منگنی ایک ایسی لڑکی سے ہوئی ہے جو چڑال کے سابق فرماں رواؤں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

اس منگنی کو چھ ماہ گزر چکے تھے اور شادی ہونے میں ابھی اتنا ہی عرصہ باقی تھا۔ خان داراب کی خواہش تھی کہ ان دونوں کی شادی عالیہ کے ناناکے موجودگی میں ہو جو علاج کی غرض سے امریکا گئے ہوئے تھے اور ان کی واپسی چھ ماہ بعد متوقع تھی۔

پچھلے دنوں ارسلان کو پھر عالیہ کا ٹیلی گرام ملا تھا کہ وہ فوراً اپنے اور جب وہ پہنچا تو عالیہ نے اسے یہ بات بتائی تھی کہ خان داراب نے اچانک کافرستان دیکھنے کا پروگرام بنایا ہے۔

”وہ مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔“ عالیہ نے کہا۔ ”لہذا میں نے سوچا کہ تمہیں بھی بلالوں۔ سفر بھی دلچسپ ہو جائے گا اور یہ کچھ بھی۔“
لیکن عالیہ کا یہ خیال قطعی غلط تھا کہ خان داراب کو شخص پکڑنے کی سوجھی تھی۔ ارسلان کو اصل بات کا علم خان داراب سے سوال کرنے پر ہوا۔

”یہ ایک خاصا دلچسپ معاملہ ہے۔“ خان داراب

نے کہا۔ ”شاید تجھے معلوم ہو گا کہ اس وادی کے لوگ قدیم یونانی اور ہندو رسم و رواج میں جکڑے ہوئے ہیں اور ابھی کچھ دنوں سے انہوں نے ایک برفانی دیوی کی پوجا شروع کر دی ہے۔ پچھلے دنوں کچھ غیر ملکی سیاح یہاں آئے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ کوئی برفانی عورت ہوگی جسے ان لوگوں نے دیوی مان لیا ہے۔ وہاں کے بیشتر لوگوں کا دعوٰی ہے کہ وہ خود اس دیوی کو دیکھ چکے ہیں اور میں برفانی انسان کے قصے سن سن کر بہت بور ہو چکا ہوں۔ برف سے ڈھکے ہوئے کئی پہاڑوں کی چوٹیوں میں نے اسی لیے سر کی تھیں کہ شاید مجھے بھی کوئی برفانی انسان نظر آجائے لیکن مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ اب اپنے ہی ملک میں ایک برفانی عورت کے وجود کی کہانیاں سننے میں آگئی تو میں نے سوچا کہ چل کر خود اس کی تصدیق کی جائے۔ متوج برف باری کی وجہ سے میں نے اس سفر کی تیاری بہت غلط میں کی تھی۔ برف باری کے بعد تو راستے بند ہو جائے اور مجھے اتنے دن تک برف پھیلنے کا انتظار کرنا پڑتا جبکہ میں بڑا عجلت پسند واقع ہوا ہوں۔“

اس طرح عالیہ کو بھی یہ بات ارسلان سے معلوم ہو گئی۔
”برفانی عورت!“ عالیہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔
”اگر واقعی وہ ہوئی تو میں اس سے ضرور دوستی کروں گی۔“
”اور میرے ہونے والے بچوں کی رحمتیں عالم بالا ہی میں بٹکتی رہ جائیں گی۔“ ارسلان نے غصہ کی سانس لے کر کہا۔

”کیا مطلب؟“
”ارے وہ تمہیں چیر پھاڑ کر رکھ دے گی۔“ ارسلان نے آنکھیں نکالیں۔

”ایسا تو نالہ نہیں ہوں میں۔“ عالیہ نے بڑا سامنے بنایا۔ ”صرف بارہ سال کی عمر میں مجھے باوا جانے نے ریوا اور وغیرہ چلانا اور کھڑ سواری سکھا دی تھی۔ اس کے علاوہ نیزہ پھینکنا، شیر زنی اور تیر اندازی بھی سکھا دی تھی۔ وہ خود تو تیر اندازی میں حد درجہ مشاق ہیں۔ انہیں قدیم ہتھیاروں اور طریقہ جنگ سے عشق ہے۔ تم نے ہمارے گھر میں اس قسم کی چیزیں دیواروں پر لگ کر رکھ رکھی ہوئی دیکھی ہوں گی؟“
”میں انہیں محض ڈیکوریشن نہیں سمجھتا تھا۔“

”ان میں سے کوئی ہتھیار بھی مصنوعی نہیں ہے۔“
”تو کیا باوا جانے وہ ہتھیار بھی ساتھ لے کر آئے ہوں گے؟“

”اس کا قوی امکان ہے۔“

”اس عہد میں وہ مضحکہ خیز معلوم ہوں گے۔ لوگ انہیں دیکھ کر نہیں گے۔“
”باوا جانے کو کسی کے ہنسنے و نسنے کی پروا نہیں ہوتی۔“ عالیہ کی یہ بات سو فیصد درست تھی۔ خان داراب بڑے غصہ سے مزاج کا آدمی تھا لیکن یوں بھی تھا کہ بعض اوقات اسے نہایت ہی معمولی بات پر اتنا غصہ آتا کہ وہ غیظ و غضب کا پیکر بن جاتا۔ اس وقت اس سے یہ توقع بھی کی جا سکتی تھی کہ وہ کسی کو ہلاک کر سکتا ہے۔

☆ ☆ ☆
کافرستان اس لیے اسم باسٹی ہے کہ وہاں کی آبادی صرف کافروں پر مشتمل تھی لیکن اب ان میں بہت سے لوگ مسلمان ہو چکے ہیں اور اس کا سہرا وادی کا کل کے سر جاتا ہے۔ یہ سارا علاقہ قبل از مسیح سے موجود ہے لیکن صدیوں تک پردہ آفتاب میں رہا۔ 1890ء میں ایک انگریز رابرٹسن نے اسے دریافت کیا اور تب سے اب تک یہ جنت نظیر علاقہ، سیاحوں اور محققین کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔

سر یہ فلک سفید پوش پہاڑیوں میں گھری ہوئی ان سرسبز و شاداب وادیوں میں رہنے والے اتنے خوب صورت ہیں کہ انہیں پریوں اور دیوتاؤں کی اولاد سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ بڑے فلفلفہ مہمان نواز اور امن پسند واقع ہوئے ہیں۔ صدیوں سے وہ ایک پرسکون زندگی گزارتے چلے آ رہے ہیں۔ بس کبھی کبھار بے تحاشا بادش اور سیلاب ان کی زندگی کو درہم برہم کر دیتے ہیں یا طویل طویل عرصے کے بعد ان کا آسمانی دیوتا ان پر اپنا قہر نازل کرتا ہے اور وہ لوگ اپنی اپنی عبادت گاہوں میں جن کو ”جنگ ہان“ کہا جاتا ہے، قربانیاں دے دے کر آسمانی دیوتا کا غصہ ٹھنڈا کر لیتے ہیں۔

لگ بھگ اٹھارہ سال پہلے بھی ان کی زندگی میں ایک ایسی ہلچل ہوئی جس کا آغاز اس علاقے میں ایک اجنبی کی آمد سے ہوا۔ اس کے پاس ایک راتل تھی اور وہ نہایت گرم کپڑوں میں لمبوس ایک جگہ برف پر بے ہوش پڑا ہوا ملا تھا۔ مقامی لوگ اسے اٹھا کر لے آئے تھے۔ اس کا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ اسے مقامی لوگوں کی زبان نہیں آتی تھی اور مقامی لوگ اس کی زبان نہیں سمجھتے تھے، لہذا اس کے علاج کے لیے ایک سیاح ڈاکٹر سے درخواست کی گئی جو ایک سال سے یہاں تھا اور مقامی زبان سے کچھ کچھ آشنا ہو گیا تھا۔

جب وہ کچھ تندرست ہو گیا تو سیاح ڈاکٹر نے مقامی لوگوں کو بتایا کہ اس شخص نے اپنا نام گردیزی بتایا ہے اور یہاں پر کسی شخص کی تلاش کئے لیے اسے قبیلے کے سردار کا

تعاون درکار ہے۔ اس کے علاوہ اس نے کوئی بات نہیں بتائی۔ وہ لوگ اس بات کے لیے تیار ہو گئے کہ جب وہ پوری طرح تندرست ہو جائے گا تو وہ اسے اپنے قبیلے کے سردار کے پاس لے چلیں گے۔

پھر جب وہ مکمل تندرست ہو گیا تو طے پایا کہ اسے اگلے دن قبیلے کے سردار کے پاس لے جایا جائے گا جو قریب کی دوسری وادی میں رہتا تھا جسے اسی رات وہاں کے لوگوں کے خیال کے مطابق ان پر قیامت صغریٰ ٹوٹ پڑی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی کبھی آسمان سے آگ برسنے لگے گی۔ آگ تو نہیں برسی لیکن کئی پہاڑ خوف ناک انداز میں گڑگڑانے لگے اور برف کے تودے ٹوٹ ٹوٹ کر وادی میں گرنے لگے۔ ان میں سے ایک تودہ اس مکان پر بھی گرا جہاں گردیزی کو رکھا گیا تھا۔ مکان مکمل طور پر برباد ہو گیا لیکن گردیزی حیرت انگیز طور پر زندہ بچ گیا۔ بس اس کے سر پر شدید ضرب لگی تھی لیکن اس ضرب نے اس کی شخصیت کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ سیاح ڈاکٹر نے اس کے سر کا زخم بھی ٹھیک کیا لیکن اس کے بعد گردیزی ایسا بن گیا تھا جیسے اسے کچھ بھی یاد نہ رہا ہو۔ اب وہ نہ تو بول سکتا تھا اور نہ اسے اپنا نام یاد رہا تھا۔ وہ حیرت سے اس طرح چاروں طرف دیکھنے لگا تھا جیسے وہ سب کچھ اس کے لیے بالکل اجنبی ہو۔ اس کے منہ سے ”خون خاں“ جیسی آوازیں نکلنے لگی تھیں جیسے وہ کوئی نوزائیدہ بچہ ہو۔ سیاح ڈاکٹر کے خیال کے مطابق سر پر لگنے والی ضرب نے اس کی یادداشت کو اس حد تک مفلوج کر دیا تھا کہ اسے اپنی زبان بھی یاد نہیں رہی تھی۔

مقامی لوگوں کی سمجھ میں یہ بات تو نہیں آ سکی کہ انسان اپنی یادداشت کبھی کبھار بھٹکتا ہے مگر ان تو ہم پرست لوگوں نے اسے ”منوس“ قرار دے دیا۔ اب وہ لوگ چاہتے تھے کہ گردیزی کو جلد از جلد اپنے علاقے سے رخصت کر دیں لیکن شیمان کے آڑے آیا۔

شیمان ایک ایسا نوجوان تھا جسے تو ہم پرستی چھوڑ بھی نہیں گزری تھی۔ وہ اپنے لوگوں کے رسوم و رواج اور عقائد سے بھی اختلاف رکھتا تھا مگر لوگوں کی مخالفت کے ڈر سے اپنے خیالات کا برملا اظہار نہیں کرتا تھا۔ قابل رحم لوگوں کے لیے اس کے دل میں بہت جگہ ہوتی تھی چنانچہ وہ گردیزی کو اپنے گھر لے آیا۔

لوگوں کو یہ بات بہت بری لگی لیکن وہ اپنے جذبات کا اظہار اس لیے نہیں کر سکے کہ شیمان کے مذہبی پیشوا کا بیٹا تھا۔ یہ لوگ اپنے مذہبی پیشوا کو ”بلان“ کہتے ہیں۔ بلان کو

بھی اپنے بیٹے کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی تھی لیکن شیما اس کا اتنا لاڈ لڑا تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کا یہ اقدام جبراً اور کراہ کر برداشت کر لیا۔

شیما کے اس ذہنی انقلاب کا سبب وہ سیاح اور محققین تھے جن کا اس کے علاقے میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اسے سات آٹھ برس ہی کی عمر سے ان لوگوں سے عقیدت ہو گئی جو اس کی دانست میں ”عظیم بیرونی دنیا“ سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاں کا ہر انسان اس کے خیال میں اقلاتوں و ارسطو کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ ان لوگوں کے ساتھ گزارتا اور جب وہ ان لوگوں کی زبان کچھ کچھ سمجھنے لگا تو بیرونی دنیا کی ترقی کے بارے میں اس کی واقفیت بھی بڑھنے لگی۔ پھر اس نے ان لوگوں سے پڑھنا بھی شروع کر دیا۔ اس کا یہ ذوق و شوق دیکھ کر لوگ اسے تختہ کتا میں بھی دینے لگے جن کا اب شیما کے پاس ڈھیر لگ چکا تھا اور وہی کتا میں اس کے نظریات و خیالات میں انقلاب کا باعث بنیں۔

شیما نے گردیزی کی پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر دی اور خود گردیزی کی تحقیق سمجھنے لگا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ گردیزی کون ہے؟ یہاں کیوں آیا تھا اور اس کی زندگی کا پس منظر کیا ہے؟ مگر یہ سب کچھ جاننے کے لیے ضروری تھا کہ گردیزی کو بولنا آتا لیکن وہ تو سب کچھ بھول چکا تھا لہذا شیما نے سب سے پہلے اسے بولنا سکھانا شروع کیا۔ وہ اسے نہ صرف اپنی زبان بلکہ خود اس کی زبان بھی سکھانے کی کوشش کرنے لگا جو اس نے بیرونی دنیا سے آنے والوں سے سیکھی تھی۔

☆☆☆

جب خان داراب کا قافلہ وادی کی حدود میں داخل ہوا تو ارسلان نے محسوس کیا جیسے وہاں کی فضا نے آہستہ آہستہ اس کی تھکان فحشو شروع کر دی ہو۔ ہر طرف پہاڑ، برف کے سفید فاقوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ کئی جزائر کی بلندی پر کھینچے جنگل بھیلے ہوئے تھے۔ شاہ بلوط اور صنوبر کے حسین جنگل بھی تھے۔ ”جگہ جگہ“ ”کل کل“ کرتی ہوئی ندیاں، بے شمار اقسام کے جنگلی پھول بوٹے، ہری بھری گھاس اور سیب، ناشپاتی، انار، تیتوں اور انناس کے درخت جن پر خوب صورت ننھے ننھے پرندے چہچہاتے پھرتے تھے۔ شاہد اب دیر بزرگھاس پر پیچڑوں کا ریوڑ بھی چرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

جب وہ آبادی کے قریب پہنچے تو وہاں کے لوگوں کو دیکھ کر بھی رنگ کے جذبات کو اغلیت لی۔ عورتیں ہی نہیں بلکہ مرد بھی بہت خوب صورت تھے مگر ان کے لباس میں بے حد سادگی تھی۔ عورتیں زیادہ تر تانبے کے زیورات پہنے

ہوئے تھیں اور کچھ نے چاندی کے زیورات پہنے ہوئے تھے۔ مکانات لکڑی، گارے اور اینٹوں کے بنے ہوئے تھے۔ وہاں کے لوگ ان کے قافلے کو دیکھ کر خوش اخلاقی سے مسکرائے اور انہوں نے بھی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ دو تین جگہ خیمے بھی گڑے ہوئے نظر آئے جو کئی یا خیمہ کئی سیاحوں کے تھے۔ خان داراب نے بھی ایک مناسب جگہ کا انتخاب کر کے ملازمتیں کو خیمے لگانے کا حکم دے دیا۔

”باد جانی!“ ارسلان بول پڑا۔ ”اس وادی میں آکر تو کیا ایک ساری صبحیں دور ہو گئی۔ جی چاہ رہا ہے فوراً اٹھو منے کے لیے نکل جاؤں۔“

”واقعی بہت خوب صورت جگہ ہے۔“ خان داراب نے تائید میں سر ہلایا۔ ”لیکن مجھے ابھی یہاں رکنا ہوگا۔ خیمے لگ جائیں تو میں اپنی گھرائی میں ہی سارا سامان بھی رکھواؤں گا۔ اس کے بعد اپنا اعلیٰ وغیرہ ٹھیک کروں گا۔“

”راٹل تو آپ کے شانے سے لٹکی ہوئی ہے۔“ ”میرے پاس کچھ اور اسلحہ بھی ہے پارا۔“ خان داراب نے اپنے مخصوص بے تکلفانہ انداز میں کہا۔ ”نیزہ اور تیرکمان وغیرہ... مجھے ان چیزوں سے شکار کھیلنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔“ ”ججے اگر گرو راہی کھوئے گا شوق چرایا ہے تو چلا جا۔“

”تم بھی چل رہی ہو عالیہ؟“ ارسلان نے پوچھا۔

”اگر تم درخواست کرتے ہو تو چلی چلی ہوں۔“

”میں آپ سے چر زور التجا کرتا ہوں۔“ ارسلان نے منہ بنا کر کہا۔

خان داراب دوسری طرف منہ کر کے خفیف سا مسکرایا۔ وہ بھی ان دونوں کے اس طریق گفتگو سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔

”لیکن اتنی دور نہ نکل جانا کہ بھیک ہی جاؤ۔“ وہ بولا۔

ارسلان اور عالیہ نے اپنے گھوڑوں کا رخ موڑا اور انہیں دکل چلائے ہوئے ایک طرف بڑھنے لگے۔ خان داراب دو کھینچے تک مصروف رہا اور جب وہ اطمینان سے پیٹھ کر اپنے پانپ میں تہا کو بھرتے ہوئے برفانی عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا تو ارسلان اور عالیہ واپس آ گئے۔

”کب... کیسی بھی تفریح؟“ خان داراب نے پوچھا۔

”بہت شان دار باد جانی۔“ عالیہ کی آنکھیں جواب دیتے ہوئے چمکنے لگیں۔ ”ملاشبہ یہ ایک جنت نظیم علاقہ ہے۔

یہاں کے لوگ بھی بہت اچھے ہیں۔“

”میں نے تو یہاں کے ایک آدمی کو اپنا دوست بھی بنا لیا ہے۔“ ارسلان نے کہا۔ ”اس کا نام شیما ہے۔ بہت ہمدرد انسان ہے۔ اس کے ساتھ گردیزی نام کا ایک شخص بھی تھا لیکن اس سے زیادہ گفتگو نہیں ہو سکی۔ نیم پاگل سا ہے۔ وہ کوئی اٹھارہ سال پہلے یہاں آیا تھا اور اب تک شیما کے گھر میں رہ رہا ہے۔“

”اٹھارہ سال سے؟“ خان داراب کو تعجب ہوا۔ ”وہ کوئی قاتل تو نہیں ہے جو قاتلوں کے خوف سے یہاں آ گیا ہو؟“

”شاید ایسا نہیں ہے باد جانی... وہ یہاں کسی کی تلاش میں آیا تھا لیکن ایک حادثے کی وجہ سے وہ سب کچھ بھول گیا۔“ ارسلان نے خان داراب کو گردیزی کی ساری کہانی سنائی جس میں اس رات کا حصہ بھی تھا جب آسمان پر رنگ لہرائے تھے اور پہاڑیوں کی گڑگڑاہٹ سے برف کے تودے ٹوٹ ٹوٹ کر وادی میں گرنے لگے تھے اور انہی میں سے ایک تودے کی وجہ سے گردیزی کے سر پر ضرب لگی تھی۔ ”وادی کے لوگ شیما سے متحضر ہو گئے تھے۔“ ارسلان نے کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن شیما نے گردیزی کو اپنے گھر میں پناہ دی اور اسے یہاں کی زبان کے علاوہ اس کی اپنی زبان بھی سکھانا شروع کی جو وہ بھول گیا تھا۔ اب وہ یہ دونوں زبانیں بول سکتا ہے لیکن بولتا نہیں ہے۔ زیادہ تر خاموش رہتا ہے۔ شیما یہاں کے لوگوں سے خاصا مختلف ذہن رکھتا ہے کیونکہ اس کے پاس ہماری دنیا کی بے شمار کتابیں جمع ہو گئی ہیں جنہیں وہ پڑھ چکا ہے۔ وہ یہاں کے روحانی پیشوا کی اولاد ہے لیکن اسے اپنی قوم کے رسوم و رواج اور عقائد سے شدید اختلاف ہے۔“

”اس برفانی عورت کے بارے میں بھی کچھ معلوم ہوا؟“ خان داراب نے پوچھا۔ شاید اسے گردیزی اور شیما کی کہانی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

”یہ لوگ اسے برف کی دیوی سمجھتے ہیں۔ مقامی آبادی کے صرف چار پانچ افراد سے دیکھنے کے دعوے دار ہیں۔“ ”اگر میں خود اسے دیکھ سکا تو مجھے بہت حیرت ہوگی۔“ اصل مجھے برفانی انسان کی باتیں محض کہانیاں معلوم ہوتی ہیں۔ بہر حال، ہم کل ہی بلندی کی طرف سفر شروع کریں گے۔ اگر واقعی وہ ہے تو اسے تلاش کریں گے۔“

لیکن یہاں کے لوگوں سے ہمیں یہ بھانڈا پڑے گا کہ ہم محض شکار کے لیے اوپر جا رہے ہیں۔ یہ بات ظاہر

نہیں ہونا چاہیے کہ ہمیں اس برفانی عورت کی تلاش ہے۔“ ”کیوں؟“

”یہ لوگ ایسے لوگوں کو ناپسند کرتے ہیں جو اوپر جا کر ان کی دیوی کے سکون کو درہم برہم کریں۔ وہ اس پارٹی سے بھی نفرت کرنے لگے ہیں جو برفانی عورت کی تلاش میں یہاں آئی ہوئی ہے۔“

”وہ لوگ کون ہیں؟“ خان داراب نے چونک کر پوچھا۔

”کوئی سائنس دان ڈاکٹر اکیم پیٹر ووج ہے جو اپنی پارٹی کے ساتھ آج کل جہاز بارش کی بلندی پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔“ ارسلان نے بتایا۔

”یہ بہت بُرا ہوا۔“ خان داراب نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ”اب ہمیں اس برفانی عورت کی تلاش میں بہت بھگت سے کام لینا پڑے گا۔ میں اس تک سب سے پہلے پہنچنا چاہتا ہوں۔“

”سب سے پہلے اس تک پہنچنے کی خواہش کسی خاص وجہ سے ہے باد جانی؟“ عالیہ پوچھ رہی تھی۔

”ہاں۔“ خان داراب نے کہا۔ ”اگر وہ ان لوگوں کے ہتھے لگ گئی تو اس کی باقی زندگی ان کے سائنسی تجربات کا ہدف بنے ہوئے گزر جائے گی جبکہ میری خواہش ہے کہ اگر وہ مجھے لگتی تو میں اسے یہاں سے چپ چاپ نکال لے جاؤں گا اور اسے ایک مہذب انسان بنانے کی کوشش کروں گا۔“ ”اوہ، گدا! عالیہ کا چہرہ پُر جوش انداز میں سرخ ہو گیا۔ ”اگر وہ مہذب بن گئی تو میں اسے دوست بنا لوں گی۔“ ”ضرور۔“ خان داراب مسکرایا۔

ارسلان نے جانے کیا سوچتے لگا۔ دوسرے دن جب ان لوگوں نے بلندی کی طرف سفر شروع کیا تو شیما ان سے ملنے آیا۔ گردیزی شاید ہر وقت ہی اس کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی عمر پچیس سال ضرور رہی ہوگی۔ اس کا شبو بڑھا ہوا تھا اور آنکھوں میں ویرانیاں ناچ رہی تھیں۔ اس نے مقامی لباس زیب تن کر رکھا تھا لیکن اس کے نقش و نگار صاف ظاہر کر رہے تھے کہ وہ مقامی باشندہ نہیں ہے۔

شیما کی عمر اڑتیس چالیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بڑی حیرت سے خان داراب کی جج دجج دیکھی۔ خان داراب کے ایک شانے سے راکٹل اور دوسرے شانے سے کمان اور تیروں سے بھرا ہوا ترش لٹکا ہوا تھا۔ ایک نیزہ اس نے گھوڑے کی زین سے باندھ رکھا تھا۔ جدید

اور قدیم دور کی یہ آمیزش بڑی عجیب سی معلوم ہو رہی تھی۔
 ”آپ بہت عجیب و غریب شکاری معلوم ہو رہے ہیں
 محترم خان!“ وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
 ”مجھے قدیم ہتھیاروں سے شوق ہے۔“ خان داراب
 نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ ”میں نے افریقہ میں نیزے اور
 تیرکمان ہی سے دو چیتے اور ایک تیندوے کا شکار کیا تھا۔ میں
 شکار میں راتوں کا استعمال بہت کم کرتا ہوں۔“
 ”بہت دل گردے کے معلوم ہوتے ہیں آپ۔“ شیمہ
 نے اسے حسین آمیز نظر سے دیکھا۔

☆ ☆ ☆

چار ہزار فٹ کی بلندی کو کمر کرنے کے لیے جانوروں کا
 استعمال ایک خطرناک بات تھی لیکن خان داراب نے یہ خطرہ
 مول لیا۔ شاید وہ عالیہ کو زیادہ محسن کا شکار ہوتے ہوئے نہیں
 دیکھنا چاہتا تھا۔ انہوں نے یہ سفر اتنی آسانی سے کیا کہ صبح
 گیارہ بجے کے چلے ہوئے اس وقت چار ہزار فٹ اوپر پہنچے
 جب سورج غروب ہونے میں صرف آدھا گھنٹہ رہ گیا تھا۔
 یہاں سے جنگل شروع ہو گیا تھا اور خان داراب نے دور بین
 سے دیکھ لیا تھا کہ چار پانچ فرلانگ کے فاصلے پر دو خیمے لگے
 ہوئے تھے جو یقیناً غیر ملکی پارتی کے ہوں گے۔ خان داراب
 پڑاؤ ڈالنے کے لیے عام خیموں کے بجائے صرف دو مووی
 خیمے لایا تھا جو نہ صرف بہت ہلکے تھے بلکہ ان میں نہ کمر سردی
 سے بھی خاصی حد تک محفوظ رہا جاسکتا تھا۔ یہاں برف کی
 تقریباً دو انچ موٹی تھی۔ مزدور خیمے لگانے میں مصروف ہو
 گئے۔ ارسلان اور عالیہ اوجھڑا دھڑکتے لگے۔ انہیں یہاں سے
 نیچے کا منظر بہت حسین نظر آ رہا تھا۔

ایک ایک وہ خشک گئے۔ ان دونوں کی نظر بیک وقت
 ان نشانوں پر پڑی تھی جو کسی کے پیروں کے تھے۔ ننگے
 پیروں کے نشان ہوتے۔ ان نشانوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا
 کہ وہ کسی ایسے شخص کے ہیں جس کے پیروں کی انگلیاں بہت
 پھیلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
 ان نگاہوں میں ایک ہی سوال تھا۔ ”کیا کوئی مہذب انسان
 یہاں ننگے پیروں پر چل سکتا ہے؟“
 ”باد جانی کو بتانا چاہیے۔“ عالیہ اس طرح بولی جیسے
 سرگوشی کر رہی ہو۔ کسی خیال سے اس کے چہرے پر سرخی
 پھیل گئی تھی۔

ارسلان نے سر ہلایا۔ وہ تیزی سے پلٹا اور خان
 داراب کو اس جگہ لے آیا۔
 ”اوہ گاؤ!“ خان داراب کے منہ سے نکلا۔ ”یہ تو ایسا

معلوم ہوتا ہے جیسے میرا خیال غلط تھا کہ برفانی انسان کا کوئی
 وجود نہیں۔ یہاں ننگے پیروں والے کوئی مہذب انسان نہیں ہو
 سکتا۔“

وہ نشانوں کا ظاہر کر رہے تھے کہ وہ شخص غیر ملکی کپ کی
 طرف سے آتے ہوئے ادھر سے گزرا تھا۔
 ”باد جانی!“ ارسلان بولا۔ ”آپ کو یقین ہے کہ یہ
 کسی برفانی انسان کے پیروں کے نشان ہوں گے؟“
 ”یقین تو خیر میں اسی وقت کروں گا جب اسے اپنی
 آنکھوں سے دیکھ لوں مگر ان نشانوں نے میرے اس یقین کو
 متزلزل نہ کر دیا ہے کہ برفانی انسان کا کوئی وجود نہیں۔“
 ”لیکن یہ نشان کبھی عورت کے تو نہیں معلوم
 ہوتے۔“ عالیہ بولی۔ ”ان انگلیاں ننگی پھیلی ہوئی ہیں۔“
 ”تم نے بھی اپنے وطن کی غریب عورتوں کے پیروں
 دیکھے، ننگے پیروں والے ان کی انگلیاں ننگی پھیل جاتی ہیں۔“
 ”مگر اتنی پھیلی نہیں۔“

”اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرو کہ یہ ایک برفانی
 پڑاؤ علاقہ ہے۔ اچھا، اب تم دونوں خیمے گاڑنے والوں کی
 نگرانی کرو، میں ان نشانوں کے تعاقب میں جاتا ہوں۔“
 ارسلان اور عالیہ کے پیروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا
 کہ وہ دونوں بھی خان داراب کے ساتھ جانا چاہتے ہیں لیکن
 خان داراب کے مزاج کا خیال رکھتے ہوئے انہوں نے کچھ
 نہیں کہا۔

خان داراب اپنے گھوڑے کے قریب گیا اور اس پر
 بیٹھ کر تیزی سے ان نشانوں کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔
 اب یہ علاقہ اتنا مرتفع نہیں رہا تھا کہ گھوڑے پر سواری کرنا
 کوئی آسان بات ہوئی۔ خان داراب کو جگہ جگہ اپنے
 گھوڑے کو جھٹ گھاتا پڑتی۔ پیروں کے نشان والا بھی ان
 اونچے نیچے مقامات پر چھلانگ لگانے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔
 ایک ایک خان داراب کو اپنا گھوڑا روک دینا پڑا۔ اب
 اس کے سامنے ایک کھائی آگئی تھی جو کسی طرح بھی بارہ چوہہ
 فٹ سے کم چوڑی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو
 کھائی کے بالکل کنارے تک لے گیا۔ وہ نشان اس جگہ
 آ کر غائب ہو گئے تھے۔ فوری طور پر خان داراب یہی
 اندازہ لگا کہ یہاں سے اس نامعلوم ہستی نے چھلانگ لگا
 کر کھائی پار کی ہوگی لیکن اب اندھیرا اتنا ہو چکا تھا کہ کھائی
 کے اس پار کی چیز کا نشان دیکھنا امر محال تھا۔ مامد پڑی ہوئی
 روشنی میں کھائی کی گہرائی کا اندازہ لگانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اگر
 روشنی مناسب ہوئی تو خان داراب اپنے گھوڑے کو کھائی کی

دوسری جانب ہٹ لگانے پر مجبور کر سکتا تھا لیکن اب۔۔۔
 ”خدا کا ایک فضا میں یہ اقدام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔
 اچانک خان داراب کے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔
 اس نے اپنا نیزہ سنبھالا اور اسے پوری طاقت سے فضا میں
 پھینکا۔ نیزہ تقریباً نو فٹ درجے کے زاویے سے پھینکا گیا تھا
 لیکن عقب سے آئی ہوئی ہوائ نے اس کے زاویے کو قدرے
 آگے کی طرف جھکا دیا۔ پھر جب وہ بلندی سے نیچے آنے لگا
 تو اس کا رخ کھائی کے اس پار تھا۔ خان داراب نے اسے
 میں چوٹائی کے قریب زمین میں دھنستے ہوئے دیکھا اور
 اطمینان کی سانس لی۔ اب اس نے زین سے بندھا ہوا رستے
 کا تھکا لال کے اسے کھولا اور اس کے سر سے پرچند اہنا کر
 کھائی کے اس پار پھینکا۔ وہ چاہتا تھا کہ نیزہ اس پسندیدگی کی
 گہرائی میں آجائے لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ اس نے رستے کو
 کھائی کی دوسری طرف متوجہ کر دیا اور کامیاب ہو گیا۔ اب وہ
 اطمینان کی سانس لے کر گھوڑے سے اترتا اور ایک تھوڑے
 سے ایک لمبی سی میخ زمین میں ٹھونکنے لگا۔ میخ کا ڈر اسے خیال
 آیا کہ وہ کھائی کے پار دھنستے ہوئے نیزے کی مضبوطی کا
 اندازہ تو کر لے۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے رستے کو اپنی
 طرف کھینچا۔ پھر زیادہ قوت صرف کی، پھر اور زیادہ قوت
 صرف کی اور جب اس نے پوری طاقت صرف کر دی تو
 نیزے نے بہت معمولی سی جھنک کی۔ وہ یقیناً اتنی مضبوطی سے
 گڑا تھا کہ تین چار آدمی مل کر رستے کو کھینچنے، تب ہی وہ
 اکڑتا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد خان داراب
 نے رستے کا دوسرا سر اس میخ سے باندھا اور خوب اچھی طرح کھینچ
 کر اس کی مضبوطی کا اندازہ بھی لگا لیا۔ اب وہ اس کھائی پر
 رستے کا ایک ”پل“ بنا چکا تھا۔ اس نے گھوڑے کی لگا میں
 دیار کے ایک درخت سے باندھ دیں اور پھر کھائی کے
 کنارے پر پہنچا۔ وہ رستے سے لٹک کر کھائی کی دوسری
 جانب پہنچنا چاہتا تھا۔ عام آدمی کے لیے یہ ایک خطرناک
 بات ہوتی لیکن خان داراب کے لیے یہ کوئی خاص بات نہیں
 تھی۔ وہ تو نہایت خطرناک برف پوش چوٹیاں سر کر چکا تھا۔
 آخر وہ احتیاط سے رستے سے لٹک گیا اور کھائی میں
 لٹک کر بازوؤں کی قوت سے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ وہ
 اس وقت خاصا پر جوش تھا۔ اس کے یقین کے مطابق دوسری
 طرف ان پیروں کے نشان ضرور ملنا چاہیے تھے۔ خان
 داراب تاراج کی روشنی میں ان نشانوں کو دیکھتا ہوا اس ان
 دھنکی آتی کے ممکن تک پہنچ سکتا تھا۔

لیکن ابھی وہ پانچ چھ فٹ سے آگے نہیں بڑھا تھا کہ۔۔۔
 ”خدا کا ایک فضا میں یہ اقدام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔
 اچانک خان داراب کے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔
 اس نے اپنا نیزہ سنبھالا اور اسے پوری طاقت سے فضا میں
 پھینکا۔ نیزہ تقریباً نو فٹ درجے کے زاویے سے پھینکا گیا تھا
 لیکن عقب سے آئی ہوئی ہوائ نے اس کے زاویے کو قدرے
 آگے کی طرف جھکا دیا۔ پھر جب وہ بلندی سے نیچے آنے لگا
 تو اس کا رخ کھائی کے اس پار تھا۔ خان داراب نے اسے
 میں چوٹائی کے قریب زمین میں دھنستے ہوئے دیکھا اور
 اطمینان کی سانس لی۔ اب اس نے زین سے بندھا ہوا رستے
 کا تھکا لال کے اسے کھولا اور اس کے سر سے پرچند اہنا کر
 کھائی کے اس پار پھینکا۔ وہ چاہتا تھا کہ نیزہ اس پسندیدگی کی
 گہرائی میں آجائے لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ اس نے رستے کو
 کھائی کی دوسری طرف متوجہ کر دیا اور کامیاب ہو گیا۔ اب وہ
 اطمینان کی سانس لے کر گھوڑے سے اترتا اور ایک تھوڑے
 سے ایک لمبی سی میخ زمین میں ٹھونکنے لگا۔ میخ کا ڈر اسے خیال
 آیا کہ وہ کھائی کے پار دھنستے ہوئے نیزے کی مضبوطی کا
 اندازہ تو کر لے۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے رستے کو اپنی
 طرف کھینچا۔ پھر زیادہ قوت صرف کی، پھر اور زیادہ قوت
 صرف کی اور جب اس نے پوری طاقت صرف کر دی تو
 نیزے نے بہت معمولی سی جھنک کی۔ وہ یقیناً اتنی مضبوطی سے
 گڑا تھا کہ تین چار آدمی مل کر رستے کو کھینچنے، تب ہی وہ
 اکڑتا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد خان داراب
 نے رستے کا دوسرا سر اس میخ سے باندھا اور خوب اچھی طرح کھینچ
 کر اس کی مضبوطی کا اندازہ بھی لگا لیا۔ اب وہ اس کھائی پر
 رستے کا ایک ”پل“ بنا چکا تھا۔ اس نے گھوڑے کی لگا میں
 دیار کے ایک درخت سے باندھ دیں اور پھر کھائی کے
 کنارے پر پہنچا۔ وہ رستے سے لٹک کر کھائی کی دوسری
 جانب پہنچنا چاہتا تھا۔ عام آدمی کے لیے یہ ایک خطرناک
 بات ہوتی لیکن خان داراب کے لیے یہ کوئی خاص بات نہیں
 تھی۔ وہ تو نہایت خطرناک برف پوش چوٹیاں سر کر چکا تھا۔
 آخر وہ احتیاط سے رستے سے لٹک گیا اور کھائی میں
 لٹک کر بازوؤں کی قوت سے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ وہ
 اس وقت خاصا پر جوش تھا۔ اس کے یقین کے مطابق دوسری
 طرف ان پیروں کے نشان ضرور ملنا چاہیے تھے۔ خان
 داراب تاراج کی روشنی میں ان نشانوں کو دیکھتا ہوا اس ان
 دھنکی آتی کے ممکن تک پہنچ سکتا تھا۔

اس کے جسم نے جھٹکا کھایا اور پھر وہ رستے کو پکڑے ہوئے،
 جھٹکولا کھاتا ہوا تیزی سے کھائی کی دوسری طرف کی دیوار کی
 طرف بڑھا۔ فوراً اس کے ذہن میں آیا کہ شیخ اکھڑ گئی تھی یا
 رستے کی بندش دھکیلی رہ گئی تھی جو اس کا وزن نہ سہار سکی اور صل
 گئی۔ لیکن یہ دونوں ہی باتیں بڑی عجیب سی تھیں۔ اس نے
 ان دونوں باتوں کا اچھی طرح دھیان رکھا تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ دوسری طرف کی سنگلاخ
 دیوار سے گھرا اس کے جسم کی بے شمار ہڈیاں ٹوٹ سکتی تھیں
 اور اگر وہ رستہ چھوڑ دیتا تو کھائی میں گر جاتا جس کی گہرائی کا
 اسے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

کھائی کی دوسری دیوار صرف دو فٹ کے فاصلے پر رہ
 گئی تھی جب خان داراب نے ایک فیصلہ کیا اور اس پر ایک
 لمبے کی تاخیر کے بغیر عمل کر بیٹھا۔ دیوار سے گھرا تو اس کے
 جسم کا نہ جانے کیا حال ہوتا اور اس کے بعد بھی وہ یقیناً کھائی
 میں گرنا، لہذا اس نے دیوار سے گھرائے بغیر کھائی میں گرنے
 کا فیصلہ کیا۔ اس میں ایک امکانی بات یہ تھی کہ شاید وہ کھائی
 بہت زیادہ گہری نہ ہو اور اسے بس تھوڑی بہت چوٹیں
 آئیں۔

یہ ایک دانش مندانہ فیصلہ تھا اور اس موقع پر قسمت نے
 بھی اس کا ساتھ دیا۔ وہ صرف پانچ چھ فٹ کی گہرائی میں جا
 پڑا لیکن پھر بھی اسے ایک جھٹکا لگا اور وہ گر پڑا۔ جسم پر چند
 معمولی چوٹیں آئیں البتہ بائیں ٹانگ میں کچھ زیادہ تکلیف
 محسوس ہوئی۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ
 اس کی جان بچ گئی تھی۔ وہ چند لمبی لمبی سانس لے کر کھڑا ہو
 گیا۔ اس نے اپنے تھیلے میں سے تارچ نکالی اور اس کا شیٹن
 دبا کر روشنی دیوار پر ڈالی۔ رستے کا سرا اسے پانچ فٹ کی
 بلندی پر لٹکا ہوا نظر آ گیا اور سرے کو دیکھ کر ایک لمبے کے
 لیے اس کی سانس رک گئی۔ اس کے یہ دونوں خیال غلط تھے
 کہ شیخ اکھڑ گئی تھی یا بندش دھکیلی پڑ گئی تھی۔ رستے کا سرا صاف
 ظاہر کر رہا تھا کہ اسے کسی تیز دھار آلے سے کاٹا گیا ہے۔
 خان داراب کی آنکھیں نیم وا ہو گئیں اور دانت ایک
 دوسرے پر سختی سے جم گئے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ
 کسی دشمن نے اس کا تعاقب کیا تھا یا پہلے ہی سے اس پاس
 کہیں موجود تھا۔ پھر جب اس نے رستے پر لٹک کر کھائی پار
 کرنا شروع کی تو اس نامعلوم شخص نے رستا کاٹ دیا۔
 لیکن وہ نامعلوم دشمن کون ہو سکتا ہے؟
 اس کا اندازہ بھی لگانا خان داراب کے لیے ممکن نہیں
 تھا۔

”خیر بیٹے خان!“ خان داراب زربلب بڑبلا۔
”اگر مجھے تمہارا پتا لگ گیا تو میں تم سے اس کا حساب ضرور لوں گا۔“

پھر اس نے نارنج کی روشنی میں رستے کا سرا پکڑ کر نارنج بجا دی۔ اسے تھیلے میں رکھا اور پھر اس ہاتھ سے بھی رسا پکڑ لیا۔ اب اس نے اوپر چڑھنے کا فیصلہ کیا تھا اور کوہ پینا کی کھجری کے باعث یہ اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ احتیاطاً خان داراب اس طرح اوپر چڑھا کہ اس کا جسم سیدھا نہ ہونے پائے۔ پھر اس نے جیب سے نارنج نکالی اور اس کی روشنی ادھر ادھر چمکنی۔ آخر اسے پاؤں کا وہ نشان نظر آئی گیا اور وہ رینگتا ہوا اس کے تعاقب میں چل پڑا۔ اس طرح چلتے ہوئے اسے کوئی پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ اس نے ایک فائر کی آواز سنی۔ وہ کوئی یقیناً کسی رائفل سے چلائی گئی تھی اور خان داراب کے اندازے کے مطابق وہ فائر اس سے چار پانچ فرلانگ آگے ہوا تھا۔

☆☆☆

جب خان داراب کو گئے ہوئے زیادہ دیر ہو گئی تو عالیہ کو گھبراہٹ ہونے لگی۔
”خیر وغیرہ گاڑے جا چکے تھے۔ سردی کے مدارک کے لیے الاؤ دھکا لے گئے تھے اور کھانا تیار کیا جا رہا تھا۔“
”میرا دل دھڑک رہا ہے ارسلان!“ عالیہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”خدا کرے تمہارا دل ہمیشہ دھڑکتا رہے اور میرے سر پر تمہارا سایہ ہمیشہ سلامت رہے۔“ ارسلان نے ہلکا ہر بڑی تنہید کی۔
عالیہ نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر غرائی۔ ”جب میں پریشان ہوا کروں تو مجھ سے مذاق نہ کیا کرو ورنہ میں تمہارے دونوں کان اکھڑ دوں گی۔“
”اچھا ہی ہو گا۔“ ارسلان نے مسکرا کر کہا۔ ”پھر میں تمہاری اوٹ پٹانگ باتیں سننے سے مامون و محفوظ ہو جاؤں گا۔“

”اچھا۔“ عالیہ نے سناٹ لہجے میں کہا اور اپنے دونوں ہاتھ قدرے اٹھا کر اپنے بڑھے ہوئے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگی۔ یہ ارسلان کے لیے اشاراتی دھمکی تھی کہ اب عالیہ اس کا منہ نوچ کر اس پر گہری خراشیں ڈال سکتی ہے۔

ارسلان جلدی سے سنجیدہ ہو گیا اور بولا۔ ”آخر تم اتنی پریشان کیوں ہو؟“

”کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ باوا جانی کو گئے ہوئے کتنا وقت گزر چکا ہے؟“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب وہ اس برقانی عورت کو پکڑ کر ہی لائیں گے، چاہے صبح ہو جائے لہذا اب ہمیں کھانا کھا کر آرام کرنا چاہیے۔“

”تم ہی ٹھوس اور تم ہی آرام کرو۔“ عالیہ کہہ کر کھڑی ہوئی اور اپنی رائفل اٹھا کر خیمے کے ذریعہ طرف بڑھی۔
”کہاں چلیں؟“ ارسلان نے ہانک لگائی۔
”جہنم میں۔“

”وہ ان سرد پہاڑوں میں نہیں ہے۔“
عالیہ کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھ گئی۔ مجبوراً ارسلان کو بھی اپنی رائفل منجبال کے باہر رکھنا پڑا۔ عالیہ نے اس کی آہٹ سن کر پلٹ کے دیکھا اور پھر تھوڑی چڑھا کر بولی۔ ”آپ جا کے آرام فرمائیے۔“

”میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ میرا مستقبل ڈارک روم میں ڈیولپ ہو۔“ ارسلان نے کہا۔ ”اس علاقے میں پچھلے پائے جاتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی تمہیں اٹھا لے گیا تو۔۔۔۔۔“

عالیہ اس کی پوری بات سننے بغیر زمین کی طرف بڑھ گئی اور انہیں بتانے لگی کہ وہ خان داراب کی تلاش میں جاری ہے۔ ذرا دیر بعد ہی دو گھوڑے وہاں سے روانہ ہوئے۔ ارسلان نے نارنج چلائی تھی۔ اس کی روشنی میں انہیں برقانی غور سے قدموں اور خان داراب کے کھوڑے کے سسوں کے نشان نظر آ رہے تھے۔

آخر وہ اس کھائی تک پہنچ گئے جہاں انہیں خان داراب کا گھوڑا ایک درخت سے بندھا نظر آیا لیکن خان داراب کا پتا نہیں تھا۔ آس پاس بھی اس کی موجودگی ممکن نہیں تھی ورنہ وہ ان دونوں کو دیکھ کر انہیں آواز ضرور دیتا۔ اب ارسلان بھی کچھ پریشان ہوا۔ وہ اور عالیہ گھوڑوں سے اتر کر کھائی کے قریب پہنچے۔ ارسلان نے نارنج کی روشنی میں کھائی کی گہرائی دیکھی اور پھر کھائی کی دوسری دیوار پر روشنی ڈالی۔ وہاں اسے ایک رستا لگا ہوا نظر آیا۔ وہ نارنج کو۔۔۔ بتدریج اوپر کی طرف حرکت دینے لگا اور آخر روشنی کا دائرہ اس نیزے سے چمک گیا جو کھائی کی دوسری جانب زمین میں گڑا ہوا تھا اور رستے کا پتہ اس میں پڑا ہوا تھا۔

”اوہ!“ ارسلان نے سر ہلایا۔ ”باوا جانی اس رستے کے سہارے اوپر چڑھے ہوں گے۔“

”لیکن ادھر سے کھائی میں کس طرح اترے ہوں

ارسلان نے نارنج کی روشنی ادھر ادھر چمکنی تو اسے ”یہ دیکھو۔“ ارسلان نے کہا۔ ”وہ اس بیخ کے ارد گرد رستے کے سہارے نیچے اترے ہوں گے۔“

عالیہ چند لمبے خاموش رہی اور پھر پریشان لہجے میں بولی۔ ”لیکن ہم اب کیا کریں؟“
”افتکار کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں۔“ ارسلان نے لٹھڑی سانس لے کر کہا۔ ”ہمارے پاس اس قسم کا کوئی سامان نہیں ہے۔ باوا جانی تو کوہ پینا کی کے سارے سامان سے لیس تھے۔“

”مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا لگ رہا ہے ارسلان!“ عالیہ روٹتی ہوئی۔
”حیرت ہے کہ تم خان داراب کی بیٹی ہو کر اتنی پلکان ہو رہی ہو۔ میں تو اس ہم سے قبل ان سے چند ہی مرتبہ ملا ہوں اور مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ وہ ایک مرد آہن ہیں۔ انہیں گزند پہنچانا کسی کے لیے آسان نہیں۔“

”تم انہیں مرد آہن کہو یا کچھ اور لیکن بہر حال وہ ایک انسان ہیں۔ ہمیں واپس کیمپ جا کر وہاں سے کچھ ایسا سامان لانا چاہیے کہ اس کھائی کو پار کر سکیں۔“
”ارے وہ دیکھو۔“ عالیہ نے اشارہ کیا۔
والے انداز میں کہتے ہوئے کھائی کے اس پار اشارہ کیا۔ کافی فاصلے پر چند ٹارچوں کی روشنیاں متحرک نظر آ رہی تھیں اور ان روشنیوں کے پس منظر میں چار انسانی ہونے بھی نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک بیولے کے قد و قامت اور حرکات و سکنات سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ خان داراب ہے۔

”شکر ہے خدا کا!“ عالیہ نے خان داراب کو پہچان کر اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”مگر ان کے ساتھ اور لوگ کون ہیں؟“
”یہ تو اسی وقت پتا لگے گا جب وہ قریب آ جائیں گے۔“
مگر اچانک ان دونوں نے دیکھا کہ ان بیولوں کے راستے بدل گئے تھے۔ تین بیولوں کا رخ کھائی کی مشرقی جانب تھا جبکہ خان داراب انہی کی طرف آ رہا تھا۔

”باوا جانی!“ عالیہ چرمسرت انداز میں بڑے زور سے کہتی۔
”لیکن ادھر سے کھائی میں کس طرح اترے ہوں

خان داراب نے جواب میں صرف ہاتھ ہلایا لیکن اس کی رفتار میں تیزی آ گئی۔ جلد ہی وہ کھائی کے دوسرے کنارے پر آکھڑا ہوا۔ اس نے نارنج کی روشنی ان دونوں کی طرف چمکنی اور زور سے بولا۔ ”تم دونوں ادھر کہاں سے آ گئے؟“

”آپ ہی کو ڈھونڈتے ہوئے آئے ہیں۔“ ارسلان نے جواب دیا۔ ”دیر ہونے کے باعث عالیہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔“

”میں نے اسے بیٹوں کی طرح پالا ہے لیکن اس کا دل اب تک عورتوں کا سا ہے۔“ خان داراب نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا اور نیزے کو زمین سے نکالنے کے لیے اسے ادھر ادھر ہلانے لگا تا کہ اس پر زمین کی گرفت ڈھیلی ہو جائے۔ اس کل کو جاری رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”تم لوگوں کے قریب زمین میں ایک بیخ گڑی ہوئی ہوگی۔“

”وہ ہم دیکھ چکے ہیں باوا جانی۔“ عالیہ نے جواب دیا۔
”اس سے رستے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی بندھا ہوا ہو گا۔“

”نہیں تو!“ عالیہ نے قدرے توجہ سے کہا۔ ”کیا اس سے رستے کا کوئی ٹکڑا بندھا ہوا ہونا چاہیے تھا؟“
خان داراب نے فوراً ہی پکھنکھن کہا۔
”جواب دیجئے تا باوا جانی!“
”ادھر آ کے جواب دوں گا۔“

زمین میں مضبوطی سے گڑا ہوا نیزہ اب ڈھیلہ ہو چکا تھا۔ خان داراب نے اسے ایک جھٹکے سے اکھاڑا اور کھائی کے اس جانب اس طرح پھینکا کہ وہ عالیہ اور ارسلان سے چند فٹ دور، زمین میں تر چھا کر گیا۔ اس کے بعد خان داراب نے اپنے تھیلے میں سے ایک اور بیخ نکالی۔ وہ اسے کھائی کے کنارے سے تقریباً ایک گز کے فاصلے پر ٹھونکنے لگا جبکہ نیزہ دس گیارہ فٹ کے فاصلے پر گڑا ہوا تھا۔

بیخ سے رستا باندھ کر وہ کھائی میں اترنے لگا۔ نیچے پہنچ کر اس نے رستے کو مضبوطی سے پکڑ کر پوری طاقت سے جھٹکے دینا شروع کیے تا کہ بیخ ڈھیلی ہو کر اٹھ جائے اور رستے سمیت کھائی میں آ کرے۔ آخر کچھ محنت کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

”تم لوگوں کے پاس تو کوئی رستا نہیں ہو گا؟“ اس نے زور سے پوچھا تو اس کی آواز کھائی میں گونج گئی۔
”نہیں باوا جانی!“ عالیہ نے جواب دیا۔

خیر! میں یہ رسا اور پھینکتا ہوں۔ اسے بہت مضبوطی سے منج سے باندھ دو اور یہ بھی دیکھ لو کہ منج پر دستور مضبوطی سے لگزی ہوئی ہے یا نہیں۔“

”بہتر ہے۔“

خان داراب نے رستے کو منج سے ڈھائی تین فٹ کے فاصلے سے پکڑا۔ اس نے مضبوط منج بندھی رہنے دی تھی تاکہ رستے کا وہ سرا بھاری رہے۔ پھر اس نے رستے کو تیزی سے گردش دینا شروع کی۔ چار پانچ گردشیں دینے کے بعد ہی اس نے رستے کو چھوڑ دیا۔ منج تیزی سے اوپر چلی۔ ارسلان کھائی کے کنارے پر اوندھالینا ہوا تھا۔ اس نے فوراً منج پکڑ لی اور رستے کو اوپر کھینچنے لگا۔

”گٹھا! خان داراب کی آواز سنائی دی۔“ اب اس منج سے رستے کو کھول کر لگزی ہوئی منج سے باندھ دو۔“

ارسلان نے ایسا ہی کیا اور خان داراب رستے کے سہارے اوپر چڑھ آیا۔

”یہ آپ کے ساتھ تین آدمی اور کون تھے باوا جانی؟“ عالیہ نے پوچھا۔

”غیر ملکی پارٹی کے آدمی۔“ خان داراب نے نفرت سے کہا۔ ”ان میں ڈاکٹر پیڑو وچ بھی تھا۔ وہ بھی ان نشانات کے تعاقب میں تھے اور مجھ سے چار پانچ فرلانگ آگے تھے۔ انہوں نے اس بے چاری پر گولی بھی داغ دی تھی۔“

”ارے۔“ عالیہ کے منہ سے نکلا۔ ”کیا وہ مرنے لگی؟“

”نہیں، انہوں نے اس کی ٹانگ پر گولی چلائی تھی۔ وہ لوگ اسے زندہ ہی پکڑنا چاہتے تھے لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔ وہ صرف زخمی ہوئی ہے۔ برف پر اس کے خون کے دھبے ملے تھے لیکن زخمی ہونے کے باوجود وہ جست لگاتی ہوئی ایک ایسے راستے سے بھاگ نکلی کہ پھر اس کا تعاقب جاری رکھنا ممکن نہیں رہا۔“

”کیوں؟“

”وہ ہلاکت خیز حد تک خطرناک نشیب و فراز ہیں۔ ہم جیسے لوگ، کوہ پیما کی مکمل سامان کے بغیر وہاں سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ کل میں پوری تیاری کے ساتھ ادھر کا رخ کروں گا۔ یقیناً وہ اپنے سکن ہی کی طرف بھاگی ہوگی۔“

”تو آپ نے اسے دیکھ لیا؟“ عالیہ نے پرمشوق لہجے میں پوچھا۔

”نہیں۔“ خان داراب نے جواب دیا۔ ”میں ان لوگوں سے بہت پیچھے تھا جب انہوں نے اس پر گولی چلائی تھی۔ میں نے صرف خون کے دھبے دیکھے تھے۔ میں نے

باقی جو باتیں بتائی ہیں وہ ان... لوگوں کا بیان ہے۔“

”وہ دوسری طرف کیوں چلے گئے؟“ ارسلان نے پوچھا جو اس طرف لگزی ہوئی منج بھی اکھاڑا تھا۔

”ادھر پانچ چھ فرلانگ آگے جا کر کھائی کی چوڑائی صرف تین چار فٹ ہے۔ یہ مجھے انہی لوگوں نے بتایا ہے۔ وہ لوگ ادھر ہی سے دوسری طرف گئے بھی تھے۔“ خان داراب نے اپنے گھوڑے کی لگائیں درخت سے کھولتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا بات ہے باوا جانی؟“ ارسلان نے اپنے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ بڑے محتاط انداز میں برابر چاروں طرف دیکھتے جا رہے ہیں؟“

”اوہ۔“ خان داراب آہستہ سے ہنسا۔ ”بھانپ لیا تو نے؟ واقعی تو بہت ڈرتا ہوں۔ ہاں، مجھے اندیشہ ہے کہ آس پاس ہمارا کوئی دشمن ہو سکتا ہے۔“

”دشمن؟“ عالیہ چونکی۔ وہ بھی گھوڑے پر بیٹھ چکی تھی۔

”ہاں۔“ خان داراب نے زمین سے اپنا نیزہ اکھاڑتے ہوئے جواب دیا اور پھر گھوڑے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تم لوگوں سے کہا تھا تاکہ ادھر لگزی ہوئی منج سے رستے کا ایک ٹکڑا بندھا ہوا ہوگا۔“

”ہاں پوچھا تھا مگر اس کا مطلب؟“

تینوں گھوڑوں نے سفر شروع کر دیا تھا۔ خان داراب انہیں بتانے لگا کہ کسی معلوم شخص نے اس کے طرح موت کے منہ میں دھکیلنے کی کوشش کی تھی۔ ارسلان اور عالیہ وہ کہانی سن کر خامے تشویش زدہ نظر آنے لگے۔

خان داراب کے خاموش ہوتے ہی عالیہ نے پوچھا۔

”وہ کون ہو سکتا ہے باوا جانی؟“

”اگر مجھے اس کا علم ہوتا تو میں تم دونوں کے ساتھ پڑاؤ کی طرف جانے کے بجائے اس سے حساب چکانے جا رہا ہوتا۔“

ارسلان بولا۔ ”لیکن آپ نے وہ خطرناک طریقہ اختیار ہی کیوں کیا تھا؟ جس طرح ادھر سے اتر کر ادھر آئے تھے، اسی طرح ادھر سے اس طرف چلے جاتے۔“

”اندازہ نہیں تھا کہ کھائی اتنی گہری ہوگی۔“

”مارج کی روشنی سے دیکھ لیجئے۔“

”ہاں، یہ بالکل سامنے کی بات تھی لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے ذہن میں سب سے پہلے جو تدبیر آتی ہے، وہ اسی پر عمل کر بیٹھتا ہے اور غالباً یہ میری خوش قسمتی

تھی کہ میں نے کھائی کی گہرائی دیکھ کر اس میں اترنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر میں اہلکار تو رہتا کتنے ہی خاصی بلندی پر کھائی میں گرنا اور نہ جانے ہڈیاں تڑوا بیٹھتا۔ خدا جو کہہ کر رہا ہے، بہتر ہی کرتا ہے۔“ خان داراب نے جواب دیا۔

خان داراب کچھ نہیں بولا۔ شاید وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔

”ان غیر ملکیوں سے آپ کی کیا بات چیت ہوئی؟“

ارسلان نے پوچھا۔

”تھوڑی سی منج کلائی ہو گئی۔“ خان داراب نے جواب میں کہا۔ ”میں نے فاز کرنے کے سلسلے میں انہیں معلوم کیا تھا۔ ڈاکٹر پیڑو وچ کے دونوں ساتھی مجھ پر کچھ گرم ہونے لگے تو میں نے بھی ترکی یہ ترکی جواب دیا لیکن پیڑو وچ ذرا غصے سے مزاج کا آدمی ہے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو خاموش کر دیا اور واپسی پر مجھ سے کچھ ٹھٹھکے ملنے کی بھی کوشش کی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اس کی قتل مزاحی اس کی عیارانہ فطرت کا ایک حصہ ہے۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا ہم لوگ بھی اس برفانی عورت کی وجہ سے یہاں آئے ہیں لیکن میں نے اس پر ظاہر کیا کہ ہمارا مقصد صرف شکار رکھنا ہے۔“

”کیا اسے یقین آ گیا؟“

”میرا خیال ہے کہ نہیں آیا۔“

”گویا وہ لوگ چاہتے ہیں کہ کوئی اور اس برفانی عورت کے چکر میں نہ پڑے؟“

”ہاں، شاید وہ بھی چاہتے ہیں۔“

”تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ انہی کے کسی آدمی نے آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کی ہو۔“

”شاید۔“

اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے وہ تینوں اپنے اپنے کیمپ تک پہنچ گئے جہاں شیما اور گردیز بھی موجود تھے۔

”ارے شیما... تم! ارسلان توجہ سے بولا۔

”ہاں۔“ شیما نے ہنس کر کہا۔ ”دراصل بستی سے تم لوگوں کی روانگی کے بعد ہی اچانک گردیز کو سونگھی تھی کہ وہ بھی چار چھ ہزار فٹ کی بلندی پر جا کے شکار کھیلے۔ میں نے سوچا کہ چلو اس بھانے میں بھی تھوڑی سی تفریح کر لوں لیکن درحقیقت مجھے صرف یہ تجسس یہاں تک لایا ہے کہ کیا واقعی

یہاں کسی برفانی عورت کا وجود ہے۔“

ارسلان نے محسوس کیا کہ اس وقت خان داراب، گردیز کی کوڑی عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”لیکن تم ہم لوگوں پر بوجھ نہیں بنیں گے۔ ہم اپنا خیمہ اور تمام ضروری سامان لے کر آئے ہیں اور ابھی ابھی یہاں پہنچے ہیں۔ خیمہ ابھی اس لیے نہیں گاڑا کہ تم لوگوں کی اجازت لے لوں۔ معلوم نہیں تم لوگ اپنی اس مہم میں کسی کی رفاقت گوارا کرو گے یا نہیں؟“

”ارے واہ! اس میں ناگواری کی کیا بات ہے؟ کیوں باوا جانی!“

”آں!“ خان داراب چونکا اور پھر ہنس کر بولا۔ ”ارے بھئی، ایک سے دو بھلے تو ہوتے ہی ہیں۔ اگر تین سے پانچ بھلے ہو جائیں تو کیا حرج ہے؟“

”اس دلچسپ جواب سے شیما بہت محظوظ ہوا۔

”بس تو اب تم خیمہ لگاؤ۔“ ارسلان نے کہا۔ ”ہم لوگ اب کھانا کھا لیں گے۔ اگر تم لوگ پسند کر تو...“

”نہیں۔“ شیما نے اس کا مطلب سمجھ کر بات کا ٹٹہ ہوئے کہا۔ ”ہم دونوں کھا چکے ہیں۔“

اس دوران میں گردیز ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ اس کی ویران ویران سی نگاہیں بلندی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

عالیہ کو مطالعے کا شوق تھا، لہذا اس مہم پر روانہ ہوتے ہوئے وہ برفانی انسان پر لکھے ہوئے دو ناول اور دو سنجیدہ کتابیں بھی لے آئی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے مطالعہ کرنا اس کی عادت بن چکی تھی، چنانچہ کھانے کے بعد وہ مطالعے میں ایسی مہمک ہوئی کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا جبکہ ارسلان کو سونے ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ گزر چکا تھا۔

آخر خان داراب نے اسے ٹوکا۔ ”اب سو جانیٹا۔“

”آں!“ عالیہ چونک گئی۔

”میں کہہ رہا ہوں کہ اب سو جا۔“ خان داراب نے کہا۔ ”کل ہمیں پھر بلندی کی طرف سفر شروع کرنا ہے۔“

عالیہ نے ایک طویل سانس لے کر کتاب بند کر دی اور پھر کیروسین لیپ کے بارے میں پوچھا۔ ”کیا اسے بجھا دوں؟“

”نہیں، جلتا ہی رہنے دے۔“

عالیہ نے کتاب سر ہانے ہی رکھ لی اور آنکھیں موند

میں۔ خان داراب بھی ایسا بن گیا جیسے سونے کی کوشش کر رہا ہو لیکن درحقیقت اس کی کوشش یہ تھی کہ اسے نیند نہ آئے۔ وہ عالیہ کے سوجانے کا شہر تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ عالیہ سو چکی ہے۔ اسے عموماً آنکھیں بند کرنے کے بعد بہت جلدی نیند آ جاتی تھی۔

”عالیہ!“ خان داراب نے احتیاطاً اسے سرگوشی کرنے والے انداز میں پکارا۔ عالیہ ٹپ سے مٹ نہ ہوئی۔ وہ سوتے میں بہت گہری گہری سانسیں لیتی تھی۔

خان داراب بڑی احتیاط سے اٹھا۔ گرم بستر سے نکلے ہی ٹھنڈی لہریں اس کے جسم میں سرایت کرنے لگیں۔ اس نے جلدی سے لمبا کوٹ پہنا، پوٹین کی ٹوٹی اورھی اورفل بوٹ جہن کرپٹوں کے بل چلتا ہوا خیمے کے در کی طرف بڑھا جسے ڈور یوں سے کس کر بند کر دیا گیا تھا۔ اس نے ڈوریاں کھولیں اور باہر نکل کر انہیں پھر باندھنے لگا۔

کیمپ پر مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ تمام ملازمین ایک خیمے میں تھے اور ایک بڑے خیمے میں جانوروں کو رکھا گیا تھا کہ اگر برف پاری ہو جائے تو وہ اس سے محفوظ رہ سکیں۔ ہوا بالکل ساکن تھی مگر سرد لہریں فضا میں جھکولے کھا رہی تھیں۔ خان داراب آہستہ آہستہ شیماء کے خیمے کی طرف بڑھا۔ نہ جانے کیوں وہ گردوزی کی طرف سے مطمئن نہیں تھا۔ اسی لیے وہ آج رات گردوزی کے سامان کی تلاشی لیتا چاہتا تھا۔ شاید سامان میں کوئی ایسی چیز مل جاتی جو گردوزی کی شخصیت پر کچھ روشنی ڈال سکتی۔

لیکن جب وہ ان کے خیمے کے قریب پہنچا تو چند لمحوں کے لیے خشک گیا۔ وہ دونوں ابھی جاگ رہے تھے۔ ان کے ہاتھیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد خان داراب مزید احتیاط سے آگے بڑھا۔ اسے خیمے میں ایک چھوٹا سا سوراخ اس لیے نظر آ گیا تھا کہ خیمے میں روشنی بھی قریب پہنچ کر خان داراب نے اپنی ایک آنکھ اس سوراخ سے لگا دی۔ اب وہ ان دونوں کو دیکھ سکتا تھا۔

”ہاں میرے دوست!“ گردوزی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”اتنے برس گزر گئے لیکن تمہاری کوششیں راکاں ہی رہیں۔ مجھے اپنا ماضی یاد نہیں آ سکا۔ بس اتنا ہی ہے کہ شروع سے اب تک صرف تمہارا نام ہی میرے ذہن میں جھماکے سے پیدا کرتا ہے۔ تمہارا نام شیماء ہے لیکن یہ نام میرے ذہن میں ”شیماء۔ شیماء“ کی گونج پیدا کر دیتا ہے۔ نہ جانے یہ شیماء کون سی یا کون ہے جو تمہارے نام کے حوالے سے میرے

وجود میں شطرنج کی طرح لپکتی گئی ہے۔“

”جب تم ہمارے علاقے میں آئے تھے تو تمہیں کسی کی تلاش تھی اور اس سلسلے میں تم ہمارے قبیلے کے سردار کا تعاون بھی چاہتے تھے۔“ شیماء نے کہا۔ ”ممکن ہے کہ وہ شیماء ہی ہو جس کی تمہیں تلاش تھی اور وہ شیماء شاید تمہاری محبوبہ ہو۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم اس کی تلاش میں ادھر ہی کیوں آئے؟“ یقیناً اس کی کوئی وجہ ہوگی۔ اگر تم صرف وہ وجہ یاد کرنے کی کوشش میں کامیاب ہو جاؤ تو میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنا پورا ماضی یاد آ جائے گا۔“

”بہت زور دے چکا ہوں ذہن پر۔“ گردوزی نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”مگر کچھ یاد نہیں آتا البتہ۔۔۔“

”البتہ کیا؟“ شیماء نے جلدی سے پوچھا۔

”ایک لفظ اور بھی ہے جو میرے ذہن میں بھونچال پیدا کرتا ہے۔ یہ بھونچال ان دنوں بھی پیدا ہوتا رہا تھا جب میرے سر پر چوٹ لگی تھی اور ایک سیاح ڈاکٹر نے میرا علاج کیا تھا۔“

”وہ لفظ کیا ہے؟“ شیماء نے بے چینی سے اپنا سوال دوسرے لفظوں میں دہرایا۔

”وہ لفظ ”ڈاکٹر“ ہے۔“ گردوزی نے جواب دیا۔

”اب ان دنوں یہ لفظ میرے ذہن میں پھر بھونچال پیدا کرنے لگا ہے۔“

”کیوں؟“

”وہ جو غیر ملکیوں کی پارٹی یہاں آئی ہوئی ہے، اس کا لیڈر بھی تو ایک ڈاکٹر ہے۔“

”ہاں، ڈاکٹر پیٹر ووج۔“

”ہاؤٹو میں بھی جاگتا رہتا ہوں۔ جب تک تمہیں نیند نہ آئے، ہم کیمپ شپ کرتے رہیں گے۔“

”کیمپ شپ کرتے رہیں گے؟“ گردوزی ہنسنے لگا۔

”مجھے ایک سلسلے میں مشورہ دو۔ میں اپنے قبیلے میں ایک دینی انقلاب لانے کا خواہش مند ہوں۔ ہر چند ہمارے قبیلے کے بہت سے لوگ مسلمان ہو چکے ہیں لیکن وہ ابھی تو ہم پر حق کے جال سے نہیں نکل سکے۔ میں چاہتا ہوں کہ انہیں نئی دنیا کی نئی باتوں کا علم ہو سکے۔ آج تک ہمارے لوگوں کو اس بات کا بھی یقین نہیں کہ انسان چاند پر قدم رکھ چکا ہے۔ اور ایک بات تو تمہاری ہی ذات سے وابستہ ہے۔“

”کون سی بات؟“

”جب تم ہمارے علاقے میں آئے تھے اور آسمان پر تاریکی اور سرخ روشنیوں کا جال بچھ گیا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بجائے آگ کی بارش شروع ہو جائے گی۔ پھر پہاڑ گرا گئے انے لگے تھے۔ برف کے ٹودے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے اور ایک ٹودے نے تمہارے سر پر اتنی شدید ضرب لگائی تھی کہ تمہارے دماغ میں شعور کا وہ حصہ مفلوج ہو گیا تھا جہاں یادیں ذخیرہ ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے قبیلے کے مسلمان اسے خدائی قہر اور غیر مسلم آسمانی دیوتا۔۔۔ کی ناراضی سمجھتے ہیں جبکہ وہ صرف ایک متناطسی طوفان تھا۔ میں اس کے بارے میں ایک کتابچہ پڑھ چکا ہوں۔ اس قسم کے طوفان دنیا میں کبھی آتے ہی رہتے ہیں۔ ان طوفانوں کا تعلق سورج سے ہے۔ جب کبھی سورج کی سطح سے کوئی طوفانی لہر اٹھتی ہے تو تیز رفتار برقی ذرات کا ایک بادل، سورج سے نکل کر خلا میں پھیلتا چلا جاتا ہے اور چونکہ ہماری زمین خود ایک بہت بڑا متناطسی ہے، وہ طوفان ادھر ہی کا رخ کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے پہاڑوں کے نیچے زمین میں کوئی آتش فشاں پہاڑ ہے جو اس طوفان سے متاثر ہوا ہوگا۔ اسی کی گرا گزراہٹ سے ہمارے پہاڑیں لرز گئے تھے اور برف کے ٹودے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔ میرا خیال ہے۔۔۔ بلکہ میں یقین ہے کہ یہ سب کچھ ہوں کہ۔۔۔“

خان داراب یہ ساری باتیں جانتا تھا، اس لیے بور اٹھنے لگا۔ وہ جس مقصد سے آیا تھا، اس کی تکمیل اب بحال نظر آنے لگی تھی۔ وہ اسی طرح سردی میں کھڑے کھڑے کب تک ان کے سونے کا انتظار کرتا؟ اتنا کہ وہ واپس اپنے خیمے کی طرف جانے لگا۔ جب وہ اپنے خیمے سے صرف دو مین گز کے فاصلے پر تھا تو اس نے ایک نسوانی چیخ سنی جو اس کی خیمے

سے آئی تھی اور یقیناً عالیہ کی تھی۔ وہ وہی جستوں میں خیمے کے در پر پہنچ گیا اور بڑی جلدی میں اس کی ڈوریاں کھولنے لگا۔

”کیا ہوا عالیہ؟“ ارسلان کی گھبراہٹ ہوئی آواز سنائی دی۔ ظاہر ہے کہ عالیہ کی چیخ سے اس کی آنکھ بھی کھل گئی ہوگی۔

”بادا جانی کہاں ہیں؟“ عالیہ کی کانتی ہوئی آواز آئی۔

”میں آ رہا ہوں بیٹے!“ خان داراب خیمے کا در کھول چکا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ ارسلان نہایت پریشان حالت میں عالیہ کے قریب بیٹھا اس کی پیٹھ تھپک رہا تھا اور عالیہ کے چہرے پر سفیدی بکھیلی ہوئی تھی۔ جیسے ہی وہ ان کے قریب پہنچا، عالیہ ”بادا جانی“ کہہ کر اس کے سینے سے لگ گئی۔

”کیا بات ہے بیٹا؟“ خان داراب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”کیا کوئی خواب دیکھ کر ڈر گئی ہو؟“

”خیمیں نہیں، بادا جانی!“ عالیہ نے جلدی سے کہا۔ ”میں نے اسے جاگتے میں دیکھا تھا۔ معلوم نہیں کوئی آواز ہوئی تھی یا کسی اور وجہ سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ اس کے نقش و نگار اتنے تھے تھے لیکن وہ بڑی بھیانک نظر آ رہی تھی۔ اس کے بال اتنے چمکے ہوئے تھے جیسے وہ برسوں سے نہایت تھکا ہوا اور اس کی آنکھوں میں ہلا کی دھشت تھی۔ شاید وہ وہی برفانی عورت ہو۔“

”وہ کہاں دکھائی دی تھی؟“ خان داراب نے پوچھا۔ ”وہ ادھر سے جھانک رہی تھی، مجھے یہ گھور رہی تھی۔“

عالیہ نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ارسلان اور خان داراب نے بیک وقت اس جانب دیکھا۔ اس طرف خیمے کا مضبوط کپڑا کوئی ایک فٹ کے قریب پھٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ خان داراب عالیہ کو چھوڑ کر تیزی سے اس طرف گیا۔ اس نے پردے کے شکاف سے اندازہ لگایا کہ وہ کسی کندھ قسم کے ہتھیار سے کاٹا گیا تھا۔ اس نے شکاف سے باہر جھانکا لیکن اندر سے میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔

”ارسلان! تم یہیں روکو۔“ خان داراب نے کہا اور نارنج لے کر پھر خیمے کے در کی طرف چھٹا۔

عالیہ کی چیخ نے ملازمین کو بھی جگا دیا تھا اور وہ اپنے خیمے سے نکل آئے تھے۔ وہ خان داراب کو دیکھ کر اس کی طرف آئے اور کسی نے پوچھا۔ ”کیا ہوا مالک! بیٹے چیخ کیسی

خان داراب اس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں خیمے کے کپڑے میں شگاف تھا۔ اس نے نارنج کی روشنی میں برف پر پھیلی ہوئی انگلیوں والے پتھروں کے نشانات دیکھے۔ ان نشانات کو دیکھ کر ملازمین کے چہرے بھی قہقہے پڑ گئے۔

”اوہ یہ تو... یقیناً... برفانی عورت کے قدموں کے نشان معلوم ہوتے ہیں۔“ خان داراب نے شیمیا کی آواز سن کر اس کی طرف دیکھا۔ گردیزی بھی شیمیا کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں عالیہ کی چیخ ہی سن کر آئے ہوں گے۔ ان کا خیمہ چالیس پچاس فٹ سے زیادہ دور نہیں تھا۔

”ہاں۔“ خان داراب نے پرتوشیں لہجے میں شیمیا کو جواب دیا۔ ”وہ یقیناً یہاں آئی تھی۔ اس نے ہمارے خیمے کا کپڑا پھاڑا تھا اور اندر چھانک رہی تھی۔ اتفاقاً عالیہ کی آنکھ کھل گئی اور وہ اس برفانی عورت کا چہرہ دیکھ کر چیخ پڑی۔ اس کے چیخنے کے باعث وہ بھاگ نکلی۔“

”کیا ان نشانات کے تعاقب میں چلا جائے؟“ گردیزی کا لہجہ خاصا مڑجوش تھا۔

”نہیں۔“ خان داراب نے فضا میں پھلتی ہوئی سفیدی کو دیکھ کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ برف باری ہونے والی ہے۔“

خان داراب چپ ہوا ہی تھا کہ برف کے ذرات گرنے لگے۔

”اوہ، یہ برا ہوا۔“ گردیزی متاسف انداز میں بولا۔ ”اب جلد ہی یہ نشانات برف باری کے باعث مٹ جائیں گے۔“

”سب لوگ خیمے میں جائیں۔“ خان داراب نے بلند آواز میں اپنے ملازمین سے کہا۔

برف باری میں بہت تیز شدت آنے لگی تھی۔ ”تم بھی جاؤ لڑکوں۔“ خان داراب نے شیمیا اور گردیزی سے کہا حالانکہ شیمیا کی عمر پینتالیس سال سے کم نہیں تھی۔ گردیزی اس سے بھی سات آٹھ سال بڑا ہوگا۔

☆☆☆

اس رات اتنی شدید برف باری ہوئی کہ ان لوگوں کو کئی مرتبہ بانسوں سے اپنے خیموں کی چھت جھاڑ پڑی ورنہ برف کے بوجھ سے ان کے خیمے گر بھی سکتے تھے۔ ارسلان نے خیمے کا پتہ ہوا پردہ مضبوطی سے سی دیا تھا۔

صبح ہوئی تو برف باری رک چکی تھی لیکن سردی میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔

ناشتے کے دوران میں ارسلان بولا۔ ”مجھے ایک بات پر حیرت ہے باواجانی!“

”کس بات پر؟“ خان داراب نے پوچھا۔

”غیر ملکی پارٹی نے کل شام ہی اسے کوئی سے زخمی کیا تھا۔ یہ بات آپ ہی نے ہمیں بتائی تھی۔ پھر وہ برفانی عورت زخمی حالت میں کل رات ہی ادھر کیسے آئی؟“

”ہاں لڑکے!“ خان داراب نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”یہ سوال مجھے بھی ابھی میں ڈالے ہوئے ہے لیکن پریشان کن مسئلہ میرے لیے ایک اور ہے۔“

”وہ کیا؟“

”آج ہمیں مزید بلندی کی طرف جانا ہے لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے عالیہ کو اپنے ساتھ لاکر غلطی کی ہے۔“

”وہ کیوں باواجانی؟“ عالیہ جلدی سے بولی۔

”میں سمجھتا تھا کہ میری بیٹی بہت بہادر ہے۔“ خان داراب نے منہ بنا کر کہا۔ ”لیکن تیری کل رات کی خوف زدہ چیخ نے میری غلط فہمی دور کر دی۔“

”یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی باواجانی۔“ عالیہ نے سر جھٹک کر کہا۔ ”میں اب اس سے قطعی خوف زدہ نہیں ہوں۔ کل رات کی بات اور تھی۔ اگر آج تک آنکھ کھلتے ہی، غیر متوقع طور پر کوئی بھیانک چہرہ نظر آئے تو بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہو سکتا ہے۔ میری وہ چیخ قطعی اضطرابی تھی۔“

”تو یہ کہنا چاہتی ہے کہ اب بھی میرے ساتھ رہے گی؟“

”کیوں نہیں۔“

”میں تو سوچ رہا تھا کہ تجھے ارسلان کے ساتھ واپس بچے بھیج دوں۔ ملازمین کو تو واپس بھیجنا ہی ہے کیونکہ اب راستہ بھی خطرناک ہے۔ جانوروں پر بھی سڑگن نہیں۔“

”میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔“ عالیہ نے حکم لہجے میں کہا۔ ”میں اس برفانی عورت کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

خان داراب نے اسے غور سے دیکھا اور پھر اس طرح مسکرایا جیسے عالیہ کے عزم نے اسے خوش کرو یا ہو۔

اسی اثنا میں خیمے کے باہر سے ایک بلند آواز سنائی دی۔ ”یاد عزیز ارسلان!“ وہ شیمیا تھا۔

خان داراب کا منہ بند ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ شیمیا کے ساتھ گردیزی بھی ہوگا اور نہ جانے کیوں اس شخص کے بارے میں خان داراب کے خیالات ابھی نہیں سمجھے۔ ہر چند

گردیزی بظاہر ایک مظلوم شخص تھا مگر خان داراب کے اس میں یہ بات سائی ہوئی تھی کہ گردیزی حقیقتاً وہ نہیں ہے جو دکھائی دیتا ہے۔

ارسلان، خان داراب سے اجازت لے کر خیمے کے باہر چلا گیا۔

”ہماری روانگی کب ہے باواجانی؟“ عالیہ نے پوچھا۔

”بس اب تیاری کرنا ہے۔“

”لیکن جب ملازمین ساتھ نہیں ہوں گے تو اتنا سامان...“

”ہم زیادہ سامان لے کر نہیں جائیں گے۔ بس کھانے پینے کی چیزیں، کچھ ضروری سامان اور ایک موٹی خیمہ جو میرے ایک خیمے میں رکھا ہوا ہے۔ وہ بہت ہلکا ہے۔ کوہ پناہی قسم کے خیمے ساتھ رکھتے ہیں۔ رہ گیا کوہ پناہی کا سامان تو وہ ہمارے ہاتھوں میں ہوگا۔ باقی سامان ہم خیموں میں اپنی پشت پر باندھ لیں گے اور زیادہ وزنی خیموں میں اپنی پیٹھ پر رکھوں گے۔“

اسی وقت ارسلان واپس آ گیا اور خان داراب سے بولا۔ ”باواجانی! شیمیا پوچھ رہا ہے کہ کیا وہ دونوں ہمارے ساتھ چلیں؟“

”نہیں۔“ خان داراب نے فوراً جواب دیا۔ ”وہ ہم سے ایک آدھ فرلانگ پیچھے ضرور رہیں۔“

”اس کی کوئی خاص وجہ ہے باواجانی؟“ ارسلان نے پوچھا۔

”ہاں۔“ خان داراب نے جواب دیا۔ ”دراصل اس کا دوست گردیزی مجھے کچھ پسند نہیں ہے۔“

ارسلان نے کچھ سوچا اور دوبارہ خیمے کے باہر جانے کے لیے مڑ گیا۔

”ان لوگوں کو ساتھ رکھنے میں حرج کیا ہے باواجانی؟“ عالیہ بولی۔

”شخص گردیزی مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔“

”لیکن آپ نے شاید ایک بار کہا تھا کہ تنہا سے پانچ چلے۔“

”اگر وہ ہم سے ایک فرلانگ پیچھے رہیں گے تو بھی گویا ساتھ ہی ہوں گے۔“

عالیہ نے اس سلسلے میں بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ”اور ہاں۔“ خان داراب پھر بولا۔ ”آج میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ملازمین کو واپس بھیجنے کے بجائے ان سے کہیں

گے کہ وہ خیمیں پڑاؤ ڈالے رہیں۔ ممکن ہے کسی وقت ہمیں ان سے کسی کام کی ضرورت پڑے۔ اس صورت میں ہمیں بالکل نیچے نہیں جانا پڑے گا۔“

عالیہ نے بھی انداز میں اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ اسی وقت ارسلان واپس آ گیا۔ خان داراب نے اس سے شیمیا گردیزی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا اور بولا۔ ”میں ملازمین کو کچھ ہدایات دے آؤں پھر ہم سفر کی تیاری کریں گے۔“

وہ کھڑا ہوا اور خیمے سے نکل گیا۔

ارسلان منہ بنا کر بولا۔ ”باواجانی کو نہ جانے کیوں گردیزی سے اتنی چڑ ہو گئی ہے۔ مجھے تو وہ بڑا مظلوم لگتا ہے۔“

”شیمیا کو تنے کیا جواب دیا؟“

”آخر اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔ میں اس سے باواجانی کی بات تو نہیں کر سکتا تھا۔“

”پھر کیا کیا؟“

”میں کہ نہیں ایک دوسرے سے کچھ دور رہنا چاہیے تاکہ اگر کوئی خطرہ پیش آ جائے تو دونوں یا ریاں بیک وقت اس کی زد میں نہ آئیں اور جب ایک پارٹی کسی خطرے میں پڑے تو دوسری اس کی مدد کر سکے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ مناسب جواب دیا ہے تم نے شیمیا کو۔ میں تو تمہیں بے دال کا بدمذہب سمجھتی تھی۔“ عالیہ شرارت سے مسکرائی۔

ارسلان نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر بولا۔ ”ذرا نکاح ہو جائے دو۔ پھر تمہاری اس قسم کی کبواں کا مناسب حساب کیا کروں گا۔“

”مت بھولو کہ میں خان داراب کی بیٹی ہوں۔ دونوں کانوں کے بیچ میں سر کردوں گی۔“

ان دونوں میں شاید کچھ دیر تک اور چوچیں لڑتیں لیکن اسی وقت خان داراب واپس آ گیا۔ وہ آتے ہی بولا۔ ”بس اب سفر کی تیاری شروع کرو۔“

☆☆☆

دوپہر کے سورج کی بیماریا زرد کر نہیں پہاڑوں پر پھیل چکی تھیں جب ان لوگوں نے سفر شروع کیا۔ ارسلان کو حیرت ہوئی کہ خان داراب کے چند ملازمین بھی ان کے ساتھ ہو لیے تھے۔ یہ بے حد وفادار و جاناں غار پتہ تھے جو اس خطرناک مہم میں اپنے آقا کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ ان لوگوں کی رفاقت سے یہ فائدہ ہوا کہ ارسلان،

عالیہ اور خان و داراب کی پیٹھ پر لدے ہوئے تھیلے زیادہ وزنی نہیں رہے۔

اب ان سب کا علیہ بالکل بدل گیا تھا اور وہ واقعی کوہ پنا نظر آ رہے تھے۔ ان لوگوں سے ایک ڈیڑھ فرلانگ پیچھے شیدا اور گردیزی بھی آ رہے تھے۔

خان و داراب اس طرف بڑھ رہا تھا جہاں گزشتہ شام غیر ملکیوں نے برفانی عورت پر گولی چلائی تھی لیکن یہ ایک حیرت انگیز امر تھا کہ زخمی ہونے کے باوجود وہ عورت رات کو خان و داراب کے پڑاؤ تک پہنچی تھی۔ اگر خیمے کا پردہ پھا ہوا نہ ہوتا اور برف پر پیروں کے نشانات دکھائی نہ دیتے تو خان و داراب یہی سمجھتا کہ عالیہ نے خواب دیکھا ہوگا۔ زخمی ہونے کے بعد اس کا دوبارہ اتنی دور تک آنا تعجب خیز تھا۔ رات کی برف باری نے گھاس پھوس کو بالکل دبا دیا تھا لیکن درخت اب بھی سراٹھائے ہوئے تھے۔ ان کی شاخوں پر کہیں کہیں برف کی سفیدی اب بھی چمک رہی تھی۔

آخر وہ لوگ اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے غیر ملکیوں کے لیے ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ برفانی عورت کا تعاقب جاری رکھ سکتے۔ وہ اسے بس ڈھکی چھپی میں کامیاب ہو سکے تھے لیکن رات کی برف باری کی وجہ سے اب وہاں خون کا کوئی دھبہ تو نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ایسے نشانات ضرور نظر آ گئے تھے کہ خان و داراب کے چہرے پر غصے کی سرفی پھیل گئی تھی۔

”یہ کہنے۔“ وہ دانت پیٹتے ہوئے بولا۔ ”خدا ان کو جہنم کے داروغہ سے ملائے۔ یہ ہم سے پہلے یہاں سے گزر چکے ہیں۔“

”ممکن ہے وہ صبح ہی صبح اپنے پڑاؤ سے روانہ ہو گئے ہوں۔“ ارسلان نے خیال ظاہر کیا۔

”اگر ایسا ہے تو وہ اس وقت ہم سے خاصے آگے ہوں گے۔“ خان و داراب نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ انہوں نے بہت عجلت سے کام لیا ہوگا۔ انہیں یقین ہو چکا ہے کہ ہم لوگ بھی اس برفانی عورت کی تلاش میں ہیں لہذا وہ ہم سے پہلے اس تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ خیر، میں بھی دیکھوں گا کہ اس ام میں کون کس کو شکست دیتا ہے۔“

وہ لوگ آگے بڑھتے رہے۔ یہ راستہ اب واقعی اتنا اونچا تھا اور خطرناک تھا کہ اگر انہوں نے کیلوں کے جوتے نہ پہن رکھے ہوتے تو کسی نے بھی پھسل کر کسی گہرے کھد میں گر کر جاں بحق ہو سکتے تھے۔ خان و داراب کیلنی چھڑی کا کام اپنے نیزے سے لے رہا تھا اور دراصل کے ساتھ تیر کمان بھی اس کے شانے سے لٹکی ہوئی تھی لیکن یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ

اب تک ان کی لمبھیر کسی درندے سے نہیں ہوئی۔

کوئی تین بجے کے قریب وہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں کوئی ڈیڑھ سو فٹ اونچی چٹان نے ان کا راستہ روک رکھا تھا۔ دائیں بائیں بھی وہ بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ کسی جانب چل کر آسان راستہ بھی تلاش کیا جا سکتا تھا مگر خان و داراب نے چٹان پر چڑھنے کا فیصلہ کیا۔ ہر چند کہ وہ تقریباً عمودی تھی لیکن کوہ پیماؤں کے لیے سو ڈیڑھ سو فٹ کی چٹانیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ خان و داراب نے جب اپنے ساتھیوں کو یہ فیصلہ سنایا تو عالیہ منہائی۔

”اب میرا بھوک سے بڑا حال ہو رہا ہے۔“

”اوہ۔“ خان و داراب دھیرے سے مسکرایا۔ ”مجھے تو ایسے موقعوں پر بھوک پیاس کا بالکل خیال نہیں رہتا۔ میرا خیال ہے کہ سب ہی بڑا حال ہوں گے۔ چلو ٹھیک ہے۔ پہلے بیہوش رک کر کھانا کھا لیتے ہیں، اس کے بعد اوپر چڑھیں گے لیکن خیمہ وغیرہ لگانے میں وقت نہ ضائع کیا جائے۔“

وہ سب ہی بھوک سے بے حال تھے لیکن خان و داراب سے یہ بات کہنے کی ہمت عالیہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ وہیں رک گئے اور کھلے آسمان کے نیچے سر دھنسا میں ایک مرتفع جگہ پر کھانا کھانے بیٹھے۔ انہیں رکتے دیکھ کر ایک ڈیڑھ فرلانگ پیچھے شیدا اور گردیزی بھی رک گئے۔ کھانا کھانے میں زیادہ وقت نہیں لگا یا گیا اور جب وہ اس سے فارغ ہو کر چٹان پر چڑھنے کی تیاری کر رہے تھے تو ایک خوفناک آواز نے انہیں چونکا دیا۔ وہ آواز چٹان کے اوپر سے آئی تھی۔

”یہ تو کوئی ریچھ معلوم ہوتا ہے۔“ خان و داراب کے منہ سے نکلا۔

اسی وقت پھر ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی جسے سن کر سب ہی اچھل پڑے۔ وہ یقیناً ایک انسانی چیخ تھی مگر اتنی بھیاں تک کہ غیر انسانی سی معلوم ہو رہی تھی۔ سب ہی نے یہ بات محسوس کی اور سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

خان و داراب کے ہونٹوں میں تفرقہ آمیز کھنچاؤ پیدا ہو گیا اور پھر وہ بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ کل مجھے ہلاک کرنے کی کوشش ابھی غیر ملکیوں میں سے کسی کی ہوگی اور اب چٹان کے اوپر بھی کوئی غیر ملکی ہی ہے۔ اس کتے ڈاکٹر بیٹرو وچ نے اپنے کسی آدمی کو اوپر اسی لیے چھوڑا ہوگا کہ وہ کسی طرح ہمیں اوپر چڑھنے سے باز رکھے لیکن یہ اس آدمی کی بد بھنٹی ہے کہ وہ کسی ریچھ کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔“

”کیا وہ کچھ تو انسانی ہوتے ہوئے بھی غیر انسانی سی لگتا ہوا جانی۔“ ارسلان نے پوچھتویش لہجے میں کہا۔

”اگر ریچھ کے ناخن جسم کے کسی نازک حصے میں دھست ہو جائیں تو چیخ یقیناً بڑی کریدہ ہوتی ہے۔“ خان و داراب نے جواب دیا۔

اوپر سے ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے اب بھی وہاں دوفرقتوں میں لڑائی ہو رہی ہو۔ دونوں قسم کی آوازیں اب لگی سنائی دے رہی تھیں۔

”وہ دیکھیے مالک!“ خان و داراب کا ایک ملازم بڑی زور سے چیخا۔

سب کی نظریں چٹان کے اوپر اٹھ گئیں اور انہوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ وہ دونوں فریق ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے چٹان کے کنارے تک آ گئے تھے۔ ان میں سے ایک یقیناً ریچھ تھا لیکن دوسری انسانی ہستی کی غیر ملکی کی ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ ارسلان، خان و داراب اور عالیہ نے دور نشیں آنکھوں سے لگ لگیں اور دو بدولرائی کا وہ منظر انہیں اپنے بالکل قریب نظر آنے لگا۔

”پاؤ جانی!“ عالیہ دانت پر دانت ہما کر بولی۔ ”یہ تو وہی عورت ہے جو گزشتہ رات میرے خیمے میں جھانک رہی تھی۔“

وہ منظر دیکھ کر خان و داراب کے ملازمین کی تو سانسیں رکنے لگیں۔ برفانی عورت بڑی بے جگری سے اس ریچھ کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اسے تقریباً رہنہ نہ کہا جاسکتا تھا۔ اس نے درختوں کی چھال اور پتوں سے برائے نام ستر پوشی کر رکھی تھی۔ خان و داراب نے جلدی سے اپنی کمان اتاری اور ترشش میں سے ایک تیر نکالنے لگا۔ وہ اس ریچھ کو ہلاک کرنا چاہتا تھا لیکن ابھی وہ چلے پر تیر چڑھا رہا تھا کہ ان لوگوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ برفانی عورت نے اس بھاری بھر کم ریچھ کو اپنے دونوں ہاتھوں پر اس طرح اٹھا لیا تھا جیسے کسی بچے کو اٹھایا ہو۔ چٹان پر اس طرح کھڑی ہوئی وہ عورت کسی دوسری دنیا کی مخلوق معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے ریچھ کو ایک جھٹکے سے نہایت گہرے کھد میں پھینک دیا۔

”شاباش ہے۔“ خان و داراب کے منہ سے نکلا اور وہ کمان نیچے کر کے تیر ترشش میں رکھنے لگا۔

برفانی عورت اب بھی چٹان کے کنارے پر کھڑی ہوئی تھی اور اس کی وحشت زدہ آنکھیں صرف عالیہ کو گھور رہی تھیں۔ اس کا چہرہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا عالیہ نے بتایا تھا۔ دفعتاً ایک چیختی ہوئی آواز نے پہاڑیوں میں گونج سی

پیدا کردی۔ ”سیسا... سیسا!“

وہ گردیزی تھا جو نہ جانے کب شیدا کے ساتھ ان لوگوں کے قریب آ گیا تھا۔

گردیزی کی چیخ سن کر برفانی عورت چونکی اور اس کی نظر گردیزی کی طرف گئی۔

”سیسا... سیسا...!“ گردیزی چیختا ہوا آگے بڑھا اور چٹان سے جا ٹکرایا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ نکلا اور وہ گر پڑا۔ شاید وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ برفانی عورت چٹان سے اچانک غائب ہو گئی۔

خان و داراب اس صورت حال سے بری طرح بھینچلا گیا تھا۔ اس نے غرا کر شیدا سے کہا۔ ”تم اپنے پاگل ساتھی کو سنیا لو۔ ہمیں تو فوراً اوپر جانا ہے۔ ہم تمہارے ساتھی کی دیکھ بھال کے لیے یہاں نہیں رک سکتے۔“

”خان بزرگ!“ شیدا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں چاہتا بھی نہیں کہ آپ لوگ ہماری وجہ سے یہاں رکیں۔“

شیدا آگے بڑھ کر گردیزی کے قریب گیا اور پیٹھ کے اس کا سراپے زانو پر رکھ کر اس کی پیشانی کا جائزہ لینے لگا۔ ارسلان کو گردیزی سے ہمدردی تھی لیکن خان و داراب کی وجہ سے وہ کچھ نہیں بول سکا۔ گردیزی کی پیشانی کا زخم بہت معمولی تھا مگر نہ جانے کیوں وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

شیدانے چٹان کی جڑ کے پاس سے مٹی بھر برف کے ذرات نکالے اور گردیزی کی پیشانی پر گزرتا شروع کیا۔ اس طرح خون کا لاسابند ہو جاتا اور پیشانی بھی صاف ہو جاتی۔ اس دوران میں خان و داراب نے اوپر چڑھنے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ اس نے چٹان میں ایک سیخ ٹھونکی۔ پھر اس سے چند فٹ اوپر دوسری سیخ ٹھونکی۔ ان ہی سیخوں کے سہارے وہ لوگ اوپر چڑھ سکتے تھے۔ ایک لمبے رستے کے ذریعے ان سب نے خود کو ایک دوسرے سے منسلک کر لیا۔ سب سے آگے خان و داراب تھا جو سیخیں ٹھونکنا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد ارسلان، پھر عالیہ اور اس کے بعد ملازمین۔

شیدانے گردیزی کی پیشانی صاف کر کے اپنے تھیلے میں سے نہ جانے کس چیز کی بیج نکالیں اور پیشانی کے زخم پر رکھ کر بیٹا باندھ دی۔ اسی وقت گردیزی کو ہوش بھی آ گیا۔ ہوش میں آتے ہی اس کے منہ سے کراہ لگی۔ وہ بھلیں جھپکاتا ہوا شیدا کی طرف دیکھنے لگا۔

”میرا خیال ہے کہ اب تم بالکل ٹھیک ہو گے۔“ شیمائے مسکرا کر کہا۔ ”چنانچہ تم اپنی پیشانی پر معمولی سا زخم لگا بیٹھے ہو جو میرا خیال ہے، دو ایک دن میں بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

گرو دیزی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے خان داراب وغیرہ کو چڑھتے ہوئے صرف ایک نظر دیکھا اور پھر چٹان کے اوپر دیکھنے لگا۔

”وہ... وہ... کہاں گئی؟“ اس کے منہ سے نکلا۔

”غالباً تم برفانی عورت کے بارے میں پوچھ رہے ہو۔ وہ بھاگ گئی ہے۔ تم نے اسے دیکھ کر ’سیرا سیماسا‘ کیوں چیخنا شروع کر دیا تھا؟“

”سیرا۔“ گرو دیزی نے بڑبڑاتے ہوئے اپنا سر تھام لیا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے؟“

”کیا کیسے ممکن ہے؟“ شیمائے پوچھا۔

گرو دیزی کوئی کھولی سی آنکھوں سے شیمائے کی طرف دیکھنے لگا اور پھر اچانک اپنے سر کو جھٹکے دیئے لگا۔

”کیا ہوا میرے دوست؟“ شیمائے گھبرا کر پوچھا۔

”میں... میں... نہ جانے کیا ہو رہا ہے میرے سر میں... بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ میرے سر میں دھماکے سے ہو رہے ہیں، بجلیاں سی جھولے کھا رہی ہیں اور ان بجلیوں کے ساتھ اس برفانی عورت کا چہرہ بھی چمک رہا ہے۔“ گرو دیزی نے چٹان سے سر ہٹا کر آنکھیں بند کر لیں۔

شیمائے اسے پر تشویش نگاہوں سے دیکھنے لگا اور پھر آہستہ سے بولا۔ ”کیا میں تمہارے سر میں ماش کر دوں؟“

”نہیں۔“ گرو دیزی نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے ذرا دیر تک آنکھیں بند کیے بیٹھا رہنے دو۔ میرا خیال ہے، میں خود کو پرسکون کر لوں گا۔“

شیمائے بدستور تشویش سے دیکھتا رہا لیکن کچھ بولا نہیں۔

کچھ دیر بعد ارسلان کی آواز سنائی دی۔ ”شیمائے!“

شیمائے چونک کے سر اٹھایا۔ خان داراب وغیرہ اوپر پہنچ چکے تھے۔ ارسلان اوپر اوندھا لپٹا ہوا تھا اور اس کا صرف سر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پھر بولا۔ ”ہم آگے جا رہے ہیں شیمائے لیکن یہ رستا لگا ہوا چھوڑ دیا ہے۔ اس کا سراپا یہاں ایک مضبوط سیخ سے بندھا ہوا ہے۔ گرو دیزی کی طبیعت سنبھل جائے تو تم دونوں ایک ایک کر کے اوپر آ جاؤ اور رستا کھینچ لیتا۔ اسے یوں ہی نہ چھوڑ دینا۔“

”شکر یہ دوست۔“ شیمائے جواب دیا۔

ارسلان کا چہرہ غائب ہو گیا۔

گرو دیزی بہ دستور آنکھیں بند کیے ہوئے تھا۔ شیمائے سوچنے لگا کہ سیرا کا نام یقیناً گرو دیزی کی زندگی میں کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بات ہو چکی تھی کہ وہ اس کی بیوی یا محبوبہ بنی ہو سکتی ہے جس کی تلاش میں وہ یہاں آیا تھا لیکن وہ برفانی عورت تو ہرگز سیرا نہیں ہو سکتی۔ وہ برفانی عورت کہاں، لڑکی تھی۔ وہ بلا کی طاقتور تھی جس نے رچھہ کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کے کھڑے میں پھینک دیا تھا لیکن اس کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں تھی جبکہ گرو دیزی کو یہاں آنے ہوئے اتنا ہی عرصہ گزر چکا تھا۔ پھر آخر وہ اس برفانی لڑکی کو دیکھ کر اسے سیرا کے نام سے کیوں پکارنے لگا تھا؟ کیا وہ گرو دیزی کی محبوبہ سیرا سے بہت زیادہ مشابہ ہے؟ شیمائے اس سوال سے صرف اچھٹ ہی سکتا تھا۔ کسی حتمی نتیجے تک پہنچنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد گرو دیزی نے آنکھیں کھولیں اور آہستگی سے کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب میں ٹھیک ہوں۔“

”تو پھر اس رستے کے سہارے اوپر چڑھو۔ تمہارے بعد میں بھی اوپر آتا ہوں۔“

گرو دیزی نے اثبات میں سر ہلایا اور لٹکے ہوئے رستے کی طرف بڑھا۔ اس کے بعد شیمائے بھی اوپر چڑھا۔ خان داراب وغیرہ غالباً کسی نشیب میں اتر گئے تھے کیونکہ ان میں سے کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شیمائے رستہ کھینچ لیا اور سیخ اکھاڑ کر دونوں چیزیں اپنے تھیلے میں رکھ لیں اور پھر وہ دونوں، خان داراب وغیرہ کے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ان نشانات کے ساتھ برفانی عورت کے پیروں کے نشان بھی دکھائی دے رہے تھے۔ شیمائے نے محسوس کیا کہ گرو دیزی ان نشاناتوں سے نظر چار رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بھی ایک نشیب میں اترنے لگا۔ اب خان داراب وغیرہ بھی ان کی نظر میں آ گئے تھے لیکن درمیان میں فاصلہ اچھا خاصا تھا۔

شیمائے سوچنے لگا کہ آج شاید پیروں کے نشانات کے سہارے، برفانی عورت کے ممکن تک رسائی ہو ہی جائے۔ مگر اس کے بعد کیا ہوگا؟ شیمائے کو یہ سوال بڑا خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔ خدا جانے خان داراب نے اس کے بارے میں کیا سوچا ہو۔ ادھر گرو دیزی کی حالت نے صاف ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اس برفانی عورت کو دیکھ کر پھر جنون کا شکار ہو جائے گا۔ وہ اس سے نہ جانے کیا چاہے گا؟ اس کے علاوہ غیر ملکی

ارسلان کی تھی۔ وہ لوگ یقیناً اس عورت کو پکڑ کر اپنے ملک لے جانا چاہتے تھے تاکہ اس پر تجربہ بات کر سکیں۔ گویا امکان یہی تھا کہ اس برفانی عورت کے سلسلے میں تین جانب سے رسائی ہو گی۔

شیمائے سب کچھ سوچتا ہوا خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گرو دیزی سے برفانی عورت کے بارے میں کوئی بات کرے اس کا ذہن پھر منتشر کرے۔ یہی علاقہ ختم ہو گیا۔ اب وہ پھر اونچے نیچے راستے پر قدم بڑھا رہے تھے۔ ہر طرف برف ہی برف تھی یا بلوط کے درخت جن پر بڑے بڑے برف کے ڈرات اب غائب ہو چکے تھے۔ دو پہر کو کچھ دیر کے لیے پھیلنے والی دھوپ نے انہیں پگھلا دیا تھا۔ آسمان پر اب بادل چھائے ہوئے تھے۔ شام کا سا وقت محسوس ہو رہا تھا۔ حالانکہ ابھی سہ پہر تھی۔

اچانک ہوا میں کچھ تیزی آ گئی اور شیمائے چونک گیا۔ اس کے پیروں پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے۔ گرو دیزی نے اس کے یہ بدلے ہوئے تاثرات محسوس کیے تو بولا۔ ”کیا بات ہے دوست! تم اچانک کچھ پریشان نظر آنے لگے ہو؟“

”ہاں۔“ شیمائے لہجے میں تشویش تھی۔ ”شاید طوفان آنے والا ہے۔ ہمیں کوئی محفوظ جگہ تلاش کرنا چاہیے۔“ وہ

تیزی سے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

”کیا برف باری...“ گرو دیزی نے کہنا چاہا۔

”نہیں۔“ شیمائے کہا۔ ”ہوا... آندھی کچھ لو...“

اسے برف باری سے کہیں زیادہ خطرناک سمجھو۔ اس طرف چلو... جلدی۔“ شیمائے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ایک ایسی چٹان کی طرف اشارہ کیا جو سائبان سائبانے ہوئے تھی۔

گرو دیزی یہاں کے بدلتے ہوئے موسم کے اثرات کو شیمائے سے زیادہ نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن جلد ہی اسے یہ ضرور محسوس ہو گیا کہ ہوا میں خوف ناک حد تک تیزی آ گئی تھی۔ ان دونوں کو اپنا توازن برقرار رکھنا مشکل ہو گیا تھا لیکن شیمائے کی جیسی الامکان کوشش تھی کہ دونوں جلد از جلد اس چٹان کے نیچے پہنچ جائیں۔ ہر چند کہ وہ جگہ بھی شیمائے کی دانست میں بالکل محفوظ نہیں تھی لیکن قرب و جوار میں اس سے بہتر جگہ کوئی اور تھی بھی نہیں۔ ہوائے اب جیسے چٹھاڑنا شروع کر دیا تھا۔ بڑے بڑے درخت اس طرح ایک طرف جھکے لگے تھے جیسے وہ چھوٹے موٹے پودے ہوں۔ ان کے پتے اور ڈالیاں تو ٹوٹنے لگی تھیں۔

آخر دونوں اس سائبان نما چٹان کے نیچے پہنچ گئے۔ اس وقت طوفان اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گیا تھا۔ برف کے

بڑے بڑے تودوں کے لیے بھی ہوا کے ان تھپڑوں کو برداشت کرنا مشکل ہو گیا اور وہ ادھر سے ادھر لڑھکتے لگے۔ چھوٹے موٹے تودے تو روٹی کے گالوں کی طرح فضا میں اڑنے لگے لیکن وہ چھوٹے موٹے تودے بھی منوں وزنی تھے۔ درخت، جڑوں سے اکڑ کر گرنے لگے۔ برف کے ذرات نے فضا کو دھندلا کر دیا۔ ان ذرات سے بچنے کے لیے گردیزی اور شیمانے ٹیکیں لگیں۔ فضا اب طرح گونج رہی تھی جیسے تقاروں پر چوٹ پڑ رہی ہو۔

☆☆☆

خان داراب اور اس کے ساتھی بھی اس طوفان بلائیز کی زد میں تھے اور انہیں کوئی محفوظ جگہ نہیں مل سکی تھی۔ خان داراب بس اتنی عقل مندی کر سکا تھا کہ طوفان کی جولانی سے پہلے ہی اس نے دو سو گز لمبے رستے سے خود کو اور اپنے ساتھیوں کو اس طرح باندھ دیا تھا کہ وہ بچھڑ نہ سکیں لیکن ہر دو افراد کے بیچ میں پندرہ میٹر گز کا فاصلہ رکھا تھا تاکہ وہ ایک دوسرے ہی سے ٹکرائے نہ ہو جائیں۔

ان سب نے چشمے لگالے تھے لیکن ہوا کے اڑانے ہوئے ذرات نے ان کی نظر کے سامنے سفیدی چادر تان دی تھی۔ کوئی بھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہوا انہیں کھلونوں کی طرح ادھر سے ادھر لڑھکا رہی تھی لیکن رستے کی وجہ سے ابھی تک کوئی کسی سے بچھڑا نہیں تھا۔

”عالیہ! کوئی چوٹ تو نہیں لگی؟“ خان داراب پوری طاقت سے چنچا لیکن اس کی آواز، برفستان کے اس طوفان کی چٹکھٹ میں دب گئی۔

شاید وہ سب ہی ایک دوسرے کو کارہے ہوں مگر کسی کی آواز کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

اچانک خان داراب کے قریب ایک زوردار دھماکا ہوا۔ غالباً کوئی درخت گرا تھا۔ خان داراب اس کے نیچے آنے سے تو بچ گیا لیکن درخت کی ایک شاخ اس کے بائیں بازو سے ٹکرائی۔ سختی تو وہ بکلی ہی شاخ لیکن خان داراب کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے بازو پر کوڑا رسید کیا ہو۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس کے منہ سے چیخ نکل جاتی لیکن خان داراب نے دانت پر دانت جما کر تکلیف ضبط کر لی اور ایک جانب لڑھکتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ رسا ٹوٹ چکا ہے۔ غالباً اس درخت ہی کی ضرب نے رستے کو کاٹ دیا تھا۔ خان داراب کو اب اپنی صرف ایک جانب بچنا و محسوس ہو رہا تھا۔ گویا اس جانب اس کے ساتھی اب بھی اس کی کمر سے بندھے ہوئے رستے سے خشک تھے جبکہ دوسری جانب کے

ساتھی اس سے بچھڑ چکے تھے۔ اس عالم میں خان داراب جیسا آہنی شخص بھی اپنے ہوش و حواس کو پوری طرح بحال نہیں رکھ سکا تھا۔ اسے یہ بات یاد نہیں آ رہی تھی کہ ارسلان اور عالیہ اس کے کس جانب تھے؟ اس جانب جدھر کے ساتھی اس سے بچھڑ چکے تھے یا اس جانب جدھر رستے میں کچھاؤ اب بھی موجود تھا۔

”عالیہ... ارسلان!“ وہ ایک بار پھر پوری طاقت سے چنچا۔ لیکن اس کی آواز تقارخانے میں طوطی کی آواز کے مترادف تھی۔

طوفان کی شدت کتنی دیر تک برقرار رہی؟ اس کا اندازہ ان میں سے کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا اور طوفان کی شدت کب کم ہونا شروع ہوئی تھی؟ اس کا احساس بھی کسی کو نہیں تھا۔ جب طوفان نے دم توڑ دیا تو بھی خان داراب کے دماغ میں ”سامیہ سامیہ“ ہورہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے اس کے سوچنے بھننے کی صلاحیت بھی منقطع ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ کچھ دیکھنے اور سننے سے بھی معذور تھا۔ جب اس کے حواس پوری طرح بحال ہوئے تو وہ یہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھا کہ وہ ہوش میں رہتے ہوئے بھی کتنی دیر تک حواس سے بیگانہ رہا ہے۔

انہیں دھندلاہ تک برف کی سفید چادر بچھی ہوئی نظر آرہی تھی۔ خان داراب کو اپنی کمر سے بندھے ہوئے رستے سے صرف ارسلان اور کچھ دوسرے مزدور خشک دکھائی دیے۔ اب خان داراب کو یاد آیا کہ عالیہ کو اس نے اپنی دوسری جانب باندھ رکھا تھا۔

”اوہ... عالیہ... میری بچی!“ خان داراب ہڈیاں انداز میں جھنجھ پڑا۔

ارسلان اور تمام ماندہ مزدور سمٹ کر خان داراب کے قریب آ گئے۔ عالیہ کی جانب کے رستے سے خشک مزدوروں کا کہیں پتا نہیں تھا۔ ارسلان نے خان داراب کو کمر سے بندھے ہوئے رستے کو کٹا ہوا دیکھا اور صورت حال اس کی سمجھ میں بھی آ گئی۔

”انہیں... انہیں ڈھونڈو۔“ خان داراب کھو۔ کھوئے انداز میں بڑبڑایا۔

وہ سب ادھر ادھر چل پڑے۔ اندھیرا پھیلنے سے پہلے انہوں نے ایک خیمہ اور کچھ سامان کے علاوہ دوسرے مزدور ڈھونڈ نکالے۔ ان کے دامن بائیں جانب کے رستے بھی کو حادثے میں کٹ گئے تھے، اس لیے صرف وہی دونوں یک جا رہ گئے تھے۔ ان کے چہروں پر دشت تھی۔ خان داراب

کچھ پر سکون ہوتے نظر آئے۔

”ہاں، خشک ہے۔“ خان داراب نے مزدوروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ لوگ خیمہ گاڑ لیں گے۔ ام آگے بڑھتے ہیں۔ تمہارے خیمے میں نارنج تو ہوگی؟“

خان داراب کے خیمے میں بھی نارنج تھی۔ وہ ارسلان کے ساتھ ایک طرف بڑھنے لگا۔ جو گمشدہ چیزیں نظر آتی ہیں، وہ انہیں اٹھاتے رہے اور آخر انہیں کچھ مزدور اور بھی لگے لیکن عالیہ کا سراغ نہیں لگا۔ خان داراب کی بے چینی بڑھ گئی اور یہی حالت ارسلان کی تھی۔

غیب خیز امر یہ تھا کہ اپنے سامان کی تین چوتھائی تعداد ابھی باقی تھی۔ یہ سب کچھ مل جانے کے بعد یہ اندیشہ پیدا ہو چلا کہ عالیہ اور باقی مزدور کی کھینچنے کے نیچے آکر ہلاک نہ ہو گئے ہوں لیکن یہ اندیشہ زبان پر لانے کی ہمت کسی میں بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

اس چٹان کے نیچے شیمانہ اور گردیزی کو ہرگز چٹان نہیں مل سکتی تھی۔ ہوا انہیں وہاں سے بھی اڑا لے جاتی لیکن چٹان کی انہیں ایک غائر لگیا اور وہ طوفان کے اس خوفناک شکنجے میں محسوس ہو گئے۔ سردی ان دونوں کے مزاج کو پوچھ رہی تھی۔

”اگر یہاں پتھر مل جائیں تو اس دہانے کو کسی نہ کسی تک بند بھی کیا جا سکتا ہے۔“ شیمانہ نے بڑبڑاتے ہوئے

خیمے میں سے نارنج نکال کر جلائی اور اس کی روشنی ادھر اچھڑکتے لگا۔

”اوہ!“ اس کے منہ سے نکلا۔

غار میں کئی جگہ مختلف جانوروں کی ہڈیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

”میں نے داخل ہوتے ہی کچھ عجیب سی محسوس کی۔“ شیمانہ نے کہا۔ ”لیکن مجھے نہیں لگا تھا۔“

”شاید یہ غار کسی درندے کا ممکن ہو۔“ گردیزی نے کہا۔

تھرپے کی بنا پر یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کسی درندے کا ممکن نہیں ہے، البتہ... یہ ممکن ہے...“ وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔ ”شاید وہ... برفانی عورت بھی جانوروں کو شکار کر کے کھاتی ہو۔“

”تو یہ برفانی عورت کا ممکن ہو سکتا ہے۔“ گردیزی نے جوش انداز میں بولا۔

”مجھے اس سے بھی اختلاف ہے۔“ شیمانہ نے کہا۔ ”وہ کوئی جانور تو ہے نہیں کہ یوں ہی زمین پر لیٹ جائے۔ جب وہ اپنی برائے نام ستر پوچی کے لیے درختوں کے نیچے اور چھال وغیرہ استعمال کر سکتی ہے تو یہاں اپنے آرام کے لیے ان چیزوں کا بستر بھی بنا سکتی ہے۔ اگر اس کے ذہن میں بستر کا کوئی تصور نہ ہو تو بھی وہ یہاں پتوں کا ایک ڈھیر تو لگا سکتی ہے جس پر وہ آرام سے سو سکے۔ نہیں میرے دوست! یہ اس کا ممکن نہیں ہو سکتا ممکن ہے وہ کبھی یہاں اپنا شکار کھانے آتی ہو۔ اچھا اب تم ایک موٹی موم بتی نکال کر روشن کرو۔ نارنج کے سیل کب تک ضائع کے جائیں۔ یہاں ہمیں پتھر بھی نہیں ملے ہیں کہ دہانہ بند کیا جاسکے۔ موم بتی کو بالکل کونے میں رکھ کر جلاؤ تاکہ روشن رہ سکے۔“

موم بتی کی روشنی ہی کتنی تھی؟ مگر انہوں نے اسی کو غنیمت جانا۔ وہ دونوں، موم بتی والے ہی کونے میں سکرے سٹے بیٹھے رہے اور باہر طوفان کچھڑتا رہا۔

”گردیزی!“ شیمانہ بولا۔ ”مجھے یہ سوال کر کے تمہارے ذہن کو پریشان تو نہیں کرنا چاہیے لیکن میری بے چینی بھی اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ لگتا ہے جیسے پھٹ جاؤں گا۔“

”کیا سوال پریشان کر رہا ہے تمہیں؟“ گردیزی نے پوچھا۔

”تم نے چٹان پر کھڑی ہوئی اس برفانی عورت کو سیماس کے نام سے پکارا تھا۔“

”ہوں۔“ گردیزی نے ایک دل دوز آہ بھری۔ ”وہ اس تصویر سے بہت مشابہ ہے جسے میں سیماس کہتا ہوں۔“

”تصور؟“ شیمانہ تعجب سے بولا۔

”ہاں۔“ گردیزی نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”میں شرمندہ ہوں کہ میں نے تمہیں کبھی وہ تصویر نہیں دکھائی۔ لاؤ، آج دکھا دیں گے۔“ وہ پشت پر بندھا ہوا تھپکا کھولنے لگا۔

شیمانہ کے جس کو ہوا ملے گی۔ گردیزی نے پوسٹ کارڈ سائز کی ایک تصویر نکال کر شیمانہ کو دی۔ وہ کافی احتیاط سے رکھے جانے کے باوجود کناروں سے کچھ مڑکی تھی۔ شیمانہ

اس تصویر میں جو سوانی چہرہ دکھا، وہ نہایت پرکشش تھا۔ بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں بھی وہ بہت خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ اس کی عمر بائیس چوبیس سال کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ کیا ایک شیا کو اپنی سانسیں اپنی محسوس ہوئیں۔ گردیزی کا خیال درست ہی تھا۔ برفانی عورت کے نقوش اس تصویر والی عورت سے کافی ملتے جلتے تھے۔ فرق تھا تو صرف عمر کا! برفانی عورت اٹھارہ اسیں سال سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اگر اس کے چہرے کی وحشت کم کر کے اسے نہلا دھلا دیا جاتا تو وہ تصویر والی عورت کی چند سال چھوٹی بہن معلوم ہوتی۔

شیمانے پلٹ کر دیکھا کہ شاید تصویر کے پیچھے کچھ لکھا ہو لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس نے گردیزی کو تصویر لوٹاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اس کا نام سیمائیوں رکھا ہے؟“ ”تمہارے نام کی وجہ سے۔ میں نہیں بتا چکا ہوں کہ تمہارا نام سننے ہی میرے ذہن میں سیمائیوں کا نام چکا تھا۔“ ”تو اس تصویر والی عورت کا نام سیمائیوں ہے؟“ ”خدا جانے۔“ گردیزی نے معصومیت سے کہا۔ ”بس یہ نام مجھے اچھا لگا اور میں اسے سیمائیوں کہنے لگا۔“ ”اور وہ... برفانی عورت؟“

کیا ایک گردیزی کے چہرے پر جوش کے آثار نظر آئے اور وہ بولا۔ ”تم نے... کیا تم نے... ہاں... ان دونوں کی... مشابہت نہیں محسوس کی؟“ ”کی تھی۔“ شیمانے آہستہ سے کہا۔ ”لیکن وہ برفانی عورت تو سیمائیوں ہی تھی۔ وہ اس تصویر والی عورت سے کئی برس چھوٹی ہے۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ تم اس تصویر والی عورت ہی کی تلاش میں یہاں آئے تھے تو اب اس کی عمر چالیس سال ہونا چاہیے۔ ہمیں ہمارے علاقے میں آئے اٹھارہ سال ہو چکے ہیں۔ اگر وہ زندہ ہوگی تو اسی طرح بوڑھی ہو رہی ہوگی جس طرح تم بوڑھے ہو چکے ہو۔ وہ برفانی عورت تو جوان ہے۔ تم اسے سیمائیوں سمجھ سکتے ہو میرے دوست؟“

گردیزی کے چہرے پر بے بسی نظر آنے لگی۔ شیمانے قدرے توقف سے پوچھا۔ ”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ تصویر تمہاری ہی ملکیت ہے؟“ ”میرے سامان میں تھی۔“ ”لیکن تمہیں یاد نہیں کہ اس سے تمہارا کیا تعلق رہا ہے؟“ شیمانے غنڈی سانس لے کر کہا۔ ”گردیزی نے نفی میں سر ہلایا۔

شیمائیوں۔ ”کبھی تم نے تمہاری میں دو جا رکھنے تک اس تصویر کو دیکھتے ہوئے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی ہے؟“ ”کئی مرتبہ۔“ گردیزی نے غنڈی سانس لے کر کہا۔ ”لیکن اس کوشش سے میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے۔“ ”مگر یاد کیجئے نہیں آتا۔“ گردیزی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ اس کی بے بسی کی انتہا تھی۔ شیمانے مناسب یہی سمجھا کہ اس ذکر کو آگے نہ بڑھائے۔ وہ ارسلان، خان داراب اور عالیہ کے بارے میں سوچنے لگا کہ اس طوفان میں ان لوگوں پر نہ جانے کیا نذر رہی ہو۔

☆☆☆

عالیہ کو جب ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک غار میں پایا۔ وہ ایک بستر پر لیٹی ہوئی تھی، بشرطیکہ اسے بستر کہا جا سکتا۔ وہ بے شمار پتوں اور پھولوں کا ایک ذخیرہ تھا جس کو چھ فٹ کی لمبائی اور چار فٹ کی چوڑائی میں مہوار انداز سے ایک چوڑے پر پھیلا یا گیا تھا۔ عالیہ کے پیروں میں جو تے اور موزے نہیں تھے۔ حتیٰ کہ جسم پر گرم لباس بھی نہیں تھا۔ وہ صرف زیریں لباس میں تھی لیکن اسے سردیوں میں محسوس ہو رہی تھی کہ غار کے وسط میں ایک الاؤ دھک رہا تھا۔ اس الاؤ کے قریب ٹن کا ایک بڑا سا ڈبا رکھا ہوا تھا جو خاں خاں تک آؤ تھا۔ ایک کونے میں مشعل بھی جل رہی تھی لیکن وہ ویسی مشعل نہیں تھی جیسی مذہب دنیا کے لوگ اب خاص خاص موقعوں پر بناتے لگے ہیں۔ ادھر ادھر پھیلی ہوئی سڑی ہوئی ہڈیوں سے بڑا ٹھہر رہی تھی۔ یہ مختلف جانوروں کی ہڈیاں معلوم ہو رہی تھیں۔

عالیہ لینے لینے سے سب کچھ دیکھتی بھی رہی اور سوچتی بھی رہی کہ وہ کہاں تھی اور کہاں آگئی ہے۔ آہستہ آہستہ جب اس کے حواس پوری طرح بحال ہو گئے تو وہ دھیرے سے اٹھ کر پیچھے گئی اور اس وقت ذہن میں آنے والے ایک خیال نے اس کی روح کو لرزادیا۔ یہ غار... کیا یہ برفانی عورت کا مسکن ہے؟

اس کے رو گئے کھڑے ہو گئے۔ اس نے غار کے دہانے کی طرف دیکھا۔ دہانے کے آگے چند گز کے فاصلے پر ایک چٹان نظر آ رہی تھی۔

اس کے دل کی دھڑکیں تیز ہو گئیں۔ وہ جلدی جلدی اپنا لباس پہننے لگی جو ایک طرف بڑھا تھا۔ اس نے موزے اور جوتے بھی پہن لیے۔ اب اسے احساس ہوا کہ اسے گرمی لگنے لگی ہے۔ اس نے سوچا کہ ٹن میں بھرے ہوئے پانی سے

آدھا والا بچا دے یا کم از کم اپنا رینڈر یا کواٹ اتار دے۔ اچانک اسے پھر خیال آیا کہ اگر وہ برفانی عورت ہی اسے یہاں لائی ہے تو کیوں اور کس ارادے سے؟ عالیہ کو وہ قیامت خیز طوفان بھی یاد آیا۔ وہ سب رستے سے بندھے ہوئے ادھر سے ادھر لڑھکتے پھر رہے تھے کہ اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کے دائیں جانب کا رستا ٹوٹ گیا ہے۔ پھر تو وہاں بائیں جانب کا رستا ٹوٹا اور وہ تیزی سے ایک طرف لڑھکی ہوئی ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتی چلی گئی۔ رستے کا وہ ٹکڑا جس سے اس کی کمر بندی ہوئی تھی، اس کے لباس کے قریب ہی پڑا ہوا تھا۔ اس نے اسے اٹھا کر دیکھا اور اس کے دونوں سروں پر نظر ڈال کر اس کا منہ تعجب سے کھل گیا۔ دونوں جانب سے رستے ٹوٹے نہیں تھے بلکہ کاٹے گئے تھے۔

مگر کاٹنے والا کون ہو سکتا ہے؟

کیا وہ برفانی عورت؟

اوہ! مگر کیوں؟ برفانی عورت کو اس سے کیا سروکار؟ خیمے کا پردہ ہٹا کر بھی وہ صرف اسی کو گھور رہی تھی۔ پھر جب وہ چٹان پر نظر آئی تھی، تب بھی اسی کو گھور رہی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی جسم جنسی دیکھی ہو یا اس لیے وہ عالیہ کو انوکھا بھی کر لائی تھی۔ یہاں لاکر اس نے عالیہ کا لباس اتارا تھا۔ وہ مکمل اطمینان چاہتی ہوگی کہ عالیہ کا تعلق اسی کے ”قبیل“ سے ہے لیکن اس وقت اس نے یہ بھی محسوس کیا ہوگا کہ بے ہوش ہونے کے باوجود عالیہ کے جسم پر سردی سے کچھ طاری ہوئی ہوگی۔ اسی کچھ کی ختم کرنے کے لیے اس نے غار میں الاؤ دھکا دیا تھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی تھی کہ وہ عورت ٹھوڑی سی سوچ بوجھ پر ضرور درستی ہے۔

عالیہ آہستہ سے اٹھی اور پانی کے ٹن کے قریب گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ٹن میں برفانی عورت کے پاس کہاں سے آسکتا ہے؟ شاید اوپر آنے والے کچھ شکاری اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اس قسم کی چیزیں یہیں پھینک جاتے ہوں گے۔ اس نے ٹن اٹھا کر الاؤ پر دھیرے دھیرے پانی پھینکا شروع کیا۔ وہ الاؤ کو مکمل طور پر نہیں بھجانا چاہتی تھی۔ اسی وقت ایک عجیب سی آواز گونجی۔ ”آ... غر...“

ٹن، عالیہ کے ہاتھ سے چھوٹ کر الاؤ پر جا گر اور پھر اس نے پلٹ کر دیکھا تو چند لمحوں کے لیے سن ہو کر رہ گئی۔ کچھل مرتبہ وہ برفانی عورت کو چند گز کے فاصلے پر اپنے سامنے کھڑا دیکھ رہی تھی۔ پتوں اور پھولوں سے نیم سبز پوش وہ عورت غار کے دہانے پر قدرے کھجی ہوئی تھی۔ اس کی

آنکھیں درندوں کی آنکھوں کی طرح وحشتناک انداز میں چمک رہی تھیں۔ جسم کے کپلے ہوئے حصوں پر سبیل کی تھیں جس میں نہیں کہیں سے جلد کا اصل رنگ بھی نکلا رہا تھا جو بڑی حد تک صاف تھا۔ اس کے بال زیادہ سے زیادہ کمر تک تھے لیکن چونٹیاں باندھی نہ جانے کے باوجود وہ میل سے چمک جانے کے باعث چونٹیوں ہی کی طرح جھول رہے تھے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں نیزہ یا نیم ہاتھ کوئی ہتھیار پکڑ رکھا تھا۔ نیزے میں ایک جانب نوک ہوئی ہے لیکن اس ہتھیار میں نوک کی جگہ کھارڑی سی نظر آ رہی تھی اور وہ کھارڑی بھی کسی مضبوط پتھر کو کھس کر بنائی گئی ہوگی۔

عالیہ اتنی خوف زدہ ہوئی تھی کہ بے اختیار پوری قوت سے چیخ پڑی۔ ”ہاوا جانی!“

اس کی یہ آواز غار میں کوئی آدھے منٹ تک گونجتی رہی۔ الاؤ کوئی تین چوتھائی کے قریب بجھ چکا تھا، اس لیے اب غار میں روشنی بھی بہت کم ہو گئی تھی۔

برفانی عورت آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی اور عالیہ خوف زدگی کے عالم میں اس طرف ہٹنے لگی دھڑکتے وغیرہ بچھے ہوئے تھے۔ برفانی عورت الاؤ کے قریب رک گئی۔ اس نے ادھر ادھر جھپٹے ہوئے پانی کو اپنے پیروں سے الاؤ کی طرف دھکیلا اور الاؤ پوری طرح بجھ گیا۔ اب غار میں صرف مشعل کی روشنی رہ گئی تھی۔ عالیہ بستر پر گر کر کبھی کبھی سانس لینے لگی۔ وہ اپنی حفاظت ریو اور سے کر سکتی تھی اور وہ اس تحیلے میں تھا جو اس کی پشت پر بندھا ہوا تھا لیکن اب وہ تحیلہ نہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ظاہر تھا کہ برفانی عورت ہی اس کا تحیلہ اٹھا کر کہیں لے گئی ہوگی... مگر کیوں؟

اس کا جواب تو برفانی عورت ہی سے مل سکتا تھا۔ الاؤ بجھا کر وہ آہستہ آہستہ پھر عالیہ کی طرف بڑھنے لگی۔ اب عالیہ کی پیشانی پر پسینا چمکنے لگا۔ وہ کبھی کبھی سانس لیتی ہوئی اس برفانی عورت کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں تو وحشت تھی لیکن چہرے پر غصہ یا اس سے ملتی جلتی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ عالیہ کے قریب آئی اور آہستہ آہستہ مار کر بیٹھ گئی۔ پھر اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ کھلنے لگے۔

”ہے...“ اس کی کراخت آواز شاید اس کے پیٹ سے نکلی تھی اور اس کی باجھیں تک کھل گئی تھیں۔ شاید وہ مسکرائی تھی لیکن اس کے سیاہی مائل زرد دانت دیکھ کر عالیہ کو کھن آنے لگی۔ اس کا دایاں ہاتھ عالیہ کی طرف بڑھا تو عالیہ کا دل اچھل کر قلق میں آ گیا۔ برفانی عورت نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا اور پھر آہستہ آہستہ گال تک لے آئی۔ وہ

اور وہ اسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

پیٹر ووج کی آنکھیں چمک اٹھیں جب اس نے صندوق کھولا۔ صندوق میں کتابیں بھری ہوئی تھیں جو بڑی حد تک خست ہو چکی تھیں۔ پیٹر ووج ایک ایک کتاب اٹھا کر بڑی احتیاط سے ان کے اوراق اٹھنے پلٹنے لگا۔ وہ سب کی سب کتابیں کسی سائنس دان کی معلوم ہو رہی تھیں۔ پیٹر ووج کے لیے یہ بات بڑی حیرت انگیز اور سنسنی خیز تھی کہ یہ غار کسی سائنس دان کا مسکن رہا تھا۔

”یہ کیسی کتابیں ہیں ڈاکٹر؟“ ساتھیوں میں سے کسی نے پوچھا۔

”یہ کتابیں کسی سائنس دان ہی کی ہو سکتی ہیں۔“

پیٹر ووج نے بڑا بڑا دالے انداز میں کہا۔

”اور غالباً اسے مرے ہوئے بھی کافی دن ہو چکے ہیں۔“ بولنے والے نے ڈھانچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کے بارے میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔“

”کیوں؟“

”انسانی جسم کو ڈھانچا بننے میں کافی عرصہ لگتا ہے جبکہ یہاں پتوں وغیرہ سے جو بسٹر بنایا گیا ہے، وہ زیادہ پرانا نہیں معلوم ہوتا۔“

”اوہ! تو یہ غار کہیں اسی برفانی عورت کا مسکن نہ ہو۔“

”ابھی میں جتنی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرا ذہن خاصا الجھ گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم لوگ اب کھانے وغیرہ کی تیاری کرو۔ ایک آدمی کو غار کے دہانے پر پہرا دینے کے لیے بھی مامور کر دو۔ میں اس دوران میں صندوق کی ساری کتابیں نکال کر دیکھتا چاہتا ہوں۔ شاید ان کتابوں میں کہیں کچھ کاغذات بھی دیے ہوئے ہوں۔“

ان سے صورت حال کو سمجھنے میں خاصی مدد مل گئی۔

”آپ سوچ تو بخیر رہے ہیں۔“

”بس تو پھر تم لوگ مجھے سکون سے کام کرنے دو۔“ وہ آدمی سر ہلا کر پیٹر ووج کے قریب سے ہٹ گیا۔

باہر طوفان اب بھی گرج رہا تھا۔ تو دونوں کے لڑکھنے کے شور میں کوئی اور بیرونی آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی۔

وہ سب لوگ اپنا اپنا سامان ٹھیک طرح سے رکھنے لگے۔ کھانے کی تیاری بھی شروع کی گئی۔ لکڑیوں کا ایک ٹکڑا ہر وقت ان کے ساتھ رہتا تھا تاکہ جب بھی الاؤ جلانے کی ضرورت محسوس ہو، انہیں لکڑیوں کی تلاش میں مارا مارا نہ پھرنا

پڑے۔ ایک آدمی کو غار کے چھوٹے سے دہانے پر متعین کر دیا گیا۔ وہ دہانہ اتنا چھوٹا تھا کہ باہر سے کوئی کھوہ معلوم ہوتا تھا۔ باہر سے دیکھنے والے تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ چھوٹا سا دہانہ ایک وسیع غار کا ہے۔

پیٹر ووج بڑے انہماک سے صندوق کی کتابیں نکال نکال کر ان پر اچھتی ہوئی نظر ڈالتا اور ایک طرف رکھتا جاتا۔

آخر اسے ایک ایسی چیز مل گئی کہ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

وہ ایک ڈائری تھی۔ اس کے ابتدائی صفحات اٹھنے پلٹنے سے معلوم ہوا کہ وہ ڈائری پر فوٹو ایکٹائڈ نام کے ایک آدمی کی تھی اور وہ گرین لینڈ کا باشندہ تھا۔

ڈائری کے اندرونی صفحات ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ پیٹر ووج نے فیصلہ کیا کہ وہ ڈائری کے مندرجات کو اطمینان سے لیٹ کر پڑھے گا۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ کوئی اہم راز پائے والا ہے۔ اس نے اپنا شب خوابی کا تھیلہ نکال کر اس طرح بچایا کہ اس کا سر، مشعل کی طرف رہے۔ اس نے تھیلے میں لیٹنے کے بعد اس کی زپ سینے تک کھینچ لی۔ اس کے دونوں ہاتھ باہر تھے۔ باقی سب لوگ کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے۔ اس نے ایکٹائڈ کی ڈائری پڑھنا شروع کی۔ پہلے ہی صفحے کے اندراجات ایسے تھے کہ پیٹر ووج کا انہماک بڑھ گیا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا رہا، اس کی دلچسپی بڑھتی ہی چلی گئی۔ پھر وہ اس وقت چونکا جب کسی نے اعلان کیا کہ کھانا تیار ہے۔

کھانے کے دوران میں پیٹر ووج خیالات میں ڈوبا رہا تھا۔ اس کا ایک ساتھی بول پڑا۔ ”کیا کوئی خاص بات معلوم ہو رہی ہے ڈاکٹر؟“

”ہاں۔“ پیٹر ووج نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس کتاب سے خاصے سنسنی خیز اکتشافات ہوں گے۔“

”یہ کس قسم کی کتاب ہے؟“

”کسی ڈاکٹر ایکٹائڈ کی ڈائری ہے۔“

”اوہ! تو پھر یہ خیال درست ہی ثابت ہوا تاکہ یہ غار کسی مہذب آدمی کا مسکن رہا ہے۔“

”ہوں۔“

”اب تک آپ نے کیا کیا پڑھا ہے؟“

”پوری ڈائری پڑھنے کے بعد سب کچھ بتاؤں گا۔“

پیٹر ووج اس گروپ کا لیڈر تھا اس لیے کوئی بھی اصرار نہیں کر سکا کہ پیٹر ووج نے اب تک کچھ پڑھا ہے، وہی بتا دے۔ کھانے کے بعد پیٹر ووج پھر اپنے تھیلے میں پہنچ گیا اور

ڈائری وہیں سے پڑھنا شروع کی جہاں سے چھوٹی تھی۔ ہر ف کے تودے لڑکھنے کا شور نہ جانے کب بند ہو چکا تھا۔ پیٹر ووج کو اپنے انہماک میں اس کا احساس ہی نہیں ہوا۔

”اب تم سب لوگ سو جاؤ۔“ پیٹر ووج نے ان سے کہا۔ ”میں نے ریو اور اپنے ہاتھ کے پاس رکھ لیا ہے۔ اگر کوئی خطرہ ہو تو میں ایک فائر کر دوں گا اور تم سب جاگ جاؤ گے۔ بس اپنا اپنا اسلحہ قریب ہی رکھو۔“

ان سب نے پیٹر ووج کی ہدایات پر عمل کیا اور شب خوابی کے تھیلوں میں لیٹ گئے۔ بعض نے زپ سر تک کھینچ لی اور بعض نے صرف منہ کھلے رہنے دیے۔ پیٹر ووج ڈائری پڑھتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے پڑھنے میں رات تو گزر رہی جائے گی۔ ریو اور اس کے داہیں ہاتھ کے قریب رکھا ہوا تھا لیکن اس کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ صبح قریب تھی جب پیٹر ووج نے ڈائری کا آخری صفحہ پڑھا اور ایک طویل سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں لیکن پھر جلدی سے کھول بھی دیں۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی غار کے دہانے کی طرف سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے تھا۔

ڈائری سے جو اکتشافات ہوئے تھے، ان کے مطابق گرین لینڈ کے ڈاکٹر ایکٹائڈ کو برفانی انسان سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ اس کے بارے میں تحقیقات کر رہا تھا۔ کئی برفانی علاقے بھی اس نے چھان مارے تھے اور اس جنون میں وہ کچھ کھینچ بھی ہو گیا تھا۔ ڈائری میں لکھے ہوئے بعض جملے اس کے غماز تھے۔ وہ خود کو ایک برفانی انسان سمجھنے لگا تھا جس کے آباء اجداد کو امریکی، کوہ ماہلی سے پکڑ لائے تھے اور پھر ان کو تربیت دے کر مہذب انسان بنالیا تھا۔

ڈائری میں اس بات کی وضاحت نہیں تھی کہ ڈاکٹر کے ذہن میں اس خیال نے جڑ کیوں پکڑی؟ لیکن اس کا جنون بڑھتا ہی چلا گیا اور وہ سوچنے لگا کہ وہ اپنی اپنے وطن، یعنی کسی برف پوش پہاڑ پر چلا جائے اور کسی طرح اپنی کھلی لکڑی آگے بڑھائے۔ اس نے اب تک تجر و زندگی گزاری تھی، ورنہ شاید وہ اپنی بیوی ہی کو لے کر کسی پہاڑ پر چلا جاتا۔ اسی دوران میں کسی میگزین کے ذریعے اسے معلوم ہوا کہ ایک ایشیائی سائنس دان عالم گردیزی بھی برفانی آدمی کے بارے میں پیمانہ بین کر رہا ہے۔

ڈاکٹر ایکٹائڈ زور زور سے اپنے ملک سے روانہ ہوا اور جا کے عالم گردیزی سے ملا۔ گردیزی بھی جنون کی حد تک برفانی انسان کے خط میں مبتلا تھا اور اس کی خوب صہلرت بیوی سیما اس کی بے توجہی سے عاجز رہتی تھی۔ اولاد سے وہ دونوں

ڈاکٹر ایکٹائڈ کی ہدایات پر عمل کیا اور شب خوابی کے تھیلوں میں لیٹ گئے۔ بعض نے زپ سر تک کھینچ لی اور بعض نے صرف منہ کھلے رہنے دیے۔ پیٹر ووج ڈائری پڑھتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے پڑھنے میں رات تو گزر رہی جائے گی۔ ریو اور اس کے داہیں ہاتھ کے قریب رکھا ہوا تھا لیکن اس کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ صبح قریب تھی جب پیٹر ووج نے ڈائری کا آخری صفحہ پڑھا اور ایک طویل سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں لیکن پھر جلدی سے کھول بھی دیں۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی غار کے دہانے کی طرف سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے تھا۔

ڈائری سے جو اکتشافات ہوئے تھے، ان کے مطابق گرین لینڈ کے ڈاکٹر ایکٹائڈ کو برفانی انسان سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ اس کے بارے میں تحقیقات کر رہا تھا۔ کئی برفانی علاقے بھی اس نے چھان مارے تھے اور اس جنون میں وہ کچھ کھینچ بھی ہو گیا تھا۔ ڈائری میں لکھے ہوئے بعض جملے اس کے غماز تھے۔ وہ خود کو ایک برفانی انسان سمجھنے لگا تھا جس کے آباء اجداد کو امریکی، کوہ ماہلی سے پکڑ لائے تھے اور پھر ان کو تربیت دے کر مہذب انسان بنالیا تھا۔

ڈائری میں اس بات کی وضاحت نہیں تھی کہ ڈاکٹر کے ذہن میں اس خیال نے جڑ کیوں پکڑی؟ لیکن اس کا جنون بڑھتا ہی چلا گیا اور وہ سوچنے لگا کہ وہ اپنی اپنے وطن، یعنی کسی برف پوش پہاڑ پر چلا جائے اور کسی طرح اپنی کھلی لکڑی آگے بڑھائے۔ اس نے اب تک تجر و زندگی گزاری تھی، ورنہ شاید وہ اپنی بیوی ہی کو لے کر کسی پہاڑ پر چلا جاتا۔ اسی دوران میں کسی میگزین کے ذریعے اسے معلوم ہوا کہ ایک ایشیائی سائنس دان عالم گردیزی بھی برفانی آدمی کے بارے میں پیمانہ بین کر رہا ہے۔

ڈاکٹر ایکٹائڈ زور زور سے اپنے ملک سے روانہ ہوا اور جا کے عالم گردیزی سے ملا۔ گردیزی بھی جنون کی حد تک برفانی انسان کے خط میں مبتلا تھا اور اس کی خوب صہلرت بیوی سیما اس کی بے توجہی سے عاجز رہتی تھی۔ اولاد سے وہ دونوں

ڈاکٹر ایکٹائڈ کی ہدایات پر عمل کیا اور شب خوابی کے تھیلوں میں لیٹ گئے۔ بعض نے زپ سر تک کھینچ لی اور بعض نے صرف منہ کھلے رہنے دیے۔ پیٹر ووج ڈائری پڑھتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے پڑھنے میں رات تو گزر رہی جائے گی۔ ریو اور اس کے داہیں ہاتھ کے قریب رکھا ہوا تھا لیکن اس کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ صبح قریب تھی جب پیٹر ووج نے ڈائری کا آخری صفحہ پڑھا اور ایک طویل سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں لیکن پھر جلدی سے کھول بھی دیں۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی غار کے دہانے کی طرف سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے تھا۔

ڈائری سے جو اکتشافات ہوئے تھے، ان کے مطابق گرین لینڈ کے ڈاکٹر ایکٹائڈ کو برفانی انسان سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ اس کے بارے میں تحقیقات کر رہا تھا۔ کئی برفانی علاقے بھی اس نے چھان مارے تھے اور اس جنون میں وہ کچھ کھینچ بھی ہو گیا تھا۔ ڈائری میں لکھے ہوئے بعض جملے اس کے غماز تھے۔ وہ خود کو ایک برفانی انسان سمجھنے لگا تھا جس کے آباء اجداد کو امریکی، کوہ ماہلی سے پکڑ لائے تھے اور پھر ان کو تربیت دے کر مہذب انسان بنالیا تھا۔

ڈائری میں اس بات کی وضاحت نہیں تھی کہ ڈاکٹر کے ذہن میں اس خیال نے جڑ کیوں پکڑی؟ لیکن اس کا جنون بڑھتا ہی چلا گیا اور وہ سوچنے لگا کہ وہ اپنی اپنے وطن، یعنی کسی برف پوش پہاڑ پر چلا جائے اور کسی طرح اپنی کھلی لکڑی آگے بڑھائے۔ اس نے اب تک تجر و زندگی گزاری تھی، ورنہ شاید وہ اپنی بیوی ہی کو لے کر کسی پہاڑ پر چلا جاتا۔ اسی دوران میں کسی میگزین کے ذریعے اسے معلوم ہوا کہ ایک ایشیائی سائنس دان عالم گردیزی بھی برفانی آدمی کے بارے میں پیمانہ بین کر رہا ہے۔

ڈاکٹر ایکٹائڈ زور زور سے اپنے ملک سے روانہ ہوا اور جا کے عالم گردیزی سے ملا۔ گردیزی بھی جنون کی حد تک برفانی انسان کے خط میں مبتلا تھا اور اس کی خوب صہلرت بیوی سیما اس کی بے توجہی سے عاجز رہتی تھی۔ اولاد سے وہ دونوں

ڈاکٹر ایکٹائڈ کی ہدایات پر عمل کیا اور شب خوابی کے تھیلوں میں لیٹ گئے۔ بعض نے زپ سر تک کھینچ لی اور بعض نے صرف منہ کھلے رہنے دیے۔ پیٹر ووج ڈائری پڑھتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے پڑھنے میں رات تو گزر رہی جائے گی۔ ریو اور اس کے داہیں ہاتھ کے قریب رکھا ہوا تھا لیکن اس کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ صبح قریب تھی جب پیٹر ووج نے ڈائری کا آخری صفحہ پڑھا اور ایک طویل سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں لیکن پھر جلدی سے کھول بھی دیں۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی غار کے دہانے کی طرف سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے تھا۔

ڈائری سے جو اکتشافات ہوئے تھے، ان کے مطابق گرین لینڈ کے ڈاکٹر ایکٹائڈ کو برفانی انسان سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ اس کے بارے میں تحقیقات کر رہا تھا۔ کئی برفانی علاقے بھی اس نے چھان مارے تھے اور اس جنون میں وہ کچھ کھینچ بھی ہو گیا تھا۔ ڈائری میں لکھے ہوئے بعض جملے اس کے غماز تھے۔ وہ خود کو ایک برفانی انسان سمجھنے لگا تھا جس کے آباء اجداد کو امریکی، کوہ ماہلی سے پکڑ لائے تھے اور پھر ان کو تربیت دے کر مہذب انسان بنالیا تھا۔

ڈائری میں اس بات کی وضاحت نہیں تھی کہ ڈاکٹر کے ذہن میں اس خیال نے جڑ کیوں پکڑی؟ لیکن اس کا جنون بڑھتا ہی چلا گیا اور وہ سوچنے لگا کہ وہ اپنی اپنے وطن، یعنی کسی برف پوش پہاڑ پر چلا جائے اور کسی طرح اپنی کھلی لکڑی آگے بڑھائے۔ اس نے اب تک تجر و زندگی گزاری تھی، ورنہ شاید وہ اپنی بیوی ہی کو لے کر کسی پہاڑ پر چلا جاتا۔ اسی دوران میں کسی میگزین کے ذریعے اسے معلوم ہوا کہ ایک ایشیائی سائنس دان عالم گردیزی بھی برفانی آدمی کے بارے میں پیمانہ بین کر رہا ہے۔

ڈاکٹر ایکٹائڈ زور زور سے اپنے ملک سے روانہ ہوا اور جا کے عالم گردیزی سے ملا۔ گردیزی بھی جنون کی حد تک برفانی انسان کے خط میں مبتلا تھا اور اس کی خوب صہلرت بیوی سیما اس کی بے توجہی سے عاجز رہتی تھی۔ اولاد سے وہ دونوں

ڈاکٹر ایکٹائڈ کی ہدایات پر عمل کیا اور شب خوابی کے تھیلوں میں لیٹ گئے۔ بعض نے زپ سر تک کھینچ لی اور بعض نے صرف منہ کھلے رہنے دیے۔ پیٹر ووج ڈائری پڑھتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے پڑھنے میں رات تو گزر رہی جائے گی۔ ریو اور اس کے داہیں ہاتھ کے قریب رکھا ہوا تھا لیکن اس کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ صبح قریب تھی جب پیٹر ووج نے ڈائری کا آخری صفحہ پڑھا اور ایک طویل سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں لیکن پھر جلدی سے کھول بھی دیں۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی غار کے دہانے کی طرف سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے تھا۔

محروم تھے۔

گردیزی کو ایکٹائڈ سے مل کر اس لیے خوشی ہوئی تھی کہ اب وہ ایک ہی مشن کے لیے ایک سے دو ہو گئے تھے۔ کچھ دن گزرنے کے بعد جب وہ کچھ بے تکلف ہو گئے تو ایکٹائڈ نے اس کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ اپنی بیوی کو لے کر اس کے ہمراہ وادی کے پہاڑوں پر چلے۔ سیما پر ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا تجربہ کیا جائے اور کامیابی کی صورت میں ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی تربیت اس طرح کی جائے کہ وہ خود کو برفانی انسانوں کی اولاد سمجھنے لگے۔

گردیزی کو یہ بات نہ صرف ناگوار گزری بلکہ وہ ایکٹائڈ سے کچھ برگشتہ ہو گیا لیکن ایک میزبان ہونے کے ناتے اس نے کسی شدید رد عمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بس اتنا ہوا کہ اس نے ایکٹائڈ سے اس موضوع پر گفتگو کرنا بالکل چھوڑ دی۔

اب ایکٹائڈ کے دماغ میں کچھ اور کیزے رہنے لگے۔ وہ چر ب زبان اور خوش شکل شخص تھا، اس لیے سیما اس سے متاثر تھی۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہ اپنے شوہر کی عدم توجہی کا شکار تھی لیکن ایکٹائڈ جانتا تھا کہ بات صرف مصروفیت کی ہے ورنہ گردیزی کو اپنی بیوی سے بہت محبت ہے۔

ایکٹائڈ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور سیما کو درغلائے لگا۔ اس کا دماغ میں کوئی ٹیس تھا لہذا جب ایکٹائڈ نے اس سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ یہاں سے اس طرح غائب ہو جائے کہ گردیزی کو ان کا سراغ ہی نہ مل سکے تو رضامند ہونے کے باوجود وہ کچھ گھبرا گئی۔ اس نے کہا کہ پہلے وہ گردیزی سے طلاق تولے لے۔ لیکن ایکٹائڈ نے مختلف تاویلیں دے کر سیما کو ڈورا دیا کہ وہ طلاق لینے میں کامیاب نہیں ہو سکی تو پھر گردیزی کا رویہ اس کے ساتھ سخت ہو جائے گا۔

دراصل ایکٹائڈ کو یقین تھا کہ گردیزی اپنی بیوی کو ہرگز طلاق نہیں دے گا، لہذا اس نے اس کی نوبت نہیں آنے دی اور سیما کو شیشے میں اتار لیا۔ جب وہ آمادہ ہو گئی تو ایکٹائڈ نے بڑی جھلٹ میں ساری تیاریاں کیں اور ایک مناسب وقت دیکھ کر سیما کو لے کر کافرستان کی طرف فرار ہو گیا۔ اس نے سیما کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھتے ہوئے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ایک آدھ سال تک ان پہاڑوں میں چھپے رہے تو گردیزی یا پولیس انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک کے پیچ جائیں گے اور پھر وہ دونوں کسی دوسرے ملک میں جا کر آرام

دراصل ایکٹائڈ کو یقین تھا کہ گردیزی اپنی بیوی کو ہرگز طلاق نہیں دے گا، لہذا اس نے اس کی نوبت نہیں آنے دی اور سیما کو شیشے میں اتار لیا۔ جب وہ آمادہ ہو گئی تو ایکٹائڈ نے بڑی جھلٹ میں ساری تیاریاں کیں اور ایک مناسب وقت دیکھ کر سیما کو لے کر کافرستان کی طرف فرار ہو گیا۔ اس نے سیما کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھتے ہوئے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ایک آدھ سال تک ان پہاڑوں میں چھپے رہے تو گردیزی یا پولیس انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک کے پیچ جائیں گے اور پھر وہ دونوں کسی دوسرے ملک میں جا کر آرام

دراصل ایکٹائڈ کو یقین تھا کہ گردیزی اپنی بیوی کو ہرگز طلاق نہیں دے گا، لہذا اس نے اس کی نوبت نہیں آنے دی اور سیما کو شیشے میں اتار لیا۔ جب وہ آمادہ ہو گئی تو ایکٹائڈ نے بڑی جھلٹ میں ساری تیاریاں کیں اور ایک مناسب وقت دیکھ کر سیما کو لے کر کافرستان کی طرف فرار ہو گیا۔ اس نے سیما کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھتے ہوئے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ایک آدھ سال تک ان پہاڑوں میں چھپے رہے تو گردیزی یا پولیس انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک کے پیچ جائیں گے اور پھر وہ دونوں کسی دوسرے ملک میں جا کر آرام

دراصل ایکٹائڈ کو یقین تھا کہ گردیزی اپنی بیوی کو ہرگز طلاق نہیں دے گا، لہذا اس نے اس کی نوبت نہیں آنے دی اور سیما کو شیشے میں اتار لیا۔ جب وہ آمادہ ہو گئی تو ایکٹائڈ نے بڑی جھلٹ میں ساری تیاریاں کیں اور ایک مناسب وقت دیکھ کر سیما کو لے کر کافرستان کی طرف فرار ہو گیا۔ اس نے سیما کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھتے ہوئے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ایک آدھ سال تک ان پہاڑوں میں چھپے رہے تو گردیزی یا پولیس انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک کے پیچ جائیں گے اور پھر وہ دونوں کسی دوسرے ملک میں جا کر آرام

دراصل ایکٹائڈ کو یقین تھا کہ گردیزی اپنی بیوی کو ہرگز طلاق نہیں دے گا، لہذا اس نے اس کی نوبت نہیں آنے دی اور سیما کو شیشے میں اتار لیا۔ جب وہ آمادہ ہو گئی تو ایکٹائڈ نے بڑی جھلٹ میں ساری تیاریاں کیں اور ایک مناسب وقت دیکھ کر سیما کو لے کر کافرستان کی طرف فرار ہو گیا۔ اس نے سیما کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھتے ہوئے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ایک آدھ سال تک ان پہاڑوں میں چھپے رہے تو گردیزی یا پولیس انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک کے پیچ جائیں گے اور پھر وہ دونوں کسی دوسرے ملک میں جا کر آرام

دراصل ایکٹائڈ کو یقین تھا کہ گردیزی اپنی بیوی کو ہرگز طلاق نہیں دے گا، لہذا اس نے اس کی نوبت نہیں آنے دی اور سیما کو شیشے میں اتار لیا۔ جب وہ آمادہ ہو گئی تو ایکٹائڈ نے بڑی جھلٹ میں ساری تیاریاں کیں اور ایک مناسب وقت دیکھ کر سیما کو لے کر کافرستان کی طرف فرار ہو گیا۔ اس نے سیما کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھتے ہوئے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ایک آدھ سال تک ان پہاڑوں میں چھپے رہے تو گردیزی یا پولیس انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک کے پیچ جائیں گے اور پھر وہ دونوں کسی دوسرے ملک میں جا کر آرام

دراصل ایکٹائڈ کو یقین تھا کہ گردیزی اپنی بیوی کو ہرگز طلاق نہیں دے گا، لہذا اس نے اس کی نوبت نہیں آنے دی اور سیما کو شیشے میں اتار لیا۔ جب وہ آمادہ ہو گئی تو ایکٹائڈ نے بڑی جھلٹ میں ساری تیاریاں کیں اور ایک مناسب وقت دیکھ کر سیما کو لے کر کافرستان کی طرف فرار ہو گیا۔ اس نے سیما کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھتے ہوئے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ایک آدھ سال تک ان پہاڑوں میں چھپے رہے تو گردیزی یا پولیس انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک کے پیچ جائیں گے اور پھر وہ دونوں کسی دوسرے ملک میں جا کر آرام

دراصل ایکٹائڈ کو یقین تھا کہ گردیزی اپنی بیوی کو ہرگز طلاق نہیں دے گا، لہذا اس نے اس کی نوبت نہیں آنے دی اور سیما کو شیشے میں اتار لیا۔ جب وہ آمادہ ہو گئی تو ایکٹائڈ نے بڑی جھلٹ میں ساری تیاریاں کیں اور ایک مناسب وقت دیکھ کر سیما کو لے کر کافرستان کی طرف فرار ہو گیا۔ اس نے سیما کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھتے ہوئے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ایک آدھ سال تک ان پہاڑوں میں چھپے رہے تو گردیزی یا پولیس انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک کے پیچ جائیں گے اور پھر وہ دونوں کسی دوسرے ملک میں جا کر آرام

دراصل ایکٹائڈ کو یقین تھا کہ گردیزی اپنی بیوی کو ہرگز طلاق نہیں دے گا، لہذا اس نے اس کی نوبت نہیں آنے دی اور سیما کو شیشے میں اتار لیا۔ جب وہ آمادہ ہو گئی تو ایکٹائڈ نے بڑی جھلٹ میں ساری تیاریاں کیں اور ایک مناسب وقت دیکھ کر سیما کو لے کر کافرستان کی طرف فرار ہو گیا۔ اس نے سیما کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھتے ہوئے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ایک آدھ سال تک ان پہاڑوں میں چھپے رہے تو گردیزی یا پولیس انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک کے پیچ جائیں گے اور پھر وہ دونوں کسی دوسرے ملک میں جا کر آرام

دراصل ایکٹائڈ کو یقین تھا کہ گردیزی اپنی بیوی کو ہرگز طلاق نہیں دے گا، لہذا اس نے اس کی نوبت نہیں آنے دی اور سیما کو شیشے میں اتار لیا۔ جب وہ آمادہ ہو گئی تو ایکٹائڈ نے بڑی جھلٹ میں ساری تیاریاں کیں اور ایک مناسب وقت دیکھ کر سیما کو لے کر کافرستان کی طرف فرار ہو گیا۔ اس نے سیما کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھتے ہوئے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ایک آدھ سال تک ان پہاڑوں میں چھپے رہے تو گردیزی یا پولیس انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک کے پیچ جائیں گے اور پھر وہ دونوں کسی دوسرے ملک میں جا کر آرام

دراصل ایکٹائڈ کو یقین تھا کہ گردیزی اپنی بیوی کو ہرگز طلاق نہیں دے گا، لہذا اس نے اس کی نوبت نہیں آنے دی اور سیما کو شیشے میں اتار لیا۔ جب وہ آمادہ ہو گئی تو ایکٹائڈ نے بڑی جھلٹ میں ساری تیاریاں کیں اور ایک مناسب وقت دیکھ کر سیما کو لے کر کافرستان کی طرف فرار ہو گیا۔ اس نے سیما کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھتے ہوئے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ایک آدھ سال تک ان پہاڑوں میں چھپے رہے تو گردیزی یا پولیس انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک کے پیچ جائیں گے اور پھر وہ دونوں کسی دوسرے ملک میں جا کر آرام

دراصل ایکٹائڈ کو یقین تھا کہ گردیزی اپنی بیوی کو ہرگز طلاق نہیں دے گا، لہذا اس نے اس کی نوبت نہیں آنے دی اور سیما کو شیشے میں اتار لیا۔ جب وہ آمادہ ہو گئی تو ایکٹائڈ نے بڑی جھلٹ میں ساری تیاریاں کیں اور ایک مناسب وقت دیکھ کر سیما کو لے کر کافرستان کی طرف فرار ہو گیا۔ اس نے سیما کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھتے ہوئے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ایک آدھ سال تک ان پہاڑوں میں چھپے رہے تو گردیزی یا پولیس انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک کے پیچ جائیں گے اور پھر وہ دونوں کسی دوسرے ملک میں جا کر آرام

دراصل ایکٹائڈ کو یقین تھا کہ گردیزی اپنی بیوی کو ہرگز طلاق نہیں دے گا، لہذا اس نے اس کی نوبت نہیں آنے دی اور سیما کو شیشے میں اتار لیا۔ جب وہ آمادہ ہو گئی تو ایکٹائڈ نے بڑی جھلٹ میں ساری تیاریاں کیں اور ایک مناسب وقت دیکھ کر سیما کو لے کر کافرستان کی طرف فرار ہو گیا۔ اس نے سیما کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھتے ہوئے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ایک آدھ سال تک ان پہاڑوں میں چھپے رہے تو گردیزی یا پولیس انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک کے پیچ جائیں گے اور پھر وہ دونوں کسی دوسرے ملک میں جا کر آرام

دراصل ایکٹائڈ کو یقین تھا کہ گردیزی اپنی بیوی کو ہرگز طلاق نہیں دے گا، لہذا اس نے اس کی نوبت نہیں آنے دی اور سیما کو شیشے میں اتار لیا۔ جب وہ آمادہ ہو گئی تو ایکٹائڈ نے بڑی جھلٹ میں ساری تیاریاں کیں اور ایک مناسب وقت دیکھ کر سیما کو لے کر کافرستان کی طرف فرار ہو گیا۔ اس نے سیما کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھتے ہوئے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ایک آدھ سال تک ان پہاڑوں میں چھپے رہے تو گردیزی یا پولیس انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک کے پیچ جائیں گے اور پھر وہ دونوں کسی دوسرے ملک میں جا کر آرام

دراصل ایکٹائڈ کو یقین تھا کہ گردیزی اپنی بیوی کو ہرگز طلاق نہیں دے گا، لہذا اس نے اس کی نوبت نہیں آنے دی اور سیما کو شیشے میں اتار لیا۔ جب وہ آمادہ ہو گئی تو ایکٹائڈ نے بڑی جھلٹ میں ساری تیاریاں کیں اور ایک مناسب وقت دیکھ کر سیما کو لے کر کافرستان کی طرف فرار ہو گیا۔ اس نے سیما کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھتے ہوئے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ایک آدھ سال تک ان پہاڑوں میں چھپے رہے تو گردیزی یا پولیس انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک کے پیچ جائیں گے اور پھر وہ دونوں کسی دوسرے ملک میں جا کر آرام

کی زندگی گزاریں گے۔ چند مقامی کارندوں کو بھی ساتھ لیا گیا تھا اور ان سے یہ بات کی گئی تھی کہ وہ یہاں شکار کھیلنے کی غرض سے آئے ہیں۔ اس غار کو ایلا نڈر نے اپنا مسکن بنایا تھا اور مزدوروں کا خیمہ چٹان کے اوپر رہتا تھا۔

جب سیماکو معلوم ہوا کہ ایلا نڈر اسے ایک ٹیٹ ٹیٹ بے بی کی ماں بنانا چاہتا ہے تو اس نے احتجاج کیا لیکن ایلا نڈر نے اسے کسی طرح رام کر ہی لیا۔ شاید سیمانے یہ بھی سوچا ہو کہ اب اسے ایلا نڈر ہی کے ساتھ زندگی گزارنا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو خوش رکھیں گے، تب ہی بات بنے گی۔ لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ ایلا نڈر اس کی ٹیٹ ٹیٹ بے بی کو برفانی عورت بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اس دن ایلا نڈر کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا جب اس کا وہ تجربہ کامیاب ہو گیا۔ ٹیٹ ٹیٹ بے بی وجود میں آگئی لیکن سیماس جہاں فانی سے کوچ کر گئی۔ ایلا نڈر کو اس کی موت کا ذرا بھی ملال نہیں ہوا لیکن یہ دشواری ضرور پیش آئی کہ اسے پہلے ہی دن سے اس بچی کی پرورش کا بوجھ اٹھانا پڑ گیا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے مزدوروں کو گولیاں مار کر ان کی لاشیں گہری کھائیوں میں پیچنک دیں تاکہ اس برف پوش پہاڑ پر ایک نو مولود لڑکی کا راز ان مزدوروں کے ذریعے دوسروں تک نہ پہنچ سکے۔ اس کے بعد وہ لڑکی کی پرورش میں لگ گیا۔ اس نے خود پرودہ گویا حرام کر لیا اور اس کا سارا ذخیرہ لڑکی کے لیے وقف کر دیا تاکہ اسے پانچ چھ ماہ کے لیے فکر نہ رہے۔

پھر اس نے ماحول کی تبدیلی کو اولیت دی تاکہ بچی طبعاً اس کی مرضی کے مطابق بن جائے۔ اس نے اپنے سارے لباس ضائع کر دیے اور اپنی ستر پوشی کے لیے درختوں کی چھالیں اور پتے استعمال کیے۔ لڑکی کو بھی پتوں کے ڈھیر میں لپیٹ کر رکھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ چونکہ اس برفانی فضا میں پیدا ہوئی ہے، اس پر یہاں کی سردی کا اثر نہیں ہوگا تاہم ابتدائی کچھ عرصے تک اس نے لڑکی کے قریب ایک چھوٹا سا الاؤ دھکا رکھا۔

دواؤں کا ذخیرہ اس نے بڑی احتیاط سے رکھا تھا کہ لڑکی کو کسی وقت بھی کسی دوا کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اسے خود ہی کچھ دواؤں کی ضرورت پڑ گئی۔ ہر چند کہ وہ ایک سرد علاقے کا رہنے والا تھا لیکن وہاں اپنے جسم پر پتے نہیں باندھا کرتا تھا جو سردی سے بچا نہ سکتے تھے۔

لڑکی کا نام اس نے چاغنی رکھا تھا۔ اس کی دیکھ بھال

کے علاوہ سارا وقت وہ ایسے ہتھیار بنانے میں لگا رہتا جو ہتھر کے زمانے کے آدمی استعمال کرتے تھے۔ ایک ہتھیار چھ سات سال کے اور ایک دس بارہ سال کے بچے کے لیے بھی بنایا۔

جب بچی چھ ماہ کی ہو گئی اور گفتگاریاں لگانے لگی تو ایلا نڈر اس سے ایسی زبان میں بات کرنے لگا جو خود اس کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی۔ وہ بچی زبانوں کا ملغہ تھا اور اسے یقین تھا کہ جب چاغنی بڑی ہوگی تو یہ ”زبان“ خود بہ خود ڈیولپ ہو جائے گی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے اسی زبان میں باتیں کیا کریں گے۔

ایلا نڈر نے جنگلی پھل، زیادہ سے زیادہ مقدار میں کھانے کی عادت ڈال لی۔ مختلف جانوروں کا شکار کر کے وہ ان کا گوشت بھی آدھ کپا آدھ کھا لے گا۔ وہ اس طرح خود کو کچا گوشت کھانے کا عادی بناتا رہا۔ کچھ وقت وہ اس طرح بھی گزارتا کہ سیماکو ڈھانچے کا معائنہ کرتا رہتا۔ اس نے کچھ سیال استعمال کر کے سیماکو گوشت چند دن میں گلا دیا تھا اور برف پگھلا کر اس کے پانی سے سارا غار دھو ڈالا تھا تاکہ مُردے کے پھلنے ہوئے گوشت کی بو نہ پھیلے۔ چاغنی بڑی ہو کر اس ڈھانچے کے بارے میں ضرور پوچھتی، لہذا ایلا نڈر نے سوچ لیا تھا کہ وہ کیا جواب دے گا۔ وہ چاغنی کو یہی بتاتا کہ یہ اس کی ماں کا ڈھانچا ہے جو اس کی پیدائش کے وقت سر

مٹی تھی۔ ایلا نڈر نے یہ پروگرام بھی بنایا تھا کہ چاغنی جب تک ایک سال کی ہوگی، وہ ان تمام اشیاء کو ضائع کر دے گا جو مہذب دنیا کے لوگ استعمال کرتے تھے۔ صرف پانی وغیرہ کے لیے اس کو دو ایک کنستریٹر اور چھوٹے موٹے دو ایک برتن بچانا تھے۔ ان کے بارے میں وہ چاغنی سے کہہ سکتا تھا کہ یہ وہ چیزیں ہیں جو نیچے سے اوپر آنے والے دوسری قوم کے لوگ بھی پہنچ چکے ہوتے ہیں۔

احتیاطاً ایلا نڈر نے ایک اٹھین گن اور کارٹوسوں کی چٹنی ایک نہایت محفوظ جگہ چھپا دی تھی تاکہ چاغنی کی نظر میں نہ آسکے۔ کتابوں کو وہ اپنے پاس ہی رکھنا چاہتا تھا۔ ان کے بارے میں بھی وہ چاغنی سے یہی کہتا کہ یہ کس دوسری قوم کے لوگ یہاں بھول گئے تھے اور وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے کہ یہ سب کیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایلا نڈر وہاں کی سردی کا عادی ہوتا چلا گیا اور چاغنی بھی اس ٹھنڈ میں کسی بیماری میں مبتلا نہیں ہوئی۔

ڈائری کا اختتام اس دن ہوا تھا جب چاغنی چھ ماہ

ایکس دن کی ہو چکی تھی۔ اس کے بعد ایلا نڈر نے اگر کچھ لکھا تھا تو وہ پیڑ وچ کے ہاتھ نہیں لگ سکا۔ بعد کے بارے میں صرف اندازے ہی لگائے جاسکتے تھے اور یہ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

غار کے دہانے پر صبح کی ہلکی ہلکی روشنی نظر آنے لگی تھی جب پیڑ وچ اپنے سونے کے تھیلے سے نکلا اور فضا کا جائزہ لینے کے لیے دہانے کی طرف بڑھا۔ دہانے سے سر نکال کر اس نے اوپر دیکھا اور یکا یک اپنی سانس رکتی محسوس کی۔ سانس کی چٹان کے اوپر ایک برفانی آدمی لٹکاتا نظر آیا اور پیڑ وچ کے اندازے کے مطابق وہ آدمی ایلا نڈر ہی ہو سکتا تھا۔ اس کی لڑکھٹا ہٹ سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ پیڑ وچ کی چٹانی ہوئی گولی، برفانی عورت کو نہیں بلکہ ایلا نڈر کو لگی تھی۔ زیادہ درمیانی فاصلہ ہونے کی وجہ سے وہ اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ انہوں نے کسی مرد پر گولی چلائی تھی۔ ویسے ان کے ذہن میں بھی عورت ہی ہوتی تھی۔

چٹان کے کنارے ایک بہت بڑا برفانی تودہ نظر آ رہا تھا اور برفانی آدمی کوشش کر رہا تھا کہ اس تودے کو دراڑ میں گرا دے۔ غالباً اس نے پیڑ وچ اور دوسروں کو دیکھ لیا تھا اور اب تودے کو دراڑ میں گرا کر اس سے غار کا دہانہ بند کر دینا چاہتا تھا۔

پیڑ وچ نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو اٹھایا اور بولا۔ ”جلدی سے نکل چلو یہاں سے، ورنہ تم زندہ درگور ہو جاؤ گے۔“

مگر اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی حرکت میں آتا، دراڑ میں ایک دھماکا ہوا۔ گرنے والا تودہ کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا اور ان میں سے ایک ٹکڑا غار کے دہانے پر آ کر جم گیا۔ ”شامت!“ پیڑ وچ دانت پر دانت بھا کر بولا۔ ”اب غار میں موجود آکسیجن ختم ہوتے ہی ہم سب موت کی آغوش میں پہنچ جائیں گے۔“

پیڑ وچ کا یہ اعلان سنتے ہی اس کے ساتھیوں کے جسم میں بجلیاں ہی بھرن گئیں۔ وہ ملاٹھیں اور چھریاں لے کر اس برفانی تودے پر اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے اپنے کسی حال دشمن کے جسم کا قیمتی تجربہ کر دینا چاہتے ہوں۔ لیکن جلد ہی ان کا اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ برفانی تودہ کسی طرح سخت تھا۔ اس کے ٹکڑے ٹوٹ تو رہے تھے لیکن ان کی سے صورت حال کامیہ افزا نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کچھ دیر بعد مشتعل بجھ گئی۔ شاید غار کی آکسیجن ختم ہو گئی۔ اس کی تصدیق یوں بھی ہوئی کہ اب انہیں اپنی

سانس کھتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں۔ موت کے خوف کے باعث ان کے جسموں سے پسینا چھوٹ پڑا۔ انہوں نے تودے کو ٹوٹنے کے لیے اپنی کوششیں مزید تیز کر دیں لیکن کھتی ہوئی سانسوں کے ساتھ یہ تیزی برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ ذرا دیر میں وہ اس قابل بھی نہ رہے کہ ہاتھ کو معمولی سی جھنک دے سکیں۔ ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ دم گھٹنے لگا اور حواس زائل ہونے لگے۔ اب کوئی مجروح ہی انہیں بچا لیتا تو اور بات ہوتی ورنہ ان کی موت یقینی تھی۔

☆☆☆

جب وہ لوگ عالیہ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے تو انہیں سستانے کے لیے رکنا پڑا۔ انہیں سستانے ہوئے آدھا گھنٹا گزارا ہوگا کہ صبح کے آثار نظر آنے لگے۔ جب سورج کی پہلی کرن چھوئی تو ارسلان نے خان داراب کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ خوش مزاج اور طاقتور بوز جاہت مرحبما ہوا نظر آ رہا تھا۔ آخر عالیہ اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ارسلان نے اس کی یہ حالت دیکھ کر اپنا بچلا ہونٹ بڑی سختی سے دانتوں میں دبایا۔ خود اس کے دل سے بھی ہوک اٹھ رہی تھی۔ اس نے عالیہ کو قلب کی گہرائیوں سے چاہا تھا۔ وہ آہستہ سے آٹھ کر خان داراب کے قریب گیا۔

”باوا جان!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ابھی اتنے مایوس نہ ہوں کہ صبح کی بوڑھے نظر آنے لگیں۔ ہم عالیہ کو ضرور ڈھونڈ لیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ہے۔ مجھے ان ہواؤں میں اس کی سانسوں کی بازگشت محسوس ہو رہی ہے۔“

ناشا کر لیجئے تو ہم پھر تلاش شروع کریں۔“

”مجھے بالکل بھوک نہیں ہے بیٹے۔“

”بھوک تو مجھے بھی نہیں ہے لیکن عالیہ کو تلاش کرنے کے لیے ہمیں اپنی توانائی بیکال رکھنا ہوگی۔“

”میرا بزرگ بننے کی کوشش مت کر لڑکے! میں کھائے بیٹے بغیر نہیں دن تک اپنی ٹانگوں کو تحریک رکھ سکتا ہوں۔ بس تو اپنے ناشتے کی فکر کر۔ ملازمین وغیرہ بھی ناشتا کر لیں۔“

لیکن جب ناشتا تیار ہو گیا تو ارسلان نے خان داراب کو بھی شریک کر ہی لیا۔ اب روشنی ہر طرف پھیل چکی تھی۔ وہ لوگ عالیہ کی تلاش میں روانہ ہونے کے لیے کھڑے ہوئے اور اسی وقت ہوا میں تیزی آ گئی۔

”اوہ!“ خان داراب کے منہ سے نکلا۔ ”ایسی ہی ہوا کل شام کے طوفان سے پہلے چلی تھی۔“

”تو کیا ہم سب رستے کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہو جائیں؟“ ارسلان کے لہجے میں تشویش تھی۔

”نہیں، اس غار کی طرف دوڑو جو ہم نے رات کو دیکھا تھا۔“

رات کو عالیہ کی تلاش میں ادھر ادھر پھرتے ہوئے انہیں ایک غار دکھائی دیا تھا اور اب خان داراب کی دانست میں وہیں پناہ لینا مناسب ہوتا۔ ہوئی تیزی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ سب اس غار کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ غار اتنا چھوٹا سا تھا کہ وہ سب پھنس پھنسا کر اس میں بیٹھ سکتے تھے کیونکہ انہیں اپنا سامان بھی وہیں محفوظ کرنا تھا۔

گزشتہ شام کی یاد تازہ ہونے لگی۔ برفانی تو دے ادھر سے ادھر لڑھکتے ہوئے نظر آنے لگے۔ بعض تو دے اوچائی سے نیچے آتے تو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں روٹی کے گالوں کی طرح اڑتے دکھائی دیتے۔ خان داراب وغیرہ نے ٹیکٹیں لگائی تھیں۔ برف کے ذرات سے محفوظ رہنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ہوا اب جیسے چمکھاؤنے لگی تھی۔ اگر وہ لوگ کل کی طرح کھلے میں ہوتے تو پھر ادھر سے ادھر لڑھکتے پھرتے۔ اس جنگ غار میں وہ ایک جگہ تو رہے۔ بس یہ خوف ہر لمحے رہا کہ کوئی بڑا تو وہ انہی کی طرف نہ آگے۔ یہ طوفان کوئی آدھے گھنٹے تک شدت سے جاری رہا اور پھر ہوا کی شدت میں بتدریج کمی ہوتی چلی گئی۔ تو دے گرنے کا وسط کم ہونے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہوا معمول کے مطابق رہ گئی اور ان لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

کچھ دیر بعد وہ اس غار سے نکلے۔ ارسلان نے دو تین آنکھوں سے لگا کر اطراف کا جائزہ لیا اور پھر دفعتاً چپتی ہوئی آواز میں بولا۔

”باداجانی! ادھر کوئی برف پر سکت پڑا ہوا ہے۔“

”کدھر؟“ خان داراب نے بے چینی سے پوچھا۔

ارسلان نے انگلی سے اشارہ کیا۔ خان داراب نے

بھی دو تین آنکھوں سے لگا کر اس سمت کا جائزہ لیا اور پھر

بڑبڑایا۔ ”ہاں، کوئی ہے تو سہی لیکن وہ عالیہ نہیں معلوم ہوتی۔“

”دیکھنا تو چاہیے۔ اگر وہ عالیہ نہیں ہے تو بھی آخر کون ہے؟“

وہ سب اس طرف بڑھنے لگے۔ ان کے گردوٹے

ہوئے برفانی تو دے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ سب جلد ہی

اس مقام تک پہنچ گئے۔

”اوہ!“ ارسلان کے منہ سے نکلا۔

برف پر اونڈنا پڑا ہوا وہ شخص تھا۔ اس نے ان کی

آہستہ سن کر بھی سر نہیں اٹھایا تو ارسلان جلدی سے جھک کر

اس کا جائزہ لینے لگا کہ وہ مرنے لگا تھا یا نہیں۔ شیمہ صرف بے ہوش

تھا۔ اس کی پیشانی پر چوٹ نظر آرہی تھی جس سے خون دس رہا تھا۔

”یہ اکیلا کیوں ہے؟“ ارسلان بڑبڑایا۔ ”گردیزی کو بھی تو ہونا چاہیے تھا اس کے ساتھ۔“

”ممکن ہے وہ طوفان میں اس سے بچ کر گیا ہو۔“ خان داراب نے خیال ظاہر کیا۔

ارسلان نے سامان میں سے فرسٹ ایڈ کس نکالا اور

شیمہ کی پیشانی پر دوا لگنے کے پٹی باندھنے کے بعد اسے ہوش

میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں زیادہ دیر نہیں

لگی۔ شیمہ نے ہوش میں آنے کے بعد خود کو ان لوگوں کے

درمیان پایا تو اس کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آئے۔

”گردیزی کہاں ہے؟“ ارسلان نے اس سے پوچھا۔

”کیا وہ میرے ساتھ نہیں ملا؟“ شیمہ نے ادھر ادھر

دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔“

”اوہ!“ شیمہ نے ایک طویل سانس لی۔ ”اس کا

مطلب ہے کہ وہ طوفان میں مجھ سے بچ کر گیا۔ کل کے طوفان

میں تو ہم کو پناہ گاہ مل گئی تھی لیکن آج صبح ہی صبح ہم وہاں سے

چلے تو اس وقت طوفان آیا جب ہم کسی پناہ گاہ کے قریب نہیں

تھے۔ ہم نے چاہا تھا کہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے رہیں

لیکن ہوا کے ایک شدید پھیر نے ہمیں جھٹکے کے ساتھ

ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ میں اس کے بعد بھی چلتا رہا

لیکن پھر برف کا ایک ٹکڑا میری پیشانی پر اتنی زور سے لگا کہ

میرے ہوش و حواس زائل ہو گئے۔“

”اوہ۔“ ارسلان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”ادھر

ہم عالیہ کو گم کر بیٹھے ہیں۔“

”اوہ، یہ تو بہت بڑا ہوا۔“

”لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم اسے تلاش کر لیں گے۔“

”اور شاید گردیزی بھی مل جائے۔“

”مجھے صرف اپنی بیٹی سے دلچسپی ہے۔“ خان داراب

نے خشک لہجے میں کہا۔

شیمہ نے خان داراب کی طرف دیکھا لیکن کچھ بولا

نہیں۔

”میرا خیال ہے۔“ ارسلان بولا۔ ”تم دیکھی ہو اور

اکیلے بھی رہ گئے ہو، اس لیے اب ہمارے ساتھ ہی رہو۔“

بات ختم کرتے ہی ارسلان نے خان داراب کی طرف دیکھا

کہ وہ اس کے خلاف نہ بول پڑے لیکن جب خان داراب

خاموش رہا تو ارسلان نے اطمینان کی سانس لی۔

”تم کمزوری نہیں محسوس کر رہے؟“ ارسلان نے

شیمہ سے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے کہ ہمارے ساتھ چل سکتے ہو؟“

”یقیناً۔“ شیمہ کھڑا ہو گیا۔ ”میں بالکل کمزوری نہیں

محسوس کر رہا ہوں۔“

وہ لوگ ایک بار پھر چل پڑے۔ خان داراب ذرا

اگلے تھلک تھا۔

شیمہ نے سرگوشی کرنے والے انداز میں ارسلان سے

کہا۔ ”مجھے تم سے گردیزی کے بارے میں کچھ بات کرنا

ہے۔“

”کیا بات؟“

”ذرا خان بزرگ سے دور ہو جاؤ۔“

”ان سے چھپانے والی بات ہے؟“

”نہیں۔“ شیمہ نے کہا۔ ”بعد میں تم چاہو تو انہیں بتا

دینا۔“

”ہوں۔“

ان دونوں نے اپنی رفتار کچھ کم کی اور خان داراب

سے ان کا درمیانی فاصلہ بڑھ گیا۔

شیمہ بولا۔ ”تم کچھ اندازہ لگا سکتے ہو کہ کیوں برفانی

عورت کو دیکھ کر گردیزی نے اسے سب کے نام سے پکارا تھا

اور اس پر بھونکی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی؟“

”وہ سب کچھ میں نے دیکھا تو تھا لیکن اس کے

بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔“

اب شیمہ نے ارسلان کو وہ ساری باتیں بتائیں جو اس

کی گردیزی سے ہوئی تھیں۔ اس نے تصویر کے بارے میں

بھی بتایا جو گردیزی کے پاس تھی۔

”معنی خیز کہانی ہے۔“ ارسلان سوچ میں ڈوب گیا۔

ٹھیک اسی وقت ایسی آوازیں سنائی دیں کہ وہ سب

چونک پڑے۔ وہ گولیاں چلنے کی آوازیں تھیں اور یقیناً کسی

اٹین گن سے چلائی گئی تھیں۔

”اوہ، یہ غیر ملکی۔“ خان داراب دانت چیں کر بولا۔

”آخر یہ کم بخت اس بے چاری کو ہلاک کرنے پر کیوں تلے

ہوئے ہیں۔“

اٹین گن کا ایک برست چلنے کی آواز سنائی دی۔

”خدا کی قسم۔“ خان داراب نے اپنی رفتار تیز کرتے

ہوئے بڑے غصے سے کہا۔ ”میں ان سب کو مار ڈالوں گا اگر

وہ اس بے چاری کو ہلاک کر چکے ہیں۔“

وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ انہیں اس سمت کا

اندازہ تو ہو گیا تھا مگر وہ گولیاں چلائی گئی تھیں لیکن درمیانی

فاصلے کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔

☆ ☆ ☆

گزشتہ رات چاغی نے رینچ کی لاش غار کے باہر لے

جا کر پھینک دی تھی۔ واپسی پر اس کا خون آلود ہالامی اس

کے ہاتھ میں تھا اور اس کی مخصوص مکروہ مسکراہٹ ہونٹوں پر

تھی۔ سیاہی مائل زرد زرد دانتوں کی مسکراہٹ۔ عالیہ سینے

میں ڈوبی ہوئی، بچوں کے ہسٹر پر بیٹھی بی بی سائیں لے

رہی تھی۔ چاغی نے اس کے سامنے کئی جنگلی پھل ڈال دیے

اور بولی۔ ”خباثت۔“

عالیہ سمجھ گئی کہ وہ اس سے پھل کھانے کے لیے کہہ رہی

ہے۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ عالیہ کے لیے چاغی

کے جذبات متنی نہیں تھے۔ اسے عالیہ نے بہت قیمت جانا۔

وہ اپنے سامان کے تھیلے کے بارے میں بھی سوچ رہی تھی جو

اب اس کے پاس نہیں تھا اور غار میں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

یقیناً چاغی ہی اسے کہیں رکھ آئی تھی۔ اسی بیگ میں عالیہ کا

پستول بھی تھا اور عالیہ خود کو سنبھال رہا تھا۔ معلوم نہیں کب

اس وحشی عورت کا دماغ کیا بات پر پھر جاتا۔ اس نے چاغی

سے اشاروں میں اپنے بیگ کے بارے میں پوچھا۔ چاغی

اس کا اشارہ سمجھ گئی اور تیزی سے چلتی ہوئی غار کے باہر نکل

گئی۔ شاید بیگ ہی لینے کوئی ہوگی لیکن یہ بات عالیہ کی سمجھ میں

نہیں آ سکی کہ اس نے بیگ کہیں اور لے جا کر رکھا ہی کیوں

تھا؟

جنگلی پھلوں میں سے دو ایک عالیہ کو قیمت معلوم

ہوئے اور وہ بھی شاید بھوک کی وجہ سے، سو اس نے کھا لیے۔

اتنے میں چاغی اس کا بیگ لے کر آئی۔ عالیہ نے اسے کھول

کر دیکھا اور تمام چیزیں چیک کرنے کے بعد ایک طویل

سانس لی۔ سارے سامان میں سے صرف پستول غائب تھا۔

یقیناً چاغی کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ایک خطرناک چیز ہے، لہذا

وہ اس نے بیگ میں سے نکال لیا تھا۔ عالیہ نے مناسب سمجھا

کہ چاغی سے اس کے بارے میں استفسار نہ کرے۔ اگر

کرتی تو چاغی اس کے بارے میں نہ جانے کیا سوچنے لگتی۔

عالیہ نے اپنے بال درست کرنے کے لیے کنگھا نکالا

اور پھر ایف کا ڈبا نکال کر کھولا جس میں آئینہ لگا ہوا تھا۔ وہ

آئینے میں دیکھ کر اپنے بال درست کرنے لگی، چاغی اس کے

قریب آگئی۔ وہ بڑی پرتشخص نظر آرہی تھی۔ عالیہ نے اپنے

بال درست کر کے آئینہ، چاغی کو دے دیا۔ چاغی نے آئینے

میں اپنا ٹکس دیکھا۔ اس کے چہرے پر پہلے تو حیرت کے آثار نظر آئے اور پھر اچانک اس نے اپنا ہاتھ اس طرح آئینے کے پیچھے ڈالا جیسے آئینے کے پیچھے کھڑی ہوئی چائنی کو پکڑنا چاہتی ہو۔ عالیہ کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ چائنی نے آئینہ اپنے چہرے کے سامنے سے ہٹا کر دیکھا کہ وہاں کوئی نہیں ہے اور پھر وہ بھی اپنی مخصوص کھر کھراتی ہوئی ہنسی کے ساتھ دوبارہ آئینہ دیکھنے لگی۔ اس مرتبہ وہ اپنے ایک ہاتھ سے اپنے پورے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ سبھی وہ عالیہ کی طرف بھی دیکھتی جیسے اپنا اور اس کا موازنہ کر رہی ہو۔ اس نے منہ کھول کر اپنے دانت بھی دیکھے۔ جڑا ہلا ہلا کر انہیں ہر طرح دیکھتی رہی اور پھر اس نے عالیہ کی طرف دیکھ کر اس طرح اشارہ کیا جیسے کہہ رہی ہو۔ ”تم بھی منہ کھولو نا۔“

عالیہ نے منہ کھول دیا۔ چائنی اس کے چمکتے ہوئے دانتوں کو دیکھتی ہوئی اس کے قریب آگئی، پھر اس نے اپنے ایک گھٹائے ناخن سے عالیہ کے اوپری دونوں دانتوں کو گویا کھٹکھٹایا۔ عالیہ کو بالائی آگئی لیکن اس نے کوشش کی کہ نہ ہو۔ چائنی اپنے دانت کھٹکھٹانے لگی۔ عالیہ نے ایک طرف تھوکا اور پھر اپنے بیگ میں سے ٹوتھ پیسٹ اور برش نکالنے لگی۔ چائنی بدستور آئینے میں اپنا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ عالیہ نے اسے اپنی طرف متوجہ کر کے اپنے دانتوں کی طرف اشارہ کیا اور پھر اس کے دانتوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ چائنی سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا وہ بھی اپنے دانتوں کو صاف کروانا چاہتی ہے؟ کئی اشاروں کے بعد یہ بات چائنی کی سمجھ میں آئی اور اس نے خوش خوش سر ہلایا۔

یہ عالیہ کے لیے بڑا صبر آزما کام تھا لیکن وہ چائنی کے دل میں اپنے لیے زیادہ سے زیادہ جگہ بنا لیتا چاہتی تھی۔ وہ کستور اٹھا کے غار کے باہر گئی اور اس میں تھوڑی سی برف بھر لائی۔ پھر لاؤ روشن کیا۔ اس آگ سے اس نے برف کو چمکھٹا کر پانی بنایا۔ خود ایک ٹکڑی کر کے چائنی کو بھی ایسا ہی کرنے کا اشارہ کیا پھر برش پر ٹوتھ پیسٹ نکالا اور چائنی کو قریب بٹھا کر اسے منہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ چائنی نے منہ کھول دیا۔ عالیہ اس کے دانتوں پر برش کرنے لگی۔ چائنی کے چہرے سے یوں معلوم ہونے لگا جیسے وہ گلدی محسوس کر رہی ہو لیکن وہ ضبط کیے بیٹھی رہی۔

یہ عالیہ کے لیے بڑا صبر آزما کام تھا۔ اسے چائنی کے بدبودار ٹکس سے بچنے کے لیے بار بار اپنی سانس روکنا پڑتی یا دوسری طرف منہ پھیرنا پڑتا۔ اس نے پندرہ منٹ تک برش کرنے کے بعد چائنی کو نکلیاں کر دائیں۔ پندرہ تیس سال کے

گندے دانت اتنی جلدی چمک دار نہیں ہو سکتے تھے لیکن پھر بھی خاصا فرق آگیا۔ عالیہ نے اسے نکلیاں کرانے کے بعد دوبارہ برش کرنا شروع کیا۔ اس مرتبہ چائنی کے تنک کی بدبو خاصی کم ہو چکی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد عالیہ نے چائنی کو پھر نکلیاں کر دائیں اور اس کے بعد آئینہ دکھایا۔ اس کے دانتوں کو چمکھٹا بنانے میں شاید ایک مہینا لگ جاتا لیکن اتنی ہی صفائی دیکھ کر چائنی بہت خوش نظر آئی تھی۔ اب اچانک اس نے اپنے کچلے ہوئے بالوں پر ہاتھ بھیرا اور اس کے بعد عالیہ کے رومی بال سہلائے۔

”ہے!“ وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسی۔ اس کی ہنسی ایسی ہوتی تھی کہ آثر میں خراش زدہ ہی آواز نکلتی تھی۔

عالیہ سمجھ گئی کہ اب چائنی اس سے کیا چاہتی ہے لیکن اب اسے سخت نیند آ رہی تھی۔ اس نے چائنی کو اشاروں میں بتانا چاہا کہ اب وہ تھک گئی ہے، اس لیے یہ کام مکمل کیا جائے گا تو بہتر ہے لیکن یہ اشارے یا تو چائنی کی سمجھ میں نہیں آئے یا وہ ضد کرتی رہی کہ یہ کام اسی وقت ہونا چاہیے۔ عالیہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی، لہذا اس کام کے لیے بھی کربت ہو گئی لیکن اسے اندازہ تھا کہ اس کام میں ساری رات گزار سکتی تھی۔

بیس سالہ گندے بالوں کو دھونے کے لیے نہ جانے کتنی برف پگھلا کر پانی بنانا پڑتا اور پھر ان اٹھتے ہوئے بالوں کو سلکھنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہوتا، تاہم اسے اس کے لیے کربت ہونا پڑا۔ اس کے تھیلے میں صابن تو تھا ہی۔

عالیہ کو پورے اکیس مرتبہ چائنی کے بال دھونے پڑے۔ ابتدا میں تو صابن کا جھاگ بالکل سیاہ پڑا رہا۔ اس کے بعد پانی کی سیاہی کم ہونا شروع ہوئی اور بالآخر عالیہ اس کے بالوں کا چمکنا پن محسوس کرنے میں کامیاب ہو گئی لیکن یہ عمل اس کے لیے نہایت تھکا دینے والا ثابت ہوا تھا۔ سردھونے سے چائنی کا چہرہ بھی دل دلایا تھا۔ وہ غاصے کھلتے ہوئے رنگ کی تھی۔ اس نے آئینہ دیکھا اور خوشی سے اچھلنے کودنے لگی۔ اس کے بعد پھر عالیہ کے قریب آٹھنی اور کھٹکے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ عالیہ کو گھما کر بٹے دیکھ ہی چکی تھی۔ خاصی تنک کے باوجود عالیہ نے اس کے بال سلکھنا شروع کیے۔ یہ عمل چائنی کے لیے خاصا تکلیف دہ تھا کیونکہ اس کے بال بری طرح اٹھتے ہوئے تھے لیکن وہ عالیہ جیسے بال بنوانے کے شوق میں بیٹھی ہی رہی۔

صبح ہوئی۔ ابھی کچھ کسربانی تھی کہ باہر سے ہواؤں کی چٹکھٹاؤں اور ٹوڈے گرنے کی آوازیں سنائی دیں گئیں۔ عالیہ کا

ہاتھ ایک دم رک گیا۔ وہ بے ساختہ بول پڑی۔ ”شاید پھر طوفان آگیا۔“ اسے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ چائنی اس کی بات نہیں سمجھ سکتی۔

چائنی اس کی بات نہیں سمجھی لیکن اس کا ہاتھ رکنے کا سبب اس کی سمجھ میں آگیا۔ اس نے ایک مرتبہ غار کے دہانے کی طرف دیکھا اور پھر اس طرح اسے ہاتھ ہلائے جیسے بے پروائی کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ یہ طوفان اس کے لیے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے ہوں گے۔ اس نے عالیہ کے سامنے اپنا سر جھکا دیا تاکہ وہ اپنا کام جاری رکھ سکے۔ عالیہ نے ایک طویل سانس لے کر کھٹکھٹا اٹھایا۔ اتنی دیر میں کھٹکے کے کئی دندانے ٹوٹ چکے تھے۔ جب طوفان رکا تو چائنی کے بال بھی سلجھ چکے تھے۔ عالیہ نے اس کی بیچ سے مانگ بھی نکال دی اور بال اس کی پشت پر پھیلا دیے۔

اب خود عالیہ کو چائنی اچھی لگنے لگی۔ چائنی نے جو آئینے میں اپنی یہ حالت دیکھی تو وہ ایک بار پھر اسے ہاتھ میں لیے غار میں جانے لگی۔ عالیہ سوچ رہی تھی کہ وہ کوشش کرے تو اس لڑکی کو مہذب بنا سکتی ہے۔ اب اس کو نیلانا اور غیر معمولی طور پر بڑے ناخن کا نمابانی تھا۔ پھر اسے پتوں کے بجائے ہلکا ہلکا لباس بھی پہنانا جا سکتا تھا۔ اس سردی کی عادی چائنی گرم کپڑے تو ہرگز نہیں پہن سکتی تھی۔

لیکن سب سے اہم کام یہ تھا کہ اسے یہاں سے لے جایا جا سکے اور یہ کام خان دار اب ہی کر سکتا تھا۔ عالیہ اندازہ لگانے سے قاصر تھی کہ وہ لوگ اسے ڈھونڈ رہے ہوں گے یا انہوں نے اسے مردہ سمجھ لیا ہو گیا۔ دفعتاً چائنی نے ناچنے ناچنے عالیہ کو بھی اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا اور ناچتی رہی۔ ”ارے ارے!“ عالیہ ہلکھلائی۔

چائنی بڑے زور سے ہنسی۔ اچانک اس نے عالیہ کو پتوں کے بستر پر اچھال دیا اور ناچنا بند کر دیا۔ اس کا چہرہ اپنا رنگ بدل چکا تھا اور اس کی وجہ عالیہ کی سمجھ میں آگئی تھی۔ کہیں قریب ہی سے گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی تھی۔ چائنی نے اپنا ہالہ اٹھایا اور غار کے دہانے کی طرف زقند لگائی۔

☆☆☆

آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتے ہوئے، دماغ نے بھی آہستہ آہستہ کام کرنا شروع کیا اور بیڑ و بیچ کو خیال آیا کہ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے غار میں دم گھٹ جانے کے باعث دم توڑا تھا لہذا اب اس کی روحانی آنکھیں عالم ارواح میں مکمل رہی ہیں۔ لیکن جب اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں تو اس نے تعجب سے اپنے ارد گرد دیکھا اور اس کے تمام

حواس یک بہ یک بیدار ہو گئے۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اسی غار میں ہے۔ اس کے تمام سامنے بھی وہیں پڑے ہوئے تھے۔ ایک آدھ کے سوا سب ہی کلبلا رہے تھے۔ انہیں ہوش آ رہا تھا۔ وہ برفانی تودہ اب غار کے دہانے پر نہیں تھا اور بہرہ منی ٹھنڈک ان تک پہنچ رہی تھی۔ وہ تودہ کہاں چلا گیا؟ یہ پیٹر ووج کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا۔ ان سب کے ہوش و حواس زائل ہو چکے تھے جب صبح کے وقت ایک تند و تیز طوفان آیا تھا اور ہوا کے تیزیزوں سے وہ تودہ وہاں سے لڑھک گیا تھا۔ صبح کی روشنی میں پیٹر ووج اپنے ساتھیوں کو جھجھوڑ جھجھوڑ کر ہوش میں لانے لگا۔

”اٹھو... اٹھو“ وہ پاگلوں کی طرح چیختا بھی جا رہا تھا۔ آخر ان سب کو ہوش آ گیا۔

”ارے!“ ان میں سے ایک حیرت سے بولا۔ ”غار کا وہاں کیسے کھل گیا؟“

”کھلا ہو گا کسی طرح! اس مسئلے میں الجھ کر وقت ضائع نہ کرو۔“ پیٹر ووج نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

”جلدی جلدی سامان سمیٹو اور یہاں سے نکل چلو۔ کہیں کوئی اور مصیبت نازل نہ ہو جائے۔“

اس کے سامنے فوراً اس کے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو گئے۔ پیٹر ووج اس طرف لپکا جہاں اس نے ڈاکٹر ایلیکا نڈر کی ڈائری چھوڑی تھی۔ غار کے اس حصے میں تقریباً اندھیرا تھا۔ باہر کی روشنی وہاں تک نہیں پہنچ رہی تھی اور مشعل تو پہلے ہی بجھ چکی تھی۔ اس نے ڈائری اٹھائی ہی تھی کہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے غار گونج اٹھا۔ اس نے بے اختیار خود کو نیچے گراتے ہوئے، ریلو اور نکالنے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور غار کے دہانے کی طرف دیکھا۔

چھوٹے سے دہانے پر وہی برفانی آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی جس سے وہ پیٹر ووج کے ساتھیوں پر گولیاں برسا رہا تھا۔ نیم تاریکی میں ہونے کی وجہ سے پیٹر ووج اس برفانی آدمی کی نظر میں نہیں آیا تھا ورنہ اب تک اس کے جسم میں بھی متعدد گولیاں بیوست ہو چکی ہوتیں۔ پیٹر ووج کے تمام ساتھیوں کے جسم چٹختی ہو چکے تھے۔ صرف وہ محفوظ رہا تھا۔ اس نے بڑی احتیاط سے برفانی آدمی کی پیشانی کا نشانہ لیا اور اپنے ریلو اور کاسٹر گنڈر دیا۔ وہ خاصا ماہر نشانہ باز تھا۔ گولی ٹھیک نشانے پر لگی اور برفانی آدمی کے منہ سے ایسی آواز نکلنے لگی جیسے اس نے پھکی لی ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنی اسٹین گن سمیت غار کے باہر لڑھک گیا۔

پیٹر ووج ایک طویل سانس لیتا ہوا سیدھا کھڑا ہوا تو

اس نے محسوس کیا کہ اس کی ٹانگوں میں خفیف سی لرزش تھی اور سردی کے باوجود مساموں سے پسینا پھوٹ نکلا تھا۔ موت اس کے بہت قریب سے نکل گئی تھی۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لیتا ہوا غار کے دہانے کی طرف بڑھا۔ اس کے تمام سامنے بے حس و حرکت ہو چکے تھے۔ کوئی امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ اب ان میں سے کوئی زندہ بچا ہوگا۔ ان کا خون اس طرح ٹھیکل رہا تھا جیسے وہاں دو تین گائیں ذبح کر دی گئی ہوں۔ پیٹر ووج کوشش کے باوجود اپنے جوتوں کو خون سے بچانے بلیغ باہر نہیں نکل سکا۔ برفانی آدمی کی لاش ساکت پڑی ہوئی تھی اور اس کی پیشانی سے خون اب بھی آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ پیٹر ووج نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا کہ یہ ڈاکٹر ایلیکا نڈر ہی ہو سکتا ہے۔ ایلیکا نڈر... ایک اینارمل آدمی! پیٹر ووج کی دانست میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی نارمل آدمی یہ سب کچھ کر گزرتا۔

ایلیکا نڈر کو گھورتے گھورتے پیٹر ووج چوٹکا۔ اب بہتر یہی تھا کہ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جاتا اور حتی الامکان تیزی سے نیچے اتر کر اپنے پڑاؤ تک پہنچ جاتا۔ وہ تیزی سے ایک مرتبہ پھر غار میں داخل ہوا اور تازہ سردی سامان سمیٹنے لگا جو تنہا اٹھا کر لے چکا۔ پھر وہ غار سے نکلا۔ اس نے اب بھی دائیں ہاتھ میں ریلو اور بائیں ہاتھ میں ایلیکا نڈر کی ڈائری سنبھال رکھی تھی۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے آخری مرتبہ ایلیکا نڈر پر ایک نظر ڈالی اور پھر دراڑ سے نکلنے کے لیے ایک طرف مڑا ہی تھا کہ اس کے روٹکنے کھڑے ہو گئے۔ وہ نیم انسانی اور نیم وحشیانہی غراہٹ تھی۔

پیٹر ووج کا سر ایک دم اٹھا اور اس نے چٹان کے اوپر برفانی عورت کو کھڑا دیکھا۔ اس نے گھبرا کر فوراً ہی اسے بھی گولی کا نشانہ بنانا چاہا لیکن برفانی عورت نے اس سے زیادہ تیزی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں دبا ہوا بلم پیٹر ووج کے بازو سے آکر ٹکرایا اور گوشت کو کاٹتا ہوا ہڈی سے ٹکرایا۔ ریلو اور اس کی گرفت سے نکل گیا۔ برفانی عورت کی چیخ بڑی لرزہ خیز تھی جب اس نے اوپر ہی سے پیٹر ووج پر جست لگائی۔ وہ دراڑ کی چٹان سے ٹکرایا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے محسوس کیا کہ برفانی عورت کی کلائی اس کی گردن پر اپنا دباؤ بڑھاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔

”چانی!“ اس نے چیخ کر کہنا چاہا لیکن اس کے حلق سے ذرا بھی آواز نہیں نکل سکی۔

☆ ☆ ☆

چٹان پر کھڑی ہوئی عالیہ نے بھی یہ خوف ناک منظر

دیکھا۔ وہ چانی کے پیچھے دوڑتی ہوئی یہاں تک آئی تھی۔ اسے یوں نظر آنے لگا جیسے پیٹر ووج کی آنکھیں اس کے حلقوں سے ابل پڑیں گی۔ اس کی گردن پر چانی کی کلائی کا دباؤ جیسے آہنی قوت لیے ہوئے تھا۔ دفعتاً چانی کا دایاں ہاتھ پیچھے ہٹا اور پھر انتہائی سرعت سے آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ کی سیدی انگلیاں پیٹر ووج کی پسلیوں کے عین نیچے ٹکرائیں اور تیز دھار چاقوؤں کی طرح اس کے سینے میں بیوست ہو گئیں... پیٹر ووج کی چیخ بڑی لرزہ خیز تھی اور یہ منظر عالیہ کے لیے اتنا ناقابل برداشت تھا کہ اس نے ایک دم آنکھیں بند کر لیں۔

”عالیہ!“ اس نے ارسلان کی آواز سنی اور چونک کر آنکھیں کھولنے ہوئے مرکز دیکھا۔

ارسلان اور خان داراب وغیرہ تیزی سے اس کی طرف آ رہے تھے۔ عالیہ نے چاہا کہ دوڑ کر ان کے قریب چلی جائے لیکن وہ کوشش کے باوجود ایسا نہیں کر سکی۔ نہ جانے کیوں اس کے پیر من بھر کے ہو گئے تھے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر چانی کی طرف دیکھا اور کانپ گئی۔ چانی نے اپنے دائیں ہاتھ سے پیٹر ووج کا کلیجہ اس کے سینے سے نکال لیا تھا۔ پیٹر ووج کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں۔ وہ یقیناً دم توڑ چکا تھا۔ چانی نے اس کی گردن سے اپنی کلائی ہٹائی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گر پڑا۔ اس وقت چانی کے چہرے پر اس بلا کی وحشت تھی کہ عالیہ کانپ گئی۔

شدید اشتعال کے باعث چانی شاید ارسلان کی آواز نہیں سن سکی تھی۔ اس نے پیٹر ووج کا کلیجہ ایک طرف پھینکا اور اس طرف لمبی جہاں ایک برفانی آدمی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ دراڑ میں پہلے تو اس کی ایک خوف ناک چیخ گونجی اور پھر وہ برفانی آدمی پر کرکے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا یہ رونا بھی کسی درد نہ کے کا سا انداز لیے ہوئے تھا۔ اتنے میں خان داراب وغیرہ وہاں پہنچ گئے۔

عالیہ کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ اس سے کھڑا نہ رہا جا سکا۔ وہ پیچھے تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے ہوش و حواس زائل ہوتے جا رہے ہوں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ ایسا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ چانی کو پکڑنے کے لیے اس پر مضبوط روشنی ڈور یوں کا جال پھینکا گیا تھا اور وہ اس میں پھنس بھی گئی تھی۔ اس کے منہ سے غرائیں نکلنے لگیں۔ وہ جال کی ڈور یوں کو توڑنے لگی۔ اس میں بلا کی طاقت تھی۔ وہ یقیناً جال کو توڑ کر نکل جاتی لیکن اسی وقت خان داراب اور اس کے ملازمین مضبوط رستے لیے ہوئے دراڑ میں کود گئے

تاکہ چاقنی کو ان رتوں سے بے تکلیف۔

”نہیں... نہیں... نہیں...“ عالیہ کے منہ سے کپکپاتی ہوئی آوازیں نکلنے لگیں اور اس کا جسم اس طرح کانپنے لگا جیسے شدید ترین سردی کی زد میں ہو۔

”عالیہ!“ ارسلان نے اسے اپنے ایک بازو میں سمیٹ لیا۔ ”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

”ارسلان!... پلینز... اسے اس طرح بیدردی سے نہ پکڑو۔ پلینز!“ عالیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”کیا پاگل ہو گئی ہو تم؟“ ارسلان نے اسے جھنجھوڑا۔ دوسری طرف چاقنی نے جال کے تو کلوے اڑا ڈالے تھے لیکن مضبوط رتوں نے اسے بری طرح جکڑ لیا تھا۔ اس عالم میں وہ بڑے ہیمانک انداز میں کھڑی تھی۔ عالیہ پر مٹی سی طاری ہونے لگی تھی جو بالآخر بے ہوش پر چڑھ گئی۔ پھر ہوش آنے پر اسے احساس نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر تک بے ہوش رہی تھی۔ اس نے خود کو اسی چٹان پر پایا۔ اس کے قریب ارسلان بھی تھا۔ باقی لوگ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ جلدی سے بولی۔ ”کہاں گئے سب؟“

”کوئی سو فٹ نیچے ایک مرتفع جگہ پر پڑاؤ ڈالا گیا ہے۔ سب وہیں ہیں۔ آؤ چلیں۔“ ارسلان نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

عالیہ نے چٹان کے کنارے سے دراڑ میں دیکھا جہاں بیڑو وچ کی سینہ چاک لاش پڑی ہوئی تھی۔ قریب ہی اس کا کلیجہ بھی پڑا ہوا تھا جو چاقنی نے اس کے سینے سے نکالا تھا۔ برقی آدی کی لاش بھی وہیں پڑی ہوئی تھی۔ عالیہ نے چاقنی کو اس سے لپٹ کر روتے ہوئے دیکھا تھا۔ شاید وہ چاقنی کا باپ ہو۔ اس کی پیشانی پر گولی لگی تھی۔ اسے مارنے والا عالیہ کی دانست میں شاید یہ بیڑو وچ ہی تھا جس سے چاقنی نے بڑے ہیمانک انداز میں انتقام لیا تھا۔

”چلو عالیہ!“ ارسلان نے اس کے ہاتھ کو خفیف سی جنبش دی۔

”چلو!“ عالیہ کہتی ہوئی آہستہ سے مڑی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ پڑاؤ میں وہ چاقنی کو کس عالم میں پائے گی۔

”ہم لوگ۔“ ارسلان بولا۔ ”پانگوں کی طرح کل سے جہیں ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ تم کہاں تھیں؟“

پڑاؤ میں پہنچنے تک عالیہ نے اپنی ساری روداد سنا دی۔

”اوہ!“ ارسلان نے ایک طویل سانس لی۔ ”ہم لوگ جبران تھے کہ اس کے بال دھلے ہوئے، بلکہ نکلیں کیے

ہوئے اور دانت اتنے صاف کیوں ہیں۔“

صرف ایک خیمہ گڑا ہوا تھا۔ باقی ملازمین کھلے میں تھے اور کھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ارسلان اور عالیہ خیمے میں داخل ہوئے جہاں خان داراب بڑے انتہاک سے کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ایک کونے میں چاقنی بڑی بے بسی کے عالم میں پڑی ہوئی تھی۔ اسے شانوں سے کمر تک رتوں سے اس طرح جکڑا گیا تھا کہ صرف گالیاں نظر آرہی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کے دونوں پیروں کو بھی ملا کر خنٹوں سے باندھ دیا گیا تھا۔

”چاقنی!“ عالیہ بے تحاشا اس کی طرف مٹی اور بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

”آخیر۔“ چاقنی دھیرے سے بولی۔ اس کی بڑی بڑی دہشت بھری آنکھوں میں اس وقت بے بسی بھی ناچ رہی تھی۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر عالیہ آبدیدہ ہو گئی اور خان داراب سے بولی۔ ”اسے چھوڑ دیجیے باوا جان! اسے میرے حوالے کر دیجیے۔ یہ کچھ ہی دن میں خوش خوشی ہمارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائے گی۔“

”کیا حیرا دماغ خراب ہو گیا ہے لڑکی؟“ خان داراب نے منہ بنایا۔

اس سے پہلے کہ عالیہ کچھ کہتی، ارسلان نے خان داراب کو بتانا شروع کیا کہ کشمیری سے اب تک عالیہ اسی برفانی لڑکی کے ساتھ رہی ہے جس نے عالیہ کو اپنا نام چاقنی بنایا ہے۔

”ہوں۔“ خان داراب نے منہ بنایا اور عالیہ سے کہا۔ ”تجھے خوش بھی ہو رہی ہے بے وقوف لڑکی! یہ تو ممکن ہے کہ تو اسے اپنی گہری دوست بنالے لیکن یہ وحشی لڑکی ان پہاڑوں سے جانے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوگی۔“

”آپ مجھے ایک موقع تو دیں باوا جان۔“

”کواس بند کر بے وقوف لڑکی۔“

اس دوران میں چاقنی پلکیں جھپک جھپک کر باری باری باپ بیٹی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ ان دونوں میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔

”لیکن باوا جان!...“

”بیچارہ تمہیں نہیں۔“ خان داراب نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”ارسلان! تو اس بے وقوف لڑکی کو سمجھا۔“

اور پھر خان داراب تیزی سے چلتا ہوا خیمے سے نکل گیا۔ عالیہ اپنا سامنے لے کر مٹی اور چاقنی کے چہرے پر بھی مایوسی نظر آنے لگی۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی

دوست عالیہ اسے آزاد کروانے کی کوشش میں ناکام ہو چکی ہے۔

یہ ایک اس بڑے زور سے بچ رہی۔ وہ اس طرح اپنے غصے کا اظہار کر رہی تھی۔ عالیہ پھر اس کے قریب جا بیٹھی اور اس کا سر سہلاتی ہوئی بولی۔ ”چاقنی! میں ایک بار پھر اپنے والد کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔“

چاقنی اس کا منہ ہتھی رہی۔ ظاہر ہے کہ عالیہ کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکی ہوگی۔ اس نے زیادہ سے زیادہ بس یہی اندازہ لگایا ہوگا کہ عالیہ اسے نکلی دے رہی ہے۔ معا

عالیہ کو دھچکا لگا۔ اس کی نظر چاقنی کے ایک ہاتھ پر پڑی تھی۔ اس کے پانچوں ناخن کٹے ہوئے تھے۔ پھر عالیہ نے اس کے دوسرے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ بھی چاقوؤں جیسے تیز ناخنوں سے محروم تھا اور ظاہر ہے کہ یہ کام خان داراب ہی نے کر دیا ہوگا۔ اس طرح چاقنی اپنے اس آخری ہتھیار سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ اپنے تیز دھارناخنوں سے رتوں کو کاٹنا اس کے لیے یں ممکن تھا۔

☆☆☆

کھانے کے بعد سفر کا آغاز ہوا۔ اب یہ ضروری تھا کہ چاقنی کو اس بڑی طرح نہ جکڑ کر رکھا جائے کہ وہ اپنے پیروں پر نہ چل سکے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی اسے اپنے اوپر اٹھا کے چل سکے۔ ویسے تو خان داراب اس عمر میں بھی اتنا نومد تھا کہ چاقنی کو اٹھا سکا لیکن اسے اٹھا کر ان اوپے نیچے برف پوش راستوں پر چلنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ مجبوراً چاقنی کے ہاتھ پر کھول دیے گئے۔ صرف کمر سے رتے کوئی بل دے کر اس کے اوڑھنوں سرے چار طاقتور ملازمین کو دے دیے گئے تھے۔ ان ملازمین کو چاقنی کے داہیں بائیں آٹھ آٹھ دس دس فٹ کے فاصلے پر رکھا گیا تھا اور اس کام کے لیے سب سے موٹے رتے کا استعمال کیا گیا تھا۔ جب بھی بیٹھوں کے سہارے کسی عودی چٹان سے نیچے اترنا پڑتا، چاقنی ان ملازمین میں سے دو کے بعد اور دو سے پہلے اترتی۔ بھی کسی اس کے منہ سے دردوں کی سی غراہیں نکلنے لگتیں جن سے معلوم ہوتا کہ وہ اپنے غصے کا اظہار کر رہی ہے۔ عالیہ برابر سوچ رہی تھی کہ چاقنی کو کس طرح رہائی دلوائے لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ خان داراب سے اس موضوع پر دوبارہ بات کرنا اس نے فضول سمجھا تھا۔

رات کو ان لوگوں نے پھر پڑاؤ ڈالا اور چاقنی کو پہلے ہی کی طرح بے بسی کر کے ڈال دیا گیا اور اس کے چہرے پر فٹے کی سرخی بڑھ گئی۔ اس کے صاف ستھرے خوب صورت ہاتھ کے ساتھ اس کا میلا کچلا جسم بڑا عجیب سا معلوم ہو رہا

انداز بیار اور

ریڈیو کے ایک چینل پر کرکٹ کشتی جاری تھی جبکہ دوسرے چینل پر میک آپ کرنے کے طریقے بتاتے جارہے تھے۔ فی خرابی کے باعث دونوں چینل کس ہو کر کسی نشریات پیش کر رہے تھے اور آپ بھی ملاحظہ کریں۔

”حسین نظر آنے کے لیے کپتان نے فیلڈنگ کا فیصلہ کیا۔ کھلاڑی بال سکھاتے ہوئے میدان کی جانب روانہ ہوئے۔ بالوں کی بیچ بالکل خشک ہے۔ سراج، فٹیل اور ماسک کے لیے شاید آفریدی تیار ہے۔ ویکٹنگ کے لیے شیب ملک موجود ہے۔

میک آپ کو تادیب قائم رکھنے کے لیے شیب اختر شارٹ لیگ پر کھڑے ہیں۔ آٹھ کے اور گردایک دن کا حریف اضافہ ہوا۔ اب بلش آئن ایک ہریک کرواتے ہیں۔ پولین کی طرف سے مسکارا لگائیں۔ ٹھوڑی پر ایک شاندار چھکا... فائوڈیشن ایلانی کرتے ہوئے ویلر سلب ہو گئے۔ لپ اسٹک لگاتے ہوئے گیند باؤنڈری لائن پار کھنچی۔ چہرے کو آخری بیچ دیتے ہوئے اسٹیز میں شیب دوبارہ خوش آمدید۔“

(مری آباد آؤنڈ سے شیب حبیب کا تعاون)

تھا۔ ان دنوں میں ارسلان کا شیوہ خاصا بڑھ گیا تھا۔ وہ اس رات شیوہ کرنے کے لیے بیٹھا تو بلیڈ دیکھ کر عالیہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ بلیڈ سے رتی کا جاسکی کی لیکن سوچنا یہ تھا کہ کیا چاقنی بلیڈ کو استعمال کر سکے گی؟ امکان نہیں تھا کہ اس وحشی لڑکی کو بلیڈ کی افادیت یا اس سے کام لینے کا طریقہ معلوم ہوتا، تاہم عالیہ نے اس رات ارسلان کے بلیڈ کا ایک پیٹک چرایا۔ صبح ان لوگوں کا سفر پھر شروع ہوا۔ شیمابہت کھویا کھویا سارے لگا تھا۔ یقیناً اسے اپنے دوست گردیزی کی یادستا رہی ہوگی جو طوفان میں اس سے بچھڑ گیا تھا۔ وہ دور میں آنکھوں سے لگائے ہمد وقت چاروں طرف دیکھتا رہتا۔

عالیہ نے بلیڈ کے پیٹک کے ساتھ رتے کا ایک فٹ بھر کا ٹکڑا اپنے لباس میں چھپا لیا تھا اور کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھی جب وہ خان داراب کی نظر سے بچ کر چاقنی کے قریب ہو سکے۔ آخر اسے یہ موقع اس وقت ملا جب ایک تقریباً عودی چٹان میں بیٹھیں ٹھونک ٹھونک کر نیچے اترنا پڑ رہا تھا۔ ایسے موقعوں پر ہمیشہ خان داراب ہی آگے ہوتا تھا۔ عالیہ چاقنی کے قریب ہوئی۔ اس نے سب کی نظر بچا کے رتی کا ٹکڑا اور بلیڈ کا پیٹک نکالا۔ چاقنی اسے عجیب سے انداز میں دیکھنے لگی۔

عالیہ چاہتی تھی کہ چاغی اسے پوری توجہ سے دیکھے۔
عالیہ نے بلیڈ کے پیکٹ میں سے ایک بلیڈ نکالا اور
رستے کے کنارے کو درمیان میں سے کاٹنے کی کوشش کرنے
لگی۔ رستا خاصا موٹا تھا۔ کوئی ایک تہائی کتا ہوگا کہ بلیڈ کند
ہوئے لگا۔ عالیہ نے بلیڈ کو پلٹ کر اس کی دوسری دھار سے
رستے کو کاٹنا شروع کیا۔ دوسری دھار بھی کند ہوئی لیکن رستا
پوری طرح نہیں کٹا۔ اب عالیہ نے دوسرا بلیڈ نکالا اور اس
سے وہ رستے کو کاٹنے میں کامیاب ہو گئی اور مسکرا کر چاغی کی
طرف دیکھا۔ چاغی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ یقیناً اس نے
سمجھ لیا تھا کہ عالیہ نے اسے کیا سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
عالیہ نے چپکے سے بلیڈ کا پیکٹ اسے دے دیا اور رستے کے
کٹے ہوئے دونوں ٹکڑے اپنے لباس میں چھپا کر آہستہ آہستہ
چاغی سے دور ہوتی چلی گئی۔

”تم اس سے کیا باتیں کر رہی تھیں؟“ ارسلان بولا۔
”میں اس سے کیا باتیں کروں گی؟“ عالیہ نے غیورگی
سے کہا۔ ”ہم دونوں ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھ سکتے۔
بس مجھے اس کے قریب رہ کر سکون ملتا ہے۔“
”گویا وہ میری رقیب روسیہ ہے۔“ ارسلان نے
ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”فضول باتیں نہ کرو۔“ عالیہ نے منہ بنایا۔
”اچھا تو ایک غیر فضول بات سنو۔“
”وہ کیا؟“
”کل رات ہمارے خیمے میں چوری ہوئی ہے۔“
عالیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیا ارسلان نے اسے
بلیڈ کا پیکٹ چراتے دیکھ لیا تھا؟
”کیسی چوری؟“ وہ آہستہ سے بولی۔

”تمہارے چہرے پر رگ ناک تو ایسے بدل گیا ہے جیسے وہ
چور تم ہی ہو۔ کیا وہ ڈائری تم ہی نے چرائی ہے؟“
”کیسی ڈائری؟“

”وہی جو باوا جانی کو پیٹروویچ کی لاش کے قریب
پڑی ہوئی ملی تھی۔“

”مجھے تم نے اس کے بارے میں نہیں بتایا۔“
”خیال نہیں رہا ہوگا۔ ویسے مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس
ڈائری میں کیا تھا۔ وہ باوا جانی ہی نے پڑھی تھی۔“
خیمے کے باہر کی آدمی کے کیل دار جوتوں کے نشان نظر آئے
تھے۔ اس سے باوا جانی نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ چور
گردیزی ہوگا۔ وہ زندہ ہے اور ہمارے ارد گرد منڈلا رہا
ہے۔ ایک بات باوا جانی نے بڑی اچھی کی کہ اگر وہ چور

گردیزی ہی ہے تو بہت اچھا ہوا کہ اس نے وہ ڈائری
چرائی۔ اب وہ تمام حقائق سے آگاہ ہو جائے گا۔“
”یعنی اس کی یادداشت لوٹ آئے گی؟“
”میں نے حقائق سے آگاہی کی بات کی تھی۔ باوا جانی
کو اس بات پر یقین نہیں کہ گردیزی کی یادداشت چلی گئی
ہے۔ وہ اسے گردیزی کا ڈراما قرار دیتے ہیں۔“
چنان سے اتر کر اب وہ لوگ ایک مرتفع جگہ پر آگے
بڑھ رہے تھے۔

خان داراب ان دونوں کے قریب آتے ہوئے بولا۔
”جہاں جہاں غار دکھائی دیں، ان کا خیال رکھو تا کہ اگر پھر
اسی قسم کا طوفان آئے تو ہم دوڑ کر اس غار میں پناہ لے
سکیں۔“

”میں اس کا خیال رکھے ہوئے ہوں باوا جانی!“
ارسلان نے سر ہلا کر کہا۔

اس وقت سب سے آگے آگے شیماء چل رہا تھا۔ اس
کے بعد چاغی اور اس کے رستے پکڑے ہوئے ملازمین
تھے۔ باقی ملازمین ارسلان، عالیہ اور خان داراب کے پیچھے
تھے۔

”ارے! یہ کیا؟“ اچانک خان داراب کے منہ سے
نکلا اور وہ بھگا۔

اب عالیہ اور ارسلان نے بھی دیکھا کہ وہ خون کے
قطرے نچے جو چاغی تک چلے گئے تھے۔

”کیا وہ زخمی ہو گئی ہے؟“ خان داراب کہتا ہوا تیزی
سے آگے بڑھا۔

عالیہ کو اپنی جان نکلنے محسوس ہوئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ
رستوں کو کاٹنے کی کوشش میں چاغی اپنی انگلیوں کو بھی زخمی کر
لی تھی۔ ظاہر ہے کہ اسے بلیڈ کو کچھ طور پر استعمال کرنا تو آتا
نہیں ہوگا۔ عالیہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ رستے ابھی پوری طرح
نہیں کٹے تھے کیونکہ چاغی کے دونوں ہاتھ رستوں پر پھیلے
ہوئے تھے اور وہ اپنی زخمی انگلیوں کی پردا کیے بغیر انہیں
کاٹنے میں مصروف تھی۔

خان داراب کے تیز قدموں کی آواز سن کر چاغی نے
پلٹ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر پر عجیب سے تاثرات
ابھرے۔ پھر اس نے ایک بیانیہ کھنچ کے ساتھ دونوں
رستوں کو پوری طاقت سے پھینکا دیا۔ دونوں رستے اس حد تک
کٹ چکے تھے کہ وہ اس جھگڑے سے ٹوٹ گئے اور ان رستوں کو
پکڑے ہوئے ملازمین برف پر گر پڑے۔ چاغی نے ایک
چختا ہوا سا پرست قہقہہ لگایا اور زخمی قدم بھرتی ہوئی دائیں

ہاتھ ہماکی۔

”پکڑو اسے۔“ خان داراب ہانگوں کی طرح چیخا۔
وہ سب دوڑے لیکن چاغی کو پکڑنا اب ان کے لیے
مستحکم نہیں تھا۔ وہ ان پہاڑوں کے چپے چپے سے واقف تھی۔

یہاں کے اونچے نیچے اور ٹیڑھے پیڑ سے راستے طے کرنے کا
انہیں اسے خوب آتا تھا۔ عالیہ کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو
آگے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی۔ پھر بھی وہ سب

ہماک رہے تھے کہ شاید اسے پکڑ لیں۔ دفعتاً چاغی ایک جگہ
رک گئی یا شاید اسے رکنا پڑا۔ کیونکہ آگے اب گہری کھائی تھی۔
”اسے تینوں جانب سے گھیرو۔“ خان داراب چیخا۔

چاغی نے عالیہ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دونوں
ہاتھ اوپر اٹھائے اور اپنے مخصوص بے ہنگم انداز میں مسکرائی۔
”آخ لیقہ!“ وہ چیختی اور اپنے جسم کو پیچھے کی طرف

ہٹا دیا۔
”منجھلو چاغی! تم گر جاؤ گی۔“ عالیہ چیختی۔

لیکن اس وقت تک چاغی کھائی میں گر چکی تھی۔ خان
داراب متاسفانہ انداز میں ہاتھ ملتا ہوا نظر آیا۔ وہ سب کھائی

کے قریب پہنچے۔ وہ خاصی گہری تھی لیکن اس کی سطح گہرائی کا
اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ کوئی دو ڈھائی سو فٹ نیچے نہ

جانے وہ کبہر تھی یا اسی رنگ کی کوئی گیس کہ اس کے آگے کچھ
دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بظاہر یہی سمجھا جاسکتا تھا کہ اس

کھائی میں گر کر چاغی کی ساری ہڈیاں پسلیاں پکنا چور ہو گئی
ہوں گی۔ عالیہ نے کھائی کے کنارے سے سر نکال دیا اور پھوٹ

پھوٹ کر رونے لگی۔
خان داراب نے اتنی سختی سے دانت پر دانت جمالیے

کہ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئیں۔ ارسلان اپنے
ہونٹوں پر زبان پھیر کر نہ جانے کس قسم کے جذبات پر قابو

پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شیماء کے چہرے پر کسی قسم کے
تاثرات نہیں تھے، پتھر پلا پلا سا تھا اور ملازمین ہوتے نظر

آ رہے تھے۔
☆ ☆ ☆

اچانک برف باری کے آثار نظر آنے لگے اس لیے
خان داراب کو وہیں پڑاؤ ڈالنا پڑا۔ برف باری کی پیش گوئی

شیماء نے اتنی اور جب وہ لوگ خیمے میں داخل ہوئے تو برف
باری کا آغاز ہو رہا تھا۔ خیمے میں ایسی خاموشی چھائی ہوئی تھی

جیسے وہ کسی قبرستان کے ماحول میں سووار کھڑے ہوں۔
یہ سکوت خان داراب نے توڑا۔ ”ارسلان!“
”جی باوا جانی!“ ارسلان کا لہجہ بہت دھیمہ تھا۔

”اپنا شیونگ بکس کھول۔“

ارسلان کے چہرے پر ابھرنے لگا لیکن وہ کوئی
سوال کرنے کے بجائے اپنے سامان میں سے شیونگ بکس

نکلانے لگا۔
عالیہ سر جھکائے ہوئے تھی اور اس کے دل کی دھڑکتیں
تیز ہو گئی تھیں۔

”ارے!“ اس نے ارسلان کی آواز سنی۔ ”میرا
بلیڈوں کا ایک بورا پیکٹ غائب ہے۔“

”مجھے یقین تھا کیونکہ میں اپنا شیونگ بکس چیک کر چکا
ہوں۔“

”لیکن اس کا مطلب... باوا جانی!“
”میں جانتا ہوں کہ وہ بہت طاقتور تھی لیکن اتنی بھی

نہیں کہ وہ مضبوط رستے توڑ دیتی۔ وہ انہیں اس وقت توڑ سکی
جب وہ آدمی سے زیادہ کٹ چکے تھے۔ انہیں بلیڈوں سے

کاٹا گیا تھا مگر چونکہ وہ بلیڈوں کے طریقہ استعمال سے
واقف نہیں تھی، اس لیے اپنی انگلیاں بھی زخمی کر بیٹھی۔“

”تو...“ ارسلان حیرت سے بولا۔ ”کیا اس نے میرا
پیکٹ چھپایا تھا؟“

”نہیں۔“ خان داراب نے کہا اور پھر بڑی سرد مہری
سے بولا۔ ”عالیہ نے!“

عالیہ نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھائیں۔
خان داراب کا چہرہ اس وقت بڑا عجیب سا نظر آ رہا تھا۔

جب وہ بولا تو اس کی آواز غصے کی جیسی آج میں تھی، کوئی محسوس
ہو رہی تھی۔ ”مجھے اس کی کیا سزا دی جائے بے وقوف لڑکی!“

عالیہ کے ہونٹ لرز کر رہ گئے اور وہ آبدیدہ نظر آنے
لگی۔

ارسلان نے ایک طویل سانس لے کر اس کی طرف
دیکھا۔ شیماء کی نظر بھی عالیہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔

”بہر حال۔“ خان داراب نے ٹھنڈی سانس لے کر
کہا۔ ”میری ساری محنت بیکار کی لیکن میرا یہ یقین ضرور پختہ

ہو گیا کہ برفانی انسانوں کا کوئی وجود نہیں۔“
”یہ آپ کیسے کہہ رہے ہیں باوا جانی؟“ ارسلان

بولا۔
”اس ڈائری کی وجہ سے جو چوری ہو چکی ہے۔“

”اوہ... مگر... کیا لکھا تھا اس میں؟“
خان داراب جواب دینے کے بجائے خیمے کے

پردے کا ٹھوڑا سا حصہ سر کا برف باری کی شدت کا اندازہ
کرنے لگا پھر مڑ کر بولا۔ ”برف باری کے بعد ہم کافرستان کی

طرف سز خرد و ز نرس کے۔“

”تو اب تک کس طرف کر رہے تھے؟“ ارسلان نے تعجب سے کہا۔

”کافرستان کے لوگ اپنی برفانی دیوی کو ہماری قیدی کی حیثیت سے ہرگز برداشت نہیں کرتے، اس لیے میں مخالف سمت سے نیچے اتر رہا تھا لیکن اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”اوہ!“ ارسلان چپ ہو گیا۔

خان داراب نے ایک مرتبہ گھور کر عالیہ کو دیکھا اور پھر ایک گھنٹی سا نسن لے کر سر جھکا لیا۔ وہ کچھ ایسا ہی آدمی تھا۔ بھی کبھی تو اسے بہت معمولی بات پر غصہ آجاتا اور بھی وہ بڑی سے بڑی بات درگزر کر جاتا۔ غالباً اس نے عالیہ کی غلطی بھی درگزر کر دی تھی۔

”خان بزرگ!“ شیمابولا۔

”ہوں۔“ خان داراب نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا آپ میرے دوست گردیزی کی تلاش میں میرا ساتھ نہیں دیں گے؟“

”اسے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ ہمارے قرب وجوار میں ہی کہیں موجود ہے۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ شیمانے تعجب سے کہا۔

خان داراب نے اسے ڈائری کی چوری کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اب اسے یہ بات بتانی گئی تو اس کی پیشانی پر سوچ بچار کی ٹھکنیں پڑ گئیں۔ وہ بولا۔ ”اگر یہ حقیقت ہے تو وہ ہمارے سامنے کیوں نہیں آجاتا؟“

”ایک تو اس نے میرے پاس سے ڈائری چرائی ہے، دوسرے شاید وہ ہم لوگوں کو پسند بھی نہیں کرتا۔ اس لیے جب ہم تمہاری بستی میں پہنچنے کے بعد اپنے وطن چلے جائیں گے تو وہ ہم سے آئے گا۔“

☆☆☆

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جب وہ لوگ اس... چر فضا وادی سے رخصت ہو گئے تو اس کے بعد شیمابندرہ دن تک اپنے دوست کا انتظار کرنے کے بعد باپوں ہو گیا۔ اسے خیال آیا کہ خان داراب کو گردیزی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لہذا وہ شیمابندرہ کو نال گیا تھا۔

اسی دوران میں شیمابا کا باپ ایک خطرناک بیماری سے دوچار ہو کر موت کی آغوش میں چلا گیا۔ اب اصولاً بڑے بیٹے کی حیثیت سے شیمابا کو ”باپ“ کی گدی پر بیٹھا تھا مگر اس

کے خیالات و افکار کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے اس کے چھوٹے بھائی کو اپنا ”مذہبی پیشوا“ بنایا۔ یہ گمراہ شیمابندرہ اس گدی پر بیٹھنے کا خواہش مند بھی نہیں تھا۔

پھر کچھ دن بعد وادی کے طول و عرض میں یہ بات پھیلنے لگی کہ اب پہاڑوں پر برفانی دیوی کے ساتھ ایک برفانی دیوتا بھی نظر آتا ہے اور برفانی دیوی پہلے سے زیادہ خوب صورت نظر آتی ہے۔ اس کے بال فضا میں لہرائے لگتے ہیں۔ کافرستان کے بٹیاؤں نے اندازہ لگایا کہ برفانی دیوی کی تہائی کو ختم کرنے کے لیے عظیم دیوتا سانجی گور نے وہاں ایک برفانی دیوتا بھی بھیج دیا ہے۔ شیمابا کو یہ باتیں معلوم ہوئیں تو وہ ان کی تلاش میں اکیلا ہی پہاڑوں پر جا چڑھا۔ بستی کے دوسرے نوجوان اس معاملے میں اس کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھے۔

پھر یہ خبر پتھر ال اس دن پہنچی جب ارسلان اور عالیہ کی شادی ہو چکی تھی اور شادی کے دوسرے دن ارسلان عالیہ کو لے کر اپنے وطن کی طرف روانہ ہونے والا تھا۔ اس خبر نے ان تینوں کو چونکا دیا اور تینوں کے ذہن میں یہ یک وقت ایک بات آئی۔

چائنی اس کھانی میں گر کر مری نہیں تھی۔ اس کھانی میں کودتے ہوئے اسے معلوم ہوگا کہ وہ بچ جائے گی اور پھر بعد میں اسے گردیزی مل گیا ہوگا۔ گردیزی کے پاس سیمائی کی تصویر تھی جس کے نقوش بڑی حد تک چائنی سے ملتے تھے۔ اس تصویر کی وجہ سے چائنی نے اسے اپنا دوست سمجھ لیا ہوگا اور گردیزی کو اس کا علم ڈائری سے ہو گیا ہوگا کہ چائنی اس کی بیوی سیمائی کی آخری نشانی ہے۔ عالیہ دوبارہ اس وادی میں جانے کے لیے چلی لیکن خان داراب نے اس کی خواہش چل دی۔

”نہیں۔“ اس نے سختی سے کہا۔ ”ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ان کی خوشی میں رہنے ڈالیں۔ چائنی ایک اعتبار سے گردیزی کی بیٹی ہے اور اگر اس کی خاطر گردیزی بھی اپنی باقی زندگی ان پہاڑوں پر گزارنا چاہتا ہے تو ہمیں کیا؟“

عالیہ چپ ہو گئی لیکن اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے باپ سے چھپ کے ارسلان کے ساتھ ایک بار پھر اس مقام تک جائے گی اور چائنی سے ملے گی۔ لیکن کیا چائنی اسے ملتی؟ کون جانے... لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ چند ہی گھنٹوں کی رفاقت میں عالیہ کو چائنی سے بے انتہا محبت ہو گئی تھی جسے فراموش کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔



کچھ فرصت کے لحاظ تھے اور ہم کچھ دوست تھا نے ملحقہ ایک کوارٹر میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ہمارا ”صاحب“ بھی اپنا تبادلہ رکوانے کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف تھا اور کسی فشر وغیرہ کی سفارش ڈھونڈنے میں ایک شہر سے دوسرے شہر کے چکر لگاتا پھر رہا تھا۔ کچھ روز سے کوئی واردات بھی نہیں ہوئی تھی، اس لیے کم از کم ہمارے لیے تو راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

اچانک دروازہ کھلا اور رسول بخش اندر داخل ہوا۔ وہ ایک باغ و بہار شخصیت کا مالک..... تھا اور دلچسپ بھی۔

”صفر سہا! کیا ہو رہا ہے؟“ رسول بخش نے میری طرف دیکھ کر باچیس پھیلا کے پوچھا مگر جانے کیوں عدنان نے اس کی طرف خاموشی سے گھورنے کے انداز میں دیکھا

واردات

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

جب ذہن کے حقیقہ گوشوں میں جذبہ انتقام کروٹیں لینے لگے تو انسان سے درندہ بننے میں دیر نہیں لگتی... شعبہ بازی اور جادو نگری دنیا میں نت نئے کرتب دکھانے والا مداری... خود ایک شعبہ گری کی نذر ہو گیا...

ذہانت کا جواب استعمال کرنے والے شخص کا پرانتھا المیہ



عدنان کی بات پر وہ عموماً خاموشی اختیار کر لیتا تھا مگر اس بار بڑے جوش سے ہم سب کی طرف دیکھ کر بولا۔
 ”ایک واردات تم لوگوں کی منتظر ہے۔“
 ”کیا؟“ ہم سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔
 ”کیا کوئی ڈاکہ وغیرہ پڑ گیا ہے؟“ ہمارے تیسرے ساتھی ایوب نے اس کی طرف دیکھ کے استفسار یہ کہا اور ساتھ ہی اپنی جیب سے ماچس کی ڈیڈا نکال کے رسول بخش کی طرف اچھال دی۔ اس نے بڑے آرام سے ماچس بیچ کی اور ہونٹوں میں دلی بیڑی سلگائی۔ یہ ہمارا مزید تھا، سادہ لباس میں رہتا تھا۔ تڑی مڑی بیڑی کا ایک گہرا کش لگا کہ وہ اسرار بھرے لہجے میں بولا۔
 ”اب تک تو نہیں لیکن ایک شخص کو ایسی ہی دھمکی دی گئی ہے اور اگر اس کی مخالفت نہ کی گئی تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ جلد ہی علاقے کی ایک بڑی واردات بن جائے گی۔ مگر تم لوگ تاش کھیلنے میں مگن رہتے ہو، خدا کے لیے اس غریب شخص کی مدد کرو۔“
 ”اس شخص کا نام کیا ہے؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔
 ”دل مراد نام ہے اس کا۔“
 ”دل مراد؟“ پھر سوچ بڑ بڑا ہٹ سے میں نے یہ شناسا نام دہرایا۔
 ”نہیں یہ وہی دل مراد تو نہیں... جو...؟“

”بالکل وہی ہے یہ شخص جو اس سے پہلے میری جگہ پولیس کے لیے خبری کرتا تھا اور اس کی نشاندہی پر کئی خطرناک مجرموں کو گرفتار کیا چکا ہے۔“ رسول بخش نے میری بات کاٹ کے کہا۔ عدنان اور ایوب وغیرہ اب اس کی بات میں سستی محسوس کرنے لگے تھے۔ ورنہ اس نے خبر رسول بخش کے متعلق ان کی رائے کچھ شک نہ تھی۔ یہ قول ان کے لیے کما حقہ تھا اور خود کو ”ایک پیوز“ کرنے کے لیے بے پرکریا لٹکا رہا تھا۔

بہر طور... رسول بخش نے اپنی بات یا اطلاع جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔
 ”دھمکنی دیے جانے کی یہی وجہ ہو۔ دل مراد کا کہنا ہے کہ وہ اسے قتل کر دیں گے۔ چنانچہ اس نے تحفظ کی درخواست کی ہے۔“ رسول بخش یہ ساری معلومات ہم تک پہنچانے کے بعد چلا گیا۔ ہم سوچ میں پڑ گئے۔
 دل مراد یہ ظاہر سیدھا سادہ نظر آنے والا شخص تھا، عمر چالیس سے تھوڑی تھی، غیر شادی شدہ تھا۔ اس نے ہمارے

لپے پانچ سال کام کیا تھا اور ہمارے ”صاحب“ کے کاموں پر پھول کے اٹھانے کا سبب بھی دل مراد ہی تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا، اس نے یہ نوکری چھوڑ دی کیونکہ اس نے شادی کر لی تھی۔ ممکن ہے اس کی بیوی نوکری چھڑوانے کا باعث بنی ہو جسے شوہر کا کام خطرناک لگا ہو۔
 دل مراد نے متعلق ایک دلچسپ بات ہم نہیں بھول سکتے تھے۔ جی ہاں، وہ بلا کا شعبہ باز بھی تھا۔ یہ نہ جانے اس نے کہاں سے اور کس سے سیکھا تھا۔ چند اچھے آئٹم اس نے ہمیں بھی کر کے دکھائے تھے، اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اچھا شعبہ باز تھا۔ اس نے پولیس کے لیے خبری کرنے کی نوکری چھوڑنے کے بعد اسی شعبہ گری کو ہی ذریعہ روزگار بنا لیا تھا اور میلوں ٹھیلوں میں حیران کن اور ششدر کرنے والے آئٹم کر کے روزی روٹی کماتا تھا۔ اس کی شہرت اس قدر چار دانگ پھیل گئی کہ علاقے کی ثقافتی شوز کرنے والی ایک تنظیم کی طرف سے اسے ٹاؤن ہال میں مغربی ایک بڑا میجک شو پیش کرتا تھا۔

”یار اصغر! ایک بات تو بتا۔“ شعبہ باز اور ساحر میں کیا فرق ہوتا ہے؟“ چند تانیوں کی پُرسوج خاموشی کے بعد ہمارے چوتھے ساتھی خرم نے استفسار یہ پلپ کشائی کی۔
 اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، عدنان اس کی طرف دیکھ کر پوچھ بیٹھا۔ ”کیا مطلب؟ کیا دل مراد ایک ساحر بھی ہے؟“
 ”ہاں، سن رکھا ہے میں نے۔ وہ اپنے شوز میں شعبہ گری کے ساتھ ساتھ حیر العقول آئٹم بھی پیش کرنے لگا ہے۔“
 ”شعبہ بازی اور ساحری میں کوئی فرق نہیں۔“ میں نے خرم کے سوال کا جواب دیا۔ ”ظاہر ہے اس کے آئٹم حیر العقول ہوتے ہوں گے تو وہ شعبہ باز کہلاتا ہے۔“
 ”ارے یار! میری مراد کالے جادو سے تھی۔“ خرم بڑبڑایا۔
 ”ممکن ہے اسے ٹیلی پتھی کے بارے میں کچھ جان کاری ہو۔“

”یہ تو لوگ کس فضول بحث میں الجھ گئے ہو؟“ ایوب نے جھٹکا کہا۔ ”کیا تم لوگ بھی بڑی بڑی جیسی واردات کے ہونے کا انتظار کر رہے ہو؟ ہمیں فوراً عملی قدم اٹھانا چاہیے۔“ پھر وہ میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”یار اصغر! کم از کم تم ہی اپنی ذمہ داری کو محسوس کرلو۔ صاحب اپنی جگہ تمہیں ہی بتانے کا چارج سوپ گئے ہیں۔“

”عارضی چارج!“ خرم نے منہ بتایا۔
 ”تم کیوں ملتے ہو؟ عارضی چارج کے لائق بھی تو آخر صاحب نے مجھے سمجھ کر ہی سونپا ہے نا، ورنہ تو تم بھی تھے۔ مجھ سے صرف چھ ماہ جوئیڑ اے اس آئی۔“ میں نے اسے اس کی اوقات یاد دلوائی۔
 وہ دوستانہ انداز میں مسکرا کے بولا۔ ”ارے یار! میں تو تمہیں چھیڑ رہا تھا۔“ میں نے سر جھٹک دیا۔ تھوڑی دیر بعد میں خرم کو لے کر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆
 دلشاد شاہراہ پندرہ پر واقع ہم اس کی تیز گاہ پر پہنچے۔ میں نے آج دل مراد کو پورے ایک سال بعد ہی دیکھا تھا اور بالکل حیران نہیں ہوا تھا کیونکہ اس نے اپنا جو حلیہ بنا رکھا تھا، وہ اس کے اس نئے پرفیشن کی مجبوری یا ضرورت تھی۔ اس نے چہرے پر چنگی داڑھی رکھ لی تھی جس سے اس کا دہلا چہرہ مزید کیوٹر نظر آنے لگا تھا۔ تاہم قد کا وہ دراز قامت تھا۔

اس وقت ایک نوعمر لڑکا، تھیمز کے اندرونی حصے میں اپنے کام میں مصروف تھا۔ وہی ہمیں اس کے کمرے میں لے کر گیا تھا، جو ہمیں ویسا ہی لگا تھا جیسا کہ ایک شعبہ باز کا ہونا چاہیے تھا۔
 حیرت کی بات تھی، وہ ہمارا شناسا ہونے کے باوجود بڑے سپاٹ انداز میں ملا۔

”خیریت... کیسے آئے ہو؟ میرے شو کے لیے ٹکٹ... انتظامیہ کے ذمے ہیں، اس میں میرا کوئی اختیار نہیں کہ میں رعایت...“
 ”خاموش رہو، ہم تم سے یہاں ٹکٹ کی رعایت کروانے نہیں آئے ہیں۔“ خرم نے پڑ کے کہا۔ وہ شاید اس کی بے رخی پر اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔
 ”ہمیں اطلاع ملی ہے کہ کوئی تمہیں جان سے مارنے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر نہایت متانت سے مقصد کی بات کر ڈالی۔
 ”یہ تمہارے اس نئے خبر رسول بخش کی کارستانی ہو گی۔“ وہ عجیب سے انداز میں مسکرا کے بولا۔
 ”کیا یہ درست ہے؟“ میں نے کسی بحث سے بچنے کے لیے کہا۔

”ہاں، تمہارا شکر یہ اصغر صاحب! میں یوں بھی مغرب تم سے مدد لینے کے لیے تھانے آنے والا تھا۔“ وہ اب ہمارا نمونہ نظر آنے لگا اور پھر ہمیں پیشے کو کہا۔ ہمارے

خواہش

ایک وکیل نے اپنے دوست کو اپنی زندگی کے پُر لطف واقعات سناتے ہوئے ایک مقدمے کا ذکر کیا، جس میں ایک عورت نے نان و نفقے کی پروانہ کرتے ہوئے بیچ سے کہا۔
 ”جناب عالی! مجھے اپنے شوہر سے کچھ نہیں چاہیے۔ میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ وہ مجھے اسی حالت میں چھوڑ دے جس میں اس نے مجھے پایا تھا۔“
 ”اورہ حالت کیا تھی؟“ بیچ سے پوچھا۔
 ”میں بیوہ تھی۔“ عورت نے سر جھکا کر کہا۔

(سمعیہ صرام آرائیں، گولارہی)

پیشے کے بعد اس نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور ایک کاغذ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے وہ کاغذ اس کے ہاتھ سے لیا۔

یہ ایک مختصر سا نوٹ تھا اور صرف اتنا ہی تحریر تھا۔
 ”دل مراد! تم چونکہ کافر ہو، لہذا ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔“

”فقط“ نیک اردواح۔
 ”یہ سستی شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ لوگ اسے واقعی ایک بڑا جادوگر سمجھیں اور جن جھپٹ کے سلسلے میں بھی اس کی کمائی کروائیں۔“ یہ نوٹ پڑھنے کے بعد خرم نے فوراً میرے کان میں سرگوشی کی۔ میں نے اس کے تیسرے پر کوئی خاص توجہ نہ دی اور کاغذ کا تارہہ لے لیا۔

یہ تحریر ایک عام بے کاغذ پر چھپی ہوئی تھی لہذا اس سے ہمیں کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ تاہم اس قدر بات تو سمجھ میں آئی تھی کہ اس کے کسی دشمن نے ”نیک روح“ کا ڈھونڈ رکھا تھا۔ اسے اس انداز میں دھمکانے کی کوشش کرنی چاہی تھی۔
 ”تمہیں دھمکی کب موصول ہوئی؟“ میں نے کاغذ کی طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھا۔

”آج صبح۔“ اس نے جواباً کہا اور آگے بتایا۔ ”مجھے اس سے پہلے بھی مختلف دھمکیاں مل چکی ہیں لیکن... یہ پہلا موقع ہے کہ کسی نے مجھے قتل کی دھمکی دی۔“

”تمہارے خیال میں یہ کون لکھ سکتا ہے؟“
 ”کوئی بھی۔“ اس نے شانے اچکا۔
 ”میں سمجھ گیا۔“ خرم بیچ میں بولا۔ ”گو یا تمہیں یقین نہیں ہے کہ یہ عبارت ارواح نے تحریر کی ہے؟“
 ”میں حقیقتاً ایسا نہیں سمجھتا اور اگر کوئی شخص یہ ثابت کر دے کہ کسی روح کا واقعی کوئی وجود ہے تو میں اسے انعام دینے کو تیار ہوں۔“
 ”آج رات تم کون سا تماشا کرو گے؟ کیا روجوں کو حاضر کرنے کا آسٹم پیش کرو گے؟“ میں نے دریافت کیا۔
 ”نہیں، آج میں میجک شو کروں گا۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”یہ کون ہے؟“ میں نے انگوٹھے سے اس نیو لہجی شکل والے لڑکے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا جو صندوقوں کو ادھر سے ادھر دھکے دے رہا تھا۔
 ”یہ سلیم خان ہے، میرا نائب۔ میرے ساتھ اسٹیج پر جاتا ہے۔“
 ”کتنے عرصے سے تمہارے ساتھ ہے؟“
 ”تقریباً ایک سال سے۔ اس نے میرے کئی شو دیکھے تھے اور پھر میرا امدید ہو گیا۔ مجھے بھی ایک نائب کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے اسے رکھ لیا لیکن تمہیں اس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ لڑکا بالکل شیک خاک ہے۔“
 ”تمہیں قتل کی یہ دھمکیاں کتنے عرصے سے موصول ہو رہی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
 ”جب سے میں اس میٹھے سے منسلک ہوا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے، یہ پہلا موقع ہے کہ کسی نے حد سے تجاوز کرتے ہوئے مجھے قتل کی دھمکی دی ہے حالانکہ ان کے اندر اتنی جرأت نہیں ہے، تاہم میں نے سوچا کہ اگر ایک دو دن میری حفاظت کی جائے تو بہتر ہے۔۔۔ اب تم لوگ آرام سے بیٹھو اور میرے کام میں خارج ہونے کی کوشش مت کرنا۔ میں شو کے سلسلے میں کچھ تیاریاں کروں۔“ اتنا کہہ کر وہ ایک صندوق پر بیٹھ گیا اور تاش کے پتوں کے کرب کی مشق کرنے لگا۔ خرم اور میں اس کے کرب کو بہ غور دیکھنے لگے لیکن میں نے اس جانب کوئی دھیان نہیں دیا کیونکہ میں ڈیوٹی پر تھا۔
 ”میں سمجھ گیا۔“ خرم یکا یک بولا۔ ”تم تاش کے ایک بہت بڑے ماہر ہو، میں تمہارے نئے گر کا جائزہ لے رہا تھا۔“

دل مراد نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پہلی بار اشتیاق کا رنگ جھلکا۔ ”تم شہیدہ بازی میں دلچسپی رکھتے ہو؟“
 ”محض ایک طفل مکتب ہوں۔“ خرم نے انکسار سے کہا۔ ”تاہم کبھی تمہارا تاش کا کوئی نیا کرمانے کی کوشش کرتا ہوں۔“
 ”تو پھر میرے پاس آؤ۔“ دل مراد نے اسے دعوت دی۔ ”اور دیکھو کہ یہ نیا گر کیسا ہے گا؟“
 خرم اس کے پاس جا بیٹھا۔ وہ اس میں الجھ گیا۔ حتیٰ کہ شو کا وقت ہو گیا۔ اٹھانے راہ۔۔۔ میں نے اٹھ کے سارے تھمر کا جائزہ لیا اور دل مراد کے نائب سلیم خان سے بھی تھوڑی بہت گفتگو کی۔ جگہ بالکل صاف ستھری تھی، کہیں پر بھی کسی قاتل کے چھپنے یا چھپ کے گھات لگا کر کوئی چلانے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ لڑکا سلیم خان پہلی ہی نگاہ میں مجھے ناپسند لگا تھا۔ شکل سے وہ نیلا نظر آتا تھا لیکن جب میں نے اس سے گفتگو کی تو خاصا اچھا لڑکا ثابت ہوا۔ اسے شعبدے بازی پر یقین نہیں تھا لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ اپنے باپ یا استاد کا بے حد وفادار تھا اور اسے بچانے کی خاطر اپنی جان پر بھی کھیل سکتا تھا۔
 رات کے تقریباً آٹھ بجے شو کا آغاز ہوا۔ تھمر تماش بینوں سے کھینچا ہوا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اجاقوں سے بھرا ہوا تھا اور میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ کتنے سارے اہم سو روپے کے عوض ایک شعبدے باز کے پیٹ میں سے خرگوش کے برآمد ہونے کا تماشا دیکھنے جمع ہوئے تھے۔ میں اور خرم ایک ایسی جگہ کھڑے تھے جہاں سے اس جادوگر پر ہر وقت نظر رکھی جاسکے اور کسی حادثے کے جنم لینے پر فوراً اس تک پہنچا جاسکے۔
 آج پر پینچے کے بعد وہ سب سے پہلے تاش کے پتوں کے کرب دکھانے لگا۔ وہ فضا میں ہاتھ لہراتا اور تاش کے پتوں کی ایک زنجیر، پھر پھڑائی ہوئی اس کی منہمی میں آ جاتی پھر دوسرے ہی لمحے غائب ہو جاتی۔ کچھ دیر تک وہ یہی عمل دہراتا رہا پھر سکرینٹ کے بے شمار کرب دکھائے اور پھر بلیئرڈ کی گیند کو اچھا اچھا کر غائب کرنے لگا لیکن مجھے اس کے کسی شعبدے میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لہذا میں اس جانب بے مشعل متوجہ تھا۔ پھر اس کا نائب، سلیم خان ایک طشت اور ایک گلاس لیے اسٹیج پر نمودار ہوا۔ طشت میں نقلی موتیوں کی مالا رکھی ہوئی تھی۔ دل مراد نے مالا لے کر اس کا دھاگا اور سارے موتی گلاس میں بھر دیے۔ اس کے بعد اس

دھاگے کو لپیٹ کر اپنے منہ میں رکھ لیا اور پھر گلاس کے تمام موتی بھی اپنے منہ میں بھر لیے۔ وہ ایک منٹ تک جھگلی کرنے کے انداز میں منہ چلاتا رہا جیسے موتی چھٹا چھٹا ہوا۔ پھر دھاگے کو پکڑ کر کھینچنا شروع کیا اور وہ مالا دوبارہ اپنی اصل حالت میں اس کے منہ سے برآمد ہونے لگی۔ میرے خیال میں یہ ساری شہدے بازی خاصی آسان اور ہلکی تھی جبکہ اس شعبدے کو دیکھنے کے لیے وہاں موجود میکڑوں افراد نے فی کس سو روپے ادا کیے تھے۔ یہ خاصا منافع بخش کاروبار تھا۔ اس کے بعد جان دار اشیا کا آکٹیشن بھی کیا جانے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا اسٹیج خرگوشوں اور کبوتروں سے بھر گیا۔ وہ انہیں بھی حاضر کرتا، کبھی غائب کر دیتا۔ اس کے فوراً بعد دو خوب صورت جوان لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ اس نے ان کے ساتھ بھی خرگوشوں اور کبوتروں جیسا سلوک کیا۔ اس موقع پر میں نے اپنی ٹانگی کی گرہ درست کی اور اس کے شعبدوں میں ذرا دلچسپی لینے پر مجبور ہوا۔
 میری ڈیوٹی بہر حال اتنی کوفت آمیز ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ اس دوران میں، میں نے ایک خاص بات محسوس کی۔ دل مراد بھی کبھی عجیب حیرتیں کرنے لگتا تھا۔ وہ پیٹ پکڑ کر یوں دہرا ہوا جاتا گویا اس کے پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہو۔ میں سمجھا کہ وہ غلطی سے کوئی موتی نگل گیا ہے۔
 یہ شو تقریباً ڈھائی گھنٹے تک جاری رہنے کے بعد ساڑھے دس بجے اختتام پذیر ہوا۔ پردہ مگر نے کے دوران سارا ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ لیکن دل مراد۔۔۔ ایک لفظ کے بغیر تیزی سے ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔ خرم نے میری جانب دیکھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا پھر ہم دونوں بھی تیزی سے اس کے پیچھے لپکے۔ ڈریسنگ روم میں پہنچتے ہی وہ دائرہ کر کے جانب بھاگا اور یکے بعد دیگرے چار گلاس پانی۔۔۔ پی لیا۔ پھر مڑ کر ہماری جانب دیکھا اور مخاطب ہوا۔
 ”مجھے اتنی شدت کی پیاس لگ رہی تھی کہ میرے لیے شو جا رہی رکھنا محال ہو رہا تھا۔ کوشو کیسا رہا؟“
 ”بہت ہی شاندار۔“ خرم نے تومسینی لہجے میں کہا۔
 ”میں نے اسے اچھا شواہج تک نہیں دیکھا۔“
 ”تم نے واقعی کمال کر دیا۔“ میں اس سے یہ کہنے ہی والا تھا کہ۔۔۔ چانک دل مراد اپنا پیٹ پکڑ کر دہرا ہوا گیا۔
 ”کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟“ میں نے قدرے گھبرا کے پوچھا۔
 ”پتا نہیں۔“ وہ بولا۔ ”شو کے آغاز سے ہی میں اپنے پیٹ میں تکلیف محسوس کرنے لگا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے،

پیٹ میں آگ لگی ہوئی ہے۔“
 ”ممکن ہے بدقسمتی ہو گئی ہو۔“ میں نے خیال آرائی کی۔
 ”ایک منٹ۔“ معاً خرم پرجوش لہجے میں بول پڑا۔
 ”تمہارا کہنا ہے کہ تمہارے پیٹ میں مردہ ہو رہی ہے اور آگ سی گئی ہوئی محسوس ہو رہی ہے؟“
 جواب میں دل مراد نے اثبات میں سر ہلادیا۔
 ”اور تمہیں بے حد شدید پیاس بھی لگ رہی ہے؟“
 دل مراد نے دوبارہ اثبات میں سر ہلایا۔
 ”انکسیر!“ خرم میری جانب مڑا۔ ”بہتر ہوگا کہ اسے فوراً ہی اسپتال لے جانے کا بندوبست کرو۔ فوراً۔۔۔ کسی نے اسے کھلیا کھلا دی ہے۔“
 ”اجق۔“ میں نے کہا۔ ”ہم نے شروع سے آخر تک اس پر نگاہ رکھی ہوئی ہے۔ کسی کو اسے کھلیا کھلانے کا موقع ہی کب ملا ہے؟ ہاں، یہ ممکن ہے کہ ہماری آمد سے پہلے ہی کوئی یہ حرکت کر گزرا ہو۔“
 ”مجھے آپ کے خیال سے اتفاق ہے۔“ دل مراد نے کہا۔ ”شاید اس کی وجہ بدقسمتی ہے۔“
 ”ہرگز نہیں۔“ خرم کا لہجہ اٹھل اور مستحکم تھا۔ ”یہ علامتیں سکلیا خوردانی کی ہیں، بدقسمتی میں اتنی شدید پیاس نہیں لگتی۔ بہتر ہے کہ اسے جلد از جلد اسپتال بھیج دیا جائے، ڈاکٹر زود تشخیص کر لیں گے۔“
 میں اس کا خیال رد کرنے کی سوچ رہی رہا تھا کہ مجھے اس کی سابقہ خدمات یاد آئیں۔ اس کے قیاسات پہلے بھی کئی موقعوں پر سو فیصد درست ثابت ہوئے تھے۔
 ”ممکن ہے تمہارا قیاس درست ہو۔“ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا اور فوراً ایبونیس کا بندوبست کرنے کے لیے وہاں موجود ایک خدمت گار کو اسپتال فون کرنے کا کہا پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔
 ”سوچ کر بتاؤ کہ تم نے سب سے پہلے کب اپنے پیٹ میں درد اور جلن محسوس کی تھی؟“
 ”شو کے آغاز سے تقریباً بیس منٹ بعد۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن میرا خیال ہے کہ تم رات کا پہلا بنا رہے ہو۔“
 چند ہی منٹ بعد مذکورہ خدمت گار نے بتایا کہ ایبونیس پہنچنے والی ہے۔
 دل مراد کی حالت پہلے سے ابتر ہونے لگی تھی۔ اس وقت سلیم خان کمرے میں داخل ہوا اور اپنے پاس کی علالت

باقی باتیں

دو خاتون کو بیس سال قید کی سزا ہوئی۔

جیل میں دونوں کو ایک ساتھ رکھا گیا۔ سزا پوری ہونے کے بعد دونوں کو قید سے نجات ملی تو جیل سے باہر آتے ہوئے ایک نے دوسری خاتون سے کہا۔ ”اچھا بہن... اب باقی باتیں گھر بیٹھے کے بعد فون پر ہوں گی۔“

کھسرے صفیر رشید کی شوخی

نے اسے ملائم لہجے میں مخاطب کیا۔ ”لیکن وہاں سے زیادہ یہاں تمہاری ضرورت ہے۔ ہم تمہاری مدد سے قاتل نیک پہنچانا چاہتے ہیں... خرم! ان لڑکیوں کی تفصیل معلوم کرو، میں باہر جا کر اس کا کافی ہاؤس کا پتا چلا تا ہوں۔“

”کیا میں ایک مشورہ دے سکتا ہوں؟“ خرم نے کہا۔ ”میرے خیال میں ان لڑکیوں اور کافی ہاؤس پر ایک لمحے کے لیے خاک ڈالو۔ میرے ذہن میں ایک تجویز ہے، کیا میں اس پر عمل کر سکتا ہوں؟“

میں چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ایک ذہین شخص تھا، چنانچہ میں نے اسے اجازت دے دی اس کا چہرہ خوشی سرت سے دکنے لگا۔

”سلیم!“ اس نے دل مراد کے نائب کو مخاطب کیا۔ ”مجھے آج رات پیش کیے جانے والے شو کے سارے آئٹم یاد ہیں... لیکن کیا تم انہیں میرے سامنے ترتیب وار دہرا سکتے ہو؟“

سلیم نے اپنا ماتھا سلا کر اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ”سب سے پہلے تاش کے پتوں کا کرب، پھر سرکریٹ، اس کے بعد پلیٹرز کی گیند اور پھر میوٹوں کی مالا کا کرب، پھر جاوٹی صندوقوں کا تماشا... اور پھر...“

”بس بس... یہ کافی ہے۔“ خرم نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”شکریہ۔“

پھر وہ میری جانب متوجہ ہوا۔ ”انپکٹر! میں چند لمحوں کے لیے باہر جا رہا ہوں اور تم سے محض اتنی سی گزارش ہے کہ مبروعل سے میری واپسی کا انتظار کرو۔ شاید میں اس طرح تمہاری مدد کر سکوں۔“

”اگر تم یہ بتا گئے جارہے ہو کہ دل مراد نے کس کافی ہاؤس میں کافی پی ٹی...“ میں نے کھنسا شروع کیا۔ ”تو...“

”میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”میرے ذہن میں اس کے علاوہ کچھ ہے لیکن میں اس وقت نہیں بتا سکتا۔ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا تو وہ رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

انتظار کے لمبے طویل ہونے لگے تھے اور میری پریشانی میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سلیم خان کھڑکی کے پاس غصہ کھڑا تھا۔ میں نے اپنی رست واپس پر گاہ ڈالی۔ بارہ بجتے ہیں پانچ منٹ باقی تھے جبکہ خرم ساڑھے گیارہ بجے رخصت ہوا تھا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا منیجر کے

نے کسی کو اپنے اس ارادے سے آگاہ کرنا پسند نہ کیا ہو۔“ میں نے خیال آرائی کی۔

”اوہ نہیں، وہ خود کشی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں ایسا نہیں سمجھتا... لیکن...“ وہ ایک لمحے کے لیے رک کر سوچنے لگا پھر ذرا ہنسی بکھینچتے ہوئے بولا۔ ”آج کل کاروبار کچھ نرم ہے۔“

”ہوں۔“ میں نے بنگارا بھرا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں کسی نکتے پر پہنچ رہا ہوں۔ اچھا آؤ... اب ذرا اس کے ساز و سامان کی تلاشی لی جائے۔“

”ساز و سامان کی تلاشی لینا وقت برباد کرنے کے مترادف ہوگا۔“ خرم نے کچھ سوچنے کے انداز میں کہا۔

”پھر بھی یہ ضروری ہے۔“ میں نے کہا اور ہم سامان کی تلاشی لینے لگے۔ میں نے زندگی میں آج تک اتنے سارے صندوق اور عجیب و غریب چیزیں نہیں دیکھی تھیں لیکن یہ تلاش بے سود ثابت ہوئی۔ نکلیا نہیں سے بھی برآمد نہیں ہو سکی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال رینگ گیا۔

”ارے سنو!“ میں چونک کر سلیم خان کی جانب مڑا۔ ”وہ دو لڑکیاں کہاں گئیں جنہیں اس نے تلوار سے دو ٹکڑے کر کے غائب کر دیا تھا؟“

”کیوں؟ وہ دونوں تو شوقم ہوتے ہی رخصت ہو گئی تھیں اور میرے خیال میں اپنے گھروں میں ہوں گی۔“ سلیم نے جواب دیا۔

”اوہ... ہاں! لیکن مجھے یقین ہے کہ اس واقعے سے ان دونوں کا گہرا تعلق ہے۔“ میں نے کہا اور خرم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”خرم! تم اس لڑکے سے ان دونوں لڑکیوں کے نام اور پتے معلوم کر کے ہیڈ کوارٹر فون کرو اور ان سے کہو کہ ان لڑکیوں کو فوراً جیشید گرجا تھانے میں طلب کریں۔“

”ایک منٹ، انپکٹر۔“ خرم بول اٹھا۔ وہ ایک لمحے قبل ہی کمرے سے نکل گیا تھا اور اس وقت فیئر کے کمرے کی طرف سے تیز تیز قدم اٹھاتا چلا آ رہا تھا۔ ”میں نے ابھی اسپتال فون کر کے ان سے مریش کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ اسے سفید نکھلیا دی گئی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ قریب المرگ ہے۔“

”اوہ میرے خدا!“ سلیم خان چیخ پڑا۔ ”مجھے اس وقت اس کے بستر کے قریب ہونا چاہیے، ہر حالت میں ہونا چاہیے۔“

”میں جانتا ہوں کہ حالات بہت گمبیر ہیں۔“ میں

کان کر بدحواس ہو گیا۔ وہ ڈاکٹر کو بلا نے کے لیے جانا چاہتا تھا کہ ہم نے اسے بتایا، ایوبوینس چند ہی لمحوں میں پہنچنے والی ہے۔ وہ واقعی بے حد پریشان نظر آ رہا تھا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ فضا ایوبوینس کے سائرن کی آواز سے گونجنے لگی۔ خرم نے باہر جا کر دیکھا اور واپس آ کر ایوبوینس کے پہنچنے کی اطلاع دی۔ اس کے ساتھ اسپتال کے دو اہل کار بھی تھے جنہوں نے اسٹریچر اٹھا رکھا تھا۔ دل مراد اسٹریچر پر لیٹا نہیں جاتا تھا لیکن اہل کاروں نے اسے زبردستی لٹا دیا اور روانہ ہو گئے۔ سلیم خان بھی اپنے باس کے ساتھ اسپتال جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ مجھے اس کی مدد کی ضرورت تھی کیونکہ وہ واحد شخص تھا اور میں وہ ساز و سامان چیک کرنا چاہتا تھا۔ ایوبوینس کی روانگی کے بعد ہم نے اپنا کام شروع کر دیا۔ میں اس سے پہلے بھی زبردستی کے کیس کی تفتیش کر چکا تھا۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے وائر لاکر کا معائنہ کیا۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ نکھلیا کس رقیق شے میں واضح طور پر نظر آتی ہے لیکن پانی آئینے کی طرح صاف اور شفاف تھا۔

”سنو لڑکے!“ میں نے سلیم کو مخاطب کیا۔ ”کیا ہماری آمد سے پہلے دل مراد نے باہر جا کر کسی ہوٹل میں چائے یا کوئی اور شربت پیا تھا؟“

سلیم خان نے ایک لمحہ غور کیا اور پھر بے حد حیران ہو کر بولا۔

”ہاں، میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا تھا۔ وہ آپ لوگوں کی آمد سے تقریباً بیس منٹ پہلے باہر گئے تھے اور جاتے ہوئے کہہ گئے تھے کہ چائے پینے جا رہا ہوں۔ آپ نے بالکل درست سوچا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا کہ اس کا شانہ چھپ گیا۔ لڑکا خاصا ذہین تھا اور مجھے اس سے کافی مدد ملنے کی توقع تھی۔

”وہ چائے پینے کہاں گیا تھا؟“ میں نے اس سے دریافت کیا۔

”یہ انہوں نے نہیں بتایا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ اسی اطراف میں واقع کسی ہوٹل میں گئے ہوں گے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور وہیں کسی نے اس کی چائے میں نکھلیا ملا دی ہو گی۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے ہوٹل کی نشاندہی نہ کر کے حماقت کی لیکن خیر... ہم اطراف کے سارے ہوٹلوں کو چیک کر کے یہ پتا چلانے کی کوشش کریں گے کہ اسے کس ہوٹل میں نکھلیا دی گئی ہے۔ ممکن ہے وہ خود کشی کرنا چاہتا ہو اور اس

میں تھا، ہمیں کسی اور کتے پر غور کرنا پڑے گا۔ مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ دل مراد مر گیا ہے۔
 ”ہاں، میں جانتا ہوں۔ میں نے اسپتال فون کر کے دریافت کیا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور میں یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ سلیم خان ہی قاتل ہے۔“
 ”ٹھیک ہے، ثابت کرو۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

”ہر شے، اسی کے قاتل ہونے کا اشارہ کرتی ہے۔“ وہ بولا۔ ”جب میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اسے ٹھیک کس طرح کھلائی گئی ہوگی تو فوراً ہی یہ میری نگاہوں میں منکھک ہو گیا۔ سفید ٹھیکھا فوراً ہی اثر انداز ہوئی ہے اور پیٹ میں شدید عین شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے قبل کہ یہ خون میں شامل ہو، اکثر اس جلن کی شدت سے ہی انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسے یہ زہر ہماری یہاں آمد سے قبل نہیں دیا گیا تھا۔ خود کشی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ٹھیکھا تلاشی کے باوجود یہاں سے برآمد نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ بھی نہ بھولو کہ ہماری آمد کے بعد سے، شو کے اختتام تک دل مراد نے کوئی نہ کھائی تھی اور نہ ہی کچھ پیا تھا۔ لہذا یہ ٹھیکھا کسی اور ہی ذریعے سے اس کے پیٹ میں پہنچائی گئی تھی۔ جب میں نے اس کتے پر غور کیا تو دو ایک باتیں سامنے آئیں کہ اس نے چند سگریٹ اپنے منہ میں رکھے تھے۔ دوسرے موتیوں کی وہ مالا... موتی کافی بڑے تھے اور جب میں نے مزید غور کیا تو یہ بات سامنے آئی کہ انہی موتیوں میں ایک سفید ٹھیکھا کی گولی تھی جو کہ موتیوں کو منہ میں رکھ کر گردش دینے کے دوران کچھل کر اس کے حلق سے نیچے اتر گئی۔ چونکہ یہ بے مزہ ہوتی ہے لہذا دل مراد کو احساس تک نہ ہوسکا اور یہی کتہ سلیم خان کو مجرم ثابت کرتا ہے کیونکہ موتیوں کی اس مالا تک صرف اس کی رسائی تھی۔“ وہ ایک لمبے کے لیے خاموش ہوا اور پھر دوبارہ گویا ہوا۔ ”اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے مختلف جگہوں پر فون کر کے معلومات حاصل کیں، میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ سلیم خان کا باپ راجا خان... ایک جرائم پیشہ آدمی تھا۔ ایک دو سال قبل جب دل مراد ہمارے لیے... یعنی پولیس کے لیے تجزیہ کرتا تھا تو اسی کی نشاندہی پر راجا خان کو گرفتار کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس لڑکے سلیم خان نے اس سے اپنے باپ کا انتقام لینے کی ٹھانی اور کسی طرح اس کا نائب بننے میں کامیاب ہو گیا تاکہ اس سے انتقام لینے کے لیے اور اسے اپنے ارادے میں ناکامی

نہیں ہوئی۔“
 ”لیکن اس نے اسے پہلے ہی قتل کیوں نہ کر دیا؟“ میں نے ایک کتہ اٹھایا۔ ”یہ تو ایک سال سے اس کے ساتھ تھا۔“

”در اصل یہ ہماری... یعنی پولیس کی موجودگی میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا تاکہ اس پر کسی کا شبہ نہ جاسکے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو فوراً منکھک قرار پاتا لیکن اب جبکہ پولیس اس کے سامنے موجود تھی اور انہیں بھی یقین تھا کہ یہ حرکت اس نے نہیں کی تو اندازہ کرو کہ اس نے کتنی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہی اسے دھکی آئیز تحریریں ارسال کرتا رہا تھا مگر دل مراد نے انہیں درخور اعتنا نہیں سمجھا اور کسی محافظ کی ضرورت محسوس نہیں کی... جبکہ یہ چاہتا تھا کہ کسی محافظ کی موجودگی میں یہ حرکت کرے چنانچہ اس نے اپنی دھمکی کو مزید سخت کر دیا اور اس دفعہ قتل کی دھمکی دے ڈالی تاکہ دل مراد اپنی جان کی حفاظت کے خیال سے کسی محافظ کی درخواست کرے۔ اس کے بعد اس نے حسبِ نشتا اپنے ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا اور تم دیکھ رہے ہو کہ اسے قاتل ثابت کرنا آسان کام نہیں ہوا... یہ دیکھو۔“ اس نے صندوق سے وہ مالا نکال کر دکھائی اور جب ہم نے اس کا یہ غور جائزہ لیا تو واقعی اس میں ایک موتی کم تھا۔

”تم پر لعنت ہو۔“ اچانک سلیم خان گرج اٹھا اور ہم نے اسے حیرت سے دیکھا تو اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ ریو اور دبا ہوا تھا۔ ”اگر تم نہ ہوتے تو میں اپنے ارادے میں کامیاب ہو چکا ہوتا۔ اب میں تمہیں بھی قتل کر دوں گا۔“ اس نے خرم کو لگا کرتے ہوئے کہا۔
 میں آپ کو خرم کے پھر تیلے پن سے پہلے ہی آگاہ کر چکا ہوں لیکن شاید آپ بھول گئے، وہ اب تک ہم سے بے ظاہر قطعی ہے نیاز تاش کے پتوں سے میل رہا تھا لیکن پھر اچانک ہی جیسے برقِ باریقی لہرائی۔ وہ یکبارگی اپنی جگہ سے تڑپ کر اچھلا اور اگلے ہی لمحے اس کا بھرپور مکالمہ سلیم خان کے جیزے پر پڑا۔ سلیم خان کا ریو اور اس کے ہاتھ سے جھوٹ کر وہ اثر کوڑ سے ٹکرایا اور پھر صندوق سے ٹکرا کر نہ جانے کہاں گم ہو گیا۔ سلیم خان الٹ کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے جلدی سے بڑھ کر اس کے ہاتھوں میں ٹھکڑی ڈال دی۔ گویا ہم نے دل مراد کے قتل کے عین ہی منٹ کے اندر اس کے قاتل کو گرفتار کر لیا تھا۔

مار یا بیڑہ بیٹھی دھومیں کے مرغولے اڑا رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں سگریٹ دہنی ہوئی تھی جبکہ دوسرے ہاتھ سے وہ اپنے گلے میں پڑی ہوئی ٹائی سے بے خیالی میں کھیل رہی تھی۔ ٹائی کی گرہ خاصی ڈھیل تھی۔

اتنے میں رچڑ بآٹھ روم سے باہر آگیا۔ اس نے اپنی کمر کے گرد ایک تولیہ لپیٹا ہوا تھا۔ ”کیا تم شور لوگ؟“
 ماریا نے اپنی نظروں کا رخ رچڑ کی جانب پھرتے ہوئے سگریٹ کا ایک لمبا سٹ کیا اور اپنے ہاتھ میں موجود پتلے ایڑی کے اونچے سرخ سیڑل کو اچھالتے ہوئے بولی۔ ”نہیں۔“
 رچڑ نے فرش پر گری ہوئی اپنی باکس شائز کو اٹھایا اور ماریا کی جانب پیٹھ کرتے ہوئے اسے تولیہ کے اندر سے پہننے لگا۔ ”میرے سامنے لباس پہننے سے شرم آ رہی ہے؟ لیکن پندرہ منٹ پہلے تو تمہیں کوئی شرم نہیں آ رہی تھی؟“
 کمرے کی فضا میں تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ رچڑ کا منہ بن گیا۔ ”تم ناراض لگ رہی ہو؟“
 ماریا نے سائڈ ٹیبل پر موجود کافی کے کپ میں سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”میں بھلا ناراض کیوں ہوں؟ اس لیے تم نے موٹیل کے اس کمرے کا انتخاب کیا ہے؟

ماریا نے سگریٹ کا آخری کش کھینچا اور پھر اسے کپ میں گرا دیا۔ کافی میں گرتے ہی سگریٹ کے انگارے نے سکاری سی لی اور بجھ گیا۔ ”تو پھر یہ بات کب کروں؟“
 رچڑ نے دونوں کہنیاں اپنی رانوں پر ٹکا دیں اور معافی کے انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ”ماریا...!“
 ”میرا نام مت لو۔“ ماریا نے بند پر مٹی تاتے ہوئے اپنا

مختصر پیرائے میں ایک سلیکی بیڑکی کا قاتل فراموش کھتا

دوسری عورت

سليم اور

اس لیے کہ اب تم روانہ ہو جاؤ گے؟ اس لیے آج کی رات تم میرے پاس ہونے کے بجائے اس کے پاس ہو گے؟“
 ”دیکھو... جیسے تمہارے وجود سے بھوٹ رہا ہے۔“ رچڑ نے پتلون پہنتے ہوئے کہا پھر بیڈ کے کنارے پڑی ہوئی اپنی قمیض اٹھا کر پینٹی اور اس کے ٹخن بند کرنے لگا۔

”تم اسے کب چھوڑ رہے ہو، رچڑ؟“ ماریا نے کپنی کے سہارے بیڈ پر لیٹتے ہوئے کہا اور چھت کی جانب دھومیں کا ایک مرغولہ چھوڑ دیا۔

جب رچڑ بیڈ پر بیٹھا تو میزس کے اسپرنگ چرچا اٹھے۔ اس نے باری باری اپنے مونہ سے پنے اور جوں کی تلاش میں بیڈ کے نیچے نظریں دوڑانے لگا۔ ”ابھی یہ بات مت کرو۔“ اس نے ماریا سے کہا۔

ماریا نے سگریٹ کا آخری کش کھینچا اور پھر اسے کپ میں گرا دیا۔ کافی میں گرتے ہی سگریٹ کے انگارے نے سکاری سی لی اور بجھ گیا۔ ”تو پھر یہ بات کب کروں؟“
 رچڑ نے دونوں کہنیاں اپنی رانوں پر ٹکا دیں اور معافی کے انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ”ماریا...!“
 ”میرا نام مت لو۔“ ماریا نے بند پر مٹی تاتے ہوئے اپنا

حسد اور انتقام کی کوئی حد نہیں... اس فتنہ کر کا قصہ جسے اپنے سوا کسی دوسرے کا وجود گوارا نہیں تھا...



Courtesy www.pdfbooksfree.pk



انصاف

تویر ریاض

ایک مقولہ ہے کہ انصاف میں تاخیر انصاف سے انکار... یقیناً انصاف کے تقاضے پورے نہ ہوں تو عدم حفظ کا احساس پروان چڑھتا ہے... جو بڑھتے بڑھتے انسان کو قانون کی حد بندیوں سے ماورا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے... عدل و انصاف کا پادارہ جانے والا ایک کڑا امتحان۔

مغرب سے برآمد تازہ شاہکار جس میں مشرقی معاشرے کی جھلک نمایاں ہے

کے مل اندوھا لٹ گیا۔ یہاں سے وہ سینٹ مارٹین کے قبرستان کا اچھی طرح جائزہ لے سکتا تھا۔ گوکہ ابھی متبر کا مہینا شروع ہوا تھا لیکن خشکی محسوس ہو رہی تھی۔ اس باغزاں کا موسم جلد آگیا تھا اور درختوں سے گرنے والے پتے اس کے جسم کو ڈھانپ رہے تھے۔ اس نے جان بوجھ کر ان پتوں کو ہٹانے

وہ گزشتہ چار گھنٹے سے اس پہاڑی پر موجود تھا جہاں نئے قبرستان کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ ہزاروں گز پر پہلے ہوئے اس قبرستان میں دور دور تک قبروں کے کتبے اٹھائی دے رہے تھے۔ اس نے اپنے لیے کئی جھاڑیوں کے درمیان ایک جگہ منتخب کی اور تڑپاں پھیلا کر اس پر پیٹ

ماریا نے خود کو رچڑ کی گرفت سے آزاد کر لیا اور قدرے سچ لہجے میں بولی۔ ”پہلے اپنی ترجیحات درست کر لو پھر ملنے کی بات کرنا۔“

☆☆☆

جب ماریا مکان کے نزدیک پہنچی خوب اندر اچھیل چکا تھا۔ اس نے نوک پر دوٹوں طرف نگاہ ڈالی۔ دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔

ماریا نے مکان کے دروازے پر دستک دی۔

اندر سے کسی عورت کی آواز آئی۔ ”کون؟“ ساتھ ہی دروازہ ہلکا سا کھل گیا۔

”ہیلو! میں ماریا ہوں اور آفس میں رچڑ کے ساتھ کام کرتی ہوں۔ کیا وہ گھر پر موجود ہے؟“

عورت نے دروازہ پورا کھول دیا۔ ”اوہ... لیکن اس نے تو کسی مہمان کی آمد کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔“

”اسے میری آمد متوقع نہیں تھی۔ میں اس کے لیے ایک پروجیکٹ مکمل کر رہی ہوں... میں نے سوچا کہ راستے میں اسے دکھائی چلوں۔“

”تو پھر اندر آ جاؤ اور چائے کا ایک کپ پی لو، جب تک وہ بھی آ جائے گا۔ اگر تمہیں دیر نہ ہو رہی ہو اور انتظار کی زحمت گوارا کر سکتی ہو؟“ یہ کہہ کر وہ پلٹی اور اندر چلی گئی۔

”ٹھیک ہے۔“ ماریا نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی دروازہ بھی بند کر دیا۔

”میں درحقیقت تم سے ملنے کے لیے آئی ہوں۔“ ماریا نے اس عورت کے عقب میں پہنچ کر کہا۔ اس دوران میں وہ اپنے پرس میں سے ٹائی نکال چکی تھی۔

”مجھے؟“ عورت نے حیرانی سے کہا۔

”ہاں۔“ ماریا نے بجلی کی سی سرعت سے ٹائی کا پھندا عورت کے گلے میں ڈال دیا اور پوری طاقت سے اس کی گہرے

کھینچتے ہوئے عورت کو بے بس کر دیا۔ اور اس وقت تک گرفت ڈھکی نہیں کی جب تک عورت ہاتھ پیر مارنے کے بعد بے جان نہیں ہو گئی۔

ماریا نے ٹکلی کرنے کے بعد اس کی گردن میں پڑی ہوئی ٹائی کی گہرے ڈھکی کی اور ٹائی نکال کر واپس اپنے پرس میں رکھ لی۔

پھر جس خاموشی سے وہ گھر میں داخل ہوئی کبھی اسی خاموشی سے نکل کر اپنی راہ چل دی۔

اسے پورا یقین تھا کہ رچڑ کی ماں کو ہلاک کر کے اس نے رچڑ کے سارے مسائل حل کر دیے تھے۔

رچڑ نے اس کے ہاتھ سے اپنے رچڑ دیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے گلے میں پڑی ہوئی ٹائی اتاری اور اسے اپنے پرس میں رکھتے ہوئے بولی۔ ”اب مجھ سے مزید یہ نہیں ہو گا۔“ اس نے یہ کہہ کر بیڈ سے نیچے چھلانگ لگائی اور ایک جھٹکے سے اپنا سرخ ساٹن کا لباس اٹھا کر پہن لیا اور خود ہی اپنے ہاتھوں سے لباس کی عقی زپ بند کر دی۔

”میں تم سے محبت کرتا ہوں لیکن میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔“ رچڑ نے اپنا کونٹ اٹھایا اور اپنے بازو باری باری اس کی آستینوں میں ڈالنے لگے۔ ”تم جتنی کیوں نہیں ہو؟“

ماریا نے غراتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو تمہیں اسے چھوڑنا ہو گا۔“

رچڑ نے ایک طویل آہ بھری اور بے بسی کے عالم میں بولا۔ ”مکان اس کے نام ہے، کاروبار اس کے نام ہے، سب ہی کچھ اس کے نام ہے... اگر میں نے اسے چھوڑ دیا تو ان سب سے محروم ہو جاؤں گا۔ تمہیں یہ بات بخوبی معلوم ہے۔“

ماریا نے اپنا پرس اٹھا لیا۔ ”اگر یہ سب چیزیں اتنی ہی اہم ہیں تو پھر انہیں اپنی تحویل میں لینے کا کوئی راستہ ڈھونڈو اور اس عورت سے چھکارا حاصل کر لو۔“

رچڑ نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ باہر کی سرطوب فضا میں تاریکی پھیل چکی تھی اور پارکنگ لائٹ میں نیون ساٹن جگمگ کر رہے تھے۔ ”یہ اتنا آسان نہیں ہے۔“

”یہ بہت آسان ہے۔ رچڑ... بہت آسان ہے۔“

لاکھوں طریقے ہیں جن سے چھکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔ حادثات تو ہر وقت ہی ہوتے رہتے ہیں۔“ ماریا نے اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

رچڑ اسے گھورتا رہ گیا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں یہ نہیں کر سکتا۔ وہ میری...“

ماریا تیزی سے گھوم گئی۔ ”وہ تمہاری ترجیح ہے؟“

رچڑ نے تیزی سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور سمجھانے کے انداز میں بولا۔ ”نہیں، نہیں۔ وہ میری ترجیح نہیں ہے۔ میں اس معاملے میں کچھ نہ کچھ سوچوں گا۔“

یہ کہتے ہی اس نے اپنا چہرہ ماریا کے چہرے پر جھکا دیا تو اس نے بل کھاتے ہوئے اپنا چہرہ دوسری طرف گھم لیا۔

رچڑ نے شکست خوردہ انداز میں ایک آہ بھری اور بولا۔ ”اب تم سے اگلے ہفتے ملاقات ہوگی۔“

”اعت ہے ایسے مہمان پر۔“ اسٹیفنی نے جمل کر کہا۔
”اے یہ پریشانی نہیں ہوگی کہ اس پر فرد جرم عائد ہونے
والا ہے؟“
”نوی جیسے لوگ ان باتوں پر پریشان نہیں ہوتے۔“
”سین نے کہا۔“ یہ لوگ روز جیتے اور روز مرتے ہیں۔ ان
کی زندگی جنگل کی اس مخلوق کی طرح ہے جو اپنی ہٹا کے لیے
دوسرے کو دھڑکتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے دو
آخرین وکیلوں کو بھی بندوبست کر لیا ہے جو اسے بری کرانے
کی کوشش کر رہے ہیں۔“

اسٹیفنی نے بے اختیار وکلاء صفائی کی جانب دیکھا۔
ان میں ایک مرد اور ایک عورت تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی
تھے اور ان کا تعلق مائیکسٹری ایک مشہور قانونی فرم سے تھا۔
اسٹیفنی نے بولی۔ ”یہ بات بھی مجھے پریشان کر رہی ہے۔
لاہمارے خیال میں ایک عورت، شوہر یا باپ کو اس طرح
کے مقدمے میں صفائی کا وکیل بننا چاہیے؟“

سارجنٹ نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”اچھے وکیل
کی پہچان ہی یہی ہے کہ وہ اپنے موکل کا کامیابی سے دفاع
کرے، اسے جرم کی نوعیت سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ ظاہر
ہے کہ ہر وکیل کسی نہ کسی رشتے میں بندھا ہوتا ہے۔ اگر وہ
اں، باپ، بیوی اور شوہر بن کر سوچنے لگے تو بھوکا مر جائے
گا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا جرم قابل نفرت ہے، وہ
اپنے جرموں کی بیروی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔“

نوی کے جرائم کا تصور کرتے ہی اسٹیفنی کو جھرجھری
اگلی اور وہ کانپنے ہوئے بولی۔ ”واقعی یہ شخص قابل نفرت
ہے۔ اس نے اس قبرستان میں ایک درجن سے زیادہ عورتوں
پر ہلکی چلے کیے۔ یہ جینی اور جیسا جوش کی پوپیس کو بھی
مطلب ہے کیونکہ اس پر دو افراد کے قتل کا الزام بھی ہے۔
پھر اس نے اپنے لیے شخص کو مقدمہ چلائے بغیر ہی سرعام گولی
داروں۔ اتنا کچھ بڑا پھیلانے کی کیا ضرورت ہے۔“

”واقعی یہ شخص قابل نفرت ہے۔“ سارجنٹ اس سے
ملاتی کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں
لے سکتے۔ اسے سزا دینا عدالت کا کام ہے۔“
اسٹیفنی نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ ”اس شخص
کو اپنے لیے پرکھنی چھتاوائیں ہے۔ دیکھو، کسی ڈھٹائی سے
کھڑا ہے۔“

نوی دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اپنے وکیلوں سے
مکمل کر رہا تھا جبکہ جیوری کے ارکان اس سے تیس گز کے
باہر پر کھڑے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر استغاثہ کے

ہوئے لیے لمبے ڈگ بھر رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کے سوٹ
پہن رکھا تھا اور سفید ٹیبل پر نیلے رنگ کی ٹائی باندھ رکھی تھی۔
جوتے پالش کیے ہوئے تھے جبکہ اس کے ہاتھ پاؤں آزاد
تھے اور وہ کسی طرح بھی قیدی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ تازہ ہوا
میں سانس لیتے ہوئے خوش محسوس کر رہا تھا۔
خوشی تو نشانے باز کو بھی ہو رہی تھی۔ انتظار کی گھڑیاں ختم
ہو چکی تھیں اور شکار اس کی زد میں آ گیا تھا۔ اس نے دور بین
سے دیکھا اور اپنے شکار کے ہاتھ کو نشانے پر لے لیا۔

☆☆☆

پولیس وین کے پاس کھڑی ہوئی آفیسر اسٹیفنی نے
قریب کھڑی ہوئی وین کا دروازہ کھلتے دیکھا اور اس میں سے
جیوری کے اراکین باہر آنے لگے۔ ان میں بارہ باقاعدہ رکن
تھے جبکہ دو اراکین کو متبادل کے طور پر شامل کیا گیا تھا۔ وہ
سب ایک گروپ کی شکل میں جمع ہو گئے تھے۔ اس گروپ
میں ایک جج، دو وکیل صفائی اور دو استغاثہ کے وکیل پہلے سے
شامل تھے۔ اسٹیفنی کے برابر میں ہی والٹ پریشن کھڑا ہوا
تھا جو عمدے کے لحاظ سے سارجنٹ اور اس کا ٹریٹنگ آفیسر
تھا، دوسرے پولیس والے اور شریف کے معاونین بھی ادھر
ادھر بکھیرے تھے۔

پریشن نے اس کی جانب دیکھا اور بولا۔ ”کیا بات
ہے، تم کچھ خوش نظر نہیں آ رہی ہو؟“

”ہاں، میں بالکل بھی مطمئن نہیں ہوں۔“
”اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟“
”جج، جیوری کے اراکین اور وکیل سب ایک جگہ جمع
تھے اور عزم و دو معاونین کے ہمراہ مسکراتا ہوا چلا آ رہا تھا جبکہ
شیرف کے دونوں معاونین کے چہروں پر تناؤ تھا اور یوں لگتا
تھا جیسے وہ ایک ناخوشگوار فریضہ سر انجام دے رہے ہیں۔“

اسٹیفنی بولی۔ ”قرنوی کو یہاں اس لیے لے کر آئے
ہو کہ وہ جائے واردات کی نشان دہی کرے جہاں وہ ممکن
نوعیت کے جرائم کا ارتکاب کرتا رہا ہے۔ لیکن اس کی
مسکراہٹ دیکھ کر لگتا ہے کہ جیسے اسے دنیا میں کسی کی پروا نہیں
ہے۔“

”کسی حد تک تمہاری بات صحیح ہے۔“ سارجنٹ نے
جواب دیا۔ ”اسے اس بات کی فکر نہیں ہے کہ وہ رات کہاں
گزارے گا، کہاں کہاں سے کھائے گا اور اگر بیمار پڑ گیا تو
ڈاکٹر کے پاس کیسے جائے گا سرکاری مہمان ہونے کے یہی
تو فائدہ ہے ہیں کہ آدی ان تمام فکروں سے آزاد ہو جاتا
ہے۔“

کی کوشش نہیں کی تاکہ وہ اپنے آپ کو چھپا سکے۔ دائیں
جانب اس کی رائفل رکھی ہوئی تھی جس پر ایک طاقتور دوربین
نصب تھی جبکہ بائیں جانب ربر کی بول میں پانی رکھا ہوا تھا۔
اس کے ساتھ ربر کا ایک پائپ منسلک تھا جس کا دوسرا سر اس
کے بائیں کندھے سے بندھا ہوا تھا۔ جب بھی اسے نیاس
محسوس ہوتی تو وہ سر کو تھوڑا سا کھٹا کر اس پائپ کے ذریعے
پانی پینے لگتا۔ اس نے گوریلا سپاہیوں جیسا لباس پہن رکھا تھا
جو برسوں پہلے اسکاٹ لینڈ کے... لوگوں نے ایجاد کیا تھا۔
اس پر جھڑپاں، پتے، گھاس اور شاخیں بنی ہوئی تھیں جسے
عام زبان میں کیو بلاج کہتے ہیں۔ اسے یقین تھا کہ ان
جھاڑیوں کو کاٹنے کے بعد ہی کوئی شخص اس تک پہنچ سکتا ہے۔
اسے دائیں جانب کچھ پچھل محسوس ہوتی تو وہ چونکنا ہو
گیا۔ دائیں جانب سے گاڑیوں کا ایک قافلہ قبرستان کی جانب
آ رہا تھا۔ تمام گاڑیاں بالکل اس کے سامنے آ کر رک گئیں۔
وہ انہیں اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ ان میں ایک مقامی پولیس کی
گاڑی بھی جبکہ دوسری کا تعلق کاؤنٹی کے شریف ڈپارٹمنٹ سے
تھا۔ اس کے پیچھے گہرے نیلے رنگ کی دو عدد وین اور ایک
پیلے رنگ کی وین بھی جبکہ سب سے آخر میں ہلکے براؤن رنگ
کی وین آئی جس کا تعلق بھی شریف کے محکمے سے تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنی رائفل اٹھالی۔
گاڑیوں کے دروازے کھلنا شروع ہوئے اور ان میں سے کئی
پولیس والے اور شیرف کے معاونین باہر آنے لگے جبکہ بڑی
وین سے چودہ مرد اور عورتیں برآمد ہوئیں۔ ان میں سے کچھ
نے سوٹ اور بقیہ لوگوں نے جینز اور قمیضیں پہن رکھی تھیں۔
نیلے رنگ کی وین سے ایک بوڑھا شخص باہر آیا جبکہ دوسری
گاڑی سے دوسرا دو عدد وین اترتی ہوئی دکھائی دیں۔ البتہ
سب سے پیچھے والی وین کے دروازے ابھی تک نہیں کھلے
تھے اور وہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

پولیس والے اور دیگر تمام افراد ایک جانب چل دیے
اور ایک بڑے کتبے کے پاس رک گئے جو صنوبر کے درختوں
سے گھرا ہوا تھا۔ ان کے انداز سے ظاہر ہوا تھا کہ وہ کسی کا
انتظار کر رہے ہیں۔ بالآخر آخری گاڑی کے دروازے بھی
کھل گئے اور ان میں سے شیرف کے دو معاونین باہر آئے
اور انہوں نے گاڑی کا عقبی دروازہ بھی کھول دیا۔ وہ اس
طرح کھڑے ہوئے تھے کہ کتبے کے پاس کھڑے ہوئے
لوگوں کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ دونوں معاونین اپنے ہاتھوں
اور بازوؤں سے کچھ اشارے کر رہے تھے پھر انہوں نے بھی
چلتا شروع کر دیا۔ ان کے درمیان ایک شخص منہ بناتے

- 1- جدید ترین تحقیق سے پتا چلا ہے کہ بیوی
اے پیار ہماری باتیں کرنے سے مندرجہ ذیل
فائدے ہوتے ہیں:
- 1- ذہنی اور اعصابی تناؤ دور ہو جاتا ہے۔
- 2- دل کا دورہ پڑنے کے خطرات 80
فیصد کم ہو جاتے ہیں۔
- 3- زندگی پر لطف ہو جاتا ہے۔
- 4- انسان سارا دن خوشگوار محسوس کرتا رہتا
ہے۔
- 5- بلڈ پریشر کے مریضوں کو 60 فیصد
افاقہ ہوتا ہے۔
- 6- مزاج کے خرو تازہ رہنے سے غصے میں
پھرنے کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔
- 7- جسم میں خون کی پیداوار 10 فیصد
بڑھ جاتی ہے۔
- 8- بریکے کا حوصلہ مندی کے ساتھ سامنا
کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔
- 9- بس ایک لمحے کا خیال رکھنے کی ضرورت
ہے کہ بیوی اپنا نہ ہو۔
(امریکا سے محمود اعجاز کی تحقیق)

دونوں وکیل بیزارے نظر آ رہے تھے جیسے اس مناشے سے
ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اسٹیفنی نے ایک بار پھر نوی کی جانب
دیکھا اور منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ
اسے آزاد کیوں چھوڑ دیا گیا ہے؟ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی
ہے اور نہ ہی بیروں میں بیڑیاں۔“

پریشن نے کہا۔ ”اس کے وکیلوں نے اعتراض کیا
تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ابھی صرف اس پر الزام عائد کیا گیا ہے
اور اس کے ثبوت ہونے تک، وہ معصوم ہی کہلائے گا۔ اسی
لیے وین سے اترتے وقت شیرف کے آدمیوں نے اسے گھیر
لیا تھا تاکہ وہ جیوری کے اراکین کو نظر نہ آ سکے اور اس دوران
میں انہوں نے اس کی ہتھکڑیاں کھول دیں۔ اگر وہ ایسا نہ
کرتے تو جیوری کے ارکان پر اچھا تاثر قائم نہ ہوتا۔“

”میں تمہارے جواب سے مطمئن نہیں ہوں۔“
اسٹیفنی نے کہا۔
”تمہیں اتنی پریشانی کیوں ہو رہی ہے؟“
”وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔“
اسٹیفنی نے کہا۔ ”فرض کرو وہ دو ڈگ لگا دے، کار چا کر بھاگ

جائے یا کسی مصنوعی ہتھیار کے ذریعے چوری کے رکن یا بچ کو
یرغمال بنالے تو اس صورت میں ہم کیا کر سکیں گے؟“
پریسٹن نے کچھ نہیں کہا۔ اسٹیفنی سمجھی کہ شاید وہ کچھ
زیادہ ہی بول گئی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے پریسٹن اس کی
جانب جھکا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ”پریشان ہونے کی
ضرورت نہیں۔ اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔“

☆☆☆

نشانے باز نے تمام تار یوں کا جائزہ لیا۔ اب اس کی
پوری توجہ اپنے ہدف پر تھی۔ وہ اپنے گرد و پیش..... کی دنیا
سے بالکل ہوا گیا تھا۔ وہ پوری طرح اپنے ہدف پر نظریں
جمائے ہوئے تھا۔ اس کی سانس آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔
دل کی دھڑکن بھی معمول پر آچکی تھی اور وہ اپنے آپ کو
قدرے چر سکون محسوس کر رہا تھا۔ اب اسے اپنا کام نمٹانے
کے لیے مناسب موقع کا انتظار تھا۔ اس نے اپنی رائفل لوڈ کر
رکھی تھی اور اسٹیفنی بھی پناہ دیا تھا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی اور
اسے محسوس دبانے کی دیر تھی۔ اس کا نشانہ بہت ہی تھا اور اس
سے پہلے وہ اس رائفل سے ہزاروں راؤنڈ فائر کر چکا تھا۔
انگلی دبانے ہی ایک دھماکا ہوتا اور اس کے شکاری موت واقع
ہو جاتی جو اس وقت بے فکری سے کھڑا قہقہہ لگا رہا تھا اور اس
کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ موت اس کے لئے قریب
پہنچ چکی ہے۔

عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ موت کا ایک وقت معین
ہے اور خدا کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں مل سکتا۔ اس
کرائے کے قاتل کو اس فلسفے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ تو ان
زمینی خداؤں کے احکامات پر عمل کرنے کا پابند تھا جو اپنے
طور پر فیصلے کرتے اور لوگوں کے لیے سزائیں تجویز کرتے
تھے۔ اسے فخر تھا کہ مشکل ترین ہدف کے لیے اسی کا انتخاب
کیا جاتا ہے کیونکہ اسے اس کام کا مقول معاوضہ ملتا تھا۔ اس
لیے وہ ان فیصلوں کو درست سمجھتے پر مجبور تھا ورنہ اس کی رائفل
ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الماری میں بند ہو جاتی اور وہ دریا کے
کنارے مچھلیاں پکڑ کر اپنی گزراوقات کر رہا ہوتا۔ اس نے
ایک گہری سانس لے کر اپنے شکار پر نظر ڈالی۔ شاید فیصلے پر
عمل کرنے کا وقت آگیا تھا۔

☆☆☆

اسٹیفنی نے غور سے سارجنٹ کی طرف دیکھا اور
حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہارا مطلب نہیں
سمجھتی۔۔۔۔ نگرانی ہو رہی ہے مگر کیسے؟“
پریسٹن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تمہیں

اندیشہ ہے کہ ٹیوی وڈر لگا دے گا، کار چینج کر فرما ہوا ہے
یا کسی کو یرغمال بنالے گا۔ یہ سب باتیں پہلے سے ہمارے
ذہن میں تھیں۔ جب اس کے وکیلوں نے اعتراض کیا تھا کہ
جب اسے جائے واردات پر چوری کے اراکین کے ہمراہ
لایا جائے تو اس کے ہاتھ میں ہتھیار نہیں ہونی چاہیے۔ لہذا
پولیس چیف اور انٹارنی جنرل کے دفتر نے ایک منصوبہ بنایا
اگر تم اس کے بارے میں جاننا چاہتی ہو تو تمہیں بہت عرصہ
رہنا ہوگا۔ تمہاری زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی ہمارے
مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔“

اچانک ہی اسٹیفنی کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا
اسے وہ دن یاد آگیا جب وہ کالج کے زمانے میں
اخراجات پورے کرنے کے لیے دو جگہ ملازمت کرتی تھی اور
اس کے لیے اس نے دن کا چینج اور رات کی فینڈ قبان کر دیا
تھی لیکن ایک بھیانک رات اس کی زندگی میں ایسا طوفان آ
جواں اس کا سب کچھ بھا کر لے گیا اور یوں لگا کہ وہ اپنی منزل
تک نہیں پہنچ پائے گی۔ لیکن اس نے اس حادثے کو زندگی
روگ نہیں بنایا اور پہلے سے زیادہ محنت کر کے اس مقام تک
پہنچ گئی۔

اس نے سر کو جھکا اور اعتماد سے بولی۔ ”ہاں، میں جانتی
رہوں گی۔“

☆☆☆

نشانے باز نے اپنا سر بائیں جانب گھمایا اور پانی کی
نگلی اپنے منہ سے لگا کر ایک لمبا ٹھونٹ لیا۔ اسے محسوس ہوا کہ
اس کے منہ میں جانے والا لنگھ کا سرا کچھ ڈھیلہ ہے۔ فی الوقت
وہ اپنی توجہ کی اور جانب نہیں کر سکتا تھا لہذا اس نے سوچا کہ
وہ بعد میں اسے ٹھیک کر لے گا۔ ایک اچھا نشانے باز ہمیشہ
اپنے ساز و سامان کی درستگی کا خیال رکھتا ہے لیکن اس کی زیادہ
توجہ اپنی رائفل اور کارٹوسول پر ہوتی ہے۔ بقیہ چیزیں
لباس یا پانی کی بوتل وغیرہ اہم ہیں اور ان میں الجھ کر وہ کو
خطرے کو دعوت نہیں دے سکتا۔

☆☆☆

پریسٹن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔
اپنی آنکھیں کھلی رکھو لیکن ادھر ادھر دیکھنے سے گریز کرو کہ اگر
قبرستان میں ایک اور پولیس آفیسر کارل ڈکسن بھی موجود
جس کا تعلق انجمن گروپ سے ہے۔ تم اسے جانتی ہو۔“
”ہاں لیکن وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟“ اسٹیفنی نے تجسس
کے عالم میں چاروں طرف اپنی نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔
”میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ اگر ادھر ادھر مت دیکھو۔“

یہیں کہیں موجود ہوگا لیکن ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ وہ
کہاں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ قبرستان سے باہر کسی اونچی جگہ پر
اپنی رائفل اور دوربین سمیت موجود ہو۔ میں شرطیہ کہہ سکتا
ہوں کہ ٹیوی اس کے نشانے کی زد پر ہوگا اور اگر اس نے کوئی
ایسی ویسی حرکت کی تو کارل گولی چلانے سے بھی دریغ نہیں
کرے گا۔“

”کہیں تم مذاق تو نہیں کر رہے؟“ اسٹیفنی کو اب بھی
یقین نہیں آتا تھا۔

”بالکل نہیں۔ یہ مذاق کرنے کا وقت نہیں ہے۔ کارل
کو یہ ذمے داری سونپی گئی ہے کہ ٹیوی اگر بھاگنے کی کوشش
کرے، کسی کو یرغمال بنائے یا کوئی کار چینج کر فرما رہے ہو
لگے تو کارل فوراً ہی اس کا خاتمہ کر دے۔“

اسٹیفنی کو یہ جان کر قدرے سکون محسوس ہوا۔ وہ
مسکراتے ہوئے بولی۔ ”یہ تو بہت زبردست منصوبہ ہے۔“
”اسی سے تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ پولیس اس معاملے
میں غفلت نہیں برت سکتی۔“

”کیا اس کے وکیلوں کو یہ بات معلوم ہے؟“
”تم بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔“ پریسٹن نے منہ
بناتے ہوئے کہا۔ ”ہم اپنے پتے بھی ظاہر نہیں کرتے۔ انہیں
ڈھکے چھپے لفظوں میں یہ پیغام دے دیا گیا ہے کہ اگر ٹیوی نے
کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو پولیس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو سکتا
ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ٹیوی تک یہ پیغام پہنچ گیا ہوگا۔“

اسٹیفنی نے ایک بار پھر ٹیوی کی طرف دیکھا جو شریف
کے معاونین کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا جبکہ چوری کے
ارکان قبروں کے گرد جمع تھے اور مختلف لوگوں کے بیانات
سن رہے تھے۔

”لغت ہو اس شخص پر۔“ اسٹیفنی نے کراہت سے
کہا۔ ”یہ تو بہت بُرا ہوا۔“
”کیا بُرا ہوا؟“ پریسٹن نے حیران ہوتے ہوئے
پوچھا۔ ”تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“

”یہ بہت بُرا ہوا کہ ٹیوی کو دارنگ لگ گئی۔ بہتر ہوتا کہ
وہ بھاگنے کی کوشش کرتا اور اس طرح کارل کو اسے نشانہ
بنانے کا جواز مل جاتا۔“

”ایک نو جوان لڑکی کے منہ سے ایسے سخت الفاظ سن کر
مجھے حیرت ہو رہی ہے۔“ پریسٹن نے خوش مزاجی سے کہا۔
اسٹیفنی جھپٹتے ہوئے بولی۔ ”اب میں ایک نو جوان
لڑکی نہیں بلکہ پولیس آفیسر ہوں اور ان عورتوں کے بارے
میں سوچ رہی ہوں جو اس شخص کی زندگی کا نشانہ بنیں۔۔۔۔۔

اور یہ کہ وہ اس کے خلاف گواہی دے گا کیا کہیں گی۔ یہی کہ وہ
سڑک پر جاری نہیں، جاگتا کر رہی نہیں یا اپنے کسی کام میں
مصروف نہیں کہ یہ شخص انہیں درغلز کر یا زبردستی قبرستان میں
لے گیا۔ وہ نہیں جانتی کہ اس حادثے کے بعد انہیں زندہ
رہنا چاہیے یا موت کو گلے لگائیں۔ انہیں صرف یہ معلوم تھا کہ
وہ جیتے جی مر چکی ہیں اور اب انہیں ایک بار پھر زندگی کی
طرف واپس آنا ہوگا۔ اس شخص کو دیکھ کر ان کے ذہن دوبارہ
ہرے ہو جائیں گے اور اب انہیں بحری عدالت میں وہ سب
کچھ بتانا ہوگا جسے بیان کر کے وہ اپنی نظروں میں گر سکتی ہیں۔
کوئی بھی شریف عورت بھرے مجمع میں اپنی بربادی کی
داستان کس طرح سن سکتی ہے؟“

پریسٹن کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ”تم ٹھیک کہہ
رہی ہو لیکن اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ
عدالت میں کس طرح کے سوالات کیے جاتے ہیں۔ مجھے یاد
ہے کہ ایک دفعہ ایک عورت گواہی دینے کے لیے آئی تھی تو
اس سے انتہائی ذاتی نوعیت کی باتیں پوچھی گئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ
پہلی بار وہ ڈیٹ پر کب اور کس کے ساتھ گئی تھی۔ شادی سے
پہلے کتنے مردوں سے اس کے تعلقات رہے ہیں وغیرہ
وغیرہ۔ لیکن اب صورت حال پہلے سے بہتر ہے اور میرا خیال
ہے کہ ان عورتوں کو گواہی دینے میں زیادہ مشکل کا سامنا نہیں
کرنا پڑے گا۔“

اسٹیفنی نے غصے کے مارے مٹھیاں سمجھنے لگیں۔ یہ کیا
انصاف تھا کہ جس پر ظلم ہوا، اسی سے اس پر ہونے والے ظلم
کی داستان مزے لے کر سنی جائے؟ اس نے اپنے
غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہاری بات پر یقین کر لیا
جائے کہ عدالت میں ان عورتوں کے زخموں پر نمک نہیں چھڑکا
جائے گا، اس کے باوجود یہ امر کتنا تکلیف دہ ہے کہ ان
عورتوں کو یہ محسوس چہرہ ایک بار پھر دیکھنا پڑے گا جس کی سچ
یا کو وہ بہت پہلے اپنے ذہن سے کھرچ کر پیچیدگی بن چکی ہیں۔“
”انصاف حاصل کرنے کے لیے تھوڑی بہت قیمت تو
ادا کرنا پڑتی ہے۔“ سارجنٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

نشانے باز بڑی بے چینی سے نیچے ہونے والی
کارروائی دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی استغاثہ کے وکیل نے اس کتبے
کی جانب اشارہ کیا تو چوری کے تمام اراکین اس جانب
متوجہ ہو گئے۔ یہ مقدمے کی کارروائی کا ایک حصہ تھا البتہ
ابھی تک کوئی گواہی ریکارڈ نہیں کی گئی تھی۔ فی الحال چوری
کے اراکین کو جانے واردات دکھائی جا رہی تھی تاکہ جب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑا جھنڈ دیکھا۔ وہ ان کے درمیان سے گزرتی ہوئی زمین پر نظریں جمائے چل رہی تھی لیکن ابھی تک اسے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ پھر اچانک اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ جھاڑیوں کے درمیان تھوڑی سی زمین صاف نظر آرہی تھی۔ لگتا تھا کہ کسی نے جھاڑیاں ہٹا کر اس جگہ کو استعمال کیا ہے۔ اسٹیفنی نے گھٹنوں کے بل جھک کر جھاڑیوں کے درمیان جھانکا لیکن اسے وہاں کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ ایک بار پھر گھٹنوں کے بل جھکی اور چونکتے ہوئے سرکوشی میں بولی۔

”جہنم میں جاؤ۔“

اس کی نگاہوں کے سامنے ٹیوب کی شکل کا ایک پلاسٹک کا ٹکڑا پڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک پین نکالا اور اس کی مدد سے وہ ٹکڑا اٹھا کر دیکھنے لگی۔

☆☆☆

نشانے باز نے بار بار پانی کی بوتل کے ساتھ گئے ہوئے ربر پائپ کو دیکھا۔ اس کے آخری سرے پر لگا ہوا ٹکڑا غائب تھا جسے من میں رکھ کر وہ پانی پیتا تھا۔ اسے یاد آیا کہ جب اس نے آخری بار پانی پیا تھا تو اسی وقت وہ ٹکڑا ڈھیلا لگ رہا تھا اور جب اس نے وہاں سے چلتے وقت اپنی سب چیزیں سمیٹیں تو وہ ٹکڑا ڈھیلا ہونے کی وجہ سے زمین پر گر گیا ہوگا۔

اس کے ذہن میں پہلا سوال یہی آیا کہ کیا اس پر کسی کی نظر پڑ سکتی ہے؟ یقیناً وہ زمین پر پڑا ہوگا اور یہ آسانی ہر ایک کی نظر میں آجائے گا۔ کوئی بھی معمولی سی سوجھ بوجھ رکھنے والا جان سکتا ہے کہ اسے کس مقصد کے لیے استعمال کیا گیا ہوگا۔ تھوڑی سی جانچ پڑتال اور اس کے ڈی این اے کے بعد وہ لوگ اس لپٹی اور دکان سے معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ ٹکڑا کہاں استعمال ہوتا ہے اور کسے فروخت کیا گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ عدالتی کارروائی کے نتیجے میں اس کا پتہ مشکل ہو جائے گا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس عورت کے بارے میں سوچنے لگا جس سے کچھ عرصے پہلے اس کی ملاقات ہوئی تھی اس نے اپنے سر کو جھکا دیا۔ اسے پہلے سے یقین تھا کہ بالآخر انصاف کی جیت ہوگی اور ایسا ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اسٹیفنی نے اس پلاسٹک کے ٹکڑے کا بغور معائنہ کیا اور سمجھ گئی کہ اسے پانی کی بوتل میں لگی تھی کہ دوسرے سرے پر لگا یا جاتا ہے اور اس کا استعمال بالعموم وہ نشانے باز کرتے ہیں جنہیں اپنے شکار کو نشانہ بنانے کے لیے کچھ دیر انتظار کرنا پڑ جائے۔ اس نے ایک بار پھر جھاڑیوں کے درمیان زمین کا جائزہ لیا اور سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ اس کی نظر

قدموں کے نشانات پر گئی جن سے لگتا تھا جیسے کوئی گھسٹا ہوا یہاں سے گیا ہے اور جانے کی جلدی میں ایک اہم ثبوت چھوڑ گیا ہے۔

اسٹیفنی کھڑی ہو گئی اور اس نے پلاسٹک کا ٹکڑا اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ وہ آہستہ آہستہ پلٹی ہوئی واپس آئی اور اپنے ساتھیوں میں شامل ہو گئی۔

پریسٹن نے اس کی جانب پُر امید نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ”کچھ ملا؟“

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے وہ خوفناک رات یاد آگئی جب وہ کالج کی ایک باری میں شرکت کرنے کے بعد واپس آرہی تھی کہ اس کے ایک ساتھی نے اسے کمرے تک چھوڑنے کی پیشکش کی لیکن اندر داخل ہوتے ہی اس نے شرافت کا لبادہ اتار پھینکا اور وہ حادثہ پیش آ گیا جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ رات اس نے بڑے کرب کے عالم میں گزاری۔ وہ فیصلہ نہیں کر پاری تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ کیا وہ اس واقعے کی اطلاع پولیس کو دے؟ لیکن اس سے کیا حاصل ہوگا؟ وہ کچھ بھی ثابت نہیں کر پائے گی، سوائے بدنامی کے اسے کچھ نہیں ملے گا وہ اس تلخ یاد کو ذہن کے کسی گوشے میں مقید کر کے بھیدگی سے اپنی پڑھائی کی جانب توجہ دینے لگی۔

ذگری حاصل کرنے کے بعد اس نے پولیس میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے سامنے جب بھی کوئی ایسا ملزم آتا جس پر عورت کے ساتھ زیادتی کرنے کا الزام ہو تو اس کا دل چاہتا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اسے گولی مار دے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ عدالتوں سے انصاف کی توقع نہیں۔ طرمان کے وکیل اکثر اوقات انہیں بری کروانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی بھی ایسے کسی موقع سے فائدہ اٹھائے لہذا اس نے خود ہی انصاف کے تقاضے پورے کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے اسے ایک کرائے کے قاتل کی خدمات حاصل کرنا پڑیں جو ایک ماہر نشانے باز تھا۔

”اسٹیفنی!“ پریسٹن نے دوبارہ کہا۔ ”کیا تمہیں وہاں سے کوئی چیز ملی؟“

”انصاف!“ اس نے دل میں سوچا۔ ”مجھے وہاں سے انصاف ملا۔“

وہ یہ آواز بلند بولی۔ ”نہیں۔ مجھے وہاں سے کوئی ثبوت یا نشان نہیں ملا۔“

مجھے کاریں پسند ہیں۔ اسی لیے جب میری نگاہ اُس کارڈ 812 پر گئی تو میں ایک لمحے کے لیے خشک کر رہ گیا۔ 1937ء ماڈل کی کنورٹبل سیڈان دیکھنے میں ہی بہت خوب صورت لگ رہی تھی لیکن جب میں نے قریب جا کر اسے دیکھا تو بڑی مایوسی ہوئی۔ کسی نے اس اعلیٰ درجے کی کار پر بُری طرح سے رنگ کیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ کسی پانچ سال کے بچے نے جس مختلف شیڈز کے رنگوں میں برش ڈیو کر اپنی طرف سے کار کو خوب صورت بنانے کی کوشش کی ہے۔ گاڑی کی چھت گلابی رنگ کی تھی جبکہ باڈی پر گہرا سرخ رنگ کیا گیا تھا جبکہ نیچے حصے پر بیرون رنگ نظر آ رہا تھا۔۔۔ اور کہیں کہیں گاڑی کا اصلی کریم ٹر بھی جھک رہا تھا۔ لگتا تھا کہ کسی نے بڑی تجلّت میں یہ کام کیا ہے اسی لیے گاڑی پوری طرح پینٹ نہیں ہوئی۔

میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور کھڑکی سے جھانک کر اندر دیکھنے لگا تاکہ جان سکوں کہ گاڑی کے اندرونی حصے کو تو نقصان نہیں پہنچا۔ وہاں ایک نیا مسئلہ موجود تھا۔ کار کی پچھلی نشست پر کوئی چیز پڑی ہوئی تھی جسے کبل سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔

میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور کھڑکی سے جھانک کر اندر دیکھنے لگا تاکہ جان سکوں کہ گاڑی کے اندرونی حصے کو تو نقصان نہیں پہنچا۔ وہاں ایک نیا مسئلہ موجود تھا۔ کار کی پچھلی نشست پر کوئی چیز پڑی ہوئی تھی جسے کبل سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔

ہر دفعہ کامیابی سے ہمسکار ہونے والے چوروں کی دلچسپ کہانی.....

ہر نایاب شے کی قسمت میں قدر دانی نہیں لکھی ہوتی ... وہ ہمیشہ ایک جوہر شناس نگاہوں کی منتظر رہتی ہے ... ایک غیر مہذب شخص کا ماجرا جسے قسمت سے قیمتی چیز مل گئی تھی ...

قدر شناس

بابر حسین



واقف تھا۔ اسی لیے جب وہ کار کی طرف بڑھنے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔ وہ کہنے لگا۔ ”واپس گیت پر جاؤ اور مزید کاروں کو اندر آنے سے روک دو۔“

”ٹھیک ہے ولیم۔“ اس نے فرماں برداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ اب اسے ان گاڑیوں کے لیے تبادلہ انتظامات کرنے تھے جو اس شو میں شرکت کے لیے آ رہی تھیں۔ ان کے مالکان کا خیال ہوگا کہ یہاں نہ صرف ان کی کاروں کی اچھی قیمت مل جائے گی بلکہ بہت سے دوستوں سے ملاقات کا بھی موقع مل جائے گا۔

اس کے جانے کے بعد بھی میں وہاں موجود رہا۔ میری کوشش تھی کہ پولیس کے پہنچنے تک میں وہاں کسی کو نہ آنے دوں تاکہ جہی زمین پر قدموں کے نشانات میں اضافہ نہ ہونے پائے۔ گاڑیوں کے مالکان کو میرا رویہ پسند آیا اور وہ فاصلے پر کھڑے ہو کر اس واردات کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے رہے۔

”کسی نے گاڑی کو یہاں آتے ہوئے دیکھا تھا؟“ میں نے بہ آواز بلند کہا۔

جواب میں مختلف آوازیں ابھرنے لگیں لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ اور کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کار کب آئی تھی اور نہ ہی کسی کو یہ معلوم تھا کہ اس کار کو چلانے والا کون تھا؟ البتہ اس کار پر بدصورتی سے کیے ہوئے رنگ کی وجہ سے سب ہی اس کی طرف لمحہ بھر کے لیے متوجہ ہو گئے تھے۔ ایک عقابی نظر رکھنے والے کار مالک کا بیان تھا کہ اس گاڑی کو ایک مرد چلا رہا تھا اور دیکھنے میں وہ ایک لہبا اور بلا شخص تھا۔ مشکل یہ ہے کہ اس شہر میں کارشو کے لیے کوئی مخصوص طریقہ کار متعین نہیں ہے۔ اس طرح کے شوز کھلے میدانوں میں ہوتے ہیں۔ عام طور پر ہوتا یوں ہے کہ لوگ اپنی کاریں بے لگ آتے ہیں۔ دوسروں کے سامنے ان کی تعریفوں کے بل باندھتے ہیں۔ کسی مالک کو کوئی گاڑی پسند آجائے تو ٹھیک ورنہ وہ دوسری کار کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ پندرہ بیس منٹ کے وقفے کے دوران آنے والی ایک درجن سے زائد گاڑیوں کو کسی نے غور سے دیکھا ہوگا۔

میں پولیس کے انتظار میں اس کار کے قریب کھڑا تھا اور لوگوں کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ایک شخص نے یہ کہہ کر میری اس کوشش کو نام برباد کیا کہ اسے اس گاڑی کے قریب آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ براڈ میڈیکسل کا مالک میجر میٹر میننگ تھا۔ وہ سیدھا چلتا ہوا

میرے پاس آیا اور بولا۔

”یہ میری کار ہے اور یہ بات میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ دیکھو، انہوں نے اس کا کیا حشر کر دیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ جھکا اور نمبر پلیٹ پر ہنسنے لگا۔ اس نے سہارے کے لیے اپنا ہاتھ کار پر رکھنا چاہا۔ ”کرائم سین“ میں چلا یا اور اس کا ہاتھ پڑا۔

وہ سیدھا ہو کر مجھے گھورنے لگا۔ ”تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟ دیکھتے نہیں کہ کسی نے میری کار پر سرخ رنگ پھیر دیا ہے۔“

”اس کار کے اندر ایک لاش بھی ہے۔“ مجھے وہ آدمی دیکھنے میں ہی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہو گی اور چہرے کے نقش و نگار جو بیس ستر سے ملتے جلتے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ حکم دینے کا عادی ہے لیکن میں اس کے رعب میں نہیں آیا۔

اس کی آواز مدہم ہوئی اور وہ آہستہ سے بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ مذاق نہیں کر رہے تھے۔“ اس نے دور کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”پولیس آنے ہی والی ہے۔“ میں نے دانت کچکا کرتے ہوئے کہا۔ ”اسی لیے میں نے ان لوگوں کو دور رکھا ہوا ہے۔“ اور ”تم کون ہو؟“

”ولیم کولبی۔“ میرا تعلق فراگ ہل کلاسک کار سے ہے اور میں کاروں سے متعلق جرائم کے کیسوں میں پولیس کے لیے کام کرتا ہوں۔“

”میری کار دو ہفتے پہلے غائب ہوئی تھی لیکن تم نے اسے تلاش کرنے کے لیے تو کچھ نہیں کیا۔ دیکھو، اس پر انہوں نے سرخ رنگ کر دیا ہے جبکہ وہ کریم۔۔۔۔۔“

میں اس سے زیادہ نہیں سنا چاہتا تھا لہذا میں نے کار کی پچھلی نشست کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور پریشان ہوتے ہوئے بولا۔ ”لیکن یہ میری کار ہے۔ یہ عورت کون ہے؟“

مجھے لگا کہ اس کی طبیعت بگڑ رہی ہے۔ کچھ بھی کیفیت میری بھی تھی کیونکہ میں اس عورت کو اچھی طرح جانتا تھا، وہ بونی تھی۔

”ہم تمہیں کاریں ڈھونڈنے کا معاوضہ دیتے ہیں، لاشوں کا نہیں۔“ سراغ رساں چیف انکپٹر ڈیوڈ جونز نے غراتے ہوئے کہا۔ میں نے پولیس کو فون کرنے کے بعد اس سے بھی ہاٹ لائن پر رابطہ کیا تھا کیونکہ کینٹ پولیس کا انجیل کرائم یونٹ اسی کے ماتحت تھا اور میں چاہ رہا تھا کہ وہ خود اس

معالے کی تعینش کرے۔ حالانکہ اس کا نائب ڈینس مولی گن ابھی خاصا محتاتی اور ہوشیار افسر تھا۔ اس نے وہاں پہنچنے ہی مجھے باہمی ہوئی نظروں سے دیکھا کیونکہ اس وقت میری حیثیت ایک ایسے شخص کی تھی جس نے سب سے پہلے لاش کو دیکھا تھا۔ اس لحاظ سے ڈیوی کی موجودگی سے بھی مجھے کوئی رعایت نہ ملتی کیونکہ یہ جرم اس کے لیے بھی خاص دلچسپی رکھتا تھا۔

پولیس کے آتے ہی معاملہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب مجھے خود کو ان کے سوالوں کے لیے تیار کرنا تھا۔ میں صبح نو بجے کے قریب یہاں آیا تھا اور اس وقت تک بہت کم تعداد میں گاڑیاں آئی تھیں، سبھی مجھ سے یہ احقا نہ حرکت سرزد ہوئی کہ میں اس کار کو دیکھنے چلا گیا۔ ورنہ ممکن ہے کہ میری جگہ کوئی اور شخص یہ عذاب بھگتا۔ پولیس نے تمام داخلی راستے بند کر دے دیے اور بعد میں آنے والی گاڑیوں کو براہیں واقع میدان میں بھیج دیا گیا۔ اب جو بی کی ف سے داری ختم ہو چکی تھی لہذا وہ بھی میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

ہم اور دوسرے کار مالکان پھنس کر رہ گئے تھے۔ پولیس نے یہاں کا جارح سنہال لیا تھا۔ ہم نہ باہر جاسکتے تھے اور نہ آپس میں کوئی ڈینگ کر سکتے تھے۔ مہمانوں کی خاطر موقع کے لیے جو فیٹ لگایا گیا تھا، وہاں مولی گن نے اپنا عارضی کیمپ بنالیا۔ لہذا ہم ایک دوسرے ٹینٹ میں جا کر بیٹھ گئے جو ٹینٹ کے لیے مخصوص تھا۔ ہمارے پاس اس واردات کے بارے میں باتیں کرنے کے علاوہ کوئی اور موضوع نہیں تھا۔ یہ کار کس کی تھی؟ اس پر سرخ رنگ کس نے کیا؟ بونی کون ہے؟ کیا کار پر دوسرا رنگ کرنا بھی جرم ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان لوگوں کے نزدیک بونی کی موت اہم ہی یا کار کا رنگ؟

مجھ سے یہ سب برداشت نہ ہو سکا اور میں ڈیوی کی تلاش میں باہر آ گیا جو ایک کرسی پر بیٹھا کچھ فارم بھر رہے تھے۔ معروف تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔ ”تم نے لاش شناخت کر لی۔ وہ بونی ہی ہے نا؟“

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ایسا ہی لگتا ہے۔ اس کا آئی بیگ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کا اصلی نام ایوا کراؤلے ہے۔ اسے اس کے اپنے ہی اسکارف سے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔“ میں نے اس زندہ دل اور پرنش لڑکی کے بارے میں سوچا جس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں۔ وہ اس شہر میں ہونے والے کارشو کی جان تھی۔ گوکہ اس کے اس ذاتی کار نہیں تھی لیکن اسے پرانی کاریں اور ان کے اہلکار مالکان پسند تھے۔ جب بھی ہم دونوں کا سامنا ہوتا تو

وہ مجھے دیکھ کر گرم جوشی سے ہاتھ ہلاتی جیسے مجھے سے دوستی کی خواہش رکھتی ہو۔ شاید وہ مجھے بھی کوئی مال دار شخص سمجھتی تھی جبکہ میری آمدنی اتنی نہ تھی کہ میں بونی جیسی طرح دارحسینہ کے خزانے برداشت کر سکتا۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کا نام بونی کس طرح پڑ گیا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ وہ پرانی کاروں کے یونٹ پر بیٹھ کر تصویریں بنواتی تھی تاکہ اس طرح ان گاڑیوں کے مالکان کا دل بھانکے لیکن اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ کبھی بھی اپنے ایک ساتھی مالک کلائڈ کے ساتھ کارشو میں آیا کرتی تھی جو اسے بونی کہہ کر بلاتا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ اس کا نیک نیم ہو۔ ان دونوں کے درمیان کیا رشتہ تھا، کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ شاید وہ اس کا بھائی ہو لیکن میرے علم میں یہ بات ضرور تھی کہ مالک کلائڈ نے بھی کسی کار کے مالک اور بونی کے تعلق پر اعتراض نہیں کیا۔ میں نے اس کے بارے میں مزید جاننے کے لیے ڈیوی سے پوچھا۔ ”کیا تمہارے ریکارڈ سے مالک کے بارے میں معلوم مل سکتی ہیں؟“

”شاید۔“ لگتا یہی ہے کہ وہ دونوں ایک نیم کی طرح کام کرتے تھے۔

”کیا تمہیں مالک پر شبہ ہے؟“

”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بونی کی لاش سرد ہو چکی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے کل سہ پہر میں قتل کیا گیا ہے۔ اگر مالک اس کے قتل میں ہاتھ ہے تو وہ بڑی احتیاط سے گاڑی چلا کر یہاں لایا ہوگا۔“

”کیا شو میں شرکت کے لیے اس کار کی رجسٹریشن کروائی گئی تھی؟“ میں نے ڈیوی سے پوچھا حالانکہ میں گاڑی کی ونڈ اسکرین پر چسپاں اسٹیکروکچر چکا تھا۔ لیکن مجھے شک تھا کہ یہ رجسٹریشن کسی فرضی نام سے کروائی گئی ہوگی۔

”ہاں۔“ ڈیوی نے کہا۔ ”یہ گاڑی کل ہی قلم اسٹین کے نام سے رجسٹر ہوئی تھی۔ یقیناً یہ ایک فرضی نام ہے کیونکہ یہ کار تو بھجری کے جس کی چوری کی رپورٹ دو ہفتے پہلے درج ہوئی تھی۔“

اتنی دیر میں پیتھالوجسٹ اور فوٹو گرافر اپنا کام ختم کر کے جا چکے تھے۔ کار میں سے تمام چیزیں سمیٹ لی گئی تھیں اور انہیں ثبوت کے طور پر محفوظ کر لیا گیا تاکہ ضرورت پڑنے پر ان سے مدد لی جاسکے۔ لاش وہاں سے ہٹائی گئی تھی اور اب میں تصور میں جیتی جاگتی بونی اور اس کی لاش کا موازنہ کر رہا تھا۔ اس طرح کے شوز میں وہ جیز اور فی شرٹ پہن کر نہیں آتی تھی بلکہ اس کا لباس انتہائی نفیس اور قیمتی ہوتا

تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ڈیوی سے پوچھا۔

”ڈیوی نے کس قسم کے کپڑے پہنے ہوئے تھے؟“

”اسکرٹ اور بلاؤز۔۔۔ لیکن مرنے سے پہلے اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔“

”میں اس بارے میں سوچتا بھی نہیں چاہتا۔“ میں نے آزدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم مجھے کارپوری کی وارداتوں کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟“

”مجھیں معلوم ہونا چاہیے کہ گزشتہ برس کئی قسمی پرانی کاریں چوری ہوئی تھیں۔“

”کیا وہ سب گاڑیاں کارشوز سے چرائی گئیں؟“

”کارچوری کرنے کے لیے کوئی شخص جسکے نہیں ہے۔

کہیں سے بھی کوئی کارچرائی جاسکتی ہے۔ ویسے زیادہ تر گاڑیاں ہولٹوں، کار پارکنگ اور مختلف مقامات سے چوری ہوئیں۔“

”ان وارداتوں میں ایسی کیا بات مشترک تھی جس کی بنا پر تم یہ اندازہ لگا رہے ہو کہ یہ کسی گروہ کی کارستانی ہے۔“

”تم جانتے ہو کہ ایسی گاڑیوں کو فروخت کرنا مشکل ہے جبکہ ان میں سے بیشتر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور اصل مالکان کو واپس کر دی گئیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان چوریوں کا کوئی اور مقصد تھا۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ ڈیوی نے محض لاگ ڈرائیو کے لیے گاڑی چوری کی ہوگی۔ اور جیسا کہ تم نے کہا، ایسا بھی نہیں لگتا کہ ڈیوی اور مائیک نے اس کاروبار سے بہت پیسے کمائے ہوں گے۔“

”مہاجر کی کار کا معاملہ دوسری چوریوں سے مختلف ہے۔ یہ گاڑی مالک کو واپس تو کر دی گئی لیکن اس کے ساتھ ہی اسے نقصان بھی پہنچایا گیا۔ اتنے انٹری پین سے رنگ کرنا ایک طرح کا نقصان ہی ہے۔“

”کار کی باڈی کو بھی نقصان پہنچا ہے۔“

”ایسی صورت میں مہاجر کا اشتعال میں آ جانا فطری ہے۔“ ڈیوی نے پرامید انداز میں کہا۔ ”مہاجر اپنی کار کو دیکھ کر غصے میں آ گیا ہوگا اور اس نے اپنا کراؤ لے کا خاتمہ کر دیا۔“

”مجھے اس کی حماقت پر ہنسی آنے لگی۔“ وہ اتنا غریب بھی نہیں ہے کہ اپنی کار پر دوبارہ رنگ نہ کروائے۔ پھر وہ اسے قتل کرنے کا خطرہ کیوں مول لے گا؟“

ڈیوی نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”یہ محض ایک خیال بھی ہو سکتا ہے۔ خطرہ تو ڈیوی اور مائیک کے لیے بھی تھا کہ وہ اس کار کو یہاں لے کر آئیں اگر یہ رنگ انہوں نے کیا تھا۔“

”رنگ تو وہ اس صورت میں کرتے جب انہوں نے

کار چرائی ہوئی۔ تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے؟“

”نہیں، یہ بات تو تحقیقات کے بعد ہی ثابت ہو سکتی ہے۔“

”سوچنے کی بات ہے کہ ڈیوی کل سہ پہر قتل ہوئی اور اس کی لاش کو آج یہاں لایا گیا۔ کیا تم نے ان درجن بھر کاروں کا بھی معائنہ کیا جو میرے ساتھ ہی امداد آئی تھیں؟“

”سب سے پہلے ڈیوی ڈارلنگ اپنی پورج کار میں آیا۔ اس کے بعد نے دانی اس کی نائب کی پھر سب گاڑیاں آگے پیچھے آئیں اور ان کی ترتیب کوئی نہیں بتا سکا۔“ ڈیوی نے بناوٹی انداز میں مجھے دیکھا اور بولا۔ ”تم کب آئے تھے ولیم۔۔۔ اور تم نے یہاں کسے دیکھا؟“

”میں سوانو بیچے کے قریب یہاں پہنچا تھا۔ دور سے ہی میری نظر اس گاڑی پر گئی اور اس کے سرخ رنگ نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ میں سیدھا اس طرف چلا آیا۔ میں نے گرد و پیش پر نگاہیں ڈالی اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ یہاں کون کون تھا۔“

”مولی کن۔ اسے ہتھکڑی لگا دو۔“ ڈیوی نے ہنستے ہوئے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ گوکہ اس نے مذاق میں یہ بات کہی تھی لیکن مولی کن کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ واقعی اس پر عمل کرنے والا ہے کیونکہ سب سے پہلے میں ہی جائے واردات پر پہنچا تھا اس لیے مجھے یہ جرم ٹھہرایا جاتا۔ خوش قسمتی سے مجھے کئی لوگوں نے اپنی کار میں آتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس لیے مجھ پر کم از کم یہ الزام تو نہیں لگ سکتا تھا کہ میں ہی مہاجر کی کار کو چلا کر یہاں لایا تھا۔ گوکہ واقعی طور پر مولی کن نے مجھ پر سے نظریں ہٹائی تھیں لیکن اس کے ذہن میں ایک اور ہی منظر نامہ چل رہا ہوگا۔ مثلاً یہ کہ گزشتہ شب میں نے اسے قتل کیا، گاڑی چلا کر اندر لایا، کار وہیں چھوڑی اور خود دیوار پھلانگ کر وہاں سے نکل گیا اور صبح کو اپنی کار میں بیٹھ کر شوش چلا آیا۔

”ممکن ہے کہ یہ میرا وہم ہو اور مولی کن کے ذہن میں ایسی کوئی بات نہ ہو کیونکہ پولیس ثبوت اور شہادتوں کی بنیاد پر آگے بڑھتی ہے۔ پھر مجھے یاد آیا کہ جب میں نے پچھلی سیٹ پر پڑے ہوئے کبل کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کی تو سہارے کے لیے اپنا ایک ہاتھ کار کی باڈی پر رکھ دیا تھا۔ اس طرح وہاں میری انگلیوں کے نشان موجود ہوں گے اور یہ بھی ایک طرح کا ثبوت تھا۔

مولی کن نے تدریسے ہنچکاتے ہوئے میری جان چھوڑی اور مایوسی سے سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ اب میرے لیے

بھی وہاں ٹھہرا بہت مشکل ہو گیا تھا لہذا میں دوبارہ اس ٹینٹ میں چلا گیا جہاں دوسرے لوگ جمع تھے۔ ان سب کو گواہی دینے کے لیے روکا گیا تھا۔ ان میں سے کچھ فارغ ہو چکے تھے اور کچھ اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں سے کم از کم اچھے لوگ ڈیوی کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ سب اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے اور بار بار ایک ہی جیسے سوال دہرا رہے تھے۔ بد قسمتی سے کسی کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور نہ ہی وہ کوئی مفروضہ قائم کر سکتے تھے۔

میرے دماغ میں بھی اس حوالے سے بہت سی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ مثلاً یہ کہ ڈیوی کا اس شوش کسی سے انفر چل رہا ہو اور مائیک کو یہ بات پسند نہ آئی ہو۔۔۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر مائیک نے ایسا کیا تھا تو پھر اس نے لاش کو یہاں لانے کا خطرہ کیوں مول لیا؟ ممکن ہے کہ مائیک کو یہ بات معلوم نہ ہو کہ یہ کار چوری کی ہے۔ لیکن وہ اور ڈیوی ایک دوسرے کے بہت قریب تھے اور اس لیے یہ بات یقیناً معلوم ہو گئی۔ ممکن ہے کہ مائیک کے بچائے وہ شخص اس کار کو لے کر یہاں آیا ہو جس نے ڈیوی کو قتل کیا تھا اور کار یہاں چھوڑ کر پیدل چلا گیا ہو۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے کار یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ اسے کہیں بھی چھوڑ سکتا تھا۔ ان سب باتوں سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا تھا کہ اس قتل کا شوش سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے لیکن اس کے باوجود ایک سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا کہ کار پر اس طرح کا رنگ کیوں کیا گیا جس سے اس کی قیمت گر گئی؟

اس سوال کی کمی مکمل جواب ہو سکتے تھے۔ پہلا تو یہ کہ اس طرح کار کے مالک کو نقصان دیا جائے لیکن کار چرانے کے بعد اس پر رنگ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ شاید اس کی شناخت چھپانے اور اسے کسی دوسرے ملک میں فروخت کرنے کے لیے ایسا کیا گیا ہو۔ اس دنیا میں ایسے شوقین حراج لوگوں کی کمی نہیں جو بھاری قیمت دے کر پرانی کار خریدتے ہیں تو اس پر اپنی پسند کے مطابق نیا رنگ بھی کروا سکتے ہیں۔ تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کار کی وجہ سے چوروں کے درمیان جھگڑا ہو گیا ہو۔ ممکن ہے کہ ڈیوی نے مائیک کو ناراض کرنے کے لیے یہ حرکت کی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ڈیوی کو کار پسند آگئی ہو اور مائیک نے اسی وجہ سے کار کا رنگ تبدیل کر دیا ہو۔ یہ بھی فرض کیا جاسکتا ہے کہ مائیک اور ڈیوی آپس میں پانڈر نہیں یا کم از کم اس جرم میں ان کی شراکت داری نہ ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ چوروں کا تعلق شوش نہ ہو اور وہ باہر کے لوگ ہوں۔ کسی نے ڈیوی کو پہلے سے تیار کر دیا ہو کہ وہ ان پر نظر رکھے۔۔۔ اور

وہ شخص جوئی بھی ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

ہنگامی طور پر شو کے شرکاء اور مہمانوں کے لیے دوسرے ٹینٹ میں جائے، کافی اور بنکٹ وغیرہ کا انتظام کیا گیا۔ ایک درمیانہ عمر کی بول صورت عورت ان انتظامات کی نگرانی کر رہی تھی۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ یہ عورت یہاں فی اسٹال چلائی ہوگی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مہاجر کی بیکریٹری بلڈا ہے اور اس کی بیوی کی غیر موجودگی میں مہمانوں کی خاطر تواسیع کر رہی ہے۔ جوئی اس کے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ اس کی حرکتیں دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ڈیوی کو بھی اسی طرح تنگ کر رہا ہوگا۔ بلڈا کسی کام سے باہر گئی تو میں نے جوئی کو گھیر لیا اور کہا۔ ”میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”کو، کیا پوچھتا ہے؟“ اس نے بیزار سی کہا۔ اس کی نظر میں اب بھی بلڈا کے تعاقب میں پیچھ رہی تھیں۔

”تم یہاں آنے والے پہلے شخص تھے اور تم نے ہی اس گاڑی کو یہی اندازہ کیا؟“

”پچھرا ہوا؟“ اس گاڑی کی وینڈ اسکرین پر ہمارا اسٹیکر لگا ہوا تھا۔ دوسری بات یہ کہ میں ڈرائیور کا چہرہ اچھی طرح نہیں دیکھ سکا کیونکہ اس نے سر پر ٹوپی اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ پہنا ہوا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ اس کار پر جس بیٹھوٹے انداز میں رنگ کیا گیا ہے، اس کی وجہ سے دوہرا نظروں میں آسکتی ہے۔“ اس نے مجھ پر ایک معاندانہ نظر ڈالی اور بولا۔ ”اگر تم یہ پوچھنا چاہ رہے ہو کہ میں نے اس گاڑی میں کوئی لاش دیکھی تو میرا جواب نہیں میں ہے۔ میں کوئی کسٹم آفیسر نہیں ہوں جو گاڑیوں میں جھانکتا پھروں۔ ویسے بھی میں کاری جانب متوجہ تھا۔ ایسی گاڑیاں بہت کم دیکھنے میں آئی ہیں۔“

”اچھا، یہ بتاؤ کہ ڈیوی سے تمہارے تعلقات کس نوعیت کے تھے؟“

”تمہارا اشارہ جس تعلق کی جانب ہے، میں اس سے محروم ہی رہا۔ وہ مجھے اچھی لگتی تھی لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ میں امیر شخص نہیں ہوں تو وہ مجھ سے دور ہو گئی۔“

”تمہارے خیال میں وہ کہنے پسند کرتی تھی؟“ وہ زور سے ہنسا اور کہنے لگا۔ ”وہ اپنے بھائی کے ساتھ آتی تھی لیکن جاتے وقت اس کے ساتھ ہمیشہ ایک نیا مرد ہوتا تھا۔“

”کیا واقعی مائیک اس کا بھائی ہے؟“

”مجھے معلوم نہیں لیکن لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اس کی گرل فرینڈ ہوتی تو اس کے ساتھ کھرا واپس جاتی۔ وہ

ہمیشہ مجھ سے یہی پوچھتی کہ شو میں کون کون لوگ آرہے ہیں اور میں اسے ٹال دیتا تھا۔ میں ایک کار شو بھی چلا رہا ہوں، کوئی کلب یا ہوٹل نہیں۔“

”ممکن ہے کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔ شاید وہ تم سے اس لیے پوچھتی ہو کہ اے کاروں سے دلچسپی تھی؟“
دلچسپی تو مجھے بھی تھی۔ شاید اسی لیے میں اس بد بخت کار کے پاس چلا گیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میرا دھیان میجر کی طرف چلا گیا جو ابھی تک غصے کے عالم میں اپنی کار کے ارد گرد منڈلا رہا تھا اور وہاں آنے والے ہر شخص سے اس واقعے کے بارے میں گفتگو کر کے اپنی بھڑاس نکال رہا تھا۔ میں بھی ٹھٹھا ٹھٹھا اس کے پاس چلا گیا اور دوستانہ انداز میں بولا۔ ”بہت بُرا ہوا۔“

اس نے مجھے ناگواری سے دیکھا لیکن جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔
”اس لڑکی کی لاش لے کر کون آیا تھا؟“ میں نے ڈھیٹ بن کر پوچھا۔

”ظاہر ہے جس نے یہ کار چرائی تھی، وہی اسے یہاں چھوڑ کر بھی گیا ہوگا۔“

میں خاموش رہا تاکہ وہ اپنی بات پوری کر سکے۔
”اس طرح کی گاڑیاں اب نایاب ہیں۔ میں نے اس کی چوری کی رپورٹ درج کرا دی تھی۔ اس لیے اسے پہچان لینے جانے کا امکان موجود تھا، چاہے اس پر کیسا ہی رنگ کر دیا جائے۔ جس نے یہ گاڑی چرائی تھی، وہ اس سے بہ آسانی چھپا نہیں چھڑا سکتا تھا چنانچہ وہ اس کار کو یہاں چھوڑ کر چلا گیا۔“

”اور وہ لاش... کیا تم سمجھتے ہو کہ بوٹی نے وہ کار چرائی ہوگی؟“
”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ویسے بھی وہ اب مر چکی ہے۔“

”اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ چور نہیں ہو سکتی۔“ میں نے اپنی بات پر اصرار کیا۔ ”پولیس کا کہنا ہے کہ اس کا اصلی نام ایو کر او لے ہے اور وہ اپنے ایک ساتھی کی مدد سے یہ کام کرتی تھی۔“
”پھر تو وہی شخص اس گاڑی اور لاش کو یہاں چھوڑ گیا ہوگا۔“

یہ ممکنات میں سے تھیں لیکن وہ کون ہو سکتا ہے؟ مائیک، جوئی یا خود میجر...؟ گو کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ غصے کے عالم میں قتل بھی کر سکتا ہے۔ وہ پاگل ضرور تھا لیکن ایک کار

کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہی کرتا کہ کار واپس ملنے پر پولیس کو فون کرتا اور گاڑی کو دوبارہ رنگ کے لیے بھیج دیتا۔

اس سے باتیں کرنے کے بعد جب میں فٹنٹ میں واپس آیا تو وہاں ایک فرد کا اضافہ ہو چکا تھا۔ میں دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ مائیک کلائنڈ ہی ہو سکتا ہے۔ وہ تیس سال کا ایک خوش شکل بندہ تھا لیکن اس کے چہرے کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ زندگی نے اس کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بوٹی کی موت کی وجہ سے اس کے چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی ہو۔ اگر وہ بوٹی کا قاتل نہیں تھا تو اس کی اداسی کی وجہ سمجھ میں آتی تھی۔

”بہت بُرا ہوا۔“ میں نے اس کے سامنے بھی وہی جملہ دہرایا۔ ”یہ پولیس والے بالخصوص مولی گن ہر ایک کو مجرم سمجھتے ہیں، خواہ اس سے جرم سرزد ہوا ہو یا نہیں۔“

اس نے مجھے شک بھری نگاہ سے دیکھا اور بولا۔
”جوئی کا کہنا ہے کہ تم پولیس کے لیے کام کرتے ہو۔“

”ہاں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ خود بھی پولیس والا ہوں۔ میرا کام چوری کی گئی گاڑیوں کو تلاش کرنا ہے۔ قتل جیسے معاملات سے میرا کوئی تعلق نہیں۔“

”اسی لیے تم یہاں نظر آرہے ہو کیونکہ تمہارے خیال میں یہ کار چوری کا پس ہے؟“

”یقیناً اور ابھی یہ معاملہ ختم نہیں ہوا... جب تک کہ یہ کار اس کے مالک کو واپس نہیں مل جائے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم اپنا کام کرو۔“ اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”مجھے بوٹی کے مرنے کا بہت افسوس ہے۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اس کے چہرے پر چھائی افسردگی میں کسی حد تک کمی واقع ہو گئی تھی۔

”میں نے تم دونوں کو اکثر ایک ساتھ شوں میں آتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”اے آج بھی میرے ساتھ ہی آتا تھا۔ میں نے کافی دیر تک اس کا انتظار کیا، جب وہ نہیں آئی تو میں یہی سمجھا کہ شاید اس کا پروگرام بدل گیا ہے۔ اس کا مو بائل بھی بند تھا پھر میں خود ہی یہاں چلا آیا کیونکہ مجھے اس شخص جوئی پر بالکل بھی بھروسہ نہیں ہے۔ وہ میری غیر موجودگی میں بوٹی کو تنگ کر سکتا تھا۔“

پوچھ کچھ کا سلسلہ ختم ہوا تو میں سوچوں میں گھرا ہوا اپنے گھر چلا آیا۔ میرے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ میرا گھر فراگ ہل فارم میں واقع ہے۔ وہیں

عقلمند

میرا گیراج اور دفتر بھی ہے۔ دوسری صبح میرے کارنگر کام پر آئے، تب بھی میں اسی خیال میں کم تھا۔ زوگرانٹ اور لین وکر، دونوں ہی اپنے کام میں بہت ماہر ہیں اور ان کے سامنے میری حیثیت ایک شاگرد جیسی ہے۔ انہیں کاروں کے بارے میں حیرت انگیز معلومات ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ”کیا تم بھی مائیک کلائڈ سے ملے ہو؟“

”ہاں۔“ ان دونوں نے بیک آواز کیا۔

”تم جانتے ہو کہ وہ اپنی گزر وقات کس طرح کرتا ہے؟“

”نہیں۔“

یہ نکتہ قابل غور تھا۔ اگر واقعی مائیک گار چوری میں ملوث تھا تو وہ اس کے دھندے کے بارے میں ضرور جانتے کیونکہ وہ اس بزنس میں موجود ہر شخص سے اچھی طرح واقف تھے۔ پھر میں نے بونی کے بارے میں پوچھا۔

”بونی کو جانتے ہو۔۔۔ اس کا اصل نام ایوا کراؤ لے ہے؟“

”اس کے بارے میں سنا ضرور ہے لیکن کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔“ زوگرانٹ نے جواب دیا۔

”کسی نے اسے قتل کر دیا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے انہیں گزشتہ روز کا واقعہ سنا دیا۔

انہوں نے اپنا کام روک دیا اور کچھ دیر خاموش رہے پھر لین بولی۔ ”یہ سن کر انہوں ہوا۔ وہ اچھی لڑکی تھی۔ میں اس سے مل چکی ہوں۔“

زوگرانٹ نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”کیا تم بھی اسے پسند کرتے تھے؟“

”نہیں، وہ میری پہچان سے دور تھی۔ اس کی نظر اچھی کاروں اور ان کے امیر مالکان پر رہتی تھی اور اس معاملے کا ہونا کچھ پہلو یہ ہے کہ کسی نے اس کا پر بہت بڑی طرح تین طرح کا لال رنگ کر دیا ہے۔“

”حالانکہ اسے فروخت کرنے کے لیے بلیک کلرز زیادہ موزوں ہوتا۔“ زوگرانٹ نے اس پر اپنی ماہر اندر رائے دی۔

لین جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ ”خدا کی پناہ۔۔۔ میں تو کبھی ایسی کار کی جانب نہ دیکھوں۔“

اسی وقت ڈیوی کا فون آگیا جس کی وجہ سے میں زوگرانٹ سے مزید گفتگو نہ کر سکا لیکن اس کے الفاظ میرے ذہن میں چپک کر رہ گئے۔ اگر بونی اور مائیک پرانی کاریں چرانے کا دھندا کرتے تھے تو اس کام میں انہیں بہت تھوڑی آمدنی ہوتی ہوگی اور بونی ایسی عورت نہیں تھی جو تھوڑے پر

گزرا رہ کر لے۔

ڈیوی نے مجھے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ اس نے مائیک کو گرفتار کر لیا ہے لیکن شاید اس پر کوئی الزام ثابت نہ ہو سکے، گوکہ کار پر اس کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔

”تب تو تم اسے کم از کم کار چوری کے الزام میں گرفتار کر سکتے ہو۔“

”شاید۔۔۔ لیکن یہ نشانات کار کے باہر نہیں بلکہ اندر ہیں۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ کار کے بیرونی حصے کو ہاتھ لگائے بغیر اسے چلا کر لے گیا ہو۔“

”کیا اس نے کار پر رنگ کرنے کا اعتراف کر لیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، اس کا کہنا ہے کہ وہ خود ایک ہنرمند ہے اور کار ڈیجی نایاب کار کو تباہ نہیں کر سکتا۔“

”اس سے مزید کیا معلومات حاصل ہو سکیں؟“

”تھوڑی بہت۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا ہے۔ مولی کن نے اس جگہ کا معائنہ کیا ہے۔ وہاں اسے ایسی کوئی علامت نظر نہیں آئی جس سے ظاہر ہو سکے کہ وہ کار چوری کے کاروبار میں ملوث ہے۔۔۔ مثلاً جعلی نمبر پلیٹیں وغیرہ۔“

”ممکن ہے کہ اس نے اس کام کے لیے کوئی اور جگہ کرائے پر لے رکھی ہو۔ آج کل اس کاروبار کے لیے زیادہ بڑی جگہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چوری کی کئی کاروں کے لیے ایک کمپیوٹر ہی کافی ہے۔ تم لوگوں نے بونی کے گھر کا بھی معائنہ کیا ہوگا؟“

”ہاں، وہ ایک ٹیرس ہاؤس میں رہتی تھی لیکن ہر اپارٹمنٹ کا بلڈنگ کے عقب میں اپنا ایک گیراج ہے جس کا راستہ برابر دیوالی سے جاتا ہے اور تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہمیں اس کے گیراج سے کیا ملا؟“

”تین مختلف شیڈز میں سرخ رنگ اور بچوں کے استعمال کا ایک برش۔“

”بالکل ٹھیک۔۔۔ البتہ پینٹ برش کافی تعداد میں تھے جن میں سے صرف دو استعمال کیے گئے۔“

اب یہ بات پوری طرح مجھ میں آگئی تھی کہ بونی کی موت کا تعلق کسی نہ کسی طرح اس کار کی چوری سے تھا ورنہ وہ اس طرح کیوں قتل کی جاتی۔ اس کا جواب مائیک ہی دے سکتا تھا البتہ اس قتل کا محرک کوئی کاروباری نہیں بلکہ ذاتی وجہ تھی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ قاتل اس گاڑی کو وہاں کیسے چھوڑ چلا گیا۔ مائیک کے ساتھ ساتھ مجھے جونی

پر بھی شک تھا لیکن اس کا بونی کے ساتھ کوئی کاروباری یا ذاتی تعلق نہیں تھا لہذا اس پر شک کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

میں زوگرانٹ کو سیاہ رنگ کی ٹرائف پر کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ اچانک میرے کانوں میں اس کے الفاظ گونجنے۔ ”سیاہ رنگ زیادہ موزوں ہوتا۔“

”بلیک سیل۔“ میں زور سے چلایا۔ ”یہی اصل کاروبار تھا جس میں کسی کار کو نقصان نہیں پہنچایا گیا۔“

”کیسا بلیک سیل؟“ زوگرانٹ نے حیرت سے پوچھا۔

”مائیک محض ایک دلال تھا۔ بونی امیر لوگوں کو گھیرتی اور ان کی کاریں چرانے پھر وہ ان کی واپسی کے لیے بیماری تاوان طلب کرتی اور یہ بھی دھمکی دیتی کہ عدم تعاون کی صورت میں وہ ان کے اہل خانہ یا پارٹنرز کو ان کے جسمی تعلق کے بارے میں بتا دے گی۔“

زوگرانٹ نے دلچسپی سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”تمہارا کہنا ہے کہ وہ امیر کار مالکان کے ساتھ رات گزرتی تھی۔۔۔ پھر وہ ان کی کار کس طرح چراتی ہوگی؟“

”جب آدمی پر کسی جوان عورت کی قربت کا نشہ چڑھ جائے تو وہ گردن پیش سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ بونی اسی کیفیت سے فائدہ اٹھا کر ان کی کار کی چابیاں چراتی تھی۔“

”کار کے مالک کو اس وقت بھی ہوش نہیں آتا ہوگا جب وہ کبھی ہوگی کہ میرے ساتھ وقت گزارنے کا بہت بہت شکر یہ۔ اب میں تمہاری کار چلاتی ہوئی گھر جاؤں گی جو تمہیں واپس نہیں ملے گی۔“ زوگرانٹ نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

”یہ کام مائیک کیا کرتا تھا۔“ میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ ان دونوں کا پیچھا کرتے ہوئے اس جگہ تک پہنچ جاتا جہاں یہ کھیل کھیلا جا رہا ہوتا یا بونی خود اسے وہاں بلا لیتی اور کسی ترکیب سے چابیوں اس کے حوالے کر دیتی۔ جب وہ کار لے کر چلا جاتا تو بونی زبان بند رکھنے اور کار واپس کرنے کے لیے بیماری رقم طلب کرتی اور کار کا مالک اپنی عزت بچانے کے لیے یہ مطالبہ مانتے پر مجبور ہو جاتا۔“

”تمہارا کہنا ہے کہ ایسی کاروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا اور وہ اپنے مالکوں کو بچ حالت میں مل جاتی تھیں؟“

”ہاں۔“

”پھر میجر کی کار کو کیوں نقصان پہنچایا گیا؟ اس پر اس بیدردی سے سرخ رنگ کیوں کیا گیا؟“

”یہی تو وہ نکتہ ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔“ میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

☆☆☆

میری نشان دہی پر میجر جیٹ میٹنگ کو گرفتار کر لیا گیا اور سرخ رنگ کی کار پر اس کی انگلیوں کے نشانات بھی مل گئے۔ یہ ایک واضح ثبوت تھا کیونکہ اس کار میں لاش دیکھنے کے بعد میں نے کسی کو بھی اس کے قریب نہیں آنے دیا تھا جس کا مطلب ہے کہ یہ نشانات اس سے پہلے کے تھے۔ یہی کسٹڈی این اسے ٹیسٹ کرنے پوری کر دی جس کا مطلب تھا کہ اس کے اور بونی کے درمیان کم از کم ایک بار ضرور کوئی تعلق قائم رہا ہوگا۔

میجر نے اپنے بیان میں اعتراف کر لیا کہ بونی نے ایک ہفتہ قبل اسے فون پر بلیک سیل کرنے کی کوشش کی تھی جس کے جواب میں پہلے تو اس نے کہا کہ وہ ان دھمکیوں میں آنے والا نہیں ہے۔ وہ چاہیے تو ساری دنیا کو بتا دے لیکن بعد میں وہ اس کی طلب کردہ رقم کا نصف دینے پر آمادہ ہو گیا۔ بونی مان گئی لیکن گھر جا کر اس نے کار پر ناٹزی پین سے سرخ رنگ پھیر دیا۔

شوشے ایک روز پہلے وہ کار واپس لے کر آگئی۔ اس نے اپنی رقم وصول کی اور جانے سے پہلے میجر کو ایک بار پھر نہال کر دیا۔ اس کے جانے کے بعد جب وہ۔۔۔۔۔ ہوش و حواس میں آیا تو اس نے باہر آ کر اپنی گاڑی کا معائنہ کیا اور اس کی حالت دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ تاہم میجر کا کہنا تھا کہ اس کا ارادہ اسے مارنے کا نہیں تھا۔ وہ صرف اسے سرزنش کرنے گیا تھا لیکن وہ اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کے نتیجے میں جو کچھ ہوا، اس سے بچنے کے لیے اس نے شو میں شرکت کرنے کے لیے اپنی کار کو فرضی نام سے رجسٹر کروایا۔ رات بھر وہ کار پارکنگ میں کھڑی رہی اور صبح ہوتے ہی وہ بھی دوسری کاروں کے ساتھ اپنی گاڑی میں گیٹ سے اندر لے آیا۔ اگر وہ گاڑی پارکنگ میں ہی رہتی تو صبح ہوتے ہی وہ نظروں میں آ جاتا۔

نظروں میں تو وہ اب بھی آگیا تھا مگر ذرا دیر سے۔ غلطی مجھ سے ہوئی تھی جو میں شروع میں سچائی کا اندازہ نہ کر سکا۔ جب وہ اس گاڑی کی ملکیت کا دعویٰ کر رہا تھا تو مجھے اسی وقت جان لیتا جا چاہیے تھا کہ کوئی غضب ناک مالک ہی اس کار کو قتل آئین کے نام سے رجسٹر کر سکتا ہے۔ قتل آئین کا مطلب ایسا غیر مہذب شخص ہے جسے نادر و نایاب چیزوں کی قدر نہ ہو اور اس شو میں میجر ہی ایک ایسا شخص تھا جو اس تعریف پر پورا اترتا تھا۔



چشمیں قسط

زمانہ قدیم سے عاشق وہ غبار خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو ہلائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے..... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی..... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے..... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے..... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے..... سر پہرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے..... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے..... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے..... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و
الانکار جذب عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے
 کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر..... ایک
 ملا کر چاروں ملک مشکل للکار ہے۔

ان عاشق پر دانوں کا مجرائے خاص جو لکار سننے اور لکارنے کو مٹتی تھے

[illegible]

اگر دیا۔ زخمی ہونے کے باعث مجھے زرگان کے سرکاری اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ عمران نے رابرٹی کی اور دات کا ڈراما کر کے انعام میں لئے والے اب غائب کر دیں پھر میری حیدر سیت زرگان سے نکلنے کا راستہ دیا گیا۔ مگر یہ بھوکھا تھا، ایک محدود قافلے پر پہنچنے کے بعد حکم کے سامنے ہمارے پیچھے آنے لگے۔ تاہم اس موقع پر عمران کی چھپائی ہوئی جیب ہمارے کام آئی اور ہم اے قلعہ تعاقب میں آئے والوں کو مل دینے میں کامیاب ہو گئے اور تھوڑے ہی مندر کے خانقاہ سے میں نکلے گئے۔ وہاں سب نے ہمارا استقبال کیا۔ پھر وہاں رہتے ہوئے میں نے سلطانہ کو قلعہ تعاقب سے چوری پیچھے ملتے دیکھا۔ میں نے بات کی دیکھ کہ کچھ کے لیے منصوبہ بنایا اور سلطانہ اور آفتاب کا بیٹھنا کیا۔ سلطانہ ایک مندر میں بیٹھی تھی۔ ہم نے آفتاب سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ بہانہ نکلا۔ اچانک مندر کے باہر گولی پلنے کی آواز گونجی۔ میں نے ٹپک کر کسی کو گھور گاڑی میں سمجھتے دیکھا۔ ایک فریکٹر اور اور کچھ گھبراہٹ گاڑی کے پیچھے لپکے۔ ہم بھی اس سووار ہو گئے۔ راستے میں گھومڑ گاڑی سے فائرنگز ہوئی اور دو تین گھسوراہا اپنی جان سے گئے۔ اچانک ایک سی آئی آنے پر فریکٹر اور ایک اساطیل میں رک گیا۔ یا قائل کا شفا خانہ تھا۔ یہ سلطانہ اور آفتاب تھے۔ انہوں نے وہاں موجود بریلیوں اور اسٹاف کو فریال بتایا اور اپنی باتیں سنوانے کے لیے آفتاب نے ایک ایک کر کے فریالوں کو مارا شروع کر دیا۔ حکم کے مطابق سب نے اسپتال کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ عمران نے آفتاب سے وادی ناکی پر بات کی مگر آفتاب اپنی بات اور اہراہرہ کو یاد رکھتا تھا۔ ڈاکٹر ایسی ہی فریالیں سن رہے تھے کہ شہر آباد تھا تو قلعہ تعاقب کے بات نہ ماننے کی وجہ سے کس کس کو اس جگہ رادیا موجود ہے جواب آفتاب کے قبضے میں تھی۔ اور ی کی وجہ سے وہاں کی لچل چلی گئی تھی۔ نتیجتاً پانچ سال سے ساتھیوں کا ساتھ اسپتال میں کھینے کی کوشش کرتا ہے مگر عمران کے یہ وقت طویل کرنے کی وجہ سے آفتاب انہیں مار رہا تھا۔ یہ میری وادی ناکی پر سلطانہ سے بھی بات ہوئی ہے۔ ہاشم راززی کو بخفاخت اسپتال پہنچا دیا جاتا ہے۔ ہمیں کیمت میں بھرت نامی نوجوان ملتا ہے جو ہمیں اپنے ساتھ کھلے جاتا ہے۔ پھر عمران بھرت کے ہاتھ آگھر زفر کو ملاقات کا پیام بھیجتا ہے اور ہماری اس ملاقات ہوئی ہے۔ عمران اسے اپنی باتوں سے قائل کر لیتا ہے کہ وہ سلطانہ کے بدلے مرایا کو وہاں سے بخفاخت نکال سکے گا۔ آگھر زفر راجسی ہوتا جائے اور ہمیں خاموشی سے اسپتال کے قریب ایک گھر میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ ہمیں راکھیں اور ایرینیشن بھی دیا جاتا ہے۔ اچانک کی جوان لڑکی یا لڑکے کے رونے کی آواز آرہی ہے۔ ہاشم کی فائون پرست مارکر کھینچنے کی دھمکی دیتا ہے۔ اسپتال کے ارد گرد پھیل جاتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں نے ٹیلی اسکوپ سے دیکھا۔ بالکی روشنی میں مجھے ایک چمک دینے والا منظر نظر آیا۔ تیرہ چودہ برس کا ایک لڑکا نونہ ہاشم کی گرفت میں تھا۔ ہاشم نے اس کی دہلی پٹی گردن بنے بازو کے خٹنے میں جکڑ رکھی تھی اور اس کے سر سے رائل کی نال لگا رکھی تھی۔ لڑکا کی چڑیا کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ رو رہا تھا اور غائبانہ ہنسی کے لیے منت ساجت بھی کر رہا تھا۔ اس کے خدوخال نے مجھے مزید چونکا یا، وہ مقامی نہیں تھا۔ اس کے نقوش بتا رہے تھے کہ وہ شاید جاپانی ہے اور آج صبح مل ہونے والے ڈاکٹری وان سے اس کا گوئی رشتہ ہے۔

چند سیکنڈ بعد اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ہاشم میکانوں پر پھردھاؤ، اس نے گھبراڈالنے والوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”جیس کی لاش نیچے آ رہی ہے، یہ لی وان کا پوتا ہے۔ امید ہے کہ پوتے کو دیکھ کر دادا خوش ہو جاوے گا۔ اس کے بعد اس انگریزی باری آوے گی۔۔۔“

ہمیں ہرگز معلوم نہیں تھا کہ آنجنابی ڈاکٹری وان کے ساتھ اس کا کوئی عزیز بھی یہاں اسپتال میں چھٹا ہوا ہے۔ اس لڑکے کو دیکھ کر حقیقت کا پتا چل رہا تھا۔ روتا بلکتا لڑکا پریزی میں کچھ کبرہا تھا۔ اس کا کوئی کوئی لفظ یہ سمجھ میں آتا تھا۔ وہ ہاشم رازی کو اٹکل کہہ کر مخاطب کر رہا تھا اور اس نے اپنی جان کی تحریک مانگ رہا تھا۔ یقیناً اس سے پہلے اس کو نو پچاس لاشیں دکھی تھیں جن میں اس کے دادا کی لاش کی شامل تھی۔ موت کا خوف اس لڑکے کو پوری طرح

تھے۔ ہاشم اور ایڈرنس کے درمیان ہونے والے مکالمے کے دوران میں ہی عمران نے اسٹیپر کن کے ہیرل کوکن کے ساتھ اٹھ کر لیا تھا۔ اس نے گن کو کھڑکی کی درز میں رکھا۔ ایک گھنٹہ زمین پر لٹا ہوا اور آٹھ گن کی ٹیلی اسکوپ سے لگا دی۔ وہ ایک انتہائی قدم اٹھانے جا رہا تھا۔ غالباً اس نے یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ اس قدم سے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اب یہ منٹوں کا نہیں سیکنڈوں کا فیصلہ تھا۔ اگر ہم لڑکے کی جان بچانا چاہتے تھے تو پھر فوری ایکشن کی ضرورت تھی۔ اس ایکشن کے لیے ہم سب سے نزدیک اور مناسب ترین جگہ پر موجود تھے۔ سوال بس ایک ہی تھا۔ ہمیں ہاشم پر حملہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ یقینی بات تھی کہ عمران نے بھی اس بارے میں ضرور سوچا ہوگا۔ عقلمن صورت حال میں وہ بہت تیزی سے فیصلہ کرتا تھا اور اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ تین چار سیکنڈ کے اندر وہ اپنے ارگرد سے یکسر بے خبر ہو گیا۔ اسٹیپر کن جیسے اس کے جسم کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کی انگلی لمبی پر تھی اور آٹھ دور بین سے لگی ہوئی تھی۔ وہ بالکل ساکت تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایک خطرناک ترین نشانہ لینے جا رہا ہے۔ اسے اپنے ٹارگٹ یعنی ہاشم کا بہت ٹھوڑا حصہ نظر آ رہا تھا اور جو آ رہا تھا، وہ بھی تین چوتھائی لڑکے کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ میں نے اپنے والی ٹیلی اسکوپ سے دیکھا۔ لڑکے کے سر کے پیچھے ہاشم کے سر کے بال اور نصف پیشانی ہی دکھائی دے رہی تھی۔

”غلطی کی تصحیح نہیں ہے عمران۔“ میں نے سرگوشی کی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ لکڑی کی طرح ساکت ہو چکا تھا۔

میں نے کہا۔ ”یہ بھی سوچ لینا کہ اس کے بعد کیا ہو گا؟“

اس نے سر کو موہم سی حرکت دی۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ سوچ لیا ہے۔

ہاشم چٹھاڑا۔ ”یہ لو سنجال لو اس کو بھی۔“ اس کے ساتھ ہی شاید اس نے فائر کرنا چاہا تھا لیکن اس سے پہلے عمران لمبی دبا چکا تھا اور یہ کسی عام شخص کا فائر نہیں تھا۔ یہ وہ ماہر نشانہ باز تھا جو ہر شام ہیکڑوں لوگوں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتا تھا اور انہیں ورطہ حیرت میں ڈال دیتا تھا۔ وہ موت کا کھلاڑی تھا اور قسمت کی دیوی اس کے کندھوں پر سوار رہتی تھی۔

ٹیلی اسکوپ میری آنکھوں پر تھی۔ میں نے ہاشم رازی

کو اچھل کر لڑکے سے الگ ہوتے اور پھر نیچے کی قرب کرتے دیکھا۔ لڑکا چلتا ہوا چھت پر چکر لگاتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ غالباً چند لمحوں کے لیے اس نے بھی سوچا کہ چھت سے نیچے چھلانگ لگا دے لیکن چھت بہت اونچی تھی۔ اسی دوران میں سیرجیوں کی طرف سے آفتاب خاں لپک کر آیا اور دشت زدہ لڑکے کو دبوچ کر تارکی میں اوچھل ہو گیا۔

میں نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”ہاشم مر گیا ہے۔ گولی اس کے ماتھے پر لگی ہے۔“

”مجھے پتا ہے۔“ عمران نے کہا۔

”کہیں آفتاب خاں حریفوں پر برسر نہ چلا دے۔“

”مجھے نہیں لگتا کہ وہ ایسا کرے گا لیکن اگر باہر سے کوئی حرکت ہوئی تو پھر وہ ضرور وحشی ہو جائے گا۔“

اسی دوران میں خیارد جھک کر دوڑتا ہوا اس رسائی نما کمرے میں آ گیا۔ اس کے گلے میں بھی ٹیلی اسکوپ جمبول رہی تھی۔ وہ ہانپی ہوئی لڑاں آواز میں بولا۔ ”بہت خوب! مجھے لگتا ہے کہ تمہاری گولی نے ہاشم کو ہٹ لیا ہے۔ وہ گرا پڑا ہے۔“

”لیکن تم لوگوں نے باہر سے کسی طرح کی کارروائی نہیں کرتی۔ ورنہ یہ لوگ سب کچھ بارود سے اڑا دیں گے۔ کچھ باقی نہیں بچے گا۔“ عمران نے کہا۔ خیارد اٹھا اور جھک کر دوڑتا ہوا واپس چلا گیا۔ یقیناً وہ عمران کا یہ پیغام ایڈرنس تک پہنچانا چاہ رہا تھا۔

صرف دو تین منٹ بعد مسٹر ایڈرنس خود بھی ہمارے پاس چھت پر چلا آیا۔ وہ بھی ہانپا ہوا تھا۔ جوش کے سبب اس کا سرخ چہرہ جھٹک رہا تھا۔ عمران نے کہا۔ ”جناب! ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جس شخص کی وجہ سے یہ کام زیادہ بگڑا ہوا تھا، وہ ختم ہو گیا ہے۔ اب باقی لوگوں سے پرانی شرطوں پر بات ہو سکتی ہے۔ اور میرے خیال میں انہیں قائل بھی کیا جاسکتا ہے۔“

ایڈرنس نے کہا۔ ”میں خود بھی چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ بغیر کسی مزید خون خرابے کے حل ہو جائے۔ تم دونوں نے کہا تھا کہ تم ان لوگوں سے مذاکرات کر سکتے ہو۔ اگر تم تیار ہو تو میں تم دونوں کو اندر بھجوا سکتا ہوں لیکن... لیکن... یہ تمہارے لیے بہتر نہیں رہے گا۔ تم ہندو آفیسرز کے سامنے آنا نہیں چاہتے۔“ اس کی کشادہ پیشانی پر چند لمحوں کے لیے سوچ کی لکیریں نظر آئیں پھر وہ تیزی سے بولا۔ ”میں ایک واک ٹاکی کا انتظام کرتا ہوں۔ ایک سیٹ اندر بھجواتا ہوں، دوسرا

تمہیں دے دیتا ہوں۔“

”میرے خیال میں یہ طریقہ ٹھیک رہے گا۔“ عمران نے کہا۔ پھر سوائے نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

ہم ایڈرنس وغیرہ کو یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ ہمارے درمیان پہلے سے وائرلیس رابطہ موجود ہے۔ ویسے یہ رابطہ زیادہ قابل بھروسہ بھی نہیں تھا۔ ہمارا ”سیٹ“ کسی وقت اڑیل ہوئی طرح کوئی بات بھی مان کر نہیں دیتا تھا۔

قریباً پانچ منٹ کے اندر ایک اچھی حالت کا واک ٹاکی ہمارے پاس آن موجود ہوا۔ اس کا دوسرا سیٹ اندر آفتاب خاں تک پہنچا دیا گیا تھا۔ عمران نے مسٹر ایڈرنس سے کہا۔ ”جناب! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں آپ کا اور اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ آپ جلدی سے میرے لیے دو باتوں کی وضاحت فرمادیں۔“

”کہو۔“ ایڈرنس نے افسرانہ شان سے جواب دیا۔

”پہلی بات تو یہ جناب کہ آپ کا اور ہمارا مفاد اس وقت ایک ہی ہے۔ ہم اس معاملے کو اس طرح حل کرنا چاہتے ہیں کہ حشر مار یا اور سلطانی دونوں کی زندگی بچ جائے۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے کہ اس حوالے سے ہمارا ارادہ کتنا مضبوط ہے۔ اندر موجود لوگوں میں سے بدترین شخص کو ہم نے شوٹ کر دیا ہے۔ اب باقی لوگوں سے بات چیت نسبتاً آسان ہو گئی ہے۔ میری درخواست یہ ہے کہ آپ اس سلسلے میں ہم پر اعتماد کریں اور ہمیں یہ بات چیت تمہائی میں کرنے کی اجازت دیں۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ میں یا مسٹر خیارد یہاں موجود نہ ہوں؟“

”بہت معذرت کے ساتھ میرا مطلب یہی ہے جناب! یوں ہمیں بات چیت کرنے میں زیادہ آسانی رہے گی۔“

ایڈرنس چند لمحوں کے لیے متذبذب نظر آیا۔ پھر اس نے اٹھائی انداز میں سر ہلا کر ہائی بھری۔ عمران نے کہا۔ ”بعد میں، میں آپ کو ساری بات چیت سے تفصیلاً آگاہ کر دوں گا جناب۔“

”اوکے... اوکے! دوسری بات کیا ہے؟“ ایڈرنس نے پوچھا۔

”ہم ان سے ”کنٹینٹ“ کی بات کریں گے۔ ہم ان سے کہیں گے کہ وہ اپنے وعدے کی پاسداری کریں۔ باہر سے بھی پاسداری ہوگی۔ اگر وہ حشر مار یا کو چھوڑ دیتے ہیں

تو انہیں یہ رعایت دی جائے گی کہ وہ باقی یہ غنایوں کو مل پانی کی حدود میں پھینچنے کے بعد آزاد کریں۔ اور مل پانی پھینچنے تک ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔“

”بالکل... تم لوگ ان سے اس ”کنٹینٹ“ کی بات کر سکتے ہو۔ میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے ایک بار پھر گارنٹی دیتا ہوں کہ اگر وہ اس ماریا کو رہا کریں تو ہم بھی اپنے عہد کی پاسداری کریں گے۔ یہ پاسداری ہم پہلے بھی کر رہے تھے۔ جو کام بھی خراب ہوا ہے، وہ ہماری طرف سے نہیں ان کی طرف سے ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے پیش امام صاحب کو زبان دے کر اس سے روگردانی کی۔ ان کے لیے شرمندگی کا باعث بنے۔“

میں نے کہا۔ ”جناب! اس ساری صورت حال کا ذمہ دار وہ اکیلا نہیں تھا جو ابھی دن منٹ پہلے مارا گیا ہے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ ایڈرنس نے کہا۔ ”ہماری اور تم دونوں کی توقعات ٹھیک ثابت ہوں۔ میری اور محترم حکم جی کی طرف سے تم انہیں معاہدے کی پاسداری کی پوری ضمانت دے سکتے ہو۔“

طے شدہ پروگرام کے مطابق ایڈرنس نے نیچے چلا گیا۔ تاہم اس کا تحت آفسر خیارد اور وہ انگریز داخل بین چھت پر ہی رہے لیکن وہ برہمنائی نما کمرے کے اندر نہیں تھے۔ یوں ہم اپنی مرضی سے آفتاب اور سلطانی وغیرہ سے بات کر سکتے تھے۔ حالانکہ اس بات کا اندیشہ بھی موجود تھا کہ کسی ذریعے سے ایڈرنس وغیرہ ہماری بات چیت سن نہ لیں۔

عمران نے سوائے نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا خیال ہے، اپنی طرف سے آفتاب کو مسٹر ایڈرنس وغیرہ کی ضمانت دی جاسکتی ہے؟“

”اس کے سوا ہم کبھی کیا سکتے ہیں۔ ویسے سنا تو یہی تھا کہ یہ گورا ایڈرنس وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ شاید تم ہی نے بتایا تھا۔“

”اور مجھے گیتا بھی نے بتایا تھا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا ہے اور رات رات کا مزہ لیا ہوا ہے۔ شاید اس نے اپنا کوئی ذاتی تجربہ بیان کیا ہو۔“

”عمران! میرے خیال میں ہمیں اور وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ تم بات کرو آفتاب سے۔“

عمران نے واک ٹاکی ان کی۔ پہلی ہی کوشش میں آفتاب سے رابطہ ہو گیا۔ اس کی دہائی آواز سنا دی۔ ”تم لوگوں نے اپنی موت پر خود دھم لگایا ہے۔ اب اس کی کوزندہ نہیں چھوڑے گا۔ کتنے کا موت مارے گا سب کو اور سب

سے پہلے یہ بھینسے کے منہ والا تمہارا گورا افسر مرے گا۔۔۔“
 عمران نے کہا۔ ”میں عمران بول رہا ہوں آفتاب۔۔۔
 مجھے افسوس ہے کہ۔۔۔“
 ”ام اب کسی کا بکواس متا نہیں چاہتا۔ ان لوگوں نے
 ہاشم صاحب کو شہید کر دیا ہے۔ اب ان کو بھی موت کا مزہ
 چکھنا پڑے گا۔ ام ان کو صرف ایک گھنٹے کا مہلت دیتا ہے۔
 یہ لوگ یہاں سے امارے جانے کا انتظام کرے۔ ورنہ
 چار پائی لے کر آئے اور احاطے میں سے اپنے ذلیل افسر کا
 لاش اٹھا کر لے جائے۔ صرف ایک گھنٹا۔۔۔ پورے ساتھ
 منٹ۔“ مہلت کی بات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہاشم کی
 نسبت آفتاب خاں میں لچک موجود ہے۔
 عمران نے دھیمے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”آفتاب
 خاں! میری بات کا بُرا نہ ماننا۔ ہاشم صاحب کا رویہ ایک دم
 بہت سخت ہو گیا تھا۔ شاید ان کی جان جانے کی وجہ بھی یہی
 ہے۔ انہوں نے امام صاحب کی بات ماننے سے بھی انکار کر
 دیا۔ حالانکہ وہ اپنی طرف سے پوری گارنٹی دے رہے
 تھے۔“
 آفتاب گرجا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، ام اس میم کو
 چھوڑ دے گا تو یہ ام پر حملہ نہیں کرے گا؟ یہ ایک سیکنڈ کا دیر
 نہیں لگے گا اور امارا لٹکا پوٹی کر دے گا۔ اس گورے افسر کا
 زیادہ اہمیت نہیں ہے ان لوگوں کی نظروں میں۔“
 ”اہمیت ہے آفتاب۔۔۔ اہمیت ہے۔“ میں نے زور
 دے کر کہا۔ ”ابھی پانچ منٹ پہلے یہاں کے انچارج افسر
 اینڈرزن سے ہماری بات ہوئی ہے۔ وہ ہر صورت میں اپنے
 اس بندے کو بچانا چاہتے ہیں۔ پھر بہت سے دوسرے لوگ
 تمہارے پاس اندر موجود ہیں۔ ان لوگوں کے بے شمار
 وارث یہاں دھرتا دیے بیٹھے ہیں۔ ان کو ہر صورت اپنے
 عزیز زندہ چاہیے ہیں۔ وہ افسروں پر مسلسل دباؤ ڈال رہے
 ہیں۔ لی وال کا پوتا بھی تمہارے پاس موجود ہے۔ ماریا کو
 چھوڑنے کے بعد بھی جنہیں کچھ خاص گھانا نہیں ہونے والا
 ہے۔“
 عمران بولا۔ ”اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ہم
 نے مسٹر اینڈرزن کے ذہن کو پوری طرح ٹھوسا ہے۔ اس کا
 ارادہ یہی ہے کہ اگر ماریا کو یہاں رہا کر دیا جائے اور باقی
 لوگوں کو لاش پانی کے اندر جا کر چھوڑ دیا جائے تو وہ کوئی
 کارروائی نہیں کرے گا۔“
 ”ام کیسے یقین کر لے اس بات پر؟ اس انگریز کے
 دماغ کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔“ آفتاب کے لہجے میں جتنی برقرار

تھی۔
 میں نے کہا۔ ”تم ہماری بات پر اس لیے یقین کر رہے
 ہو مسئلہ جتنا تمہارا ہے، اتنا ہی ہمارا بھی ہے۔ میں سلطانہ کو زندہ
 دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کی ضرورت ہے، میرے بچے کو
 اس کی ضرورت ہے۔“
 ”کچھ بھی ہے۔ ام یہاں سے نکلنے سے پہلے اس سفید
 کتیا کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کسی صورت نہیں۔“ اس کے الفاظ سخت
 تھے لیکن لہجے میں تھوڑا سا ڈھیلا پن بھی محسوس ہوتا تھا۔
 میں نے کہا۔ ”تم سلطانہ سے مشورہ کرو۔ مجھے یقین
 ہے کہ وہ بھی خون خرابا نہیں چاہے گی۔ کیا تم اس سے میری
 بات کر سکتے ہو؟“
 ”بالکل نہیں۔ وہ یہ بچے ہے۔ وہاں سے ایک منٹ کے
 لیے بھی نہیں مل سکتا۔“ آفتاب نے کہا۔
 میرے، عمران اور آفتاب کے درمیان یہ گفتگو قریباً
 آدھ گھنٹا جاری رہی۔ ہاشم رازی کی اچانک موت کے غم نے
 آفتاب کو بچکانہ میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ
 وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ ہاشم رازی کا رویہ غیر معمولی طور پر
 سخت تھا۔ غالباً یہ رویہ آفتاب اور سلطانہ کے لیے بھی اچھے کا
 باعث بنا تھا۔ آفتاب یقیناً ہاشم رازی کی موت کی وجہ انگریز
 اور ہندو فوجیوں کو کچھ رہا تھا۔ اس کے دہم و گمان میں بھی نہیں
 ہوگا کہ اسے اسپتال کے ساتھ والی چھت سے ہم نے شوٹ
 کیا ہے۔
 ہاشم اس سارے ”سین“ میں آندھی کی طرح آیا اور
 طوفان کی طرح رخصت ہو گیا تھا۔ اب اس ساری صورت
 حال میں فیصلے کی طاقت ایک بار پھر آفتاب کے پاس تھی اور
 اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پہلے والا فیصلہ برقرار رکھنا چاہتا ہے۔
 یعنی ماریا کو چھوڑنا اور باقی رہنماؤں کے ساتھ روانہ ہونا۔
 قریباً دس منٹ بعد آفتاب نے ہم سے واک ٹاکی پر
 رابطہ کیا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے خود رابطہ کیا تھا۔ ایک
 بار پھر ہمارے اور اس کے درمیان گفت و شنید شروع ہوئی۔
 وہ سمجھوتے کے مطابق ماریا کو چھوڑنے پر رضامند تو تھا لیکن
 ایک شرط کے ساتھ اور وہ شرط بھی کچھ اتنی زیادہ سخت نہیں
 تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اسپتال کے احاطے سے نکلنے وقت
 اپنے ساتھ دس رہنماؤں بٹھائے گا، ان میں زخمی انگریز اور لی
 وال کا پوتا بھی شامل ہوں گے۔ ان میں کوئی عورت نہیں ہو
 گی۔ یہ سب کچھ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ نئی شرط یہ تھی کہ
 احاطے سے نکلنے ہونے ماریا بھی ان کے ساتھ گھوڑا گاڑی
 میں سوار ہوگی۔ بہر حال، گاؤں سے باہر نکلنے کے فوراً بعد وہ

ماریا کو گاڑی سے اتار دے گا۔
 آفتاب کی یہ نئی شرط فوری طور پر قابل قبول نہیں تھی تو
 اسے ناقابل قبول بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس بارے میں
 انگریز افسروں سے بات کی جاسکتی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ
 شاید وہ یہ شرط مان بھی جائیں گے۔
 غالباً آفتاب خاں کو اندیشہ تھا کہ رہنماؤں کے ساتھ
 اسپتال کے اندر سے نکل کر گھوڑا گاڑی میں سوار ہونے کا
 مرحلہ خاصا مشکل ہوگا۔ وہ اچانک حملے کے خطرے سے
 دوچار ہوں گے۔ اس کے بعد جب وہ گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر
 گاؤں کی گلیوں سے گزریں گے تو تب بھی خطرے میں ہوں
 گے۔ لیکن گاؤں سے نکل کر کھلے راستے پر پہنچنے کے بعد وہ نسبتاً
 محفوظ ہو جائیں گے۔ تب وہ ماریا کو اتار دے گا۔
 ہم نے آفتاب خاں سے چندہ منٹ کا وقت لیا اور
 واک ٹاکی پر سلسلہ منقطع کر دیا۔ ہم نے آفیسر فیئرڈے سے کہا کہ
 وہ اینڈرزن صاحب کو یہاں بلائے۔ فیئرڈے گیا اور پانچ منٹ
 میں اینڈرزن کو لے آیا۔ اینڈرزن اور فیئرڈے وغیرہ کی یہ ساری
 آمدورفت بڑی رازداری سے ہو رہی تھی۔ ہندو آفیسر
 اور فوجی اس سارے معاملے سے خبر نہ تھے۔ عام لوگوں کو
 بھی اس بات کی شبہ نہیں پڑنے دی گئی تھی کہ اس رہائشی
 مکان کی چھت پر کون موجود ہے اور یہاں کس طرح کے
 مذاکرات چل رہے ہیں۔
 عمران نے پُر امید لہجے میں کہا۔ ”جناب اینڈرزن
 صاحب! ہمارا خیال ہے کہ یہ معاملہ حل کے قریب آ گیا ہے۔
 بس ایک چھوٹی سی رکاوٹ ہے۔ ہاشم کی موت کے بعد اس
 کے ساتھیوں نے ایک چھوٹی سی شرط رکھی ہے۔ وہ اپنے تحفظ
 کے حوالے سے زیادہ محتاط ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ
 محترمہ ماریا کو اسپتال میں نہیں بلکہ گاؤں سے باہر کھلی جگہ پر
 نکل کر چھوڑیں گے۔“
 ”کھلی جگہ سے کیا مطلب ہے؟“ اینڈرزن نے
 پوچھا۔
 ”مطلب یہ کہ گاؤں کی آبادی سے نکلنے کے فوراً
 بعد۔“ میں نے جواب دیا۔
 اینڈرزن نے سگار کے دو ٹوٹل کش لیے پھر بولا۔ ”تم
 دونوں کا کیا خیال ہے، اس میں کوئی جکڑ بازی تو نہیں ہوگی؟“
 ”میں نے تفصیلی بات کی ہے۔“ عمران نے کہا۔
 ”ہاشم کی موت کے بعد وہ لوگ کچھ ڈرے ہوئے ہیں۔ شاید
 انہیں خطرہ ہے کہ گاڑی میں متعلق ہونے کے دوران میں ان
 پر حملہ نہ ہو جائے۔“

میں نے کہا۔ ”مسٹر اینڈرزن! آپ ان معاملوں میں
 زیادہ بہتر فیصلہ دے سکتے ہیں لیکن جو چیز مجھے بندے کو
 بھی نظر آ رہی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ پورا گاؤں فورس کے
 گھیرے میں ہے۔ عمارت کے اندر کی نسبت گھوڑا گاڑی
 میں ان لوگوں کی پوزیشن کہیں زیادہ کمزور ہوگی۔ اگر وہ
 گاؤں سے نکلنے ہی محترمہ ماریا کو باہر کرنے کی بات کر رہے
 ہیں تو یہ کچھ میں آتی ہے۔“
 اس معاملے میں ہمارے درمیان چند منٹ بات
 ہوئی۔ دو چار منٹ کے لیے سیکنڈ آفیسر فیئرڈے بھی اس میں
 شامل ہوا۔ آخر طے ہوا کہ اگر حملہ آور باقی ساری شرائط مان
 رہے ہیں تو ان کو یہ گنجائش دے دی جائے۔ اینڈرزن وغیرہ
 ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ اندر دو سے زیادہ حملہ آور موجود
 ہیں۔
 اینڈرزن کی موجودگی میں ہی ہم نے واک ٹاکی پر
 آفتاب خاں سے رابطہ کیا۔ اس رابطے میں ساری تفصیلات
 طے ہو گئیں۔ ہم نے آفتاب کو بتایا کہ دو گھنٹوں والی بڑی
 گھوڑا گاڑی تیار ہے۔ دو اضافی گھوڑے بھی موجود ہیں۔
 راستے کے لیے راشن وغیرہ بھی مہیا کیا جا رہا ہے۔
 آفتاب بولا۔ ”شک ہے، ام آدھ گھنٹے کے اندر اندر
 تیس عورتوں اور مردوں کو چھوڑ دے گا۔ دس بندہ امارے
 ساتھ رہے گا۔ ام ایک بار پھر سب لوگوں کو بتانا چاہتا ہے کہ
 اگر ہمارے خلاف کوئی حرکت ہو تو ان سب میں سے کوئی
 ایک بھی زندہ حالت میں نہیں ملے گا۔“
 اینڈرزن کے اشارے پر عمران نے اس سے پوچھا۔
 ”کیا تم ماریا یا آفیسر نام سے بات کر سکتے ہو؟“
 ”نہیں، ابھی کسی سے بات نہیں ہو سکتا۔“ اس نے
 بھڑک کر کہا۔ ”ابھی تم فوجیوں سے کہو کہ وہ گھوڑا گاڑی کو
 احاطے میں لے کر آئیں اور برآمدے کے پاس بائیں
 طرف کھڑا کر کے باہر نکل جائیں۔ پچانک کے سامنے اور
 آس پاس کوئی کالا گورا فوجی نہیں ہونا چاہیے۔ پوری کئی
 ہونے کے بعد ہی ہم لوگوں کو چھوڑے گا۔“
 آدھ گھنٹے کے اندر اندر یہ سب کچھ ہو گیا۔ آفتاب
 نے ایک بار پھر چھت پر چڑھ کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہ ہمیں
 واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پانی والی گول ٹینکی کے پیچھے
 بس اس کے بیوے کی جھلک ہی دکھائی دیتی تھی۔ ہاشم کی
 اچانک موت کے بعد وہ زیادہ محتاط ہو چکا تھا۔ ہمارے
 اندازے کے مطابق ہاشم کی لاش بھی ابھی تک ٹینکی کے آس
 پاس ہی پڑی تھی۔

آفتاب نیچے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ہم نے دھڑکتے دلوں کے ساتھ دیکھا کہ اسپتال کا ایک اندرونی دروازہ کھلا اور ایک قطار میں کچھ لوگ باہر نکلے۔ ان میں چھ سات عورتیں اور تین بچے بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کی کل تعداد تیس کے قریب رہی ہوگی۔ میں نے ٹیلی اسکوپ کے ذریعے دیکھا۔ ان میں سے کچھ افراد زخمی بھی تھے۔ ایک مریض کی ٹانگ پر پلاسٹر تھا اور وہ بیٹھا کھڑے باہر آ رہا تھا۔ قریباً بہتر محض کے اعصاب شکن دباؤ کے بعد ان لوگوں کو مکملی ہوا میں سانس لینا نصیب ہوا تھا۔ ان کا یہ سفر موت سے زندگی کی طرف تھا۔ وہ احاطے میں پہنچے اور باہر نکل آئے۔ پچانک سے پچیس تیس میٹر کی دوری پر ان کے لواحقین موجود تھے۔ وہاں رقت آمیز مناظر دیکھنے میں آئے۔ لوگ ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے اور دھاڑیں مار مار کر رورہے تھے۔ ایک فاقہ زدہ یرغالی عورت جس کا شوہر آفتاب خاں کی گولی کا شکار ہو کر مر گیا تھا، باہر آ کر بے ہوش ہو گئی اور لوگ اسے اٹھا کر اندر لے گئے۔

صبح چار بجے کے قریب وہ مرحلہ شروع ہوا جس کا ہر کسی کو شدت سے انتظار تھا۔ آفتاب خاں نے وادی ناکی پر بتایا۔ ”ام لوگوں کو لے کر باہر نکل رہا ہے۔ ام ایک بار پھر کھڑے رہا ہے کہ احاطے کے آس پاس اور پچانک کے قریب کسی کو موجود نہیں ہونا چاہیے۔“

”کوئی موجود نہیں ہے۔“ عمران نے کہا۔ ”اور تم سے بھی گزارش ہے کہ خود کو پُر مسکون رکھو۔ اب جو کچھ ہوتا ہے، وہ سب طے ہے۔ کوئی پکڑے، کوئی چال بازی اب یہاں نہیں ہے۔“

چند منٹ بعد ہم نے چھت پر سے اسپتال کے برآمدے کا منظر دیکھا۔ فباڑ بھی ہمارے ساتھ موجود تھا۔ اندرونی دروازہ کھلا اور یرغالیوں کی قطار باہر نکلی۔ ان سب کے ہاتھ پشت پر مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ سر جھکا کر چل رہے تھے۔ ان میں ہمیں ڈاکٹری وان کا سہا ہوا پوتا بھی نظر آیا۔ سب سے آخر میں ماریا بھی۔ اس کے ہاتھ بھی پشت پر کسے گئے تھے۔ آفتاب نے اپنی طاقتور سیون ایم ایم کی نال اس کی پشت سے لگا رکھی تھی۔ یقیناً اس رائل کے دو تین برست چنڈکنڈ میں ان دس گیارہ یرغالیوں کا خاتمہ کر سکتے تھے۔ پھر ہم نے سلطانہ کو دیکھا۔ اس کا یہ روپ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنا پہرہ چادر میں اس طرح پیٹا ہوا تھا کہ بس آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک چوٹی نال کی رائل تھی۔ اس کا رائل تھامنے کا انداز اور اس

کا اعتماد بتاتا تھا کہ وہ اسلحہ شاس ہے اور بوقت ضرورت اسے بے دریغ استعمال بھی کر سکتی ہے۔ وہ یرغالیوں کی قطار کی بائیں جانب تھی۔ صرف زخمی انگریز آفیسر نام وہ شخص تھا جس کے ہاتھ پشت کے بجائے سامنے کی طرف باندھے گئے تھے۔ ٹیلی اسکوپ میں دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے کندھے پر گھرا زخم ہے۔ وہ لنگڑا ہوا۔ مشکل چل پارہا تھا۔ یرغالیوں کی قطار احاطے میں کھڑی گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھی۔ یہ بے حد تاؤ بھرے لمحے تھے۔ اسپتال کے ارد گرد گلیوں میں اور گھروں کی چتوں پر سیکڑوں سپاہی اور گارڈز موجود تھے۔ ان میں سے بہت سے براہ راست یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

ابھی پہلا یرغالی گھوڑا گاڑی میں داخل ہوا تھا کہ وہ کچھ ہوا جس کی توقع کسی کو نہیں تھی۔ اوپر سے دو فائر ہوئے۔ میں نے آفتاب کو ایک دم لڑکھڑاتے اور جھٹکے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی آفتاب نے اپنی رائل کا ٹریگر دبا دیا۔ تڑتڑکی لڑزہ خیز آواز گونجی۔ کئی گولیاں ماریا کے جسم کے آس پاس ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی سلطانہ نے بھی اوپر تلے فائر کیا۔ میں نے یرغالیوں میں سے کم از کم دو افراد کو زمین بوس ہوتے دیکھا۔

ایک دم کھرام بج گیا اور شب کا سناٹا چٹکھڑاتی آوازوں سے چٹکا چور ہو گیا۔ کئی طرف سے فائر ہونے لگے۔ میں نے دیکھا کہ زخمی آفتاب تیزی سے ریتکتا ہوا ایک طرف اوچھل ہو گیا ہے۔ رائل بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ سلطانہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ لگتا تھا کہ وہ بھی کسی اوٹ میں ہو گئی ہے۔ گھوڑا گاڑی کا ایک گھوڑا زمین پر پڑا ترپ رہا تھا۔

دفعتاً میں نے عمران کو دیکھا۔ وہ میرے پہلو میں نہیں تھا۔ وہ تیزی سے دوڑتا ہوا چھت کے آخری کنارے کی طرف جا رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کسی کے پیچھے لپکا ہے۔ چھت کی منڈ پر تک پہنچ کر اس نے ہوا میں جست لگائی۔ یہ ویسی ہی جست تھی جیسی پیراک سوئمنگ پول میں کودنے کے لیے لگاتے ہیں لیکن عمران کے نیچے سوئمنگ پول نہیں تھا۔ پھر بیٹھے اندازہ ہوا کہ وہ پرانی کے ایک بڑے ڈھیر پر گر رہا ہے اور وہاں سے لڑھک کر زمین پر آ گیا ہے۔ اٹھ کر وہ پھر کسی کے پیچھے لپکا۔ اب میں نے بھاگنے والے کا سایہ بھی دیکھ لیا۔ وہ برق رفتاری سے چھتوں کی طرف جا رہا تھا۔ ایک دم میری سمجھ میں آ گیا کہ عمران کس کے پیچھے دوڑا ہے۔ جن دو فائر کی وجہ سے ہنگامہ شروع ہوا، وہ ہماری

دائیں جانب والی دو تین چتوں میں سے کسی ایک چھت پر سے ہوئے تھے۔ غالباً عمران نے فائر کرنے والے کو دیکھ لیا تھا اور اب اس کو پکڑنا چاہ رہا تھا۔ اس شخص نے بھاگتے بھاگتے ایک دم پلٹ کر عمران پر گولی چلائی۔ اس کے ہاتھ میں رائل تھی۔ عمران نے نیچے گر کر خود کو بچایا تاہم اس وقت یہ اندیشہ بھی میرے ذہن میں آیا کہ کہیں اسے گولی تو نہیں لگ گئی۔ عمران نے نیچے لیٹے لیٹے دو جوابی فائر کیے لیکن یہ فائر تو مقابل کو لگے نہیں۔ میں نے اسے برق رفتاری سے گتے کے کیمٹوں میں اوچھل ہوتے دیکھا۔

جونہی عمران کھڑا ہوا، میں نے ایک اور لڑزہ خیز منظر دیکھا۔ ایک جانب سے ایک اور لمبا ترنگ شخص برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں رائل تھی۔ اس کا ارادہ عیاں تھا، وہ عقب سے عمران کو نشانہ بنانا چاہ رہا تھا۔ یہ بس سینکڑوں کاکیل تھا۔ میں نے ٹیلی اسکوپ پھینک کر رائل پکڑی۔ ابھی مجھے رائل سیدھی کرنے اور نشانہ لینے میں تین چار سینکڑ گتے تھے اور میرا نشانہ بہت اچھا بھی نہیں تھا لیکن یہ تین چار سینکڑ شروع ہونے سے پہلے ہی وہ کچھ ہو گیا جس کی توقع نہیں تھی۔ قریبی کھیت میں سے ایک چوڑا سا نکلا اور برق رفتاری سے رائل بردار پر جا پڑا۔ یہ ایک کتا تھا۔ اس کی آواز کیمٹوں کے درمیان دور تک گونجی۔ میں نے کتے اور رائل بردار کو اوپر نیچے کرتے دیکھا۔ دونوں جھمکے کھاتے تھے۔ ان کے درمیان فائر کا شعلہ لپکا۔۔۔ یہ وہ وقت تھا جب عمران کو اندازہ ہوا کہ اس کے عقب میں کیا ہو رہا ہے۔ عمران پلٹا۔ مگر جب تک میں کھلے ہو گیا۔ خودمختار کتے نے ایک دم رائل بردار کو چھوڑا اور کیمٹوں میں اوچھل ہو گیا۔ یوں لگا جیسے وہ فائر کی خوفناک آواز سے بدک گیا ہے لیکن جو کچھ بھی تھا، کتا اپنا کام کر رہا تھا۔ رائل بردار بے سدھ پڑا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، وہ یو پیکل کتے کی اچانک جست کے سبب اس کی رائل سے گولی چل گئی تھی۔ رائل کا رخ اوپر کی طرف تھا اس لیے گولی نے رائل بردار کو ہی نشانہ بنا ڈالا تھا۔ پگھلا ہوا قریباً بیس گرام سیسہ رائل بردار کی ٹھوڑی کے نچلے حصے میں داخل ہوا تھا اور اس کا تالو پھاڑ کر کھو پڑی میں گھس گیا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ کوئی اور نہیں، وہی کتا ہے جو پچھلے دو تین دن سے ہمارے ارد گرد منڈلاتا رہا تھا۔

آفتاب کو گولی لگنے سے لے کر، کتے کے نمودار ہونے اور پھر نامعلوم رائل بردار کی ہلاکت تک کے سارے واقعات صرف آٹھ دس سینکڑ کے اندر ہی رونما ہوئے۔ عمران دوڑتا ہوا دوبارہ گھر میں داخل ہوا اور سیزر حیاں چڑھ کر پھر

چھت پر آ گیا۔ اسپتال کے احاطے کے اندر قیامت پر پا کھی۔ اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہمیں احاطے میں کم از کم پانچ لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک واضح طور پر ماریا کی تھی۔ وہ آوندھی پڑی تھی، اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

”اب یہ لوگ سلطانہ اور آفتاب کو نہیں چھوڑیں گے۔“ عمران نے مسراتی آواز میں کہا۔ میرے سینے میں کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا اور اس کی کرچیاں پورے جسم میں پھیل گئیں۔۔۔ ”ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے کراہتی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

عمران نے جواب نہیں دیا۔ اس کی نگاہیں احاطے پر جمی تھیں۔ ہنزیر چل رہا تھا۔ بلب کی مدھم دھم میں سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ درجنوں رخ گاڑز اور کمانڈوز نے ایک دم تین اطراف سے اسپتال پر بلا بول دیا تھا۔ وہ بارش کی طرح گولیاں برساتے ہوئے اسپتال کے احاطے میں گھس گئے اور مختلف چیزوں کی آڑ لے لی۔ کمانڈوز کی ایک ٹولی احاطے کا ایک بطنی دروازہ توڑ کر اندر گھس گئی۔ انہوں نے برآمدے کے بالکل قریب پوزیشن لی۔ ان کی اندھا دھند فائرنگ نے اسپتال کے سارے اندرونی شیشے توڑ ڈالے۔ ہر طرف شعلے لپکتے نظر آئے اور دھواں پھیل گیا۔ میں ٹیلی اسکوپ سے دیکھ رہا تھا۔ جب اچانک میری نظر ایک منظر پر پڑی اور ہر امید دم توڑ گئی۔ یہ آفتاب خاں کی لاش تھی۔ وہ برآمدے کے ایک پورکھونٹوں کے پیچھے اونڈھا پڑا تھا۔ اس کے لباس پر خون کے دھبوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا سارا جسم پھٹنی ہو گیا ہے۔ اس کی بے لیر ہوا سیون ایم ایم رائل بھی اس کے پاس پڑی تھی۔

میں نے کہا۔ ”عمران! سلطانہ اکیلی رہ گئی ہے شاید۔“ اس کے ساتھ ہی میں نے ٹیلی اسکوپ عمران کی طرف بڑھائی اور برآمدے کے آخری حصے کی طرف اشارہ کیا۔ عمران نے دیکھا اور اس کے ہونٹ بھی کڑ گئے۔

”اس کا مطلب ہے کہ جوابی فائر صرف سلطانہ کر رہی ہے۔“ عمران نے کہا۔

”اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ۔۔۔ دو تین منٹ سے زیادہ نہیں نکال سکے گی۔“ میری آواز رندھ گئی۔

تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اسی جگہ آفتاب اور سلطانہ کا قہر کر دینا چاہتے ہیں۔

”کیا خیال ہے عمران... اسے بچانے کی کوشش کریں؟“ میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔
”کوشش کرنی چاہیے لیکن اس کے لیے ہمیں نیچے جانا ہوگا۔ سب کے سامنے آنا ہوگا۔ کیا تم اس کے لیے تیار ہو...؟“

”میں تیار ہوں۔“ میں نے کہا۔

عمران ایک سینئر ضابطہ کے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دوڑتے ہوئے سڑکیاں اترے پھر ایک گلی سے گزر کر اسپتال کی طرف آئے۔ لوگ کوٹے کھدروں میں جیسے ہوئے تھے۔ ہر طرف دہشت بریں دہی تھی۔ ہم چھانک پر پہنچے۔ ہندو گارڈز نے ہمیں دیکھا۔ ان میں سے کچھ نے ہمیں پہچان لیا۔ ان کی آنکھوں میں ہراس آمیز حیرت نظر آئی۔ پانڈے کے ایک ماتحت کا ہاتھ بے ساختہ اپنے پتول کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب عمران کی نظر خیاباد پر پڑ گئی۔ وہ انگریزی میں بولا۔ ”مسٹر خیاباد! بات سنئے۔“

خیاباد بھی ہمیں کھلے عام سب کے سامنے دیکھ کر حیران ہوا۔ عمران اسے ایک طرف لے گیا۔ ان دونوں کے درمیان بس چار پانچ جملوں کا تبادلہ ہوا۔ احاطے میں ہونے والی فائرنگ شدید ہوتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ سلطانہ نے کہیں اچھی پوزیشن لی ہوئی ہے اور پھر پورے جواب دے رہی ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ عمران نے خیاباد سے کیا کہا ہے۔ یقیناً اس نے اس سے درخواست کی تھی کہ اسے آگے جانے کا موقع دیا جائے۔ وہ سلطانہ کو ہتھیار ڈالنے اور گرفتاری دینے پر آمادہ کر دے گا۔ خیاباد کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ عمران کی بات کا اس پر مثبت اثر ہوا ہے۔ وہ تیزی سے پیچھے گیا۔ غالباً آپریشن انچارج مسٹر اینڈرسن سے اجازت لینے گیا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا گیا تھا، دوڑتا ہوا ہی واپس آیا۔ اس دوران میں ہندو سپاہی ہمیں شعلہ بار نظروں سے دیکھتے رہے تھے۔ واپس آتے ہی خیاباد نے ہم دونوں کو ساتھ لیا اور چکر کاٹ کر احاطے کے اس نقلی دروازے پر پہنچا جسے توڑ کر کاٹھنڈ واز چار پانچ منٹ پہلے اندر گھسے تھے۔

احاطے میں داخل ہونے سے پہلے خیاباد نے میری اور عمران کی رائفلیں لے کر اپنے ساتھیوں کو تھما دیں۔ اس کے بعد اس نے بلند آواز میں کاٹھنڈ واز کو حکم دیا کہ کچھ دیر کے لیے فائرنگ روک دیں۔ فائرنگ دم دم ہوئی اور پھر رک گئی۔ تاہم کاٹھنڈ واز نے اپنی پوزیشن برقرار رکھیں۔

رائفلوں کے کندھے ان کے شانوں سے گھر رہے اور انہیں مارگٹ پر بھی رہیں۔ اندازہ ہوا کہ سلطانہ انشور روم کے قریب ایک دس فٹ اونچی گیلری میں موجود ہے۔ اور اس کے اندر سے جوابی فائر کر رہی ہے۔ قیامت خیز فائرنگ میں وقفہ آیا تو دہلی ہوئی آوازیں ابھر آئیں۔ ایک آواز کسی شدید زخمی کی گئی جو برآمدے کے اندر دنی حصے میں پڑا تھا اور مدد کے لیے تڑپ رہا تھا۔ دوسری آواز احاطے میں تڑپتے پھڑکتے زخمی گھوڑے کی تھی۔ اس کے علاوہ احاطے کے باہر اور ارد گرد کی چٹتوں پر گونجنے والی صدائیں تھیں۔ مسل فوجی اور کمانڈر ایک دوسرے کو پکار رہے تھے۔ ہدایات دے رہے تھے یا رے تھے۔

”آجاؤ اندر۔“ خیاباد نے ہم دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کر کے کہا۔

ہم دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے خیاباد کے پیچھے، برآمدے تک پہنچے اور ایک چھوٹی سی دیوار کی اوٹ میں ہو گئے۔ میں نے کن آنکھوں سے دیکھا۔ آفتاب خاں کی لاش بس اٹھ دس قدم کے فاصلے پر چوکور ستون کے پیچھے پڑی تھی۔ لگتا تھا کہ کاٹھنڈ واز نے دہشت میں اس کی لاش پر بھی گولیاں برسائی ہیں۔ چوکور ستون کی اوٹ میں کھڑے ایک انگریز نے بھاگ کر اپنی پوزیشن تبدیل کی تو گیلری کی طرف سے فوراً رائفل کا فائر ہوا۔ کاٹھنڈ واز بال بال بچا۔

خیاباد نے ہاتھ میں پکڑا ہوا مکانو میری طرف بڑھا یا۔ میں نے پکار کر کہا۔ ”سلطانہ! گولی چلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تم اپنی رائفل نیچے پھینک دو اور خود بھی باہر آ جاؤ۔“ خیاباد صاحب نے وعدہ کیا ہے، تم پر فائر نہیں کیا جائے گا۔“ کچھ دیر تک مکمل خاموشی رہی پھر اندر سے چلا کہ کچھ کہا گیا۔ یہ سلطانہ ہی تھی۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آئے لیکن آواز واضح طور پر پہنچ رہی تھی۔ میں نے مکانو کی طرف رکھ دیا اور بلند آواز سے کہا۔ ”سلطانہ! یہ لوگ زیادہ دیر انتظار نہیں کریں گے۔ تم فوراً رائفل باہر پھینک دو اور ہاتھ اٹھا کر نکل آؤ۔“

جواب میں سلطانہ نے پھر چلا کہ کچھ کہا۔ اس مرتبہ الفاظ بھی ہماری سمجھ میں آئے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”تاہم یہودج... میں ہندو خ تاہم بیچیکوں کی... میں... آخری دم تک لڑوں گی...“ اس کی آواز میں زخمی شیرینی جیسا درد موجود تھا اور غلط فہمی۔ یہ اسی راجپوت لڑکی کی آواز تھی جو سر جھکانے سے سر کھٹا بہت بڑھتی تھی۔ یہ آواز کہہ رہی تھی۔ ”ہوا“ کو زنجیریں کون پھانسا سکتا ہے اور میں گھنے جھنگوں کی مست ”ہوا“

ہوں۔ اور سمندر کو قید کون کر سکتا ہے؟ میں ساحلوں کے گہرے میں نہ رہنے والا سمندر ہوں اور حق کی آواز کو کوئی ”ختم“ کیسے دبا سکتا ہے اور میں حق کی وہی سرکش آواز ہوں۔

میں نے ہر دور میں ظلم کو لاکھا رہا۔ میں ہر دور میں لہو لہان ہوئی ہوں اور ہر آنے والے دور میں نئی طاقت اور نئے جوش کے ساتھ ابھر رہی ہوں۔

میں نے اور عمران نے دیکھا تھا کہ سلطانہ موت کے گہرے میں ہے۔ کسی بھی وقت اس کی جان جاسکتی ہے۔ یہ گھنٹوں یا منٹوں کی نہیں، سینکڑوں کی بات تھی۔ ہم سلطانہ کو بچانا چاہتے تھے۔ کم از کم وقتی طور پر بچانا چاہتے تھے۔ وہ زندہ گرفتار ہو جاتی تو پھر شاید اس کی زندگی کے لیے کوئی راستہ بھی نکل آتا، کوئی وسیلہ بھی پیدا ہو جاتا۔ انہونیوں کی منہاجش تو ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ امید کی آنکھیں ہمیشہ کرشموں کی راہ دیکھتی ہیں اور میری بھی یہ انتظار رنگ بھی لاتا ہے۔

اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جاتا تو اس موجودہ واقعے میں سلطانہ کا کردار، گھنٹی میں سب سے کم تھا۔ خون خرابے کے اصل ذمے دار آفتاب اور پھر ہاشم رازی تھے۔ ممکن تھا کہ سلطانہ کے گرفتار ہوجانے کی صورت میں مسٹر اینڈرسن اور دوسرے انگریز عہدیداروں کے دلوں میں اس کے لیے رحم کی کوئی رقع پیدا ہو جاتی۔ میرا اندازہ بھی یہی تھا کہ مسٹر اینڈرسن اور خیاباد وغیرہ سلطانہ کو زندہ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ سلطانہ کا انکار سننے کے بعد کاٹھنڈ واز نے پھر گیلری کا نشانہ لے لیا تھا۔ اب مسٹر اینڈرسن خود بھی وہاں آن موجود ہوا تھا۔ اس کے اپنے ہاتھ میں بھی جدید ماؤزر تھا۔ اس کے صرف ایک اشارے پر ایک بار پھر سلطانہ پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو سکتی تھی۔ میں مسٹر اینڈرسن کے سامنے آ گیا۔ میں نے کہا۔ ”جناب! آپ ان لوگوں سے کہیں کہ کوئی فائر نہ کرے۔ میں سلطانہ سے بات کر رہا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ گرفتاری دے دے گی۔“

”جو کچھ کرنا ہے، جلدی کرو۔“ مسٹر اینڈرسن کا لہجہ سخت تھا۔

میں کاٹھنڈ واز اور مسٹر خیاباد کی ہدایات کو نظر انداز کرتا ہوا ٹھوڑا سا اور آگے چلا گیا۔ میں نے پکار کر کہا۔ ”سلطانہ! میں تمہارا شوہر ہوں۔ میں... زندگی میں پہلی بار تم سے کچھ مانگ رہا ہوں۔ انکار نہ کرنا سلطانہ... بات تمہاری سمجھ میں آنے یا نہ آنے لیکن مان لو۔ رائفل کھڑکی سے باہر پھینک دو

اور خود بھی نکل آؤ۔“

چند سینکڑ بعد سلطانہ کی گونگہر آواز ابھری۔ ”مہرودج... خدا کے لیے... مجھے اتنی بڑی آزمائش میں ناہیں ڈالو۔ یہ بڑا سخت امتحان ہے۔“

”سخت امتحانوں میں سے ہی بہتری کا راستہ بھی نکل آتا ہے سلطانہ۔ اور مجھے امید ہے نکلے گا۔ میری اور بالوکی خاطر بات مان لو۔ باہر نکل آؤ۔ میں نے بڑے صاحب سے بات کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ تم بس کھڑکی کھول کر رائفل باہر پھینک دو۔“

وہ خاموش رہی۔ یوں لگا کہ وہ فیصلے کی سولی پر لٹک رہی ہے۔ مسٹر اینڈرسن نے دیواری اوٹ سے دہاڑ کر کہا۔ ”میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ اسے کہو باہر نکل آئے۔“

کمانڈر اب آگے بڑھتے ہوئے گیلری کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ میں نے ایک بار پھر کہا۔ ”سلطانہ... باہر آ جاؤ۔“ میری خاطر۔“

پندرہ بیس سینکڑ... پندرہ بیس گھنٹوں کی طرح گزرے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ گیلری کا دروازہ کھلا۔ سلطانہ باہر نکلی۔ وہ ابھی تک اسی لباس میں تھی جس میں پھر یوم کے مندر میں تھی۔ اس کے جسم پر لہرے دار ساڑی تھی، نکالوں میں چاندی کے جھمکے، کلانیوں میں وہی پہلی اور سرخ چوڑیاں تھیں جو اسے آفتاب نے لا کر دی تھیں۔ یہ سب کچھ ایک ہندو ناری کا روپ دھارنے کے لیے تھا۔ میں نے دیکھا اس کی ساڑی کندھے پر سے خون آلود ہے۔ یقیناً وہ زخمی بھی تھی۔ اس کے ہر وقت قدحاری اتاروں کی طرح دھکنے والے رخسار پر نظر آتے تھے۔ اس کی سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے رائفل پھینک دی۔ یہ رائفل پھر شور انداز میں سڑکیوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے آ گئی۔ یہی وقت تھا جب میری نظر سینکڑ آفیسر خیاباد پر پڑی۔ اس نے کاٹھنڈ واز کی طرف دیکھ کر آنکھوں سے کوئی اشارہ کیا۔ اگلا کچھ قیامت کا تھا۔ ایک ساتھ تین چار رائفلوں سے تڑتڑی خوفناک آواز بلند ہوئی۔ سلطانہ کا جسم اچھل کر پیچھے کی طرف گیا۔ گیلری کی دیوار سے ٹکرایا اور پھر سڑکیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آ گیا۔

”سلطانہ!“ میرے سینے کی گہرائی سے پکار بلند ہوئی۔ میں بے ساختہ اس کی طرف لپکا۔

میں اس کے اوپر گر گیا۔ اس حشر خیز لمحوں میں شاید میرے دماغ کے اندر یہ آیا تھا کہ میں اس کے اوپر گر جاؤں گا تو وہ مزید گولیوں کی زد سے محفوظ ہو جائے گی۔ لیکن اسے

مزید گولیوں کی ضرورت ہی کہاں تھی؟ اس کا سیدہ چھٹی ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ شاید اس کی زندگی کے آخری دو تین سیکنڈ تھے۔ ”مہر دج“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی... وہ مر چکی تھی۔ میرے زخموں پر اپنے محبت بھرے ہونٹ رکھنے والی، میرے رستے کے کانٹے اپنی ہچکوں سے چھنے والی، میری خاطر اپنا سب کچھ لٹا دینے والی، مر چکی تھی اور اس کا سر میری بانہوں میں تھا۔

...میں پلٹا... مجھے اپنے سامنے کچھ نظر نہیں آیا۔ بس ایک سرخ چادر تھی جو آنکھوں کے سامنے لٹی تھی۔ اس چادر کے اندر سے کمانڈوز کے منکس چہرے برہمنائیوں کی طرح نظر آتے تھے۔ میں دھاڑا۔ مجھے نہیں معلوم میں نے کیا کہا اور کس کو کہا۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ اس آواز کی گونج مجھے اپنے پورے جسم میں اور سارے درود پوار میں محسوس ہوئی۔ میں اپنے قریب ترین انگریز کمانڈو کی طرف بڑھا۔ یہ انہی میں سے تھا جنہوں نے میری ہتھی سلطانیہ پر کوئی چلائی تھی۔ اس کے جسم کو چھلنی کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کمانڈو نے میری طرف رائفل سیدھی کی ہے۔ اس وقت یہ قاتل رائفل مجھے دنیا کی حقیر ترین چیز محسوس ہوئی۔ میں کمانڈو سے ٹکرایا اور اسے اپنے نیچے لیتا ہوا درو جا گرا۔ یہی وقت تھا جب میں نے ضیاء کو دیکھا۔ وہ میری طرف رائفل سیدھی کر رہا تھا۔ ایک طرف سے عمران عقاب کی طرح جھپٹا اور ضیاء کی رائفل کی ٹال اوپر اٹھا دی۔

اچانک میرے سر پر کوئی بہت وزنی چیز لگی۔ اس کے ساتھ ہی محسوس ہوا کہ درجنوں ہاتھوں نے مجھے دبوچ لیا ہے۔ ایک بار پھر کوئی وزنی شے سر سے ٹکرائی۔ میری آنکھوں کے سامنے تپتی ہوئی سرخ چادر کا رنگ تبدیل ہونے لگا۔ وہ بتدریج سیاہ ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

پتا نہیں میں کتنی دیر بے ہوش رہا اور کس حال میں رہا۔ دوبارہ حواس بحال ہوئے تو میرے ارد گرد لائٹس کی مدھم روشنی تھی۔ میں کچھ دیر تک بالکل خالی ذہن کے ساتھ لیٹا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے مجھے احساس ہوا کہ مجھ پر کیا قیامت بیت چکی ہے۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے سر سے درد کی شدید تپسیں اٹھیں۔ لیکن شاید اس سے دس گنا زیادہ درد بھی ہوتا تو مجھے وہ کرنے سے نہ روک سکتا جو میں نے کیا۔ میں اٹھا اور نیم دیوالگی کی سی کیفیت میں ”سلطانہ... سلطانہ...“ پکارنے لگا۔ پھر میں کمرے کے بند دروازے پر پل پڑا۔ میں نے دو ہنتر چلائے، اسے

ٹھوکریں رسید کیں۔ میری آواز نے درود پوار کو لرزادیا۔ میں چلا رہا تھا۔ ”دروازہ کھولو حرام زادو... تم نے اسے مار دیا۔ میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، میں تمہیں زندہ جلا دوں گا۔ میں سب کو را کہ کر دوں گا۔ میرا کچھ نہیں بچا۔ کان کھول کر سن لو۔ کسی کا کچھ نہیں بچے گا۔ کسی کا نہیں بچے گا۔“ میں پھر دروازے پر حملہ آور ہوا۔ چوٹی دروازہ بہت مضبوط تھا پھر بھی چھٹنے لگا۔

ایک طرف سے عمران نمودار ہوا اور اس نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ ”ہوش کرو تابی! اس طرح کچھ نہیں ہو گا۔ جانے والی جا چکی ہے... اب میرا اور بہت سے کام لینا ہو گا۔“

میں نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا۔ ”تم لو میرا اور بہت سے کام، میں نہیں لوں گا۔ میں مر جاؤں گا اور ان سب کو مار ڈالوں گا۔ انہوں نے میری ہتھی سلطانیہ کو بار بار ہے۔ وہ میرے کہنے پر باہر آئی تھی۔ میرے کہنے پر اس نے خود کو حوالے کیا تھا۔ اس سفید سورنیارڈ اور اینڈرسن نے مروایا اسے۔ انہوں نے دھوکا دیا۔“

عمران نے ایک بار پھر مجھے بازوؤں میں بھرا۔ ”نہیں تابی! موت کا وقت مقرر ہے۔ جو ہوا ایسے ہی ہوتا تھا۔ اور کیا پتا... یہ اچھا ہی ہوا ہو۔ وہ پکڑی جاتی تو اس کی موت مشکل ہو جاتی۔ ان لوگوں نے اسے معاف تو نہیں کرتا تھا نا۔ یہ تو اس کی بوئیاں نوچنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اب اسے خدا کی رضا سمجھو۔ اپنے آپ کو سنبا لو تابی۔“

درد میری برداشت سے باہر تھا۔ میں کراہا۔ ”مجھے چھوڑ دو۔ مر جانے دو مجھے۔ اس کے پاس چلے جانے دو۔“

میں نے خود کو چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ عمران نے مجھے نہیں چھوڑا۔ میں نے اسے زوردار جھٹکے دیے۔ کوئی اور ہوتا تو مجھے گرفت میں نہ رکھ سکتا مگر اس کے فولادی بازوؤں نے مجھے گھیرے رکھا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ دے کر زور لگایا۔ اس کی گردن پیچھے مڑ گئی مگر بازوؤں کی گرفت برقرار رہی۔ میں پٹکارا۔

”تم نے کیا کیا... تم نے بھی بس تماشا دیکھا؟ میری طرح تم نے بھی اسے مرنے دیا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ چھلنی ہو گئی۔ مجھے چھوڑ دو۔“

میں نے پورا زور لگایا۔ ہم دونوں دیوار سے ٹکرائے پھر پختہ فرش پر گر گئے لیکن عمران نے مجھے چھوڑا نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ میں پھر دروازے پر پل پڑوں گا۔ اسے توڑ دوں گا یا خود کو شدید زخمی کر لوں گا۔ اس کی مضبوط گرفت اس کی

دوستی ہی کی طرح ناقابل شکست تھی۔

کچھ دیر بعد میری وحشت ایک دم شدید غم و اندوہ میں ڈھل گئی۔ میں نے خود کو سیلا جھوڑ دیا۔ اپنا سر اس کے سینے سے لگا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ہم اسی طرح فرش پر گرے رہے۔ میں روتا رہا، وہ مجھے اپنے سینے سے بھیجتا رہا، میرا سر جوتا رہا۔ مجھے لگا میرے جسم کا سارا پانی آنکھوں کے راستے پھوٹ جائے گا۔ میری آنکھوں میں چند دن پہلے کے مناظر تھے جب مندر کے دفنانے میں وہ میرے ساتھ تھی۔ شب کے اندھیرے میں وہ اپنی تمام تر تسوانیت اور حلاوت کے ساتھ میرے اندر سما جاتی تھی۔ وہ بولے بولے میرا نام پکارتی تھی۔ میں اس کے کانوں میں محبت بھری سرگوشیاں کرتا تھا۔ وہ جواب دیتی تھی۔ وہ مل پانی کی ان سہانی شاموں کا سہنا دیکھتی تھی جب ہم دیوان کے وسیع احاطے میں گیندے اوزموتے کے پھولوں کی کھارپوں کے درمیان ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دور تک چلتے چلتے جاتے۔ ہمارا بالو ہماری بانہوں میں ہوتا اور ہم باری باری اس کے گال چومتے۔ وہ اب اپنے اس پنے سیت مٹی کے نیچے سو رہی تھی، بھی نہ اٹھنے کے لیے۔ وہ بس تین چار دن کے اندر ہی سو گئی ریت کی طرح میری مٹی میں سے پھسل گئی تھی۔

میں رو رو کر نڈھال ہو گیا۔ میں نے جسم کا درد سہتا تو کسی حد تک سیکھ لیا تھا لیکن دل کا درد سہتا مجھے کہاں آتا تھا؟ میں تڑپ تڑپ کر نیم جان ہو گیا تو عمران کے ساتھ ہی چٹائی پر نیم دراز ہو گیا۔ شاید یہ نیم بے ہوشی کی کیفیت تھی۔ دوبارہ میری آنکھ مٹی تو بدستور اندھیرا تھا۔ لائین روشن تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ بالکل بند جگہ ہے۔ کوئی کھڑکی، روشن دان، کوئی درز کچھ بھی نہیں۔ بس وزنی چوہی دروازے کے اندر ایک چوکور خانہ سا تھا اور وہ بھی بند تھا۔ یہاں رات اور دن کی تمیز مشکل تھی۔ عمران میرے سر ہانے بیٹھا تھا۔ میرے سر کے دھم سے رتنے والے خون کو روٹی سے پونچھ رہا تھا۔

”ہم کہاں ہیں عمران؟“ میں نے پوچھا۔

”زرگاں میں۔“

میں نے ارد گرد دیکھ کر کہا۔ ”زرگاں کی چیل میں؟“

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کب پہنچے ہم یہاں؟“

”کل رات۔“

”اور سلطان؟“ میری آواز دکھ کے بوجھ سے بیٹھ گئی۔

”وہ بھی آگئی تھی۔ اسے کل رات دفن کیا گیا۔ یہاں

زرگاں میں اس کے کچھ عزیز موجود ہیں۔ اس کی میت انہیں دے دی گئی تھی۔“

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں سے تازہ گرم آنسو رنے لگے۔ عمران کہہ رہا تھا۔ ”اس کا جنازہ کڑے پیرے میں پڑھا گیا۔ شاید چند ہی لوگ ہی ہوں گے۔ لیکن پتا چلا ہے کہ آج دوپہر زرگاں میں ہزاروں لوگوں نے اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی ہے۔“

اسپتال میں سلطانہ کے آخری لمحات میری نگاہوں میں گھومنے لگے۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا اندازہ غلط نکلا عمران! ہمارا خیال تھا کہ شاید یہ گورے اسے زندہ پکڑنا چاہتے ہیں لیکن وہ نہیں چاہتے تھے۔ میں نے خود اس سفید سویرا زکواشارہ کرتے دیکھا تھا۔ اس کے اشارے پر ہی سپاہیوں نے گولیاں چلائیں۔“

عمران نے طویل سانس لی۔ ”تم شیک کہتے ہو۔ ان چچی چڑی والوں کو بھجنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ دراصل انہوں نے سوچ لیا تھا کہ سلطانہ والا معاملہ وہیں پر ختم کر دینا ہے۔ اپنے حساب سے انہوں نے شیک ہی سوچا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سلطانہ کو زندہ پکڑا گیا تو اسے مارنے اور نہ مارنے کا مسئلہ بہت بڑا ایٹو بن جائے گا۔ بہت سی مشکلیں پیدا ہو جائیں گی۔ راجواڑے کے حالات تو پہلے ہی سے بہت خراب ہیں۔“

میں نے سسک کر کہا۔ ”عمران! یہ سب کیوں ہوا؟ سب کچھ تو شیک ہونے جا رہا تھا۔ سب کچھ ملے ہو گیا تھا۔ وہ گولی کس نے چلائی جس نے آفتاب کو زخمی کیا اور پھر ہنگامہ شروع ہو گیا۔“

عمران نے کہا۔ ”وہ ایک نہیں دو گولیاں تھیں۔ اور مجھے یقین ہے وہ اس بندے نے چلوائیں جو اس راجواڑے میں ہمارا سب سے کمینہ اور خطرناک دشمن ہے۔ وہ پانڈے نے چلوائیں۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ خوش اسلوبی سے ہو جائے۔ سلطانہ بچ کر یہاں سے نکل جائے۔“

میرا لہو کھول گیا۔ میں نے کہا۔ ”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ پانڈے نے چلوائیں؟“

”یہ گولیاں ہمارے پیچھے والی ایک چھت سے چلائی گئی تھیں۔ میں نے اس بندے کا سایہ دیکھ لیا تھا۔ وہ چھت سے کودا اور بھاگ نکلا۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ شاید تم نے بھی اسے دیکھا ہو۔ وہ ایک پاؤں ذرا دبا کر بھاگ رہا تھا۔ پانڈے کا ایک چوڑی ناک والا ماتحت بھی ایک پاؤں دبا کر

ہٹا ہے۔ سریش نام ہے اس کا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ وہی بندہ تھا۔“

میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب تو یہ ہے کہ... ماریا کی ہان جانے کے علاوہ اور بھی جو کچھ ہوا، اس کا ذمے دار ہی کرہیت پانڈے ہے۔“

”بالکل ایسا ہی ہے۔ سب کچھ شیک جا رہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اپنے دوسرے ساتھی کپٹن نام اور باقی برٹانیوں کی جان بچانے کے لیے ان گوروں نے سلطانہ اور آفتاب کو مل پانی میں داخل ہونے دینا تھا۔“

ایک جاں کسل انفس اور دکھ نے مجھے گھیر لیا۔ واقعی اگر وہ دو گولیاں نہ چلتیں تو حالات اس وقت کتنے مختلف ہوتے۔ ہو سکتا تھا کہ اب سلطانہ کے علاوہ ہم دونوں بھی مل پانی کے خوب صورت دیوان میں ہوتے۔ وہ اپنے بچے کو انہوں میں لے کر نہال ہو رہی ہوتی۔ اس کی آنکھوں میں لوشی کے ستارے چمکتے۔ لیکن اب یہ سب کچھ نہیں تھا۔ اس کی جگہ ایک ناقابل تلافی دکھ تھا۔ ایک آگ بھی جو میری رگوں میں دوڑ رہی تھی اور میرے تن بدن کو بار بار جسم کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”عمران! وہ دوسرا بندہ کون تھا جس پر تھے حملہ کیا؟“

”وہ یقیناً سریش نام کا کوئی ساتھی ہوگا۔“

میری نگاہ میں سارا منظر پھر سے گھوم گیا۔ اس شخص کا مقب ہے عمران کو قتلانہ بنانے کی کوشش کرنا کھیت میں سے اچانک جیم کتنے کا لٹکا اور اس پر جا پڑنا۔ کتنے کی لڑزہ خیز آوازیں، اس شخص کی دردناک چٹھاڑ، پھر گولی کا چلنا اور کتنے کا پلک جھپکنے میں اوچھل ہوتا...

میں خالی خالی نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا۔ میں نے کہا۔ ”عمران! یہ کتنا وہی تھا جس کی رتی تم نے کھینچ لی؟ کوئی تھی؟“

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”کتنا بڑا وفادار جانور تھا ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا، وہ تب سے ہمارے آس پاس ہی تھا۔“ عمران نے کہا۔

میرا خیال تھا کہ عمران کچھ اور بھی کہے گا... اس نے کہا کہ نہیں کہا... لیکن میرے ذہن میں وہ تمام الفاظ گونجنے لگے جو عمران نے اپنی روداد بیان کرتے ہوئے کہے تھے... اس نے جانوروں کے ساتھ اپنے خصوصی اور حیرت انگیز تعلق کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ خاص کشش جس کی وجہ سے وہ ہاں صاحب کی مردم شناس نظریں آیا اور پھر اسٹار سرکس میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ بعد ازاں امریکن

پروفیسر چرچر پچی نے عمران کی اس انوکھی صلاحیت کو ”پیش پیشمل ماسٹری“ کا نام دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وقتی طور پر یہ صلاحیت عمران کے اندر دب گئی ہے یا کہہ لیا جائے کہ زائل ہو گئی ہے لیکن امکان ہے کہ یہ کچھ عرصے بعد پھر بحال ہو جائے گی۔

تو کیا وہ صلاحیت بحال ہو رہی تھی؟

”کیا سوچ رہے ہو؟“ عمران نے کہا۔

”یہی کہ اگر وہ کتا اچانک نمودار نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟“

”اگر“ بڑا عجیب لفظ ہے تاہی! اس کے بارے

میں زیادہ غور نہیں کرنا چاہیے۔ جو ہو گیا وہ ہو گیا۔ اب آئندہ کے بارے میں سوچنا چاہیے۔“

اچانک ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ یہ واضح طور پر کوئی بڑا بارودی دھماکا تھا۔ درودیوار لرز گئے۔ اس کے فوراً بعد رافٹوں کی گرج سنائی دی۔ نیل کے آس پاس کہیں گولیاں چل رہی تھیں۔ ”یہ سب کیا ہے؟“ میں نے عمران کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”لگتا ہے کہ زرگاں میں گڑ بڑ چل رہی ہے۔ رات کو تم تو سوئے پڑے تھے، پر میں گولیوں کی آوازیں سنتا رہا ہوں۔ رات تین بجے کے قریب دقتی بموں کے کئی دھماکے بھی ہوئے تھے۔“

”تمہارا کیا اندازہ ہے؟“

”کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لوگ انگریزوں اور ان کے پٹو حکم جی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہوں۔ گڑ بڑ تو یہاں پہلے سے ہی چل رہی تھی۔“

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی کوشٹری کے وزنی چوہی دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی اور دروازے میں موجود چوکور خانہ کھل گیا۔ اس بڑے فٹ مربع کے خانے میں اب ایک مولیٰ آہنی سلاح نظر آ رہی تھی۔ دوسری طرف ایک بارودی گارڈ موجود تھا۔ اس کے عقب میں ایک دوسرا گارڈ مسلح کھڑا تھا۔ پہلے گارڈ نے چوکور خانے میں سے کھانے کے برتن اندر پہنچا دیے۔ ایک قبر آلود نگاہ ہم پر ڈالی اور بغیر کچھ کہے چوکور خانہ پھر سے بند کر دیا۔ کوشٹری میں ایک بار پھر صرف لائین کی روشنی رہ گئی۔

عمران نے مجھے کھانا کھانا چاہا مگر میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ گلے میں کانٹے سے پڑے ہوئے تھے۔ وہ اسپتال کے اندر تین دن تک بیویکی پیاسی رہی اور پھر آزدافضا میں سانس لینے سے پہلے ہی گولیوں سے چھلنی ہو گئی۔ اس کا زرد چہرہ، اس کی آنکھوں کے سیاہ حلقے، اس کے سوکھے

ہوٹ، سب کچھ میری نگاہوں میں گھوما۔۔۔ میں غصے فرس پر ایک کونے میں لیٹ گیا اور بازو موڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ ماں کی موت کے بعد یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا جو میں نے جھیلنا تھا اور اس نے مجھے اندر سے جھلسا ڈالا تھا۔ دھڑے دھڑے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے تصوری آنکھ سے دیکھا۔ وہ سارے گہنے پہنے آنکھوں میں کا جل لگائے میرے سامنے کھڑی ہے۔ میرے کانوں میں جیسے اس کی جیتی جاتی آواز گونجی۔ ”مہروج! آپ نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟ آپ کو پتا آج ہے کہ آپ نہیں کھائیں گے تو میں بھی نہیں کھاؤ گی۔ بھوک اچ رہوں گی۔“

میں تصور میں کراہا۔ ”سلطان! کہاں جلی گئی ہو تم؟ میں تو توانا چھوٹا بڑا پردیسی تھا۔ تم نے مجھے پھر سے جینا سکھایا۔ مجھے پھر سے زندگی دی۔۔۔ میرے زخموں پر مرہم رکھا۔ میری ناتوانیوں کو سہارا دیا۔ میرے لیے ساری دنیا سے ٹکر لے لی لیکن مجھے اکیلا نہیں چھوڑا۔ اب کیوں چھوڑ دینی ہو مجھے؟ تم نے کہا تھا۔۔۔ میں جب بلاؤں گا تم آؤ گی۔۔۔ دیکھو میں بلا رہا ہوں تمہیں۔۔۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ ہمارے بچے کو تمہاری ضرورت ہے۔۔۔ وہ معصوم تمہاری راہ دیکھتا ہوگا۔ ایک بار آ جاؤ سلطان۔۔۔ پھر میں تمہیں اپنی ہاتھوں میں چھپا لوں گا۔ تمہیں اتنی دور لے جاؤں گا کہ اس آگ کی گرم ہوا بھی تمہیں چھونے سکے۔“

وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی۔ اس کے کانوں میں سنہری جھمکے پلٹے رہے۔ اس کے سینے پر طلائی ہار چمک رہا۔ وہ بولی۔ ”مجھے میری غلطیوں پر معاف کر دینا مہروج۔۔۔ میں اب آتا ہوں سکتی لیکن میں ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی۔۔۔ میں موتیے اور گیندے کے پھولوں میں آپ کو ملوں گی۔۔۔ اور چاندنی راتوں کی غنڈک میں اور صبح دم چلنے والی ہوا میں۔۔۔ اور مہروج! جب کسی تہی دوپہر میں برسات کے بادل چھائیں گے تو میں آپ کے پاس آ جاؤں گی۔۔۔ جب سردیوں کی نرم دھوپ آپ کے شہر میں پھولوں اور بچوں کے منہ چوسے گی تو میں آپ کے آس پاس ہی ہوں گی۔۔۔ ہاں، میں آپ کو اور اپنے بالوں کو چھوڑ کر کہاں جاسکتی ہوں۔“

اس کا ہیوا لدم ہوتا چلا گیا۔۔۔ پھر او بھل ہو گیا۔ میری جلتی آنکھوں میں نمی تھی۔۔۔ اس کا تصور آنکھوں میں بسائے بسائے میں سو گیا۔

دوبارہ میں زوردار آوازوں کی وجہ سے جاگا۔ گارڈ چلا رہے تھے۔ کسی قریبی کوشٹری کا دروازہ زور سے کھلا پھر بند ہو گیا۔ تب ہماری کوشٹری کا دروازہ بھی دھماکے سے کھلا۔

مسلم گارڈ نے دو افراد کو اندر دھکیلا، پھر ایک تیسرے شخص کو اٹھا کر بیدردی سے کوشٹری کے پختہ فرش پر پھینکا اور دروازہ دوبارہ باہر سے لاک کر دیا۔

میری طرح عمران بھی جاگ گیا تھا اور حیرت سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ جس شخص کو اٹھا کر فرش پر چٹا گیا تھا، وہ بے ہوش تھا۔ وہ طے سے مسلمان لگتا تھا۔ اس کی چھوٹی داڑھی خون سے رنگین تھی۔ باقی دو افراد میں سے ایک شخص کو دیکھ کر میں اور عمران بری طرح چو گئے۔ ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ اسے یہاں دیکھیں گے اور وہ بھی اسی حالت میں۔ وہ بھرت تھا۔ اس کے نفس کیڑے پھینے ہوئے تھے اور چہرے پر خربوں کے نیگوں نشان تھے۔ بھرت بھی ہمیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ شاید اسے بھی پتا نہیں تھا کہ وہ اس جیل کے اندر ہماری ہی کوشٹری میں بند کیا جائے گا۔ ہم کچھ دیر تک ساکت و جامد ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ ”یہ تمہارے ساتھ کیا ہوا بھرت؟“ عمران نے پوچھا۔

”جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے، وہ زرگاں میں بہت سے لوگوں کے ساتھ ہوا ہے اور ان میں زیادہ تر مسلمان ہی ہیں۔ زرگاں میں گوروں اور حکم جی کے سپاہیوں کے خلاف بغاوت پھوٹ پڑی ہے۔“ بھرت کا لہجہ انکشاف انگیز تھا۔ ”یہ بغاوت نہیں، یہ زندگی اور موت کی جنگ ہے اور یہ جنگ ہم جیتیں گے۔“ بھرت کے ساتھ کوشٹری میں بند کیا جانے والا دوسرا شخص جوش سے بولا۔

اس کی عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ وہ اپنے لباس اور طے سے مسلمان نظر آتا تھا۔ اس کے سر پر کسی کند آ لے کا زخم تھا۔ راتل کی ایک گولی اس کی پنڈلی کا گوشت چیرتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اس زخم پر ایک خون آلود پٹی بندھی تھی۔ ”تم کون ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا کوئی نام نہیں۔ میں بس مسلمان ہوں اور ان سو رگوروں کو اپنے شہر سے نکالنا چاہتا ہوں۔ یہ ہمارا خون چوسنے والے دندنے ہیں، یہ ہماری عزتوں کے قاتل ہیں۔ یہ مٹی بھر پلید جانور ہمارے را جوڑے پر حکومت نہیں کر سکتے۔ ہم انہیں یہاں سے مار بیٹھا کریں گے۔“

ہم نے دیکھا کہ جس نے ہوش شخص کو بیدردی سے فرش پر پھینکا گیا تھا، وہ آخری بچکیاں لے رہا تھا۔ جو کھا ہمارے لیے اندر آیا تھا، اس میں پانی بھی موجود تھا۔ عمران نے اسے پانی پلانے کی کوشش کی۔ یہ پانی اس کی ہاتھوں سے بہہ گیا۔ ہم نے پھر سے داروں کو آواز دی۔ لیکن کسی نے نہیں سنا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ اسی عمر شخص جان

کی بازی ہار گیا۔ اس کے سینے پر تلوار کا گھاؤ تھا اور یہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس کا بہت سا خون بہہ چکا تھا۔ میں نے دیکھا، اس کے گلے میں دو تین تعویذ تھے۔ اس کے بازو پر امام خاں بندھا ہوا تھا۔ یہ امام خاں یقیناً اس کے کسی پیارے نے اسے باندھا تھا اور باندھ کر اس لڑائی میں بھیجا تھا جو گوروں کے خلاف لڑی جا رہی تھی یا لڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد مسلح گارڈ نے دروازہ کھولا۔ کم از کم چار راتلئیں ہماری طرف ابھی ہوئی تھیں اور یہاں یہ اکیلے چار گارڈ ہی نہیں تھے۔ ہم دیکھ سکتے تھے کہ یہاں ہر طرف باوردی گارڈز موجود ہیں۔ مر جانے والے شخص کی لاش صحت کرا باہر لگائی گئی۔ بھرت کے ساتھ اندر آنے والا دوسرا شخص چلا یا۔ ”تم گوروں کا ساتھ دے رہے ہو۔ تم کتوں کی موت مرو گے۔ تمہارا نام و نشان مٹ جائے گا اس را جوڑے سے۔ تم نے۔۔۔“

ابھی اس کا فقرہ منہ میں ہی تھا کہ ایک ہندو گارڈ نے راتل کا دستہ پورے زور سے گھما کر اس کے منہ پر مارا۔ وہ دیوار سے ٹکرا یا اور زمین یوس ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو ہمیں یہ خدشہ محسوس ہوا کہ شاید وہ بھی تم ہو گیا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ تین چار منٹ بعد وہ کسمانے اور بڑبڑانے لگا۔ اس کی بے ہوشی خیم بے ہوشی میں بدل گئی تھی۔ ”تم اسے جانتے ہو؟“ عمران نے بھرت سے پوچھا۔

”ناہیں۔۔۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ ان لوگوں میں شامل ہے جو زرگاں کے اندر پھیلے دودن سے مختلف کارروائیاں کر رہے ہیں۔ شاید تم کو پتا نہ ہو، باغیوں نے جامع مسجد کے علاقے میں فوجیوں کا ایک بڑا ڈھپو دھماکے سے اڑا دیا ہے۔ وہاں پندرہ تیس سپاہی زندہ جل مرے ہیں۔ ان میں تین چار گورے بھی شامل ہیں۔“

اقت۔ ”عمران نے کہا۔ ”یہ وہی ڈھپو ڈھماکا تھا۔ اس کے بعد زرگاں میں حکم کے سپاہیوں اور گورے فوجیوں پر کئی جگہ حملے ہوئے ہیں۔ گوروں کے کئی گھروں کو بھی آگ لگائی گئی ہے۔ ان کی گورتیں اور بچے پناہ کے لیے راج بھون کی طرف جا رہے ہیں۔“

”تم کس جرم میں پکڑے گئے ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”بے گناہی کے جرم میں۔“ وہ تاسف سے بولا اور

اپنی بیٹھائی سے رتنے والا خون پوٹھنے لگا۔ ہم کونے میں بھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ ”کسی شک میں پکڑا گیا ہے تمہیں؟“ عمران نے دریافت کیا۔ ”شک میں نہیں، دوشواں میں پکڑا گیا لیکن یہ بالکل جھوٹا دوشواں تھا۔“ بھرت نے آہ بھری۔ ”تمہارے گھر والے اور بچہ وغیرہ تو خیریت سے ہیں نا؟“

”میرے آنے تک تو خیریت سے تھے، اب کا پتا ناہیں۔“ تفصیل بتاتے ہوئے بھرت نے کہا۔ ”ج پوچھیں تو زرگاں شہر میں بہت خون خرابا ہو رہا ہے۔ بلوائیوں نے جگہ جگہ آگ لگا دی ہے۔ آپ کو آواز آرہی ہوگی۔۔۔ میں اب بھی گولیاں چل رہی ہیں۔“ واقعی کہیں گولیاں چل رہی تھیں۔

بھرت نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”شہر میں فساد کی خبریں سن کر میں گاؤں سے یہاں پہنچا تھا۔ آپ کو پتا ہے نا، میرے بڑے بھیا یہاں آئے ہوئے ہیں۔ مجھے ان کی چٹائی میں یہاں اپنے ایک دوست مدن کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ کل رات ایک انگریز ٹیلی مدن کے پاس پناہ کے لیے آئی۔ اس میں اٹھائیس تیس سال کی ایک جوان سال ناری اور اس کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ لڑکے کی عمر سات آٹھ سال ہووے گی، لڑکی چار پانچ برس کی تھی۔ یہ مدن دراصل سرکاری ملازم بھی ہے۔ یہ اسی انگریز عورت کرشی کے محلے میں رہتا ہے۔ اس عورت نے سوچا ہووے گا کہ یہاں وہ محفوظ ہو جاوے گی۔ لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ بغاوت پھوٹنے کے بعد بہت کچھ بدل چکا ہے۔ پرانے، اپنے بن گئے ہیں اور دوستوں نے دشمنوں کا روپ دھار لیا ہے۔ مدن نے کرشی کو پتا تو دے دی لیکن اندر خانے اس کی نیت خراب ہو گئی۔ اس نے اپنی بچی سے کہا کہ کرشی اور اس کے بچے یہاں گھر میں محفوظ ناہیں ہیں۔ بلوائیوں کو شک ہو گیا تو وہ انہیں گھسیٹ کر یہاں سے لے جاویں گے اور گولی میں جا کر ان کی ہتھیر کر دیوں گے۔ شاید میں نے بتایا نہیں، یہ کرشی محلے دار ہونے کے کارن مدن کی بچی کی نکلی بھی تھی۔ وہ بھی ڈر گئی کہ کہیں کرشی اور اس کے بچوں کے ساتھ کچھ ہونہ جاوے۔ مدن نے کہا کہ وہ کرشی کو اپنی باغ والی حویلی میں لے جاتا ہے۔ وہ اسے وہاں لے گیا۔ وہاں اس کے دو دوست بھی موجود تھے۔ تیسرا میں تھا۔ باغ والی حویلی میں پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ مدن کی نیت کیا ہے۔۔۔“

میں نے بھرت گورو کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جہاڑی بات کاٹ رہا ہوں... کہیں یہ دن وہ... فیبرمدن تو نہیں جولال بھون میں کام کرتا ہے؟“

بھرت نے کہا۔ ”مجھے لال بھون کا تو پتا تھا لیکن اتنا جاننے ہوں کہ وہ فیبر ہے۔ اس کے بال جلدی سفید ہو گئے ہیں اس لیے بھی کبھی خضاب بھی لگا دیتے ہیں۔“

میں اور عمران جان گئے کہ وہ اسی فیبرمدن کی بات کر رہا ہے جولال بھون میں ”پریوں“ کی تربیت کے کام میں میڈم صفورا کی مدد کرتا تھا۔ دیکھنے میں وہ جنٹلمن لگتا تھا لیکن اب جو صورت حال سامنے آ رہی تھی، وہ کسی دوسری طرف اشارہ کر رہی تھی۔

میں نے بھرت سے کہا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔ بھرت نے تفصیل میں جاتے ہوئے جو کچھ بتایا، اس کا لپ لبا بچھ یوں ہے۔

مدن اور اس کے دونوں دوستوں کی نیت کرشی پر خراب ہو چکی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ مدن اور اس کے دونوں دوستوں نے بھی عورت نہیں دیکھی تھی۔ ہاں، یہ بات ضروری تھی کہ انہوں نے بھی گوری عورت نہیں دیکھی تھی۔ جس طرح مکٹیں جمع کرنے کے شوقین ہر طرح کی مکٹیں اپنے الم میں جمع کرنا چاہتے ہیں، ایسے ہی عیاش لوگ ہر طرح کی اور ہر رنگ و ڈھنگ کی عورت کے ساتھ شہب ہری کی خواہش رکھتے ہیں۔ کچھ یہی کیفیت مدن اور اس کے دوستوں کی تھی۔ وہ کسی انگریز میم کی قربت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن جو سنی خیز اور خطرناک صورت حال پیدا ہوئی تھی، اس نے انہیں یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ ایک میم کو اپنے تصرف میں لائیں۔ دوسری طرف میم کرشی بھی اچھی طرح جان مانی تھی کہ اگر وہ اپنی اور اپنے معصوم بچوں کی جان بچانا چاہتی ہے تو اسے مدن کمار کی ہدایات پر عمل کرنا پڑے گا۔ مدن کمار نے اسے مجبور کیا کہ وہ نہاد دھوکہ ہندوستانی کپڑے پہنے، خوشبو لگائے اور ان سب کو شرب پلائے۔ درحقیقت یہ لوگ اپنے طور پر یہ حتی نتیجہ نکال چکے تھے کہ انگریزوں اور ان کے بچوں حکم جی کے خلاف، یہ خونی انجی ٹیشن کامیاب ہونا ہے اور کرشی اور اس جیسی دوسری عورتوں کی حیثیت بال غنیمت سے زیادہ نہیں۔

بھرت فطرتاً اچھا آدمی تھا۔ جو کچھ مدن اور اس کے دوست کرنے جا رہے تھے وہ اسے کسی طور قبول نہیں تھا۔ اس نے انہیں باز کرنے کی کوشش کی لیکن وہ باز نہیں آئے۔ ان کے درمیان جھڑا ہو گیا۔ نوبت گام گلوچ تک آئی۔ بھرت

نے کہا کہ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا، وہ جا کر چوکی میں اطلاع کرے گا۔ بھرت کے یہ تیور دیکھ کر مدن کمار اور اس کے دوستوں نے بھرت کو ایک استوروم میں بند کر دیا۔ بھرت شور مچاتا رہا اور کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح وہاں سے نکل سکے لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ مدن اور اس کے دونوں دوستوں نے کرشی کے ساتھ عیاشی شروع کر دی۔ کرشی کے دونوں بچے بالائی منزل کے ایک کمرے میں سہمے ہوئے بیٹھے رہے۔ کرشی کو امید تھی کہ وہ اپنی اور بچوں کی جان بچانے میں کامیاب ہو جائے گی اور اس کی ”خدمات“ کے عوض یہ ہندوستانی اسے کسی محفوظ مقام تک پہنچا دیں گے لیکن جو کچھ ہوا، اس کا علم کرشی کو نہیں تھا اور مدن وغیرہ بھی بے خبر تھے۔ حکم کے وفادار سپاہیوں کی ایک گھوڑا گاڑی اس عمارت کے پاس سے گزری۔ ان سپاہیوں میں ایک گورا افسر بھی شامل تھا۔ ان لوگوں نے بالائی منزل کی ایک کھڑکی میں ایک سفید فام بچی کو روکتے ہوئے دیکھ لیا۔ یہ کرشی ہی کی بچی تھی۔ سپاہیوں نے حقیقت حال جاننے کے لیے عمارت کے اندر آنا چاہا... مدن کے چونکدارنے رنگ رلیوں میں مصروف مدن کمار کو اطلاع دی۔ اسی دوران میں سپاہیوں نے پھاٹک پھلا گنگ کر اندر آنے کی کوشش کی۔ مدن اور اس کے ساتھیوں کے پاس اسلحہ تھا۔ مدن تو دھڑے ڈریلوگ بندہ تھا مگر اس کے ساتھیوں نے گولی چلا دی۔ دوسری طرف سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی۔ ایک گولی کھڑکی کا شیش توڑ کر آئی اور کرشی کے سر کے سنہری بالوں میں سرخ پھول گل گیا۔ وہ چند سیکنڈ میں وہ توڑ پھوٹی۔ حکم کے سپاہیوں میں سے ایک کو عمارت کے احاطے میں گولی لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا شدید زخمی ہوا۔ باقی دو بھاگ کھڑے ہوئے۔ شاید انہیں اندر سے اتنی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ اب یقیناً وہ ملک لینے گئے تھے۔ مدن اور اس کے ساتھیوں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ اب انہیں فوراً یہاں سے کھسکانا ہو گا۔ تاہم جاتے جاتے انہوں نے بھرت کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ استوروم میں آئے مدن تو بھرت سے گام گلوچ کرتا رہا جبکہ اس کے دونوں ساتھیوں نے اچانک عقب سے بھرت کو دیوچ لیا۔ اس کے منہ پر بڑی سختی سے ایک بندوقدار رومال رکھ دیا گیا۔ چند سیکنڈ میں بھرت بے ہوش ہو گیا۔

جب آدھ پون گھنٹے بعد وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں آیا اور اس نے بوجھل آنکھوں سے اپنے ارد گرد دیکھا تو خود کو عجیب حالت میں پایا۔ وہ بالکل برہنہ تھا اور کرشی کی برہنہ لاش کے ساتھ بستر پر پڑا تھا۔ کرشی کی برہنہ لاش کے اوپر

چادر ڈال دی گئی تھی۔ ان کے ارد گرد کئی گورے اور مقامی فوجی موجود تھے۔ گورے فوجیوں نے اسے شوکرین ماریں اور گندی گالیاں دیں۔ اسے کرشی کے روتے ہوئے بچوں کے سامنے لایا گیا۔ بچوں نے بھی تصدیق کی کہ بھرت ان بندوں کا ساتھی ہے جنہوں نے ان کی ماما کو پکڑا تھا۔ بھرت نے بہت دہائی دی مگر اس کی کسی نے نہیں سنی۔ اس کی مدہوشی کو بھی شراب اور فحشیت کی مدہوشی سے ہی تعبیر کیا گیا اور اب بھرت یہاں اس جیل میں تھا۔ پکڑ دھکڑ کی وجہ سے جیل میں گھنٹاؤں تک کم پڑ رہی تھی۔ لہذا بھرت کو بھی دیگر دو قیدیوں کے ہمراہ ہماری کونٹری میں خوش دیا گیا تھا۔

ہم نے پوری توجہ سے بھرت کی رد وادبی اور بیچ میں سوالات بھی کیے۔ بھرت نے باہر کے حالات کی مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”مارا کی موت کا گورا جانی کے لوگ (انگریز کیونٹی) نے بہت سوگ منایا ہے۔ مارا کو گورا قبرستان میں جارج کے پہلو میں دفن کیا گیا ہے۔ سرجن اسٹیل اور اینڈرسن وغیرہ نے سوگند کھائی ہے کہ وہ مارا کے قاتلوں کو بھرت تک انجام سے دوچار کریں گے۔“

”اس زخمی افسر کیپٹن نام کا کیا بنا؟“ عمران نے پوچھا۔

”وہ غیبت مچ گیا ہے۔ سنا ہے کہ اسے بچانے کے لیے پولیس افسر رنجیت پاڈے نے خود کو خطرے میں ڈالا تھا۔ وہ اسے برستی گولیوں میں اپنا ”گور“ دے کر احاطے سے باہر لے آیا تھا۔“

عمران نے کہا۔ ”لیکن نام کو اور باقی لوگوں کو خطرے میں ڈالنے والا بھی تو یہی کتا پاڈے تھا۔“

”کیا مطلب؟“ بھرت نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ عمران بات گول کر گیا۔ پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ”آفتاب اور ہاشم کی لاشوں کا کیا بنا؟“

”ان کی لاشیں کسی نے وصول ہی نہیں کیں۔ ان کا جو کچھ کیا ہوگا، حکم کے سپاہیوں نے ہی کیا ہوگا یا پھر ہو سکتا ہے کہ انہیں امام مسجد قادری بخش صاحب کے حوالے کر دیا گیا ہو۔ کچھ کٹر قسم کے لوگ یہ الزام بھی لگا رہے ہیں کہ امام قادر بخش صاحب کے دہشت گردوں سے رابطے ہیں اور ان کی بدعہدی کی وجہ سے مارا کی جان مانی ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ امام صاحب نے معاملے کو سنہالنے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔ یہ ہاشم راز کی ہٹ دھرمی تھی جس کے کارن معاملہ بگڑتا چلا گیا۔ بہر حال، جتنے منہ اتنی باتیں ہیں۔ کچھ لوگن کا یہ بھی خیال ہے کہ آپ دونوں یعنی

آپ اور باتش، گورے افسروں کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھے اور مارا کے بدلے میں سلطانہ بی بی کا جیون بچانا چاہتے تھے۔“

عمران نے کہا۔ ”اب باہر کے حالات کیا ہیں بھرت؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ گوروں اور حکم کے وفادار سپاہیوں کے خلاف عام لوگوں کی یہ بغاوت کامیاب ہو جائے گی؟“

بھرت نے پُرسوج انداز میں کہا۔ ”ابھی وشواس سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ فی الوقت جو بھی کارروائیاں ہو رہی ہیں، ان میں زیادہ تر مسلمان ہی حصہ لے رہے ہیں۔ کہیں کہیں چلی جاتیوں کے ہندو اور بڑھ بھی اس میں شریک ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ گوروں اور حکم جی کے پاس جدید اسلحہ اور طاقت ہے۔ ایک باقاعدہ فوج ہے۔ جب تک مل پانی میں چھوئے سرکاری طرف سے کوئی حرکت نہیں ہووے گی، اس لڑائی کا فوری نتیجہ نکلنا آسان نہیں ہے۔“

”غلط... بالکل غلط۔“ اچانک فرش پر لیٹے زخمی نے دھاڑ کر کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ ہنسا رہا تھا۔ وہ جوش سے بولا۔ ”زرگاں کے جی داروں میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اکیلے ہی ان سبھی بھگوروں کو چیر کر جیل کوٹوں کے آگے پھینک دیں۔ انور خاں ہمارا سالار ہے... اور اب وہ ہمارے درمیان ہے۔ اس شیر کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی اور کی مدد کی ضرورت نہیں۔ دینا جاتی ہے کہ انور خاں کا ایک ایک جاں غار... کرائے کے ان سوسو ٹوٹوں پر بھاری ہے۔“

انور خاں کا نام سن کر میں چونکا۔ اس کا روشن چہرہ، اس کی کشادہ پیشانی، اس کا چوڑا سینہ اور اس کا پُر جوش انداز... سب کچھ ایک لمحے میں میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ زرگاں کے مسلمان انور خاں کی آواز پر لبیک کہتے تھے۔ یہ انور خاں ہی تھا جس نے سلطانہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے بعد جارج گورا کو آڑے ہاتھوں لیا تھا... انور کی قیادت میں سیکڑوں پُر جوش لوگوں نے جارج گورا کی رہائش گاہ پر بلا بولا تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اب یہ زخمی شخص بتا رہا تھا کہ انور خاں پھر زرگاں میں ہے اور باقی گروہوں کی قیادت کر رہا ہے۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر یہ حوصلہ افزا صورت حال تھی۔ میں نے زخمی شخص سے پوچھا۔ ”تم کیسے جانتے ہو کہ انور خاں یہاں ہے؟“

”بچے بچے جانتا ہے۔ یہ جو انگریزوں اور دیسی انگریزوں کی دم میں منہ دھت ہو رہا ہے، یہ یونہی نہیں ہو رہا۔ لوگ جانتے ہیں کہ شیر بھڑوں میں گھس آیا ہے اور اب ان

بھیڑوں کو بھاگتے ہی بنے گی۔ تم دیکھنا چند دن کے اندر زرگاں کی گلیوں میں حکم کے بھاڑے کے ٹٹوں اور ان گوروں کی لاشیں پھینکی جا سکیں گی۔“

بھرت نے کہا۔ ”بے شک انور خاں دلیر شخص ہے۔ بہت سے لوگ اس سے ہمدردی بھی رکھتے ہیں لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ زرگاں میں ابھی تک کہیں نظر نہیں آیا۔ یہی کارن ہے کہ ابھی تک بہت سے لوگ یہ دشواں نہیں کر رہے کہ وہ واقعی یہاں موجود ہے۔“

”وہ... وہ... میں نے خود اسے دیکھا ہے اور باقی بھی جلد دیکھیں گے۔“ زخمی شخص پورے اعتماد سے بولا۔

”کل جن جاں بازوں نے اسلحہ گودام میں آگ لگائی ہے، ان میں انور خاں بھی شامل تھا۔“

اسی دوران میں ایک اور بڑے دھماکے کی آواز سنائی دی۔ یہ دھماکا شہر کے وسط میں کہیں ہوا تھا۔ گونج سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بھی ایک بڑا دھماکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹے ہتھیاروں کی فائرنگ بھی سنائی دینے لگی۔ زخمی شخص نے پرجوش انداز میں ایک فاتحانہ نعرہ بلند کیا اور بھراپے گلے میں موجود چاندی کے ایک چیلکے توڑی کو کھینچ کر بولا۔

”ہم کچھ دیر تک کان لگا کر سنتے رہے۔ قریباً پانچ منٹ بعد فائرنگ ختم ہو گئی۔ زخمی شخص نے عمران اور بھرت کے پوچھنے پر اپنا نام ابراہیم بتایا۔ وہ بولا۔ ”آج رات بارہ بجے تک پورے شہر میں کارروائیاں ہوں گی۔ آج بڑا مبارک دن ہے۔“

”مبارک دن؟“ میں نے پوچھا۔

”آج چاند کی سات تاریخ ہے اور بدھ کا دن ہے۔ چاند کی سات اور بدھ کا دن ان گوری چڑی والوں کے لیے بہت منحوس ہے۔ اسی طرح اگر چاند کی پانچویں اور تیرہویں تاریخ کو بدھ کا دن آئے گا تو وہ بھی ان گوروں اور حکم کے ہر کاروں کے لیے بڑا نحس ہوگا۔ اور میرا تو خیال ہے کہ اب آنے والا ہر دن ہی ان مردودوں کے لیے نحس ہوگا۔ بہت جلد ان کا بیڑا فرق ہونے والا ہے۔ ان کا ظلم ہی ان کے گلے کا پھندا بننے والا ہے۔“

”یہ چاند کی تاریخوں والی بات کس نے بتائی ہے؟“ بھرت نے ابراہیم سے پوچھا۔

ابراہیم نے چاندی کے توڑی کو چوما اور عقیدت سے بولا۔ ”ہمارے حضرت صاحب نے۔ اور یہ ہوائی باتیں نہیں ہیں۔ نہ ہی تم ان کو وہم کہہ سکتے ہو۔ ان گوری چڑی والوں کے دن اس راجاؤں سے ہم پورے ہو چکے ہیں۔ اب ان کو

یہاں سے بھاگنا ہے یا کتے کی موت مرنے ہے۔“ اس نے ایک بار پھر پرجوش نعرہ لگایا۔

کوشڑی کے چوٹی دروازے میں موجود چھوٹا چوکور پت کھلا اور ایک گاڑی نے شعلہ بار نظروں سے ہمیں گھورا۔ وہ زخمی ابراہیم کو طلب کر کے بولا۔ ”گندے گڑی طرح زیادہ اہمیت جا۔ چپ کر کے بیٹھ ورنہ ابھی گلا کاٹ کر پیسٹک دیوں گے۔“

ابراہیم پھینکا۔ ”گلا کاٹ بھی دو گے تو یہ آواز بند نہیں ہوگی۔ تم کتنے گلے کاٹو گے، کتنی آوازیں بند کر دے گے؟“

گاڑی نے زہرناک لہجے میں کہا۔ ”دوسروں کا تو کہہ نہیں سکتا لیکن تیری بوٹی ضرور صبح تک بند ہو جاوے گی۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے چوکور خانے کا پتہ زور سے بند کر دیا۔

ابراہیم نے بلند آواز میں اسے کوسا پھر دروازے کی طرف تھوک دیا۔

گاڑی دھمکی اور اس کا لہجہ قابل غور تھے۔ ”یہ کیا کہہ کے گیا ہے؟“ عمران نے ابراہیم سے پوچھا۔

”جان سے مارنے کی دھمکی دیتے ہیں لیکن نہیں مار سکتے۔ جب تک میری زندگی ہے، کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ اس نے ایک بار پھر عقیدت سے چاندی کے توڑی کو چوما۔ اس کے چہرے پر فکر زدگانہ تنگ نہیں تھا۔

ابراہیم ان ہزاروں لوگوں میں سے ایک تھا جن کے دلوں میں انگریزوں اور ان کے کٹھ پتلی حکم کی کے خلاف شعلے بھڑک رہے تھے۔ سلطانہ کی موت کے بعد یہ شعلے کچھ اور بلند ہو گئے تھے۔ وہ مرنا یا مار دینا چاہتے تھے۔

رات بھر فائرنگ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ علی الصبح سلاخ گاڑ دیا۔ انہوں نے ابراہیم کو بتایا کہ بڑے صاحب محترم نے انڈرن اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ابراہیم نے جانے میں پس و پیش کی لیکن وہ اسے کھینٹ کر باہر لے گئے۔ ہمیں مختلف آوازوں سے اندازہ ہوا کہ اگر دروازہ کی کوشڑیوں سے بھی کچھ قیدیوں کو نکال کر لے جایا جا رہا ہے۔ ایسے کچھ قیدی مزاحمت بھی کر رہے تھے۔

صرف آدھ گھنٹے بعد ساری صورت حال سامنے آگئی اور یہ کافی سنگین تھی۔ یہ سنگین صورت حال ہمیں دکھانے کے لیے گاڑی نے ہماری کوشڑی کے دروازے میں موجود چھوٹا چوکور پت کھول دیا۔ آہنی سلاخ کی دوسری جانب دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر موجود ایک دوسرا دروازہ بھی کھول دیا گیا تھا۔ اب ہمیں جیل کے ایک چھوٹے احاطے کا منظر دکھائی

دے رہا تھا۔ یہاں ایک سرسری ساعت کی عدالت لگی ہوئی تھی۔ بس ایک جی میز پر جس کے پیچھے اسٹیٹ کے چار فوجی افسر بیٹھے تھے۔ دو مقامی اور دو انگریز تھے۔ انگریزوں میں تھمتاے چہرے والا اینڈرسن بھی تھا۔ اسے دیکھ کر میری رگوں میں لہو کی جگہ آگ پھیلنے لگی۔ سلطانہ کی اچانک موت کے مناظر لگاؤں میں گھوم گئے۔

اسٹیٹ کے فوجی افسروں کے سامنے ایک قطار میں قریباً پندرہ افراد کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ مضبوط رسیوں سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ پاؤں کو بھی اسی طرح باندھ دیا گیا تھا۔ ان کے رنگ زرد ہو رہے تھے۔ ابراہیم بھی ان میں شامل تھا۔ لگتا تھا کہ ان قیدیوں کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اینڈرسن نے پات دار آواز میں کہا۔ ”تم لوگوں پر یہ الزام ثابت ہونا ہیں کہ تم نے عام شہریوں پر حملے کیے۔ ایکشنی تم نے برٹش عورتوں اور بچوں کا مرڈر کیا۔ ان کی پراپرٹی کو نقصان پہنچایا۔ اور کھلے عام بغاوت کی۔ اس کے علاوہ دوسروں کو بغاوت پر اکسایا۔ ان کرانز کے لیے یہ کورٹ تم کو سزا دے گا۔“

قیدیوں میں سے دو افراد چلائے گئے۔ ان میں ایک ابراہیم تھا۔ وہ اینڈرسن کے فیصلے کو کمر درد کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ انہوں نے عورتوں اور بچوں کو نہیں اپنے ساتھ لڑنے والے مسلح لوگوں کو مارا۔ ان غلاموں کو مارا جنہوں نے یہاں کے لوگوں کا جینا حرام کیا ہوا ہے۔

اینڈرسن اور دیگر افسروں کے چہرے پتھر کی طرح ساجت تھے۔ ان پر ان باتوں کا بالکل اثر نہیں ہو رہا تھا۔ ایک نو جوان قیدی کارنگ کیسر بلدی نظر آیا۔ اس نے اٹھا کے لہجے میں کچھ کہا۔ شاید افسروں کی منت سناجتے گی۔ غالباً وہ کہہ رہا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے ان لوگوں میں شامل نہیں ہوا۔ موت کو بالکل سامنے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ اس کی حالت ترس ناک تھی مگر یہاں انہیں ترس کھانے کے لیے نہیں، شوٹ کرنے کے لیے کھڑا کیا گیا تھا۔ اس لڑکے کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لیوان کا تیرہ چودہ سالہ پوتا یاد آ گیا۔ وہ بھی تو ایسے ہی روپا لگا تھا۔ بھرت کی زبانی ہمیں معلوم ہوا تھا کہ اسپتال کے خونی ہنگامے میں وہ بچ گیا ہے۔ ابراہیم دباڑے لگا۔ ”تم گوری چڑی والوں کی موت بڑی دردناک ہوگی۔ کتوں کی طرح زرگاں کی گلیوں میں پھینکے جاؤ گے۔ موت کو ترسو گے لیکن موت نہیں ملے گی۔“ بھرت اس نے اپنا سینہ تان لیا۔ جیسے گولی کھانے کے لیے بالکل تیار ہو گیا ہو۔

اس کو دیکھ کر اور کئی افراد نے بھی سینے تان لیے اور آنکھیں بند کر لیں۔ ان میں سے اکثر منہ ہی منہ میں کچھ پکڑ رہے تھے۔ رائل اسکواڈ بالکل تیار کھڑا تھا۔ یہ چھ باوردی سپاہی تھے جو جدید ریفلیکس کنڈھوں سے لگائے بالکل تیار حالت میں کھڑے تھے۔ اینڈرسن نے اپنے ہاتھ میں سفید رومال پکڑ لیا تھا۔ رومال کے اس اشارے پر قیدیوں پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو جاتی تھی۔ یہ بڑا تکلیف دہ منظر تھا۔ مجھے کچھ عرصے پہلے اسحاق کی دردناک موت یاد آگئی۔ دو مسلح سپاہی آگے بڑھے۔ ان کے ہاتھوں میں تیز دھار چاقو تھے۔ انہوں نے قیدیوں کے توڑی اور اہام خائن وغیرہ کاٹ کر ان کے جسموں سے علیحدہ کر دیے۔ ایک پارسی نو جوان کے لباس سے ایک چھوٹی سی... پاکت ساڑی مذہبی کتاب بھی نکلی۔ یہ اشیاء قیدیوں کے جسموں سے علیحدہ کرنے کے بعد قیدیوں کو بتایا گیا کہ وہ اپنے اپنے عقیدے کے مطابق خدا سے گناہوں کی معافی مانگ لیں، انہیں گولی ماری جا رہی ہے۔ نو جوان لڑکا آخری کوشش کے طور پر پھر منت سماجت کرنے لگا۔ آٹھ دس سیکنڈ بعد اس کی آواز فائرنگ کی خوفناک آواز میں دب گئی۔ فائرنگ اسکواڈ نے اندھا دھند برسٹ چلائے اور پندرہ کے پندرہ قیدیوں کو پھینک کر دیا۔ ان کے جسم اوندھے پدھے گرے اور تیزی سے خون اگلنے لگے۔

ہماری طرح یہ منظر چیل کے اور بھی بہت سے قیدیوں نے دیکھا۔ ایک وحشت زدہ سی خاموشی نے سب کو گھیرے میں لے لیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر مقدمہ چلا تھا۔ استغاثہ اور صفائی کے دلائل سنے گئے تھے اور سزائے موت دے دی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازے کا چوکور دروازہ بند کر دیا گیا اور ہماری کوشڑی میں صرف لائسن کی مذموم روشنی باقی رہ گئی۔ ”یہ لوگ درندگی پر اتر آئے ہیں۔ انصاف کے تقاضے پورے کیے بغیر زد و خوں کو مارا جا رہا ہے۔“ بھرت نے تاسف سے کہا۔

”جب پاؤں تلے سے زمین ٹھکے لگے تو ظالم حکمران ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں۔“ عمران نے پوچھ لہجے میں کہا۔ زخمی ابراہیم نے دو گھنٹے پہلے جن برتنوں میں ناشتا کیا تھا، وہ اسی طرح ایک کوٹنے میں پڑے تھے۔ اس کی خون میں بیگی ہوئی ایک پٹی بھی ایک گوشے میں رکھی تھی لیکن وہ خود اب نہیں تھا۔

صاف ظاہر تھا کہ ان پندرہ قیدیوں کو سر عام سزا اس لیے دی گئی ہے کہ دیگر قیدی عبرت پکڑیں اور عملے کے احکام

ہرے چوں چڑاں عمل کریں۔ اس سزا کے بعد دروازے کا وزن بند ہو چکا تھا اور ہمیں امید نہیں تھی کہ وہ جلد ہی دوبارہ کھلے گا۔ مگر ہمارا یہ اندازہ غلط نکلا۔ دروازے کی دوسری جانب ایک دو منٹ تک کھٹ پٹ ہوتی رہی۔ یوں لگا جیسے کوئی وزنی کرسی گھسیٹ کر دروازے کے پاس لائی گئی ہے۔ پھر روزانہ یعنی چوکور خانے کا چھوٹا سا دروازہ کھول دیا گیا۔ دوسری طرف کا منظر تعجب خیز تھا۔ ہم سے صرف سات آٹھ منٹ کی دوری پر مسٹر اینڈرن بڑی شان سے ایک صوفہ نما شست پر بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رگاد اور دوسرے میں جھسکی کا جام تھا۔ اس کا سرخ چہرہ ہمیشہ سے زیادہ تھمرا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں دو منٹ انگریز فوجی موجود تھے۔ وہ اپنے جھیلے جوتے والے ایک پاؤں کو مسلسل ہلارہا تھا۔

میرا خون ایک بار پھر رگوں میں سیال آگ کا روپ دھار گیا۔ جی چاہا کہ اگر گرد کی ساری رگادوں سے کھرا جاؤں، ان کو توڑ دوں یا خود ختم ہو جاؤں۔۔۔ اور اگر ان کو توڑ دوں تو پھر اس تھمرا چہرے والے سفید شیطان پر جا پڑوں اور خالی ہاتھوں سے اس کا جسم بھاڑ کر رکھ دوں۔

اس نے سگار کا دھواں فضا میں چھوڑا اور بولا۔ ”افسوس ہے کہ مجھے تمہیں یہاں دیکھنا پڑ رہا ہے۔“

عمران نے کہا۔ ”ہمیں بھی افسوس ہے کہ ہم یہاں ہیں۔ آپ نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ ہمارے درمیان کچھ طے ہوا تھا۔“

اینڈرن نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس کے پیچھے کھڑے دونوں انگریز محافظ ایک طرف اوجھل ہو گئے۔

اینڈرن بولا۔ ”ہمارے درمیان جو کچھ طے ہوا تھا، اس کی پہلی شرط تو یہی تھی کہ تم دونوں ہندو سپاہیوں کے سامنے نہیں آؤ گے۔ لیکن جب تم آ گئے اور بہت سے لوگوں نے تمہیں دیکھ لیا تو پھر ہمارا معاہدہ بھی ختم ہو گیا۔“

عمران نے جواب دیا۔ ”ہم اس وقت سامنے آئے تھے جب سارا کھیل بگڑ چکا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ کم از کم سلطانہ کو یہ بتایا جاسکے اور پھر۔۔۔“

یہ ایک عمران کو خاموش ہونا پڑا۔ ایک طرف سے وزنی یوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی اور پھر رنجیت پانڈے ہاتھ میں کچھ کاغذات لیے نمودار ہوا۔ اس کی پگڑی میں ایک سرخ رنگ کی پٹی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس نے نیک فاتحانہ نظر ہم پر ڈالا اور پھر مسٹر اینڈرن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے کاغذات مسٹر اینڈرن کے حوالے کیے اور دیکھتے لہجے میں کچھ کہا بھی۔ ”ویل ڈن۔۔۔ ویل ڈن۔“ اینڈرن نے سر

ہلا لیا۔

ہم پر ایک اور ترجیحی نظر ڈال کر وہ واپس چلا گیا۔ بڑی زہریلی مہکتی تھی اس نظر میں۔

عمران نے اینڈرن سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”لگتا ہے پانڈے صاحب کی پریشانی ہو گئی ہے۔“

”کیوں نہیں۔۔۔ کیوں نہیں۔ ہمیں اچھے اور قابل ساتھیوں کی قدر کرنا آتی ہے۔ پانڈے نے اٹھرا گاؤں میں کارکردگی دکھائی ہے۔“

”ہاں کارکردگی تو اس نے واقعی دکھائی ہے۔“ عمران نے ہلے کہا۔

”تم کیا کہہ رہے ہو؟“ اینڈرن نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔۔۔ آپ۔۔۔ پانڈے صاحب کی کارکردگی کا بتا رہے تھے۔“

اینڈرن نے گلاس میں سے ایک سنہری گھونٹ لیا اور بولا۔ ”اسپتال میں اندھا دھند فائرنگ کے وقت پانڈے نے دُھی کپتان نام بریرے کو بچانے میں زبردست کردار ادا کیا۔ وہ برتی گولیوں میں اس تک پہنچا اور اسے اپنی اوٹ میں لے کر فائرنگ کی زد سے نکال لیا۔ اور یہی نہیں، اس سے صرف دو منٹ پہلے وہ ایک اور اہم کارنامہ انجام دے چکا تھا۔“

”وہ بھی بتا دیجیے جناب۔“ عمران نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس جنونی قاتل آفتاب خان کو شوت کیا۔ اگر وہ جلد ہی ایسا نہ کرتا تو شاید اور کئی لوگوں کی جان جاتی۔۔۔ بہر حال، وہ تیسرا بندہ کہیں نہیں مل سکا جو آفتاب اور سلطانہ کے ساتھ تھا۔“

عمران خاموش رہا۔ ہم جانتے تھے کہ تیسرے بندے کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ یہ ساری گفتگو حسب سابق انگلش میں ہو رہی تھی۔ عمران چند سینکڑ خاموش رہا، پھر اینڈرن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔ ”واقعی جناب! وہاں پانڈے صاحب کی کارکردگی زبردست رہی ہے۔ بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ محترمہ ماریا کی موت کا ”گریڈ“ بھی پانڈے صاحب کو ہی جاتا ہے۔“

”کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“ اینڈرن نے عمران کو گھورا۔

عمران نے کہا۔ ”آپ نے سوچا ہے کہ وہ گولی کس نے چلائی جس کی وجہ سے یہ ساری گڑبڑ ہوئی اور محترمہ ماریا سمیت کئی افراد کی جان بچ گئی؟“

اینڈرن نے سگار کا گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا۔ دھوئیں کے پس منظر میں وہ قیدی مزدور نظر آرہے تھے جو ”سرسری عدالت“ کے فرش پر سزائے موت پانے والے قیدیوں کا خون صاف کر رہے تھے۔ کسی ساتھ والی راہداری میں پہرے داروں کے جوتوں کی ٹھک ٹھک گونج رہی تھی۔ ماحول میں عجیب سی گہمی ہوئی خاموشی تھی۔ اینڈرن نے ایک ابرو اٹھائی اور انگلش اسٹائل میں بولا۔ ”مجھے یقین ہے گولی چلانے والا کوئی پاسنڈر مقامی ہوگا۔ اور ہو سکتا ہے کہ مسلمان ہی ہو۔ وہ نہیں چاہتا ہوگا کہ سر جارج کی معزز زمین اس صورت حال میں سے زندہ سلامت نکل جائے۔ اس نے کسی قریبی چھت پر سے فائرنگ کی اور سب کچھ درہم برہم کر دیا۔ یہ مسلمان زیادہ تر ہوتا ہی جنونی ہے۔“

عمران نے کہا۔ ”اگر میں یہ کہوں کہ گولی چلانے والا اور اس سارے معاملے کو خراب کرنے والا آپ کا چچیتا افسر رنجیت پانڈے تھا تو پھر۔۔۔“

”میں تمہاری اس بکواس پر ہرگز یقین نہیں کروں گا۔“

”بہت احماد ہے آپ کو اس پر؟“

”اعتماد ہی ہے۔ اس کے علاوہ جب وہ گولیاں چلیں، اس وقت وہ میرے ساتھ موجود تھا۔“

”اس نے وہ خود نہیں چلائیں۔ اس کے ساتھیوں نے یہ کام کیا۔“

”کیا میں شکل سے تمہیں اتنا گاؤڈی نظر آتا ہوں کہ تمہاری باتوں پر ہنس و سا کروں گا؟“

”اسی لیے تو آپ کو اطلاع دے رہا ہوں۔“

اینڈرن جھنجھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ ”اپنی اطلاع تم اپنے پاس رکھو۔ میں تم دونوں سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں اور مجھے اپنے سوالوں کا صحیح جواب چاہیے۔“

عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگر ہم آپ سے تعاون کریں تو ہمارے بیٹے کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔“

اینڈرن نے دھواں نکتوں سے خارج کیا۔ ”تم نے اسپتال والے ہنگامے میں سب کے سامنے آکر غلطی کی۔ اس غلطی کا خمیازہ تو تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ کیا خمیازہ ہوگا، ابھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

”آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“ عمران نے کہا۔

”انور خاں کے بارے میں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ لائش کا ساتھی رہا ہے۔ وہ اس وقت یہاں زرگاں میں موجود

ہے۔ یہاں ہونے والی تخریبی کارروائیوں میں اس کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ میں لائش سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہاں زرگاں میں انور خاں کا ٹھکانا کہاں ہو سکتا ہے۔ مجھے زرگاں میں اس کے قریبی دوستوں کے کوائف بھی درکار ہیں۔“

میں اب تک ہونے والی گفتگو میں بالکل خاموش رہا تھا۔ میری آنکھیں اینڈرن کی دید سے جل رہی تھیں اور سینے میں آتشیں طوفان ابل رہا تھا۔

اینڈرن نے عمران سے توجہ ہٹا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”ہاں۔۔۔ انور خاں کے بارے میں تم کیا بتا سکتے ہو ہمیں۔۔۔“

میں خاموش رہا۔ عجیب سی بے حسی طاری تھی مجھ پر۔

اینڈرن بھنک رہا۔ ”میں کچھ پوچھ رہا ہوں آپ جناب سے۔۔۔ اپنے ساتھی انور خاں کے بارے میں کیا جانتے ہو تم؟“

میں نے اینڈرن کی نیلگوں آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”میں صرف اتنا جانتا

ہوں کہ انور خاں تم جیسے سارے سفید کتوں کی ٹانگیں چیرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ ضرور چیرے گا۔ اور اگر کسی وجہ سے وہ یہ کام نہ کر سکا تو پھر کچھ اور کرے گا۔ میں کروں گا یا میرے جیسا کوئی دوسرا۔ لیکن کچھ بھی ہو، اس راہ جواز سے میں تم ڈیلیوں کی بد معاشریوں کے دن گزر سکے ہیں۔۔۔ گزر گئے ہیں۔ میں نے آخری الفاظ اتنی بلند آواز میں کہے کہ۔۔۔ دو دیواروں کو گونج محسوس ہوئی۔

میرا یہ جواب اور لب و لہجہ بالکل غیر متوقع تھا۔ پہلے اینڈرسن کی آنکھوں میں شدید حیرت نظر آئی پھر اس کا چوڑا چکلا سرخ چہرہ سرخ تر ہوتا چلا گیا۔ وہ ذرا تپش کر بولا۔ ”باسٹرو۔۔۔ بد ذات کالے۔۔۔ تیری یہ جرات۔۔۔ وہ صوفے پر سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے چنگھاڑ کر آواز دی۔ ”جوزف۔۔۔ ڈیوی۔۔۔ ادھر آؤ۔۔۔ جلدی کرو۔“

پھر اس نے فرط طیش میں جھپٹ کر اپنا توانا بازو دروازے کے چوکور خلا سے اندر گھسا دیا۔ وہ میری گردن پکڑتا رہا۔ یہ تھا لیکن میری گردن اس کی پیچھے سے قریب ایک فٹ دور تھی۔ اس نے ہاتھ باہر نکالا اور خوفناک آواز میں دہاڑا۔ ”لگتا ہے سابر مقابلی نے تیرے ہوش ٹھکانے پر نہیں رہنے دیے۔ اس جھوٹی فتح کی زہریلی غماری تیرے داغ کو چڑھ گئی ہے۔ میں تیرا علاج کرتا ہوں۔ بڑا کارگر علاج کرتا ہوں۔ اگر آج کے بعد تجھے ایسے کہنے پنا کی شکایت ہوئی تو میرا نام بدل دینا۔۔۔“

یہی وقت تھا جب دونوں انگریز گارڈز لپکتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ اینڈرسن نے ان میں سے ایک کے ہاتھ سے ٹرپ ٹوڑا رائل لی اور دروازے کے چوکور خلا میں سے میرا نشانہ لے لیا۔ اندازہ ہوا کہ وہ پہلے قدم کے طور پر میری ٹانگ کو نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ اس نے بے دریغ گولی چلائی جو میری ٹانگ کو تقریباً چھوئے ہوئے گزرتی۔ اس سے پہلے کہ وہ میری ٹانگوں پر دروازہ فائر کرتا، عمران تو بک چوکور خلا کے سامنے آگیا۔ ”نہیں جناب! گولی نہ چلائیں۔ میں اس کی غلطی کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ اس نے غلطی کی ہے لیکن۔۔۔“

”تم آگے سے ہٹ جاؤ باسٹرو۔ ورنہ تمہیں بھی شوٹ کر دوں گا۔“ اینڈرسن دہاڑا۔ اس نے رائل کندھے سے لگا رکھی تھی اور اس کی انگلی ٹریگر پر تھی۔

عمران نے پھر لپکتا ہوا بھروسے لہجے میں کہا۔ ”بیوی کی موت کے بعد یہ اپنے خواس میں نہیں ہے جناب! اول فول بک رہا ہے۔ ہوش ٹھکانے آئیں گے تو آپ سے معافی

مانگے گا۔“

”ہوش تو اس کتے کے ابھی ٹھکانے آجاتے ہیں۔ تم پیچھے ہٹو۔“ اینڈرسن پھر گرجا۔

عمران اپنی جگہ ڈنارہ اور دو تین منٹ کی کوشش سے اینڈرسن کا پارا نیچے لانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا اندوختیز گفتگو کے آخر میں اینڈرسن نے پھسکارتے لہجے میں کہا۔ ”میں تم دونوں کو کل اس وقت تک کی مہلت دیتا ہوں۔ تمہیں انور خاں کے بارے میں میرے ہر سوال کا جواب دینا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا، اس کے ذمے دار تم خود ہو گے۔“ وہ اپنے بھاری بولوں سے فرش کو کھتا ہوا اور گالیاں بکتا ہوا بارہا چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد عمران نے مجھے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن مجھ پر تو جیسے اس کی باتوں کا کچھ اثر ہی نہیں ہوا۔ ہاتھ ہاتھ ملکر ارد گرد کا سارا ماحول ہی مجھ پر بے اثر تھا۔ ایک عجیب سی بے حسی طاری تھی۔ نگاہوں کے سامنے صرف سلطان کا دم توڑتا ہوا چہرہ تھا۔ اکھڑی سانسیں، مجھے حسرت سے کتنی نظریں اور پھر اس کے بعد نیت پانڈے کی محسوس شکل۔ اس کا چہرہ میرے لیے دنیا کی سب سے قابل نفرت شے بن گیا تھا۔ اسی شخص کی مکاری نے اسپتال میں بساط اٹلی تھی۔ اس شیطان نے بارود کو چنگاری دکھا کر سب کچھ ختم کیا تھا۔

اینڈرسن نے ہمیں انور خاں کے حوالے سے چوبیس گھنٹے کی مہلت دی تھی لیکن یہ مہلت پوری ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ ہمیں اس امتحان سے گزرنے کی ضرورت نہ رہی۔ وہ سارا دن ہی عجیب سے تناؤ اور غیر یقینی کیفیت میں گزرا۔ صبح سویرے جس طرح پندرہ قیدیوں کو سب کے سامنے گولیوں سے اڑا دیا گیا تھا، وہ ناقابل فراموش منظر تھا۔ ان قیدیوں کی آخری کراہیں جیسے ابھی تک درو دیوار میں گونج رہی تھیں۔ عمران کے بے حد اصرار پر میں نے شام کے وقت کھانے کے دو تین تھپے لیے اور پھر ایک گوشے میں پڑ کر لیٹ گیا۔ بھرت ایک خوش گفتار شخص تھا مگر اس کو کھڑی میں آنے کے بعد سے بالکل خاموش تھا۔ اس پر نہایت سنگین نوعیت کے الزامات تھے اور وہ آج دیکھ ہی چکا تھا کہ سزا دینے میں بے گورے کتنے سفاک اور بے حس ہیں۔ عمران کی خوش کلامی بھی سنجیدگی کی گمبیرتا میں چھپی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ اس کا ذہن تیزی سے موجودہ صورت حال سے عہدہ برآ ہوئے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔

رات کوئی نو دس بجے کا وقت ہوگا۔ بھرت مذہال سا

سورہا تھا۔ عمران ایک گوشے میں اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لائین تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر سرگوشی میں بولا۔ ”ادھر آؤ۔ تمہیں ایک چیز دکھاؤں۔“

جب اس نے دوسری بار اصرار سے کہا تو میں اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ اٹھنے بیٹھنے سے میرے سر کے گوشوں میں ٹیسس اٹھتی تھیں لیکن ایسی ہی سوں کو میں نے اب خاطر میں لانا چھوڑ دیا تھا۔ اپنے زخموں کے حوالے سے میں ایسی بے پروائی برتنا تھا کہ کبھی کبھی بھول ہی جاتا تھا کہ مجھے زخم لگے۔ میں عمران کے پاس پہنچا تو اس نے انگلی سے پتھری دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے غور کیا اور حیران رہ گیا۔ یہاں کسی نکلی شے سے انگریزی کے پانچ حرف کندہ کیے گئے تھے۔ ان حرفوں سے جو لفظ بنتا تھا وہ ”جنگی“ تھا۔

عمران نے کہا۔ ”لگتا ہے تمہارے روحانی استاد بارودنا جنگی نے اسی کو کھڑی میں اپنے اسیری کے دن گزارے تھے۔“

میں ششدر رہ گیا۔ اگر واقعی ایسا تھا تو یہ حیرت انگیز اتفاق تھا۔ میں نے چاروں طرف سرگمرا کر پہلی بار اس کو کھڑی کو بغور دیکھا۔ یہ قریباً ضرب بارہ فٹ کی مختصر جگہ تھی۔ یہاں رات اور دن میں تیز کرنا ناممکن تھا۔ کو کھڑی کی عقبی دیوار کے ساتھ مونے لوہے کا ایک جھون سا رنگ آلود دروازہ تھا۔ یہ دروازہ قریباً پانچ ضرب چار فٹ کے ایک بدبو دار غسل خانے میں کھلتا تھا۔ تو یہ بھی وہ جگہ جہاں جارج گورانے بارودنا جنگی کو رکھا اور اس پر ستم کے پہاڑ ڈھائے۔ عمران نے لائین کی روشنی میں مجھے کو کھڑی کا ایک اور گوشہ دکھا یا۔ یہاں جنگی کے نام کا پہلا حرف ”بے“ اور اس کی مجبوری ٹھکانا کے نام کا پہلا حرف ”ائیں“ کندہ تھا۔ ان دو حرفوں کے اوپر یقیناً کوئی رومانی فقرہ لکھا گیا تھا مگر اس فقرے کو بعد ازاں رگڑ کر اس طرح مٹا دیا گیا تھا کہ اسے پڑھنا مشکل تھا۔ ظاہر ہے یہ کام جیل کی انتظامیہ نے ہی کیا۔ ہوگا۔ اب اس بات میں شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ بارودنا جنگی نے اپنی قید کے دن یہاں کاٹے تھے۔ یا کم از کم اپنی قید کا کچھ عرصہ یہاں کا تھا۔

ہم لائین کی زبردستی میں ان دیواروں کو بغور دیکھتے رہے۔ یہ جگہ میرے لیے ایک دم تاریخی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ایک جگہ جنگی کا سب سے پسندیدہ فقرہ لکھا ہوا نظر آیا۔ ”نو پین۔۔۔ نو کین۔“ یعنی دو نہیں تو کامیابی بھی نہیں۔

...ہاں، یقیناً یہی وہ جگہ تھی جہاں جنگی رہا تھا۔ یہاں کی دیواروں پر اس کا کس تھا۔ یہاں کی فضا میں اس کی

سانسیں دھجی ہوئی تھیں۔

رات گہری ہوئی۔ میں سونے کے لیے لیٹا تو جنگی کا تصور میرے سامنے آگیا۔ کتا چھٹا پانچ جسم، مدقوق چہرہ، اندر دھنسی ہوئی لیکن جنگی آنکھیں۔ میں نے سوچا، وہ بھی ایسے ہی اس فرش پر چرت لیٹتا ہوگا۔ ایسے ہی لائین کی زرد روشنی میں سیاہی مائل پھٹ کودیکھتا ہوگا۔ اپنی ٹھکانا کو یاد کرتا ہوگا۔ ایک دم مجھے لگا کہ وہ میرے آس پاس ہے۔ اس کی روح اپنے اس پرانے مسکن میں موجود ہے۔ میں نے خیالوں ہی خیالوں میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”جنگی! تم نے اس تاریک کو کھڑی میں کرب کے جوش و رجز گزارے تھے، ان کا مداد تو شاید کوئی نہ کر سکے لیکن تیرے بدترین دشمن جارج کو اس کے انجام تک میں نے پہنچا دیا ہے۔ اس نے تیرے ہاتھ پاؤں ٹوٹا کر تجھے اس تاریک قبر میں پھنکوا دیا تھا، آج وہ خود ”گورا قبرستان“ کی ایک قبر میں موجود ہے۔۔۔“

میں تصور میں جنگی کے جو کلام تھا جب اچانک مجھے اس چاقو کا خیال آیا جو جارج کی موت کی یادگار تھا اور میں نے اپنے پاس محفوظ کیا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے جھپٹیں ٹولیں۔ ہماری گرفتاری کے وقت یقیناً وہ چاقو بھی دوسری اشیاء کے ساتھ فوجیوں کے پاس چلا گیا تھا۔ میں اس بارے میں سوچ رہا تھا جب ایک ایک باہر جیل کی چار دیواری سے باہر دھماکے سنائی دیے۔ عمران کا کہنا تھا کہ یہ دہشتیوں کے دھماکے ہیں۔ ساتھ میں فائرنگ بھی شروع ہوئی۔ اس مرتبہ یہ فائرنگ کافی شدید تھی اور لگتا تھا کہ جیل کے آس پاس ہوری ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ طرفدار فائرنگ شدت پکڑ گئی۔ عمران اور بھرت بھی اٹھ کر بیٹھ گئے۔

عمران نے سسٹی خیر لہجے میں کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ جیل پر حملہ ہوا ہے۔“

”ایسے ہی لگت ہے۔“ بھرت بولا۔ ہم فائرنگ اور دھماکوں کی آوازوں کو بغور سنتے رہے۔ یہ آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ پھر اس کے ساتھ نعروں کی مدھم گونج بھی سنائی دینے لگی۔ ”یہ تو لگتا ہے کہ جیل کے احاطے میں لڑائی ہو رہی ہے۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔ ”اور لڑنے والے کافی زیادہ تعداد میں ہیں۔“

عمران نے اضافہ کیا۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ جیل پر ایک بڑا حملہ ہوا ہے اور کچھ لوگ جیل توڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہرگز رتے لمحے کے ساتھ ہنگامہ شدت اختیار کرتا

گیا۔ چھوٹے بڑے ہتھیاروں کی فائرنگ اور دقتی بموں کے دھماکوں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بارود کی تیز بو ہماری بند کوفٹری تک پہنچ رہی تھی۔ یوں لگا کہ اب کچھ ہی دیر میں ہمیں ایک ہی صورت حال کا سامنا ہوگا۔ عین ممکن تھا کہ جارج کی جیل پر مارے جانے والا یہ بزدل دوست شب خون کامیاب ہو جاتا اور ہم اپنی کوفٹری کے دروازے کو اپنے سامنے کھلا پاتے۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں کیا کرنا ہے؟ اس سوال کا جواب ہمارے ذہن تیزی سے سوچ رہے تھے۔

تین چار منٹ بعد محسوس ہونے لگا کہ لڑائی ہماری کوفٹریوں کے آس پاس ہی ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بھی محسوس ہونے لگا کہ جیل کا دفاع کرنے والے بھی جم کر لڑ رہے ہیں۔ ہم نے اپنی کوفٹری کے قریب ہی کسی انگریز افسر کی لٹکارتی ہوئی آواز سنی۔ وہ اپنے ہاتھوں کو ہدایات دے رہا تھا اور ”کالے باغیوں“ کو گالیوں سے نواز رہا تھا۔ دو تین ایسے دھماکے بھی سنائی دیے جو دقتی بموں کے دھماکوں سے مختلف تھے۔ عمران نے کہا: ”شاہد راکٹ لا چر ہے۔“

یہ فیصلہ کن معرکہ آجھ دس منٹ جاری رہا، یکا یک صورت حال بدلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ فائرنگ کی آوازیں قدرے فاصلے پر چلی گئیں۔ پھر یوں لگا جیسے جیل پر حملہ کرنے والے پسپا ہو رہے ہیں۔ غالباً جیل کی چھت پر سے بھی گارڈز نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی تھی۔ قریباً پندرہ منٹ مزید یہ ہنگامہ جاری رہا۔ ہم اس بند کوفٹری میں صرف اندازے ہی لگا سکتے تھے۔ ہماری کوفٹری کے عین سامنے بھی گارڈز کا تعداد میں موجود تھے۔ ان کی آوازیں سے جوش و خروش کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں فائرنگ کی آوازیں مزید فاصلے پر چلی گئیں۔ یوں محسوس ہوا کہ انتظامیہ کے سب لوگ، بھاگتے ہوئے حملہ آوروں کا پیچھا کر رہے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ہماری کوفٹریوں کے سامنے گارڈز کا جھگڑا ہوا۔ کوفٹریوں کے دروازے کھلنے لگے اور پکڑے جانے والے لوگوں کو گالیوں کی بوچھاڑوں کے ساتھ کوفٹریوں میں ٹھونسا جانے لگا۔ ہماری کوفٹری کا دروازہ بھی کھلا اور ایک دشمن قیدی کو بیدردی سے دھکا دے کر کوفٹری کے گندے فرش پر پھینک دیا گیا۔ میں نے انگریز افسر خیارڈ کو دیکھا، اس نے نفرت سے قیدی پر تھوکا اور اسے ”کالے ذلیل... سوڑ“ کے خطاب دیے۔

وزنی دروازے کو ایک بار پھر دھماکے سے بند کر دیا گیا۔ زخمی کا ایک بازو کھائی پر سے ٹوٹ چکا تھا اور عجیب انداز

میں مڑا ہوا تھا۔ اس کے سر پر بھی زخم تھا اور اس زخم سے بہنے والے خون نے اس کے پورے چہرے کو لکھڑا ہوا تھا۔ بس اس کی آنکھیں ہی دیکھی جا سکتی تھیں۔ وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ ”انور خاں تم؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ مجھے اپنی نگاہ پر بھر و سائیں ہو رہا تھا۔

انور خاں کوئی جواب نہ دے سکا۔ بس کھینچ کھینچ کر سانس لیتا رہا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے سینے سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ یہاں کی رافٹل کی سنگین یا کوئی اور تیز دھار چیر گئی تھی۔

عمران نے بھی سن لیا تھا کہ میں نے زخمی کو کس نام سے پکارا ہے۔ وہ بھی جلدی سے پاس آ گیا۔ چوٹی دروازے کا چوکور خانہ کھلا۔ ایک مقامی گارڈ نے ایک چھوٹا سا چری تھیلہ ہماری طرف پھینکا اور پتہ نکارا۔ ”اس کی مرہم پٹی کرو۔“

چری تھیلے میں مرہم پٹی کا سامان تھا لیکن یہ انور خاں کے زخموں کے لیے کافی نہیں تھا۔ وہ زخموں سے چرہ... بے بسی کی تصویر بنا ہمارے سامنے پڑا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھر و سائیں ہو رہا تھا۔ ابھی کل کی بات تھی، ابراہیم نامی شخص انور خاں کے حوالے سے کتنے جوش و خروش کا اظہار کر رہا تھا۔ اسے کامل یقین تھا کہ انور خاں زرگاں کے لیے نجات دہندہ کا کردار ادا کرنے والا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ انور خاں کی قیادت میں حکم کے باقی زرگاں میں تھلک چلنے والے ہیں۔ وہ بہت جلد سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیں گے۔ اس حوالے سے اس بے چارے نے بڑے جوش سے چاند کی سات تاریخ اور بدھ کا ذکر بھی کیا تھا۔

لیکن یہ تو قحط غلط ثابت ہوئی تھی۔ بے شک انور اور اس کے ساتھیوں نے ایک بہت دلیرانہ قدم اٹھا لیا تھا۔ وہ جارج کی جیل توڑنے کے لیے بڑی قوت سے حملہ آور ہوئے تھے لیکن بالآخر یہ کوشش ناکام ہوئی تھی۔ اور اس ناکامی سے بھی بڑھ کر مایوس کن بات یہ تھی کہ انور خاں خود بھی شدید زخمی حالت میں یہاں موجود تھا۔ اس کے زخموں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اس نے آخری وقت تک کوشش کی ہے کہ اسے زندہ نہ پکڑا جا سکے لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔

”انور خاں... آنکھیں کھولو۔ مجھے دیکھو... میں تابش ہوں۔“ میں نے اس کے کندھوں کو ہلایا۔

اس نے پلٹیں اٹھائیں۔ تھوڑی دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اثبات میں سر ہلایا۔ یوں اس نے مجھے سمجھا یا کہ وہ مجھے پہچان گیا ہے۔

اس نے خشک، خون آلود ہونٹوں پر زبان پھیری۔ میں نے اسے پانی پلایا۔ عمران اور بھرت اس کے سر سے بہنے والا خون بند کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس کی کلائی کی حالت بھی تشویش ناک تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اپنا کان اس کے ہونٹوں کے قریب کیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”...مجھے ختم کر دو... یہ لوگ مجھے... بہت بُری موت مارنا چاہتے ہیں...“

عمران نے عجیب گونجتے سے لہجے میں کہا۔ ”ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے انور خاں... تم حوصلہ رکھو۔“

انور خاں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ کون ہے۔ میں نے اس کا کندھا ہاتے ہوئے کہا۔ ”یہ دوست ہے اپنا... پاکستان سے آیا ہے...“

انور خاں کی خون آلود آنکھوں میں چمک مودار ہوئی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر عمران کے ہاتھ پر رکھا اور ایک بار پھر دہم آواز میں بولا۔ ”میں جانتا ہوں... آخری سچ ہماری ہوگی۔ ان گوروں کو ہمارا راجا جوڑنا ہوگا۔ لوگ جاگ پڑے ہیں... وہ قربانیاں دے رہے ہیں...“

زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے انور خاں پر قحط طاری ہو رہی تھی۔ اسے کسی ایسے اسپتال میں ہونا چاہیے تھا مگر وہ یہاں ہمارے درمیان اس تاریک سرد کوفٹری میں موجود تھا۔ ہم کئی گھنٹے تک اس کی تیمارداری میں مصروف رہے۔ اس کی حالت قدرے اچھی ہوئی۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ رات کو قریب چار سو جابا بازوں نے جیل پر حملہ کیا تھا۔ ان کو یقیناً کامیابی سے ہتھیار ہوجانا تھا۔ یہ زبردست منصوبہ بندی تھی لیکن عین موقع پر ایک شخص نے دغا کیا اور بازی پلٹ دی۔ ہم نے انور خاں سے پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ شخص کون تھا مگر انور خاں نے اس بارے میں خاموشی اختیار کی۔

میں نے آج انور خاں کو کئی ماہ کے بعد دیکھا تھا۔ میں اس سے تل پانی کے حالات پوچھنا چاہتا تھا۔ اپنے دوست ڈاکٹر چوہان، کپتان اسے، عبدالرحیم اور کھٹکلا وغیرہ کے بارے میں جانتا چاہتا تھا۔ مگر انور کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ان سوالوں کے جواب دے سکتا۔ اس سے صرف اتنا پتا چلا کہ ڈاکٹر چوہان بھی یہاں زرگاں میں موجود ہے۔ سارا دن انور خاں کی حالت بھی بگڑتی اور بھی سنبھلتی رہی۔ اس کے سینے پر شدید اندرونی ضرب آئی تھی اور اس وجہ سے اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔

شام کے وقت انور خاں سو گیا۔ عمران نے دیوار سے

ٹیک لگا رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ کہنے لگا۔ ”سچ کہتے ہیں تابی تاریخ اپنے آپ کو دہرائی ہے۔ ہم نے ہندوستان میں انگریزوں کی آمد، ان کے قبضے، ان کی چالاکیاں اور ریشہ دوانیوں کے بارے میں صرف پڑھا اور سنا تھا، آج ہم وہ سب کچھ یہاں اس بھانڈیل اسٹیٹ میں دیکھ رہے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ماحول بھی وہی ہے۔ یہاں بندو قوں اور مشین گنوں کے ساتھ تلواریں اور کلہاڑیاں بھی ہیں۔ موٹر کاروں کے ساتھ گھوڑے اور گھوڑا گاڑیاں بھی ہیں۔ یہاں بھی ان مشین بھر گوروں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو قہم کر رکھا ہے اور اپنے لیے کٹھ پتلیاں ڈھونڈی ہوئی ہیں۔ اور ابھی انور خاں بنا رہا تھا کہ خیر سے میر جعفر اور میر صادق جیسے لوگ بھی یہاں موجود ہیں۔“

میں نے کچھ نہیں کہا۔ بس عمران کی باتیں سن رہا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے بولنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں بس خاموش رہتا چاہتا تھا۔

عمران بولا۔ ”جب ہم یہاں آئے تھے تو ہم نے سمجھا تھا کہ حکم جی زرگاں کا حکمران ہے اور انگریز اس کے ساتھ تعاون کرتے ہیں لیکن اب کھلا ہے کہ یہاں کے تو حکمران ہی یہ انگریز ہیں۔ حکم جی کو ایک ڈمی کے طور پر سامنے رکھا گیا ہے۔ وہ شراب اور عورت کے نشے میں غرق رہتا ہے۔ عملی طور پر اس نے یہاں کی باگ ڈور سرجن اسٹیکل اور اینڈرسن جیسے لوگوں کو سونپ رکھی ہے۔“

رات کسی وقت زرگاں کے وسطی علاقے میں پھر فائرنگ شروع ہو گئی۔ پھر یہ فائرنگ اور بھی دو تین علاقوں تک پھیل گئی۔ ہم اس قبر نما کوفٹری میں بس آوازیں ہی سن سکتے تھے۔ باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ فقط اس ڈیڑھ ضرب ڈیڑھ فٹ کے چوکور خلا کے ذریعے تھا۔ اس خلا میں سے ہمیں کھانا اور ضرورت کی دیگر اشیا پہنچائی جاتی تھیں۔ یہ اشیا فراہم کرنے والے تین شخصوں میں کام کرتے تھے۔ رات کی شفٹ میں کام کرنے والا ایک گہرا ساولا ہندو تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کا بچہ اور آواز مجھے کچھ پہچانی سی لگتی تھی۔ لگتا تھا کہ یہ آواز کچھ دن پہلے میں نے سنیں تھی۔ کہاں؟ یہ یاد نہیں پڑتا تھا۔ میں نے اس بارے میں عمران سے پوچھا تو وہ بھی کوئی واضح جواب نہ دے سکا۔ بہر حال یہ آواز میرے ذہن میں کھپتی رہی۔

رات کو پھر سلطانہ کی موت کے دردناک مناظر نظروں کے سامنے گھومتے رہے... یہ سوچ کر میری آنکھیں نم ہوتی

رہیں کہ معصوم بالواب بھی اپنی ماں کو نہ دیکھ سکے گا۔ اس کو کبھی پتا نہیں چلے گا کہ ماں کا محبت بھر اس کا ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا کہ اگر میں موت کے اس گھر سے نکل کر واپس فتح پور کے مندر تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تو وہاں میرے دل کی کیفیت کیا ہوگی؟ وہاں سلطانہ کے ذاتی استعمال کی چیزیں ہوں گی۔ اس کے کپڑے، اس کے برتن، اس کے زیور... اور وہ سب کچھ جو وہ چھوڑ کر جا چکی ہے۔ سلطانہ کے قاتلوں کے ساتھ ساتھ کٹر انتہا پسند ہاشم رازی کا چہرہ بھی میری نظروں میں گھومنے لگا۔ وہ بھی تو بالواسطہ سلطانہ کے قتل میں شریک رہا تھا۔ میری آنکھیں جلنے لگیں اور جسم میں لاوا سا بہنے لگا۔

رات کسی وقت میں جاگا تو میں نے دیکھا کہ دروازے کا چوکور خانہ کھلا ہوا ہے۔ خانے کی کھلٹی سلاح کی دوسری جانب وہی پکی رنگت والا پہرے دار موجود ہے اور عمران سے باتیں کر رہا ہے۔ میں نے کر دت بدلی اور پھر سو گیا۔

صبح میں نے دیکھا کہ انور خاں ہولے ہولے کر راہ رہا ہے۔ اس کی چونوں میں شدید درد تھا۔ جب انور خاں جیسا فولادی بندہ کراہتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ درد معمولی نہیں ہے۔ میں نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر بعد ایک انگریز گاڑ کا ٹائرنر جیسا چہرہ چور خلا میں نظر آیا۔ وہ نشے میں دھت تھا۔ شاید یہ اس کا نثر تھا جو ان کو لی گئی یا مل رہی تھی۔ ”کیا تکلیف ہے؟“ وہ انگریزی میں بولا۔

”انور خاں کو بہت درد ہے۔“
”اس کا درد بڑی جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک دم ختم۔ بس تھوڑی دیر انتظار کرو۔“ اس کے منہ سے خیر لہجے نے میرے ذہن میں اندیشوں کی بھر مار کر دی۔

کچھ اسی طرح کی دھمکی ان گاڑ نے اس وقت دی تھی جب زخمی ابراہیم کو گولی سے اڑانے کے لیے اس کو کھڑی سے لے جایا گیا تھا۔

تو کیا اب انور خاں کی باری آنے والی ہے؟ میں نے بے حد کرب سے سوچا۔

اور اگر ایسا ہوا تو کیا ہم اب بھی تماشائی بنے دیکھتے رہیں گے؟ میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ اس کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اٹھ بجے کے قریب صبح گاڑ ڈر آگئے۔ میں سمجھا کہ وہ انور خاں کو لے جانے آئے ہیں لیکن انہوں نے پہلے بھرت کو باہر نکلنے کا حکم دیا۔ ان کے ہاتھوں میں بھری ہوئی

رائفلیں تھیں اور تھوروں سے پتا چلتا تھا کہ اگر ہم حکم عدولی کریں گے تو وہ ہمیں اندر ہی بھون سکتے ہیں یا اس بری طرح زخمی کر سکتے ہیں کہ ہم پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہی نہ رہیں۔ وہ لوگ بھرت کو لے کر ایک طرف چلے گئے۔ پھر ہم سب کو باری باری باہر نکالا گیا اور ہمارے ہاتھ بڑی مضبوطی کے ساتھ پشت پر رسیوں سے باندھ دیے گئے۔ ہمارے ارد گرد درجنوں رائفلوں کا چہرا تھا۔ یہاں کسی بھی طرح کی مزاحمت خود کشی کے مترادف تھی۔ انور خاں کو سب سے آخر میں ایک اسٹریچر پر بٹھایا گیا۔ اس کے ہاتھ بھی مضبوطی سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

کچھ لمحے میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ ہمارے ساتھ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے تھے اور تھوڑے گھبراہٹ کی بات بھی کوٹھی آخری بار دیکھ رہا ہوں۔

ہمیں برہنہ پا اور برہنہ سر چندنگ رابڈاویوں سے گزارا گیا اور پھر ہم تن میں آ گئے۔ ہماری آنکھیں روشنی میں چندھیا گئیں۔ آج ہم پورے چار دن بعد سورج کی روشنی دیکھ رہے تھے۔ جارج کی اس بدنام زمانہ جیل کے درو دیوار میں اس سے پہلے کسی ایک بار دیکھ چکا تھا جب مجھے سلطانہ کے ہمراہ پکڑ کر زرگاں لایا گیا تھا اور پھر میری خدمات جارج گورا کے حوالے کی گئی تھیں۔ لیکن آج جارج گورا تھا اور نہ سلطانہ۔

گاڑ کے نہایت سخت پہرے میں ہم خیل کے پھاٹک سے باہر آئے اور یہی وقت تھا جب ہمیں زرگاں کی اصل صورت حال کا پتا چلا۔ یہ سب کچھ تعجب خیز تھا۔ جیل کی بیرونی دیوار اور پھاٹک وغیرہ گولیوں سے چھلٹی تھے۔ یقیناً یہ نشانیاں اس زبردست شب خون کی تھیں جو دو دن پہلے باغیوں کی طرف سے مارا گیا تھا اور جو بقول انور خاں ایک غدار کی وجہ سے ناکام ہوا تھا۔ ہم نے اپنے ارد گرد درختوں پر کچھ لاشیں لٹکی دیکھیں۔ ان لوگوں کو پھانسی دی گئی تھی۔ جوں جوں ہم آگے بڑھے، ہم نے زرگاں کے کزنہ خیز منظر دیکھے۔ ایک چوراہے میں کئی جلی ہوئی لاشیں ایک چھوٹے سے ڈھیر کی صورت میں پڑی تھیں۔ کچھ منہم اور ادھ جلی مکان بھی دکھائی دے رہے تھے۔ درختوں اور مختلف پولوں سے لٹکی ہوئی لاشیں جابجا دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ کے جسم گولیوں سے چھلٹی تھے، کچھ کے چہرے مسخ تھے۔ ان میں سے چند ایک کے سوا سب مسلمان دکھائی دیتے تھے۔

”گناہ ہے کہ بغاوت پوری طرح چل دی گئی ہے۔“

میرے پہلو میں چلتے ہوئے عمران نے سرگوشی کی۔ ہم آخری قطار میں تھے۔ ہر قیدی کے عقب میں ایک مسخ گاڑ تھا جس نے اسے بازو سے پکڑ رکھا تھا۔

ہم خیل سے نکلنے والے قریب چالیس قیدی تھے۔ تین قیدی اسٹریچر پر تھے۔ ان میں انور خاں بھی شامل تھا۔ بھارت بار بار اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ کچھ اچھا ہونے نہیں جا رہا۔ منہم کی عزت لوٹنے کے جرم میں وہ بے گناہ پکڑا گیا تھا مگر یہاں اس کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔

جب ہمارا قافلہ ایک کشادہ سڑک پر مڑا تو بھرت نے ہمیں آگاہ کرتے ہوئے زیر لب کہا۔ ”ہم قاسم کے علاقے میں جا رہے ہیں۔ یہاں مسلمان آبادی ہے بلکہ یہ زرگاں میں مسلمانوں کا گڑھ ہے۔“

ارد گرد کے مکانات کی کھڑکیوں اور دروازوں میں سے کبھے ہوئے چہرے جھانک رہے تھے۔ ہر طرف ہراس کی فضا تھی۔ ہم نے ایک چھوٹا سا محلہ دیکھا جو پورے کا پورا جلا ہوا تھا۔ یہاں نماش کے لیے ایک سر بریدہ لاش چوراہے کے بیچوں بیچ پڑی تھی۔ جب ہم اس علاقے کی تنگ گلیوں میں داخل ہوئے تو ایک فوجی گاڑی ہمارے قافلے کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ میں نے اور بھرت نے مڑ کر دیکھا۔ اس گاڑی میں منہم تھوڑے والا اینڈرزن موجود تھا۔ تاہم ایک شخص اینڈرزن سے بھی انہم اس گاڑی میں موجود تھا۔ وہ دروازے قدر جنرل اسٹیل تھا۔ اس کے چہرے پر خشونت برس رہی تھی۔

چند منٹوں کے اندر اس نے اپنے کتے بھائی کے علاوہ اپنی بیوی بھی کھودی تھی۔ اس کا لبوڑا چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کے اندر بدلے کی آگ بجھ کر رہی ہے۔

بھرت کے پیچھے چلتے والے مقامی گاڑ نے اس کی گردن پر زوردار جھاپیز رسید کیا اور حکم دیا کہ وہ صرف آگے دیکھے۔

ہم باجولاں چلتے رہے۔ چند منٹ بعد پیچھے آتی ہوئی گاڑی میں سے اینڈرزن کی گرخت آواز بلند ہوئی۔ وہ ”گاؤں کے ذریعے نوٹی پھوٹی اردو میں بول رہا تھا۔“

”اسٹیل اور حکم کی کے جرم ہیں۔ آج ان لوگوں کو ہمارے آنکھوں کے سامنے بھرت ناک بخش منٹ دیے جائیں گے۔ ہاشم تو م کو دکھائیں گا کہ باغیوں کا انجام کیا ہوتا۔“

”گناہ اور بھرت پکڑو۔“

اس نے یہ چند فقرے بار بار دہرائے۔ ایک چھوٹے گناہ پر یہ قافلہ رک گیا۔ یہاں ایک مسجد نظر آرہی تھی۔

ارد گرد کی دیواروں پر انگریزوں اور حکم کے خلاف باغیانہ نعرے لکھے تھے جنہیں بعد ازاں منانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہاں آبادی گنجان تھی۔ ارد گرد کے مکانات کی پھتوں اور کھڑکیوں میں لا تعداد لوگ موجود تھے۔ اگر یہ سب لوگ اکٹھے ہو کر ایک دم ٹوٹ پڑتے تو ان دو ڈھائی سو فوجیوں کی ٹکا بونی کر ڈالتے لیکن عملی طور پر ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ اینڈرزن نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”یہی جگہ ہے جہاں سے پانچ دن پہلے تو ہم لوگوں نے اپنی ٹینشن شروع کیا۔ اسی جگہ سے وہ آگ بجھ کر جس نے اسٹیل کے پُر امن لوگوں کا بہت زیادہ نقصان کیا۔ سیکڑوں بے گناہ لوگوں کا مڑر ہوا۔ ہاں، یہی وہ جگہ ہے۔“

اینڈرزن نے مسلح سپاہیوں کو حکم دیا۔ انہوں نے قیدیوں میں سے چند افراد چنے۔ رائفلوں کی سنگینوں کے ذریعے ان کے کپڑے چاک کر دیے گئے اور انہیں زمین پر اوندھا لٹا دیا گیا۔ یہ ایک تکلیف دہ منظر تھا۔ اینڈرزن چنگھاڑا۔ ”یہی وہ جگہ ہے جہاں پُر امن شہری ڈاکٹر ولیم اور اس کی وائف کا پکڑا پھانسا گیا اور ان کو مار مار کر بے ہوش کر دیا گیا۔ اگر تو ہم لوگوں نے وہ سین دیکھا تھا تو آج یہی بھی دیکھتے۔“

اوندھا لٹا بے جانے والے چھ قیدیوں کو اس طرح بے بس کیا گیا کہ ان کے سر کے بال اور نچنے گاڑنے اپنی گرفت میں لے لیے۔ پھر ان پر چڑے کے وزنی جوتوں کی بارش کر دی گئی۔ وہ چلا تے رہے، چلا تے رہے۔ ان کی جلد سے خون رسنے لگا۔ ان میں سے تین نیم بے ہوش اور تین مکمل بے ہوش ہو گئے۔ مکمل بے ہوش ہو جانے والوں کو بھی اسٹریچر پر ڈال لیا گیا اور انہیں بغیر کوئی طبی امداد دیے یہ قافلہ آگے روانہ ہو گیا۔

چھوٹی چھوٹی گلیوں میں سے نکل کر لوگ اس قافلے کے پیچھے چلتے گئے تھے۔ ان کی حیثیت صرف تماشائیوں کی تھی۔ مزاحمت تو دور کی بات ہے، وہ مسلح فوجیوں کے سائے سے بھی خوفزدہ تھے۔ ان میں زیادہ تر لڑکے بالے تھے۔

قیدیوں کو چپ لگ گئی تھی۔ ان کے چہرے زرد ہو گئے تھے۔ سب کا انجام دکھائی دینے لگا تھا۔ ایک سرسری سی عدالتی کارروائی، تین چار منٹ کا رسمی مکالمہ اور پھر سزائے موت۔ مجھے لگا کہ میں کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے 1857ء میں کھڑا ہوں۔ انگریزوں کے خلاف بغاوت چل دی گئی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کو قید میں ڈال دیا گیا ہے۔ لوگوں کو سرعام پھانسیاں دی جا رہی ہیں۔ ان کے سر جدا کیے جا رہے ہیں۔

117

کپنی کی حکومت نے ساڑھے تین سو سالہ مغلیہ دور حکومت کو ختم کر دیا ہے اور لوگوں پر ظلم کے پہاڑ ڈھاری ہے... ہاں، یہ سب کچھ ویسا ہی تو تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں کا براے نام اقتدار ایک ہندو کے پاس تھا اور وہ ان گوروں کا کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔

میں نے سوچا۔ ”تو کیا آج ہماری زندگیوں کو غفلت سناپ گئے والا ہے؟“ میں نے ایک بار پھر کن انگیوں سے لڑا۔ ان کو دیکھا۔ اس کے سپاٹ چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔

آخر ہم ایک بڑے چوراہے میں پہنچے۔ یہ قاسم پوک تھا۔ ہماری آمد سے پہلے ہی یہاں بہت سے افراد جمع تھے۔ ہماری آمد کے بعد اور بھی ہجوم ہو گیا۔ گھروں کی چھتوں اور گلیوں میں بھی لوگ نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ جو کچھ یہاں ہونے جا رہا ہے، وہ انہیں خون کے آنسو رلا رہا ہے مگر وہ اسے روکنے کے لیے کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ یہاں بھی درختوں پر کئی لاشیں لٹکی نظر آئیں۔ ابھی ان میں سے بڑا ٹھنا شروع نہیں ہوئی تھی۔ غالباً ان بد نصیبوں کو کل رات کسی وقت چھائی دی گئی تھی۔ یہ سب کے سب مسلمان تھے۔

یہاں ہمیں ایک قطار میں دس سولیاں لگڑی نظر آئیں۔ ایک طرف بہت سی کرسیاں رکھی تھیں اور میزیں لگی تھیں۔ میزوں پر صاف ستھرے کپڑے بچھے ہوئے تھے۔ یہاں درجنوں انگریز صاحبان پہلے سے موجود تھے۔ ان میں سے بیشتر شراب سے شغل کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک لرزہ خیز تماشے کی ہوس تھی۔ اس جگہ چاروں طرف خاردار بارشیں۔

ہمیں ایک چوڑے پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ برہنہ کیے جانے والے چھ افراد میں سے تین تو اسٹریچرز پر تھے، باقی تین ہمارے ساتھ کھڑے تھے۔ ان کے جسموں پر کپڑے کی ایک دھجی نہیں تھی۔ سولیاں ہم سے فقط پندرہ میس قدم کی دوری پر تھیں۔ دو بچے کٹے جلا دھما افراد یہاں موجود تھے۔ ایذا رسانی کے بیشتر آلات بھی یہاں نظر آ رہے تھے۔ لکڑی کے دستے والے وزنی ہتھوڑے، چھوٹی ہتھوڑیاں، آہنی میٹھیں اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ میری نگاہوں میں ایک بار پھر اسحاق کی لرزہ خیز موت کے مناظر گھوم گئے۔ ہزاروں افراد کے سامنے اس ”جاں بلب“ کو میٹوں کے ذریعے سولی پر ٹھونکا گیا اور پھر اس کی ہڈیوں کا چورا کر دیا گیا تھا۔

فوجی افسر نیارڈ ٹھہلا ہوا ہمارے پاس آیا۔ ہم چالیس قیدیوں کی تین قطاروں میں سب سے آخری قطار میں تھے... لیکن بھرت کو اب پہلی قطار میں کھڑا کیا گیا تھا۔ قیدیوں والے چار اسٹریچرز بھی ایک طرف رکھے تھے۔ اسٹریچرز کی بیٹلس باندھ کر قیدیوں کو ہلٹے چلنے سے روک دیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ انور خاں کی آنکھیں بند ہیں اور وہ منہ میں مسلسل کچھ پڑھ رہا ہے۔ نیارڈ ٹھہلا ہوا ہمارے پاس آیا اور منہ نیڑھا کر کے انگریز میں بولا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ تم تیسری قطار میں ہو۔ بہر حال، تمہارے لیے ایک خبر اچھی ہے اور ایک بُری۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”اچھی خبر یہ ہے کہ تم تیسری قطار میں ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں ابھی سزا نہیں دی جا رہی۔ تمہاری سزا ملتی ہوئی ہے۔“

میرے سینے میں لہری دوڑ گئی۔ ”اور بُری خبر؟“ میں نے پوچھا۔

وہ سفاکی سے بولا۔ ”یہ سزا زیادہ دیر کے لیے ملتی نہیں ہوگی۔ آدھے قیدیوں کو یہاں سزا دی جا رہی ہے۔ آدھے قیدیوں کو ڈیڑھ دو میل دور قاسم پوک میں دی جائے گی... چلو کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہے۔ تمہیں دو ڈھائی گھنٹے اور زندگی مل گئی ہے اور زندگی تو پھر زندگی ہی ہوتی ہے۔“

میں آزاد ہوتا تو شاید اس سفید سور پر مل پڑتا مگر میرے ہاتھ پشت پر بے انتہا سختی سے بندھے ہوئے تھے اور درجنوں رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

نیارڈ نے بڑی ادا سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

”یہ ارد گرد کا نظارہ تم کو کیسا لگ رہا ہے؟ دیکھو، یہ صرف دو ڈھائی سو سہائی ہیں۔ انہوں نے ارد گرد کے ہزاروں تماشا نیوں کو ہینڈ ٹائز کر رکھا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ اندر سے کھول رہے ہیں، اہل رہے ہیں مگر کچھ کر نہیں سکتے۔ یہ انسان نہیں بھیڑ بکریاں ہیں اور بھیڑ بکریاں بھی ایسی جو ہینڈ ٹائز ہو چکی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں عزت تاب اکیل صاحب کی بہادری کی داد دی جائے۔ لوگ کہتے تھے کہ قاسم پوک کے علاقے میں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ لیکن ہم یہاں موجود ہیں اور قاسم پوک کے ان باغی قیدیوں کو ان کے عزیز و اقارب کے سامنے ہی کتے کی موت مارنے والے ہیں۔ ہے نا بہادری؟“ نیارڈ نے سائنس طلب نظروں سے مجھے اور عمران کو دیکھا۔

عقلمند

”لیکن یہ نئے لوگ ہیں۔“ عمران نے کہا۔

وہ ہنسا۔ ”اتنے بھی نئے نہیں ہیں۔ کچھ نئے کچھ ضرور ہے ان کے پاس۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کے پاس تو ہیں اور راکٹ لانچر بھی ہوں تو کچھ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ لڑائی ہتھیار سے نہیں یہاں سے ہوتی ہے۔۔۔ یہاں سے۔“ اس نے

چنے سننے کو بائیں طرف سے ٹھونکا۔
سکرپٹ کا کٹس لے کر بولا۔ ”اسٹیل صاحب اور مسٹر اینڈرسن چاہتے تو یہاں بہت ساری نفری بھی لاسکتے تھے۔ یہاں کے ہر کالے کے سر پر ایک رائل برادر کھڑا کر سکتے تھے لیکن وہ صرف دو کمپنیوں کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ڈھائی سو سپاہی۔ اور تم ان ڈھائی سو سپاہیوں کی دہشت دیکھ رہے ہو۔ یہ اس سے آدھے بھی ہوتے تو نتیجہ یہی ہوتا تھا۔ اب تو ہمیں یہ بات مانی چاہیے کہ ایک برٹش سپاہی ایک سو کالے لنگھوؤں پر بھاری ہے۔۔۔“

خیار ڈ صرف بڑ نہیں مار رہا تھا۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ سیکڑوں تماشائی واقعی انسانوں کے بجائے سمیڑ بکریاں نظر آ رہے تھے۔ دور فاصلے پر چند ٹولیاں ضرور ایسی تھیں جو نعرے لگا رہی تھیں اور احتجاجی رویے کا اظہار کر رہی تھیں مگر فی سب کوٹ تھا۔

اسٹیل اور اینڈرسن وغیرہ ایک شاندار میز کے عقب میں مٹلی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ ملکی سنہری دھوپ میں ان کے چہرے کچھ اور بھی سرخ دکھائی دیتے تھے۔ اینڈرسن اپنی جگہ سے اٹھ کر چوڑے پر آیا اور ایک بار پھر ریگ فون کے ذریعے دہاڑا۔ ”۔۔۔ ہام دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن ہیں۔ یہ تمہارے سامنے عبرت کا تصویر بناؤ۔ سب ڈرٹی لوگ کھڑا ہے جس نے اپنی اوقات سے بڑھ کر ظلم کی۔ پچھلے پانچ دن تک ان لوگوں نے اس شہر کو جہنم بنائے رکھا۔ اب ان کا انجام تو تم لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ گے۔ یہ سب کا سب اپنے گراؤ کو تسلیم کر چکا ہے۔ حکم جی کے قانون میں ان کے لیے کوئی رعایت نہیں اور نہ ہی ہام دیں گے۔ اب کہاں ہیں وہ موٹی گردنوں والے سرکردہ لوگ جنہوں نے ان کو بیڑ کیا۔ ان میں سے بہت سا بھاگ چکا اور بہت سا چوہوں کی طرح انڈر گراؤنڈ ہے۔ یہ بیویوں اور کیزوں کے جھرمٹ میں رہنے والے، جھوٹے دغا باز، فریبی عیاش تم کو کچھ نہیں دے سکتے۔ اسپرین کا ایک گولی، جیزٹر کا ایک پزہ، رائل کا ایک رائف۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔“

قوی جیکل اینڈرسن کئی منٹ تک دہاڑتا رہا۔ آخر میں اس نے کہا۔ ”ہام ڈرنے والا نہیں، لڑنے والا لوگ ہے۔“

ہام کو اپنے بازو بدھیر ہوسا ہے اور اسی لیے ہام یہاں موجود ہے۔ اگر کسی کو کسی بھی ناٹم اپنے دل کا ارمان نکالنا ہے تو ہام اس کے لیے تیار ہے۔“

اینڈرسن کی تقریر ختم ہوئی تو ہم پر پری انکشاف ہوا کہ یہاں کوئی سرسری سماعت بھی نہیں ہوگی اور اگلے چند منٹ کے اندر کم از کم بیس قیدیوں کو مقامی طریقے کے مطابق سولی چڑھا دیا جائے گا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ انور خاں اور بھرت بھی ان میں افراد میں شامل ہوں گے۔ ہم نے دیکھا کہ بھرت کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد نظر آ رہا تھا۔ آفیسر ریڈا اس کے قریب ہی موجود تھا۔ بھرت نے دو تین بار اس سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن گارڈز نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔ یقیناً وہ ان آخری لمحوں میں پھر اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا ہو گا۔ ان کو بتانا چاہتا ہو گا کہ وہ میم کرسی کو مارنے والوں میں نہیں بچائے والوں میں شامل تھا۔ مگر صاف پتا چلتا تھا کہ اب صفائی دہائی کا مرحلہ گزر چکا ہے۔ کسی فریادی کی کسی فریاد پر اب کان نہیں دھرا جائے گا۔

اسی دوران میں میری نظر میڈم صفورا پر پڑی۔ وہ کرسیوں پر بیٹھے معزز مہمانوں کی آخری قطار میں نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ غم و اندوہ کی تصویر تھا۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر اتنی دور سے بھی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کچھ دیر پہلے تک روتی رہی ہے۔ چند سیکنڈ کے لیے میری اور اس کی نگاہیں ملیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عمران نے بھی اسے دیکھ لیا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھنے کے سوا ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ صفورا میں اتنی سخت نہیں ہوگی کہ وہ یہاں بیٹھ کر سفاکانہ طریقے کے سولیاں چڑھا نے کا منظر دیکھ سکے۔ یقیناً وہ صرف ہمیں دیکھنے کے لیے یہاں آئی تھی۔ خونی تماشیا شروع ہونے سے پہلے ہی اسے یہاں سے چلے جانا تھا۔

عمران نے مجھے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔ ”میڈم کو اچانک دل میں حسرت دل میں ہی رہی۔ آہ۔۔۔ اب اس کو بھی پتا نہیں چل سکے گا کہ میں اس پر کس طرح قہار تھا۔“

میں نے حیرت سے عمران کو دیکھا۔ سلطانہ کی موت کے بعد سے میری طرح اسے بھی چپ سی لگ گئی تھی۔ آج وہ کئی دنوں کے بعد تھوڑا سا چمکا تھا۔ ہم بے حد تکلیف صورت حال کا سامنا کر رہے تھے۔ ایسی صورت حال میں وہ اپنے مخصوص انداز میں کیوں بولا تھا؟

میں نے بھی اپنی خاموشی توڑی۔ میں نے بتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”عمران! کیا آج پھر ہم دیکھتے رہ جائیں

گے؟ ہم اسحاق کو نہ بچ سکے، کیا انور خاں اور بھرت کے لیے بھی کچھ نہ کر سکیں گے؟“

”نہیں یار! اس دفعہ تو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔“

”کیسے ہو جائے گا؟“

”یار! جب تم چاہو گے تو ہو جائے گا۔ تم کوئی ایویں شیوس چیز ہو؟ تم نے یہاں کے فٹکی دیوتا جارج کو انوکھوں سے چبوائے ہوئے ہیں۔ اکھاڑے میں اسے موت کے گھاٹ اتارا ہوا ہے۔ تم کوشش کرو گے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم زور لگاؤ تو تمہارے ہاتھوں کو بکڑنے والی رتی ٹوٹ جائے گی۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ میں نے بیزار سی کہا۔

”یار! میں نے بھی خبروں کے علاوہ جھوٹ بولا ہے؟ میں وہی کہہ رہا ہوں جو ہو سکتا ہے۔“ عمران نے جواب دیا۔ ہم دونوں چٹائی میں بات کر رہے تھے اور لہجہ بہت دھیمہ تھا۔ گارڈز کچھ فاصلے پر تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ ہماری بات نہیں سمجھ رہے ہوں گے۔ عمران کی اس بے وقت کی راگنی پر میرا دل بھر آیا۔ آنکھوں کے کنارے جل اٹھے۔

”عمران!“ میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

وہ سنجیدہ ہو گیا اور بدلے ہوئے آہنگ میں بولا۔

”یار! تمہارے ہاتھوں پر بندھی ہوئی رتی اتنی مضبوط نہیں ہے کہ تم اسے توڑ نہ سکو۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اسے کمزور کر دیا گیا ہے۔ تمہارے پیچھے چلنے والا گارڈ اسے کمزور کرتا رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ریزر بلیڈ کا ایک ٹکڑا تھا۔ وہ اس ٹکڑے کو رتی کے بلوں پر چلاتا رہا ہے۔ اب یہ رتی سات آٹھ جگہ سے کمزور پڑ چکی ہے۔ ہمارے پیچھے دیوار ہے اس لیے ہمارے بندھے ہوئے ہاتھ کسی کو نظر نہیں آ رہے۔“

میں نے اپنے ہاتھ ہلا کر دیکھے۔ وہ جلدی سے بولا۔

”نہیں۔۔۔ ابھی زور نہیں لگاتا۔ ابھی زور لگانے کا وقت نہیں آیا۔“

میں نے سرگوشی کی۔ ”تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔۔۔ اگر۔۔۔ کئی کمزور کی ہے تو کس نے کی ہے۔۔۔ اور کیوں؟“

”تمہیں بتایا تو ہے کہ تمہارے پیچھے چلنے والے گارڈ نے کی ہے۔ اور کیوں کی ہے، اس کا جواب بڑا مشکل ہے۔ اس پر تو پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے۔“ وہ عجیب کھوٹے سے انداز میں بولا۔ میں اس کا اطمینان اور ٹھہراؤ دیکھ کر حیران

ہو رہا تھا۔ یہ اطمینان اور ٹھہراؤ میرے اندر ایک بے نام امید جگا رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”چلو تم طویل جواب نہ دو، مختصر دے دو۔“

ہم بڑے عام سے انداز میں بات کر رہے تھے۔ بات کرتے ہوئے ایک دوسرے کو کچھ بھی نہیں رہے تھے۔ گارڈز نے ابھی تک ہمارا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ عمران بدستور کھوٹے کھوٹے انداز میں بولا۔ ”کہتے ہیں نا کہ چیونٹی بھی اپنی طاقت کے مطابق اپنا دفاع کرتی ہے۔ کچھ لوگ چیونٹیوں ہی کی طرح حقیر اور بے حیثیت سمجھے جاتے ہیں۔ جب رنجیت پانڈے جیسے لوگ ان کی انا کے منہ پر ٹھپڑ مارتے ہیں تو وہ اندر سے بدل جاتے ہیں۔ وہ رہتے تو چیونٹی ہی ہیں لیکن یہ زہریلی چیونٹی ہوتی ہے۔ ہاتھی کو گرا دیتی ہے۔۔۔“ عمران کالب و دھجی خیر تھا۔

عمران کی بات نے میرے اندر ایک جھٹکا سا کیا۔ دماغ میں روشنی سی بھرمی۔ پانڈے اور ٹھپڑ والی بات سے مجھے چند روز پہلے کا ایک منظر یاد آ گیا۔۔۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ یاد آ گیا کہ ہماری کوشش پر پھر دینے والے گہرے سانولے گارڈ کی آواز میں نے پہلے کہاں سنی تھی۔ وہ آواز مجھے یوں ہی جانی پہچانی نہیں لگتی تھی۔ جب ہم اٹھرا گاؤں میں کما کے کھیت میں چپے ہوئے تھے تو رات کی تاریکی میں رنجیت پانڈے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک کمانڈو ایکشن کے لیے نکلا تھا۔ یہ لوگ سیوریج کی ایک پرانی پائپ لائن تک پہنچے تھے اور اسپتال میں گھسنے کے لیے اس پائپ لائن کے سرے پر سے مٹی ہٹائی تھی۔ پانڈے کی ہدایت پر اس کا ماتحت کدال چلا رہا تھا۔ کدال سینٹ کے پائپ سے ٹکرائی تھی اور آواز پیدا ہوئی تھی۔ پانڈے نے بھنا کر اس ماتحت کو تھپڑ رسید کیا تھا۔ تھپڑ کی آواز سنائے میں دور تک گونجی تھی۔ پانڈے اور اس کے اس مزدور ماتحت کے درمیان جو مختصر مکالمہ ہوا تھا، اس میں یہ آواز میرے کانوں تک پہنچی تھی۔ یہ بھرائی ہوئی سی آواز والا ماتحت اس وقت ایک دیہاتی کے حلیے میں تھا اور دھوئی کرت پہننے ہوئے تھا۔

ایک دم واقعات کی بہت سی کڑیاں مل گئیں۔ کوشش میں، میں نے دو تین بار اس سانولے ماتحت گارڈ کو عمران سے باتیں کرتے سنا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہاں کوئی کچھوڑی بھی تھی۔ کوئی پلان بنا تھا۔ عمران نے دوبارہ تیز سرگوشی کی۔ ”میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں۔ ابھی زور نہیں لگاتا۔ جب وقت آئے گا، میں بتا دوں گا۔“

دوسری طرف اجتماعی سویلوں کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔ ورزشی جسم والے مقامی جلاؤ بالکل تیار تھے۔ ہزاروں کا مجمع مضطرب لیکن خاموش تھا۔ میرے جسم میں سویلوں کی جیسے لگیں۔ دھڑکن برحق جاری تھی۔ میں نے کہا۔ ”لیکن میرے پیچھے چلنے والا گارڈ تو کوئی اور تھا؟“

”وہ اس کا ساتھی ہے۔“ عمران نے مختصر جواب دیا۔ اب مجھے کچھ دیر پہلے کی وہ ساری صورت حال یاد آ رہی تھی۔ جب ہم یہاں آ رہے تھے، سب قیدیوں کے پیچھے ایک ایک گارڈ تھا اور گارڈ نے اپنے قیدی کو باقاعدہ بازو سے پکڑا ہوا تھا۔ میرے والے گارڈ نے بھی میری کلائی تھامی ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ میرے ہاتھوں کی بندش کے ساتھ کچھ کیا جا رہا ہے۔ ”عمران! اگر کچھ کرنا ہے تو جلدی کریں۔ یوں نہ ہو کہ وقت پھر ہاتھ سے نکل جائے۔“ میں نے سرگوشی کی۔ ”بس تھوڑا سا انتظار... تھوڑا سا... کسی نے یہاں آنا ہے۔“

”کس نے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔ ”ٹھیک سے مجھے بھی پتا نہیں... لیکن وہ آئے گا ضرور۔“

”تم پھر پہیلیاں بھجوا رہے ہو۔ تمہیں سب پتا ہوگا۔“ ”سب نہیں... ہاں تھوڑا بہت پتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ جب آئے گا تو سیدھا ان میزکریوں کی طرف جائے گا جہاں یہ گورے بیٹھے، انگوڑی بیٹی سے میل رہے ہیں۔ ایک دم پھل سچ جائے گی... اور یہی وقت ہوگا تمہارے زور لگانے کا۔ تم اپنی رسیاں توڑ دینا اور سیدھا سرجن اسٹیل کی طرف جانا۔“

”سرجن اسٹیل کی طرف؟ وہ تو وہاں بیٹھا ہے۔ ان آخری کرسیوں کی طرف۔“ ”تب وہ وہاں نہیں ہوگا۔“ عمران نے کہا۔ ”وہ یہاں ہوگا، ہمارے سامنے۔ وہ ذیل ان میں بندوں کو اپنے ”دست مبارک“ سے سولی چڑھانا چاہتا ہے۔ اپنی بیوی آنجنبا باری کی روح کو خوش کرنا چاہتا ہے۔“

ایک نومند گارڈ ہمارے قریب آیا اور دانت چیں کر بولا۔ ”تم دونوں لگا تار باتیں کر رہے ہو۔ چپ ہو جاؤ ورنہ پہلے تمہاری باری آ جاوے گی۔“

میں اور عمران اس زہرناک وارنگ کے بعد خاموش ہو گئے۔ میڈم صفور اب اپنی جگہ سے اٹھ کر جا چکی تھی۔ ممکن

تھا کہ وہ اب بھی کہیں پیچھے تماشا نیوں میں موجود ہو۔ عمران کا کہا درست ثابت ہوا۔ دروازہ سرجن اسٹیل اپنی جگہ سے اٹھا اور گارڈز کے ساتھ چلتا ہوا چوتھے پر آ گیا۔ سویلوں اب بالکل تیار تھیں۔ قنار میں کھڑے پہلے قیدی کا رنگ بالکل سفید ہو چکا تھا۔ یقیناً پہلی باری اسی کی تھی۔ اسٹریچرز پر لیٹے قیدیوں کو بھی چوتھے پر چڑھا دیا گیا۔ ان میں انور خاں بھی تھا۔ وہ آنکھیں بند کر لیا تھا۔ ہمارے لیے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ بے ہوش ہے یا نہیں۔

ایڈورسن، خیارڈ اور دیگر معزز گورے اپنی اپنی کرسیوں پر موجود تھے۔ وہ اس سفاکی کا نظارہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار و آمادہ تھے جو یہاں روا رکھی جانے والی تھی... پہلے قیدیوں کو سویلوں سے باندھا جاتا تھا۔ پھر ان کی ہتھیلیوں اور ٹخنوں میں آہنی پتھیں ٹھونکی جاتی تھیں۔ پھر آہنی ہتھوڑے کی ضربوں سے ان کے جسم کی اہم ہڈیاں ٹوٹی تھیں۔ آخر میں رانفل کی گولی یا خنجر کے وار سے ان کا قصہ تمام ہوتا تھا۔

...اور وہ کون تھا جسے آتا تھا؟ جس کے آنے کی امید عمران کو تھی... وہ کون ہو سکتا تھا؟ ڈاکٹر چوہان؟ کپتان اچے؟ چھوٹے سرکار کا کوئی جان باز یا پھر اقبال جسے ہم سچ پور کے تھانے میں چھوڑ آئے تھے؟

...تین قیدیوں کو سولی سے باندھا جا چکا تھا۔ میری دھڑکن عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ میں نے بے حد اضطراب کے ساتھ عمران کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک بار پھر آنکھوں آنکھوں میں مجھے انتظار کرنے کو کہا... دو تین منٹ مزید گزرے اور پھر وہی ہوا۔ آنے والا آ گیا۔ وہ کون تھا؟ میں نے اسے کافی فاصلے سے دیکھا۔ اس نے اپنا چہرہ بھی ایک ڈھانے میں چھپایا ہوا تھا۔ میں نے اسے اس کے قد کا ٹھہ، اس کی جسامت اور اس کے بھانسنے کے انداز سے پہچانا۔ اور یہ وہ تھا جس کے بارے میں، میں نے بالکل نہیں سوچا تھا۔ میں اسے بھولا ہوا تھا... شاید میں نے لاشعوری طور پر بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ یہاں نظر آ سکتا ہے... وہ وہاں تھا۔ سلطنت کا پندرہ سولہ سالہ بھانجا... جو کسی رشتے سے اس کا بھتیجا بھی تھا... کم گو، کم آواز، بڑی بڑی بھید بھری آنکھوں والا۔ سلطنت اس کے لیے خالہ تھی، ماں بھی اور بہن بھی۔ وہ اس سے بے حد محبت رکھتا تھا۔ پچھلے چند دنوں میں حالات کچھ ایسے رہے تھے کہ میں نے طلال کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا اور نہ ہی غور کیا تھا کہ جب سچ پور مندر کے تھانوں میں سلطنت کی موت کی خبر پہنچی تو

اس کے اس راجپوت بھانجے پر کیا گزرے گی۔ اور اب اچانک وہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کی آمد کا منظر قابل دید تھا۔ وہ اور اس کی برادری کے قریب آدس پندرہ افراد اچانک ہجوم میں سے نکلے تھے اور اندھا دھند ان نشستوں کی طرف دوڑے جہاں گورے صاحبان سے نوشی میں مصروف تھے۔ طلال سب سے آگے تھا۔ مجھے اس کے ہاتھوں میں چھوٹی نال والی رانفل نظر آئی۔ وہ لگا تار فائر کرتا اور چلاتا ہوا سلطنت کے قاتلوں ایڈورسن اور خیارڈ وغیرہ کی طرف بڑھا۔ چند سیکنڈ کے لیے جیسے درجنوں گارڈز سکتے زندہ ہو گئے۔ پھر انہیں ہوش آیا۔ انہوں نے رانفلیں سیدھی کیں۔ دھماکوں سے فضا کچھ اور بھی لرز اٹھی۔ طلال کے چار ہانچ ساتھی رستے میں ہی گر گئے لیکن باقی خاردار باز ٹیک پیچھے میں کامیاب ہو گئے۔ طلال کے پیچھے آنے والے شخص کے ہاتھ میں قریب ڈیڑھ فٹ چوڑا اور دس بارہ فٹ لمبا تختہ تھا۔ اس نے یہ تختہ خاردار میز کے کول چھلوں کے اوپر پھینکا، پلک جھپکتے میں طلال اپنے تین چار ساتھیوں سمیت اس تختے پر چڑھا اور خاردار رکاوٹ پار کر گیا۔ میں نے اس کی گولی سے سیکنڈ آفیسر خیارڈ کو زخمی ہوتے اور میز پر اوندھے گرے دیکھا۔

سویلوں کے قریب کھڑے درجنوں گارڈز اپنے ”دو“ آئی بیڑ“ کو بچانے کے لیے چوتھے سے اترے اور خاردار تاروں کی طرف بڑھے۔ یہی وقت تھا جب عمران نے مجھے کہا۔ ”توڑ دو۔“

اور میں نے پشت پر بندھے ہاتھوں کی بندش توڑ دی۔ رسی کے ٹیبل تڑانے سے ٹوٹے اور وہ میرے ہاتھوں سے ٹھیکہ ہو گئی۔ میں پوری رفتار سے دروازہ سرجن اسٹیل کی طرف دوڑا۔ اس کا رخ بھی خاردار باز اور اس کے اندر موجود معززین کی طرف تھا۔ ایک گارڈ نے مجھ پر فائر کیا۔ گولی میرے کندھے کو بوسہ دیتی ہوئی نکل گئی۔ میں اپنے پرے زور سے اسٹیل پر چاڑھا۔ سلطنت کی موت کے بعد جو آگ میرے اندر جمع ہوئی تھی، اسے ایک دم نکاسی کا راستہ ملا۔ وہ شعلہ جوالا لگتی۔ آسانی بجلی کا روپ دھار گئی۔ اسٹیل اور میں لڑھکتے ہوئے تین فٹ اونچے چوتھے سے نیچے گرے۔ تب تک اسٹیل کا چمکیلا پمپل میرے قبضے میں آ چکا تھا۔ میں نے پمپل اس کی ڈرنا جیسی لمبی لیکن مضبوط گردن سے لگا دیا... اور اسے گھٹنا ہوا دیوار کے بالکل پاس لگایا۔ کئی گارڈز نے رانفلیں میری طرف سیدھی کیں۔ ”خبردار... گولی مار دوں گا۔ اڑا دوں گا اسے۔“

میں نے چلا کر کہا۔ گارڈز ایک لمبے کے لیے خشک لیکن اسی دوران میں بائیں طرف سے ایک گارڈ نے گولی چلا دی۔ گولی میرے سر کے بالوں کو چھو کر گزری۔ میں نے بھی اپنی دھمکی سچ کر دی۔ میں نے تپتے پھڑکنے، زور لگاتے اسٹیل کی گردن میں گولی ٹھونک دی... میرا دوسرا فائر اس کے نچلے جڑے کو چیر کر یقیناً اس کے سر میں کھسا ہوگا۔ وہ ایک دم ڈھلا پڑ گیا۔ میں اس کے جسم کو ڈھال کی طرح استعمال کر کے پیچھے ہٹا اور پھر جست لگا کر ایک فوجی چپ کے عقب میں گرا۔ یہ جگہ جوابی فائرنگ کے لیے بہترین تھی۔

ہر طرف کھراہٹ مچ گئی۔ سلیقے سے رکھی ہوئی میزیں الٹ چکی تھیں۔ گورے بدعوا میں چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ میں نے طلال کی ایک جھلک دیکھی۔ میرے سامنے اس نے زمین پر گرے۔ ایک فربہ اندام انگریز کی توند میں کوارکھوئی اور دست تک اتار دی۔ پھر وہ نیچے جھک کر بھاگتا ہوا ایک طرف اونچل ہو گیا۔

یہی وقت تھا جب صورت حال نے ایک بالکل غیر متوقع کروٹ لی۔ کچھ دیر پہلے تک یہ کروٹ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھی۔ ڈیڑھ دو ہزار کا وہ مجمع جسے انگریزوں اور سچ گارڈز نے اپنی دہشت سے ہینا ناز کر دیا تھا... اس ”ٹرائس“ میں سے اچانک ہی نکل آیا۔ عمران کہتا تھا، جادو ایسے ہی ٹوٹا کرتے ہیں۔ زنجیریں ایسے ہی کسی اچانک واقعے کی حدت سے پھل جاتی ہیں اور رکے ہوئے پانی ایسے ہی کسی پھل کے سبب بلند و بالا ڈیموں کو بہا کر لے جاتے ہیں۔ یہاں بھی یہی کچھ ہوا۔ انگریزوں اور ان کے گارڈز کو تیز تر دیکھ کر ایک دم مجمع حرکت میں آ گیا۔ کچھ دیر پہلے تک جو لوگ بالکل غیر رخ نظر آتے تھے، اب ان میں سے کئی ایک کے ہاتھوں میں لٹائیاں، ٹکڑیاں اور اسی ہی دیگر اشیاء نظر آئیں۔ وہ غرہ زنی کرتے ہوئے کسی سیلاب کی طرح آگے بڑھے۔ گارڈز نے رانفلوں کے منہ کھول دیے۔ دھماکے ہوئے، شعلے لپکے، لیکن ہجوم رکنے کے لیے نہیں بڑھا تھا۔ وہ منظر گواہی دے رہا تھا کہ یہاں شاید تو ہیں بھی نصب ہوئیں تو ان دیوانے لوگوں کو روک نہیں سکتیں۔ تاہم تو فائرنگ سے زخمی ہو کر بہت سے لوگ گرے لیکن وہ رکے نہیں۔ یہ بڑا کلاسیکل منظر تھا۔ ایک سیکنڈ کے لیے مجھے یوں لگا کہ میں پھر ڈیڑھ سو برس پیچھے چلا گیا ہوں اور آزادی کی جنگ کا ایک گلاؤ دیکھ رہا ہوں۔ لوگ لٹکارتے ہوئے خاردار تار کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ شاید ایسے ہی کسی موقع کے لیے یہ شعر کہا جاتا

ہے۔ کتنے بھی چلو بڑھتے بھی چلو بازو بھی بہت ہیں سربھی بہت... اور پھر تصادم ہو گیا۔ زرگاں شہر کا قاسمہ چوک میدان جنگ بن گیا۔ میں نے عمران کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹریل فورائل تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا عمران کے ہاتھ چند کینڈ پیلے اسی "سیاہ رنگت اور روشن دل" والے غریب گارڈ نے کھولے تھے جس نے میرے ساتھ مہربانی کرانی تھی۔

عمران لپکا ہوا چوترے پر چڑھا اور اس اسٹریچر تک پہنچا جس پر انور خاں دراز تھا۔ میں بھی اوٹ سے نکل کر بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ہم نے انور کے اسٹریچر کو اٹھایا اور فائرنگ کی زد سے دور ایک بڑی ٹرک گاڑی کی اوٹ میں لے گئے۔ باقی چار اسٹریچرز پر موجود افراد گولیوں سے پھلتی ہو چکے تھے۔ ہم نے جیسے اسٹریچر کو بھی محفوظ اوٹ میں پہنچا دیا۔ طلال کے کچھ ساتھی چوترے پر چڑھ آئے تھے اور انہوں نے ان تین قیدیوں کی رسیاں کاٹ دی تھیں جنہیں سویلیوں سے باندھا جا چکا تھا۔ ان میں سے بھی ایک شخص رابہی عدم ہو گیا تھا لیکن باقی دو سلامت تھے۔

میری نگاہیں صرف اور صرف سلطانہ کے قاتلوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اگر میں ان سے اپنی سلطانہ کا بدلہ نہ لے سکا تو اپنی ہی آگ میں جل کر بسم ہو جاؤں گا۔ رنجیت پانڈے، خیارد اور اینڈرسن میں سے کوئی مجھے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ یہاں موجود تھے۔ مجھے پتا تھا، وہ موجود ہیں۔ میں نے ماؤز نما ہٹل پر گرفت مضبوط کی اور خاردار تاروں کی طرف بڑھا۔ یہ ساری جگہ دو طرفہ فائرنگ کی زد میں تھی۔

عمران نے میرا ارادہ بھانپ کر مجھے روکا۔ "کیا کر رہے ہو تانی؟" "نہیں، مجھے جانے دو عمران... مجھے مرنے دیا مار دینے دو۔"

"حوصلہ کرو... سب کچھ ہوگا۔" "اب نہیں ہوگا تو کب ہوگا؟" میں نے خود کو عمران سے چھڑایا اور مختلف چیزوں کی آڑ لیتا ہوا خاردار تاروں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ جب عمران نے دیکھا کہ میں روکنا نہیں تو وہ بھی میرے ساتھ ہو گیا۔ ہم دونوں دیوانہ وار ان پوزیشنوں میں کھس گئے جہاں سے انگریز اور مقامی گارڈز ہجوم پر اندھا حد فائرنگ کر رہے تھے۔ ہم نے کم از کم چار گارڈز کو اپنے ہاتھوں سے گولی ماری۔ یہاں ہماری دست

دست لڑائی بھی ہوئی۔ عمران نے بے دریغ ایک گورے سپاہی کے سینے میں رائفل کی سنگین گھونٹی اور میں نے ایک مقامی گارڈ کے پیٹ میں گولی مار کر اس کی رائفل جھین لی۔ اور تب ہمیں خیارد نظر آیا... اس کا ایک کندھا طلال کی گولی سے شدید زخمی ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دوسرے ہاتھ میں میگا فون تھا ہوا تھا۔ شاید چند سیکنڈ پہلے تک وہ اپنے بچے گارڈز کو یہ ہدایات دے رہا تھا کہ گولیوں کی بارش کر دو۔ ان لوگوں کو چوبیسوں کی طرح سٹل دو۔ لیکن وہ بھول رہا تھا کہ ہر جگہ جلیا نوالہ بارش نہیں ہوتی اور نہ ہر جگہ جزل ڈانر کے ظلم کا سکہ چلتا ہے۔ میں نے عمران سے سنگین چوٹی رائفل لی اور اپنی رائفل اسے دے دی۔ یہی وقت تھا جب خیارد نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ یہی شخص تھا جس نے سلطانہ پر گولیوں کی بوچھاڑ کرنے کے لیے گورے کاٹھنڈ کو آگے کا قاتل اشارہ کیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھ کو بی نشانہ بنایا۔ سنگین قوت کے ساتھ اس کی آنکھ سے نکلنے لگی اور وہ سب کچھ تباہ کر گئی جو اس کی آنکھ کے پیچھے اور کھوپڑی کے اندر موجود تھا۔ شاید میں کچھ زور اور لگاؤ تو سنگین کھوپڑی تو زور دوسری طرف سے باہر آ جاتی۔ خیارد کی دوسری آنکھ اور چہرے کے تاثرات بڑے بھیاں تک تھے۔

ایک انگریز رائفل مین نے قریبی گلی کے اندر سے عمران کو نشانہ بنایا۔ عمران کی بے مثال لگ کہاں کام نہیں کرتی تھی۔ اس نے یہاں بھی کام کیا۔ گولی سیدھی عمران کو کٹی مکر راستے میں عمران کی رائفل آگئی۔ گولی اس کے دتے سے نکل گئی تھی۔ عمران نے مہارت سے جوابی فائر کر کے رائفل مین کو ڈھیر کر دیا۔

اب یہ وقت تتر بتر ہونے کا تھا۔ چوترے کے ارد گرد اور میز کرسیوں والے احاطے میں تیس تیس چالیس لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں سے میں نے پچیس تو ضرور گارڈز کی ہوں گی۔ ان میں پچیس میں کئی انگریز بھی نظر آ رہے تھے۔ یقیناً وہ سب سے اہم لاشیں سرجن اسٹیل اور خیارد کی تھیں۔ اب کسی بھی وقت راج بھون سے کلک یہاں پہنچ سکتی تھی۔ اگر تک پہنچ جاتی تو راج فرار اختیار کرنے والے اور گلیوں میں روپوش ہونے والے سرکاری فوجی بھی واپس آ کر لڑائی میں شامل ہو جاتے۔ نیچے شہر کی کہاں تک مسل فوجیوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

"بھرت کہاں ہے؟" میں نے عمران سے پوچھا۔ "ابھی تک مجھے بھی کہیں نظر نہیں آیا۔" ہم اپنے ارد گرد دیکھتے ہوئے واپس اس گاڑی تک

پہنچے جس کے عقب میں دونوں اسٹریچرز رکھے تھے۔ یہاں مسلح اور نیم مسلح شہریوں کا جھگڑا تھا۔ ہم بھرت کے ساتھ ساتھ اس محر کے اصل ہیرو طلال کو بھی ڈھونڈ رہے تھے لیکن وہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ شہری فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ انہوں نے سرجن اسٹیل کی لاش کو کھینے کی کوشش بھی کی مگر عمران کے اشارے پر میں نے انہیں منع کر دیا۔ جمع ہونے والے لوگ بچنے سے حد اہمیت دے رہے تھے۔ میں نے جارحانہ یہاں کے شعلی دیوتا کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور یہی میری پہچان تھی۔ کچھ لوگ وہ ٹوٹی ہوئی رتی دیکھ رہے تھے جسے تنے توڑنے کے بعد میں اسٹیل پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ یہ رتی ایک دوسرے کو دکھا رہے تھے اور تھرے کر رہے تھے۔ ان میں سے شاید کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس رتی کے ٹوٹنے میں مجھ سے زیادہ ایک ریزر بلیڈ کا کمال ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں مرکز نگاہ بن گیا۔ میرے گرد ہجوم بڑھتا چلا گیا۔ لوگوں نے میرے اور انور خاں کے گرد حفاظتی حصار قائم کر دیا۔ وہ میرے اور انور خاں کے حق میں فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ یہ نعرہ زنی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

عمران نے سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے کہا۔ "ان لوگوں سے ہو کہ وقت ضائع نہ کریں۔ بہت جلد سرکاری فوجی پوری طاقت سے یہاں ہلا بولیں گے۔ لوگ اپنے دفاع اور بھاؤ کی تیاری کریں۔ گھروں اور محفوظ جگہوں پر مورچے بنائیں۔ خاص طور سے ان دو اہم راستوں کو روک لیں جو قاسمہ میں داخل ہوتے ہیں... یقیناً ان میں کچھ لیڈر ٹائپ ہندے بھی ہوں گے۔ ان کے ذریعے فوری بندوبست کریں۔"

میں نے کہا۔ "یہ سب باتیں تم خود کیوں نہیں کہتے؟" "نہیں یار! تمہاری بات کا اثر ہوگا۔ یہ لوگ تمہیں اہمیت دے رہے ہیں اور شیک ہی دے رہے ہیں۔"

"لیکن..."

"لیکن شیک کچھ نہیں۔ چلو شروع ہو جاؤ۔" اس نے ایک ہندے سے میگا فون لے کر میری طرف بڑھایا۔ یہ وہی فون آلود میگا فون تھا جو ابھی ہم نے خیارد کی لاش کے پاس سے اٹھایا تھا۔ میں نے کبھی تقریر کی تھی اور نہ اس طرح لوگوں کا سامنا کیا تھا۔ پھر بھی عمران کے کہنے پر میں چوترے پر چڑھ گیا۔ دور تک مجھ کو لوگ نظر آ رہے تھے۔ خاردار تاروں کے ارد گرد کالے اور گورے فوجیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔

ان میں سے کچھ لاشوں پر چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ قاسمہ کے نوجوان، فوجیوں کی بھری ہوئی رائفلیں اور ایمونیشن وغیرہ اکٹھا کر رہے تھے۔ میں نے میگا فون ہونٹوں کے قریب کیا۔ یہی وقت تھا جب دو افراد مجمع چیرے ہوئے آئے اور چوترے پر آ کر مجھ سے پلٹ گئے۔ یہ ڈاکٹر چوہان اور عبدالرحیم تھے۔ چوہان کو میں نے بس اس کی آواز سے پہچانا۔ ان دونوں نے اپنے چہرے منڈاسوں میں چھپا رکھے تھے۔ کندھوں سے رائفلیں جھول رہی تھیں۔ چوہان نے مجھے زور سے پتھے ہوئے کہا۔ "مجھے پتا تھا، میں تمہیں ایک دن ضرور زندہ دیکھوں گا۔ مجھے پتا تھا۔"

عبدالرحیم بھی میرے گلے لگ گیا۔ عبدالرحیم ان قیدیوں میں سے تھا جو اسحاق اور انور خاں وغیرہ کے ساتھ ہمارے ہمراہ اٹل پانی پہنچے تھے۔ عبدالرحیم زرگاں کے اسی محلے میں رہتا تھا جہاں سلطانہ کا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا۔ ادیسر عبدالرحیم بچپن سے رونے لگا۔ "سلطانہ بی بی چلی گئی۔ وہ ہم سب کو چھوڑ گئی۔ اس کی کوئی عمر تھی جانے کی۔" عمران نے اسے ہلکا سا جھٹکا۔ پھر میرے کان میں تیز سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ "وقت کم ہے۔ جو کچھ کہا ہے جلدی سے اس کا اعلان کر دو۔"

میں نے میگا فون اپنے سامنے کیا اور بلند آواز سے وہ الفاظ دہرانے شروع کر دیے جو عمران نے کہے تھے۔ لوگوں کا جوش و خروش عروج پر پہنچ گیا۔ وہ ہوائی فائرنگ کرنے لگے۔ گواہیں، لاشیاں اور کھڑیاں ہوا میں لہرانے لگیں۔ کچھ دیر پہلے تک ان لوگوں کو اسٹیل اور اینڈرسن وغیرہ مردہ سمجھ رہے تھے۔ ان لوگوں کے سامنے ہی ان کے پیادوں کو بدترین طریقے سے مار کر اپنی ہیبت میں اضافہ کرنا چاہتے تھے مگر ایک "پر جوش واقف" نے انہیں زندہ کر دیا تھا۔ ایک شخص نے فوجی جیب کی چھت پر چڑھ کر حکم کے لیے مردہ باؤ کا نعرہ لگوا یا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا اور کڑک کر بولا۔ "آپ فکر نہ کریں جی۔ ہم ان گوروں اور ان کے بچپوں کے لیے قاسمہ کو قبرستان بنادیں گے۔ ان کو اپنی لاشیں اٹھانے کی ہمت بھی نہیں ہووے گی۔"

ایک اور شخص جیب پر چڑھ گیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بھی انور خاں کا ایک ساتھی ساتھی حسنا تھا۔ وہ دھاڑتی آواز میں بولا۔ "تاہم صاحب بالکل شیک کہہ رہے ہیں۔ یہاں اکٹھا ہونے کا فائدہ نہیں۔ اپنے گھروں میں جاؤ۔ عورتوں اور بچوں کو پیچھے پرانے قلعے میں جمع کر دو۔ گھر کو بور جانا۔ ہر گئی میں ان سفید سوروں کے لیے موت

کا تا کا لگا دو۔ اب ہم پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ اب ہمیں مرنا ہے یا مار دینا ہے۔“

عمران نے پھر مجھے بولنے کے لیے کہا۔ میں نے خون آلود میکانی فون اپنے سامنے کیا تو لوگ پھر ہمت نہ ہونے لگے۔ میں نے کہا۔ ”بھائیو! آج یہاں قاسم چوک میں جو کچھ ہوا ہے، اس نے پورے بھائیوں کی اسٹیٹ میں پھیل چا دی ہے۔ میں غائب کا علم نہیں جانتا اور نہ انور خاں جانتا ہے لیکن میں آپ سب کو دھواں دلاتا ہوں کہ اب ”مل پانی“ نے خاموش نہیں رہتا۔ اب وہاں سے سیلاب ضرور آئے گا اور یہ سیلاب ہمارے ساتھ لے کر ان گورے کالے حکمرانوں کو بہا کر لے جائے گا۔ راج بھون کی اینٹ سے اینٹ بیچے گی۔ ہاں، اینٹ سے اینٹ بیچے گی۔“

لوگوں کا جوش و خروش عجیب رنگ اختیار کر گیا۔ مجھے لگا کہ اگر میں اس وقت اس چوڑے پر کھڑے ہو کر لوگوں سے کہوں کہ وہ میرے ساتھ چلیں اور راج بھون پر ہلا بول دیں تو وہ فوراً تیار ہو جائیں گے۔ سب اندیشوں کو بالائے طاق رکھ دیں گے۔

زمین کی پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ عوام الناس کس طرح کسی کو اچانک بلند ترین درجے پر پہنچاتے ہیں اور پھر اس کے اشارے پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ابھی لوگوں کو کسی انتہائی اقدام کی طرف لے جانے کا وقت نہیں آیا اور غالباً اس پرچہ پر لے ہوئے انور خاں کی سوچ بھی یہی تھی۔ اس کی آنکھیں نیم دائیں، وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا۔

عمران کے اسرار پر سانولی رنگت والا گاڑا امرتا تھ بھی چوڑے پر آ گیا۔ عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”اس کو بھی چند لفظ بولنے کا موقع دو۔“

میں نے میکانی فون امرتا تھ کو ہاتھ دیا۔ وہ چند لمحے تک ہچکچایا پھر جذباتی انداز میں بولا۔ ”ہمارا کوئی دواہ یوننا نہیں آت۔ اور نہ ہم نے زیادہ کچھ کہنا ہے۔ بس یہی کہنا ہے کہ ہم سب نے مل کر ان جالوں کو یہاں سے نکالنا ہے۔ اب مرنا ہے یا مار دینا ہے۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے جھک کر مجھے پر نام کیا۔ میکانی فون مجھے تھمایا اور اٹھ بار آنکھوں کے ساتھ نیچے چلا گیا۔

عمران کے اشارے پر میں نے لوگوں کو منتشر ہونے اور ہدایات پر عمل کرنے کا کہا۔ لوگ منتشر ہونے لگے۔

☆☆☆

سہ پہر ہونے والی تھی۔ ہم زرگاں کے پرانے قلعے میں تھے۔ یہ کافی قدیم عمارت تھی۔ اس کا ایک چوتھائی حصہ منہدم ہو چکا تھا۔ اسے چاروں طرف سے گھناؤنی آبادی نے گھیرا ہوا تھا۔ یہ مسلمانوں کی آبادی تھی۔ یہ کھنڈر قلعہ اس راستے پر واقع تھا جو شرقی سمت سے قاسم میں داخل ہوتا تھا۔ چوہان، عبدالرحیم اور انور خاں بھی ہمارے ساتھ تھے۔ انور خاں کی حالت میں بہتری واقع ہوئی تھی۔ وہ اب دھیمے لہجے میں بات بھی کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے بھرت بھی بچ بچا کر یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی چچا عرف چچی اور اس کی ماما بھی تھیں۔ چچی کا یہاں آنا اس کے لیے خطرناک تھا مگر بھرت تو اسے کنوئیں میں کوئٹہ کو کہتا تو بھی وہ ایک سینکڑی کی دیر نہ لگتی۔ بہر حال دونوں ماں بیٹی اوڑھنیوں میں لپیٹی بڑی سہمی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ قاسم چوک میں لڑائی شروع ہوتے ہی بھرت نے چوڑے سے چھلانگ لگا دی تھی اور ایک قریبی گلی میں روپوش ہو گیا تھا۔ لوگوں نے پکڑ کر اس کے ہاتھ کھولے تھے اور اسے گوروں سے بچانے کے لیے کئی گھنٹے تک ایک بیکری میں چھپائے رکھا تھا۔

سرکاری فوج نے ابھی تک قاسم پر کسی طرح کی کارروائی نہیں کی تھی۔ یقیناً انہیں پتا چل چکا تھا کہ وہاں زبردست مزاحمت کا ماحول پیدا ہو چکا ہے۔ ہر گھر نے ایک مورچے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب وہ بڑی احتیاط اور پوری طاقت کے ساتھ کارروائی کرنا چاہتے تھے۔ بس چند گھنٹوں کے اندر ہی میں بالکل غیر متوقع طور پر مزاحمت کاروں کا لیڈر بن گیا تھا۔ وہ میرے گرد پروانوں کی طرح جمع تھے۔ قاسم چوک میں میرا جست لگا کر چوڑے سے اترنا اور پھر سرجن اسٹیل پر چھینا ایک ایسا واقعہ تھا جو ہر کسی کی زبان پر تھا۔ میں نے اسٹیل کو اس کے اپنے ہی ماؤز رنڈا پل سے مل گیا تھا۔ یہ پل ابھی تک میرے پاس تھا۔ لوگوں کے لیے یہ آجیٹل پل بھی ”زیارت“ کی چیز بنا ہوا تھا۔ جارن کی عبرت ناک شکست کے بعد جو ”بہا“ میرے سلسلے میں بندھی تھی، اب وہ اور زور پکڑ گئی تھی۔ میرا اپنے ہاتھوں کی بندش کوڑا نا بھی لوگوں کے لیے زبردست حیرت اور تحریک کا باعث تھا۔ جبکہ میرے خیال میں اس صورت حال کا اصل ہیرو عمران تھا یا پھر گاڑا امرتا تھ کا وہ ساتھی جس نے میری بندش کو بڑی صفائی سے قابل شکست بنایا تھا۔

میرے بعد اگر لوگ کسی کو تھوڑا بہت کرڈٹ دے رہے تھے تو وہ راجپوت نوجوانوں کا وہ جھٹا تھا جس نے

اچانک ہجوم میں سے نکل کر ہنگامے کا آغاز کیا۔ اس جھٹے کے تقریباً چار نوجوان جاں بحق اور دو سخت زخمی ہوئے تھے۔ ان کو ڈاکٹر چوہان وغیرہ قلعے کے اندر ہی طبی امداد دے رہے تھے۔ جھٹے کے باقی نوجوانوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ ہاں، اتنی قتل ضرور ہوئی تھی کہ طلال مرنے والوں میں شامل نہیں۔

سرجن اسٹیل اور خیاریڈ کی موت نے میرے اندر بھڑکتی آگ پر پانی کے کچھ چھینٹے تو ڈالے تھے مگر اس کی حدت میں خاص کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنے ہاتھوں اور بازوؤں میں ابھی تک سرجن اسٹیل کے خونچکاں جسم کا لمس محسوس کر رہا تھا۔

مہی فیض تھا جس نے اپنی سانس مہارت سے بھائیوں کی اسٹیٹ کے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنانے کا شہکار لے رکھا تھا۔ وہ اس سلسلے میں حکم کو کھنکھتی سی طرح استعمال کرتا تھا اور لوگ حکم کو بہت بڑا داتا سمجھنے لگے تھے۔

عمران نے اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ”جگر! آج تم نے سرجن صاحب کو کھنڈا کر کے اپنا بہت پرانا بدلہ چکا دیا ہے۔“

”کون سا بدلہ؟“

”الکھڑا ایک چپ والا بدلہ۔ دراصل یہ چپ ہی تو تھی جس نے تجھیں برسوں اسٹیٹ کا قیدی بنائے رکھا ہے۔“

”لیکن حکم اور اینڈرزن ابھی زندہ ہیں عمران۔“

”یہ جو ایکشن سے بھرپور فلم شروع ہوئی ہے، اس میں ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ لیکن گارنٹی دیتا ہوں کہ بہت سے لوگ مریں گے۔۔۔ لیکن۔۔۔“

”لیکن یہ گارنٹی نہیں دیتا کہ ان فوت شدگان میں ہم شامل نہیں ہوں گے۔“ میں نے کہا۔ ”کم از کم تم تو شامل ہو ہی جاؤں تو چھاپا ہے۔“

میری آنکھوں میں پھر سلطانہ کا غم جاگ اٹھا۔ آنکھوں کے کنارے جلنے لگے۔ عمران کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ میں کتنی ہی دیر تک اپنی ٹھوڑی اس کے کندھے پر ٹکائے آنکھیں جھکوتا رہا۔ اچانک ایک آواز نے ہمیں چوکایا۔ ”دیکھو تاش! کون آیا ہے؟“ یہ چوہان کی آواز تھی۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ میرے سامنے کھوسٹ بڑھیا کی پوتی بیو مالا اور پوتا تیش کھڑے تھے۔ مالا کے ہاتھوں میں ایک نومولود بچہ تھا۔ وہ بہت کمزور

اور سخت حال نظر آتی تھی۔ مالا اور تیش کو ہم نے آخری بار فتح پور کے مندر میں دیکھا تھا۔ ایک خونی ہنگامہ ہوا تھا۔ تیش کے والد کے ہاتھ تلے کے کڑے میں چلے تھے اور پھر لوگوں نے اسے دوٹی ٹھہرا کر قتل کر دیا تھا۔ مالا کی جان بھی یہ مشکل بچ پائی تھی۔ اس کے بعد سے مالا اور تیش منظر سے ہٹ کر اوجھل تھے۔

تیش ایک نہایت کٹر اور انتہا پسند برہمن زادہ تھا لیکن جو اطلاعات ملی تھیں، ان سے پتا چلا تھا کہ وہ اب بہت حد تک بدل گیا ہے۔ اس کے بدلنے کی ایک وجہ یقیناً اس کی خوبرو اور روشن خیالی بنتی مالا ہی تھی۔ دوسرے اس نے اپنے بزرگوں کا جو انتہائی وقیفانہ رویہ دیکھا تھا، اس نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ تیش کا ایک بازو پلاسٹر میں جکڑا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ سنگین اور بگڑی ہوئی چوٹ اسی مندر والے ہنگامے کی یادگار ہے۔ وہ بیمار اور کمزور بھی دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اور عمران نے ان دونوں کو خوش آمدید کہا۔ ان دونوں کو کچھ پتا نہیں تھا کہ ہمارا رویہ ان کے ساتھ کیسا ہوگا۔ بہر حال، میرے دو چار فقرے تو ہی ان کے خدشات دور کر دیے۔ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا گیا۔ مالا اور تیش ان تمام حالات سے آگاہ تھے جو پچھلے ڈھائی تین ماہ میں پیش آئے تھے۔ سامبر مقابلے میں جارن کی عبرت ناک شکست اور موت کی تفصیلات بھی انہیں معلوم تھیں۔

مالا نے اٹھک بار لہجے میں مجھے بتایا۔ ”ماتا جی ہماری جان کی دشمن ہو رہی ہیں، تاش بھتی۔ آپ کو پتا ہی ہووے گا، یہاں زرگاں میں ان کے بہت سے عقیدت مند پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ ان کے اشارے پر ہر کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ماتا جی نے چند خطرناک لوگوں کو ہمارے پیچھے لگا رکھا ہے۔ ان لوگوں کو حکم ہے کہ میں جہاں بھی ملوں، میری ہتھیار کر دی جاوے۔ میرے پیچھے اور تیش کو پکڑ کر ان کے پاس لایا جاوے۔ ہم دو بیٹوں سے جگہ جگہ چھپتے پھرتے ہیں۔“

عمران نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”بہت جلد آپ دونوں کو ہمیں چھینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ آپ دونوں یہاں قلعے میں آگئے ہیں، یہ بڑا اچھا کیا ہے۔“

اس گفتگو میں مالا کے پتی تیش نے بھی حصہ لیا۔ وہ

اپنے سابقہ رویے پر بڑا نادم تھا۔ اسے اس بات پر بھی افسوس تھا کہ اس نے استھان میں سلطانہ کو زندہ جلانے کی کوشش میں حصہ لیا اور بعد ازاں وہ گرو کی موت کا سبب بھی

بنا۔ وہ بالکل بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھ کو خوشیاں ملیں ہوتا کہ دادی جی اس حد تک جا سکت ہیں۔ وہ میری پتی اور میرے بچے کے جیون کی دشمن ہو رہی ہیں۔ ان کے ہر کارے ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔“

یہ واقعی کٹر پن کی انتہا تھی۔ وہ بڑھاپا کہہ عقیدوں کی بچارن تھی۔ اور وہ اکیلی نہیں تھی۔ پرانی نسل کے ایسے ہزاروں لوگ یہاں موجود تھے۔

اسی دوران میں انور خاں کے ساتھی حسنا احمد کے ایک خبر نے اطلاع دی کہ حکم کے فوجی دستے بڑی تعداد میں قاسم کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ان کی کمان ایڈرن صاحب خود کر رہے ہیں۔ وہ ایک ہندو فوجی جیس میں سوار ہیں۔ اس جیس کے علاوہ بھی درجنوں گاڑیاں اور گھوڑا گاڑیاں اس کارروائی میں شریک ہیں۔

خبر فیروز احمد نے کہا۔ ”وہ لوگ ایکٹروں کے ذریعے بار بار اعلان کر رہے ہیں کہ علاقے کے لوگ اپنے گھر خالی کر کے پیچھے ہٹ جاویں ورنہ ان کو دشمن سمجھا جاوے گا اور اپنے انجام کے وہ خود ذمہ دار ہوں گے۔“

حسنا احمد نے مجھ سے کہا۔ ”اس وقت قاسم کے لوگ اور زرگاں کے دوسرے مسلمانوں کو آپ کی ضرورت ہے۔ آپ ان کے درمیان ہوں گے تو ان کے حوصلے بلند ہو جاویں گے۔ وہ ایک دودن تک تو ان حکم کے ٹھوڈوں کو قاسم میں داخل ہی نہیں ہونے دیں گے۔“

میں عمران سے تنہائی میں بات کرنا چاہ رہا تھا مگر تنہائی کہیں نہیں تھی۔ پورا قلعہ غورتوں اور بچوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں عمران کو لے کر ایک ڈیوڑھی میں آ گیا۔ مجھے اپنے دل و ماغ پر بڑا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”عمران! تم دیکھ رہے ہو، یہ لوگ مجھ پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کر رہے ہیں۔ وہ مجھے ہیں کہ میں جارج کو مار سکتا ہوں تو سب کچھ کر سکتا ہوں۔ لیکن کہیں تو پتا ہے یہ سب کچھ میرے بس کا روگ نہیں۔“

”کیا تمہارے بس کا روگ نہیں؟“

”یار! انجان نہ بنو۔ کیا تم مجھے ہو کہ میں اس طرح کی بار دھاؤں کر سکتا ہوں اور کروا سکتا ہوں۔ یہ لوگ مجھے کمانڈر وغیرہ بنانے کے پکر میں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ لڑیں اور میں ان کو لڑاؤں۔“

”تو یار! اس میں مشکل کیا ہے؟ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ تم یہ مجھ کو سب کچھ میں نے ہی سمجھایا ہوا ہے، تم

صرف آرڈرز جاری کر رہے ہو۔“

”مگر۔۔۔“

”یار! کوئی مسئلہ نہیں۔ سب ہو جائے گا۔ اصل کام تو یہاں کے لوگوں کے جذبے اور حوصلے نے ہی کرتا ہے۔ بس ان کو تھوڑی سی راہنمائی کی ضرورت ہے۔ وہ ذرا ہمتی ہم کریں گے۔“

”ہم نہیں، تم کرو گے۔“

”چلو، میں ہی کروں گا۔ کیا ہم انور خاں کا اتنا ساتھ بھی نہیں دے سکتے؟ اب یوں کر دیکھنے سے باہر نکلتے ہیں۔ جیس پر علاقے کا ایک راونڈ لگاتے ہیں۔ میگافون ساتھ لے لیتے ہیں۔ راستے میں دو چار جگہ رک کر لوگوں کو حوصلہ دیں گے۔ انہیں بتائیں گے کہ وہ جیم کا پناہ دافع کریں۔ کم از کم اتنی دیر تک ان گوروں اور کالوں کو روکیں جب تک مل پانی سے ”ایک“ نہیں آ جاتا۔“

”کیا تم مجھے ہو کہ مل پانی سے ایک آئے گا؟“

”ہم تو کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ سویرے قاسم جوک میں ہزاروں کا مجمع تھا اور دو ڈھائی سو سچا سپاہیوں نے انہیں بھیڑ بکری بنایا ہوا تھا۔ مگر جب لٹال اور اس کے ساتھیوں نے بلا بولا اور تم نے سرجن اٹھل کی گردن دیوچی تو دیکھتے ہی دیکھتے سارا منظر بدل گیا۔ یار! یہ منظر ایسے ہی بدلتے ہیں۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ اس نل پانی چپ نہیں رہے گا۔ مراد شاہ اور پچھوے سرکار دیکھ رہے ہیں کہ حکم مکمل طور پر ان گوروں کا کٹھ پتلی بن چکا ہے۔ وہ اب آئیں گے۔ ضرور آئیں گے۔ اب تک یہ لڑائی جتنی رہی ہے مگر اب نہیں ملے گی۔“

ہم نے گوروں سے جھنجھتی ہوئی دو بچوں پر قاسم کے اندر ایک چکر لگایا۔ حسنا اور آندھ دس مسخ محافظ ہمارے ساتھ تھے۔ ہم اہم جگہوں پر تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے رکے۔ عمران کے کہنے پر میں نے میگافون کے ذریعے لوگوں کے جوش و جذبے کو ابھارا۔ ہر جگہ فلک شکاف نعروں سے فضا گونجی۔

ہم رات دس بجے کے قریب واپس آئے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد گوروں اور حکم کے دستوں کی طرف سے حملہ شروع ہو گیا۔ یہ حملہ دو طرف سے تھا۔ حملے کی جگہ قلعے سے خاصی دور تھی۔ پھر بھی تازہ توڑ فائرنگ اور دھاتی بھونکے دھماکوں سے پھل پھٹتی گئی۔ ہمیں معلوم تھا کہ سرکاری دستوں کے لیے تیزی سے آگے بڑھنا ناممکن ہو گا۔ دفاع کرنے والے گھروں میں موبہ چاند تھے اور سرکاری سپاہیوں کو کھلی

جگہ پر آگے بڑھنا تھا۔ حسنا اپنے دیگر اہم کمان داروں کے ساتھ دفاعی لائن پر موجود تھا۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ کم از کم چوبیس گھنٹے سرکاری دستوں کو قاسم کی گلیوں میں داخل نہیں ہونے دے گا۔

عمران نے مجھ سے کہا۔ ”ہم دونوں میں سے کسی ایک کو لڑائی والی جگہ پر موجود ہونا چاہیے۔ اور میرا خیال ہے کہ میرا جانا مناسب ہے۔“

”تم نے خطرے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟“

”مجھے پتا تھا کہ تم یہ فقرہ ضرور بولو گے۔ لیکن ایک طرف تم مجھے مکمل ذمے دار پالا سوچ رہے ہو، دوسری طرف میرے اختیارات میں مداخلت بھی کر رہے ہو۔ میں جو کہہ رہا ہوں، ویسا ہی کرو۔ یہاں عورتیں، بچے اور بوڑھے ہیں۔ ان پر خوف طاری ہے۔ لیکن اگر یہ اب تک حوصلے کا مظاہرہ کر رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم ان کے درمیان ہو۔ تمہارا یہاں رہنا ضروری ہے۔ باقی جہاں تک لڑائی کی بات ہے، وہی الحال میں نے لڑا ہے اور تم نے۔“

اس نے مجھے دہاں رہنے پر مجبور کیا اور خود چوہان، عبدالرحیم اور دیگر مسخ افراد کے ساتھ قلعے سے نکل گیا۔

پتا نہیں کیوں وہ مجھے قائل کر لیتا تھا۔ اور مجھے ہی کیا، وہ ہر کسی کو قائل کر لیتا تھا۔ اگر وہ قائل نہ کر سکا۔۔۔ تو شاید ایک لڑکی کو نہ کر سکا۔۔۔ شہو کو آمادہ نہ کر سکا کہ وہ اس کا ہاتھ تمام لے اور سارے بندھن توڑ کر اس کے ساتھ آزاد فضاؤں کا رخ کر لے۔ یا شاید اس نے اسے قائل کرنے کے لیے اپنا پورا زور لگایا ہی نہیں تھا۔ وہ اس کی اپنی خواہش اور اندر سے پیدا ہونے والی رضا کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ بہر حال، اب یہ سب دور افتادہ ماضی کی باتیں تھیں۔

شدید لڑائی کی صورت حال قریباً ڈیڑھ گھنٹہ رہی۔ پھر غیر متوقع طور پر ایک دم سکون ہو گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد عمران اور چوہان وغیرہ قلعے میں واپس آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ حکم کے وفاداروں کا پہلا بڑا حملہ روک دیا گیا ہے۔ ہاں، جنوبی راستے سے وہ لوگ قریباً ایک فلائنگ اندر آ گئے ہیں اور انہوں نے دھماکوں پر کنٹرول حاصل کر لیا ہے۔ عمران کو کندھے پر معمولی زخم بھی آیا تھا۔ یہ کسی شات کن کا پھرا تھا جو اس کے کندھے سے چھوٹا ہوا گزر گیا تھا۔

عمران، چوہان اور میرے درمیان لڑائی کی صورت حال کے بارے میں بات ہوئی۔۔۔ عمران نے کہا۔ ”ہمیں حقیقت سے نظر نہیں چرائی چاہیے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ ہم

اکیلے انگریزوں اور ان کے کٹھ پتلی حکم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہاں، یہ ہے کہ ہم انہیں کچھ دیر تک روک سکتے ہیں۔ اگر اس دوران میں مل پانی حرکت میں آ جاتا ہے تو پھر جارج بیون کی باقاعدہ فوج کے ساتھ زوردار مقابلے کا ماحول بن سکتا ہے۔“

قرآن سے پتا چلتا تھا کہ اب سویرے تک کوئی نیا حملہ نہیں ہوگا۔ اس دوران میں قاسم کے اندر گھس آنے والے دستے اپنی پوزیشنیں بہتر بنائیں گے۔ اتفاقاً اس لڑائی میں دونوں فریقوں کا زیادہ جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ دونوں طرف سے صرف سات آٹھ افراد ہلاک اور دو درجن کے قریب زخمی ہوئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تعداد حکم اور ایڈرن کے فوجیوں کی تھی۔

چوہان، حسنا، بھرت اور عبدالرحیم وغیرہ کو بنگرانی کا کام دے کر میں اور عمران تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے چلے گئے۔ کل کے ہنگامہ خیز دن کی ذمے داریاں پوری کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ہم تھوڑی دیر آرام کر لیتے۔ حسنا احمد نے قلعے کی دوسری منزل پر ایک محفوظ کمرہ ہمارے لیے منتخب کیا تھا۔ یہاں ایک بڑا پینک تھا جس پر مکمل بڑے ہوئے تھے۔ کمرے میں اچھی سی حرارت بھی موجود تھی۔ دور کہیں قلعے کی بیرونی دیوار کے پاس کسی کتے کی آواز بار بار سنائی دیتی تھی۔ میرے ذہن میں آیا کہ کہیں یہ وہی کتا تو نہیں لیکن پھر اس ”فضول“ خیال کو میں نے ذہن سے جھٹک دیا۔ ابھی ہمیں لیٹے ہوئے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ کمرے کے قدیم طرز کے فرش چوٹی دروازے پر دھم دھم دستک ہوئی۔ عمران نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دوسری طرف انور خاں کا ساگی حسنا احمد تھا۔ مجھے شک گرا کہ شاید انور خاں کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے لیکن یہ شک صحیح نہیں تھا۔ حسنا احمد سے کچھ دیر تک کھس پھس کرنے کے بعد عمران نے دروازہ بند کیا اور تیزی سے اندر آیا۔ اس نے بے تابی سے دایم بائیں دیکھا جیسے جیسے کے لیے کوئی جگہ ڈھونڈ رہا ہو۔ وہ واقعی جگہ ڈھونڈ رہا تھا لیکن اپنے چھپنے کے لیے نہیں، میرے چھپنے کے لیے۔۔۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور جلدی سے ایک قد آدم آئینی الماری کے پیچھے موجود خلا میں چھپا دیا۔ سر گوشیوں میں پوچھتا رہ گیا کہ کیا بات ہے مگر اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔ یہ کوئی اہم معاملہ لگ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے دوبارہ کمرے کا دروازہ کھولا اور کسی کو اندر لے آیا۔ یہ ایک لمبی گرم چادر میں لپیٹی ہوئی جوان سال عورت تھی۔

قاتل مسیحا

مختار آزاد

ضرورت اور خیال کا طلسم... ایک دفعہ اپنے سحر میں جکڑ لے تو اس سے نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے... اس کی ضرورت نہ بھی اسے ایک ایسی راہ سجھا دی تھی، تکمیل کے بغیر رہائی اس کے بس کی بات نہ رہی...

ایمانیت اور مسیحیت کے برائے ایک دل گداؤں پر

وہ جھوٹا نہیں تھا لیکن حالات نے کلیتہً ڈوکھی کی پیشکشوں ساگر سے کچھ پہلے ہی اسے اگلی درجے کا جھوٹا بنا دیا تھا مگر وہ یہ جھوٹ کسی کو تکلیف پہنچانے یا تفریح کی غرض سے نہیں بولتا تھا۔ اس کے جھوٹ بولنے کا مقصد صرف اپنی بیمار بیوی کو تسلی دینا تھا۔

ہوایہ تھا کہ ڈوکھی کی سادہ لوح بیوی لیرا گزشتہ دس برس پہلے ایک ٹریفک حادثے میں بڑی طرح زخمی ہو گئی تھی جس کے بعد سے اس کا بخلا دھڑ بالکل مغلوب ہو کر رہ گیا تھا۔ کئی ماہ کے علاج کے بعد وہ گھر تو لوٹ آئی تھی لیکن اس حالت میں کہ بس بستر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ ڈوکھی اپنی بیوی سے بہت محبت



عمران نے فورے سے دیکھا اور تاڑ لیا کہ اس کے پاس کوئی بہت اہم خبر ہے۔ وہ اپنے لہجے کو ذرا نرم رکھ کر بولا۔ ”گیتا! مجھے پہیلیاں نہ بھجواؤ۔ بات بتاؤ۔“

”بات کی قیمت؟“ وہ صرف دو تین انچ کے فاصلے سے عمران کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا قیمت؟“

وہ اس کے گلے لگ گئی۔ عمران نے جیکٹ اور قمیض اتاری ہوئی تھی۔ اس نے عجیب جذباتی انداز میں اس کے کندھے کی خونی خراش پر اپنے احمریں ہونٹ رکھ دیے۔ وہ کسی جو تک کی طرح اس کے کندھے سے رسنے والا خون چوس رہی تھی۔ عمران نے اسے بالوں سے پکڑ کر پیچھے ہٹایا۔

”یہ کیا حرکت ہے گیتا؟“

”یہ پریم ہے عمران... اور پریم کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ کچھ پریم بلیڈان دیتے ہیں، کچھ نہیں دیتے۔ ایسے پریموں میں ایک ہاتھ دیا جاتا ہے، دوسرے ہاتھ لیا جاتا ہے۔“

”تم کیا دینا چاہتی ہو؟“

”میں تمہیں بھانڈیل اسٹیٹ کی نقدیر بتانا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں ایک ایسی جانکاری دینا چاہتی ہوں جو اس لڑائی کا نقشہ بدل دیوے گی۔“

”کیسی جانکاری؟“

وہ نشی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”سب کچھ بتا دوں گی تو پھر مجھ بے چاری کے پاس کیا رہ جاوے گا۔ چلو تمہیں تھوڑا سا بتا دیوت ہوں۔ مل پانی سے آنے والی بڑی بی بی جسے اب لوگن ماما جی کہنے لگے ہیں، اس سارے کھیل میں تپ کے سچے جیسی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اس بڑی بی بی نے اب سے تھوڑے سے پہلے قاسم کے علاقے اور قلعے پر زوردار حملے کے لیے ایک ٹھہ گھڑی بھی نکالی ہے۔ یہی کارن ہے کہ ہندو فوجیوں کے مشورے سے گوروں نے ابھی لڑائی روک دی ہے۔ لیکن اس بڑی بی بی کے حوالے سے اگلی بات بہت زیادہ خاص ہے...“

”کیا؟“ عمران نے پوچھا۔

”قیمت؟“ گیتا بھی نے عمران کو خشار آلود نظروں سے دیکھ کر کہا۔

☆☆☆

خطروں کے دائروں میں سفر کو نہ جاننا ہوں گی داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

دروازہ بند ہونے کے بعد اس نے چادر سے سر کاٹی تو میں دنگ رہ گیا۔ گیس لپس کی سفیدی بالکل روشنی میں میرے سامنے گیتا کھڑی تھی۔ وہی لڑکیوں کی ڈانس انسٹرکٹر، پکی عمر لیکن چست جسم والی ”چلتی پرزی“۔ اس کے ہونٹوں پر لالی تھی۔ چہرہ ہنستا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر لگا کر وہ ہلکے سے نٹنے میں ہے۔ اس نے عجیب دل ربا انداز سے عمران کو دیکھا۔ گرم چادر اس کے شانوں سے ڈھلک رہی تھی۔ جسمانی تشبیہ و تفاویہاں تر ہو رہے تھے۔ عمران نے ذرا جھنجھلاہٹ سے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے اپنا ہاتھ عمران کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

”بیکار میں تھیں آئی ہوں۔ بڑے کام کی خبر لائی ہوں۔ تمہارا من خوش ہو جاوے گا۔ تم ہو گے، مانگو گیتا آج کیا آتی ہو۔“

عمران نے کہا۔ ”گیتا! یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں ہے۔ ہم جنگ کی حالت میں ہیں۔ تمہیں سناٹی دے رہا ہوگا، اب بھی فائرنگ کی آوازیں آرہی ہیں۔“

”مجھے کیا بتا رہے ہو۔ جتنا زرگاں کے بازے میں، میں جانتی ہوں کوئی اور ناہیں جان سکتا۔ زرگاں گیتا بھی سے ہے اور گیتا بھی زرگاں سے ہے۔“ اس نے عجیب بے باکی سے کہا اور عمران کو نیم باز آنکھوں سے دیکھتی ہوئی اس کے بالکل قریب چلی آئی۔

یہ زرگاں کے شیتانوں کی رازدراں وہی تیز طرار عورت تھی جو اس سے پہلے زرگاں سے ہماری واپسی کے وقت، عمران کے ساتھ ایک رومانی سین کر چکی تھی۔ یہ رومانی سین ان کو ششوں کا عوضانہ تھا جو اس نے سلطانہ کے زیور ڈھونڈنے کے حوالے سے کی تھی۔

... لیکن آج وہ کچھ زیادہ ہی بے باک نظر آتی تھی۔ اس نے اپنی چادر تھوڑی سی اور سر کاٹی اور میں سناٹے میں رہ گیا۔ چادر کے نیچے اس نے دو حصوں پر مشتمل مختصر ترین لباس پہنا ہوا تھا۔ اس نے عمران کو کندھوں سے تھما اور جذباتی انداز میں اس کا گال چوم لیا۔ عمران ہنستا گیا۔ اسے ذرا حیل کر بولا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم میں شرم کی اتنی کمی ہو سکتی ہے۔“

وہ نشی انداز میں بولی۔ ”اپنوں سے شرم ناہیں ہوتی۔ شاید تم میری گستاخی پر ناراض ہو رہے ہو۔ لیکن اگر یہ گستاخی ہے بھی تو سوچو کہ کیوں ہے؟ کوئی تو ایسی بات ہووے گی جس کی وجہ سے تمہاری اس بندی کو اتنی جرأت ہو رہی ہے۔“

کرتا تھا۔ وہ ایک ریٹائرڈ سپروائزر تھا۔ اس کو ملنے والی ساری پیشن بیتی کے علاج پر خرچ ہو جاتی تھی لیکن اس کے باوجود وہ ہر وقت اُسے یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ بہت جلد دوبارہ اپنے غیروں پر کھڑی ہو جائے گی۔ حالانکہ ڈاکٹر کہہ چکے تھے کہ اب اس کی ساری زندگی بستر پر ہی گزرے گی مگر پھر بھی وہ ہر وقت اسے ٹھیک ہوجانے کی جھوٹی امیدیں دلاتا رہتا تھا۔

ڈوکی غریب آدمی تھا۔ وہ فلوریڈا کے مصافحاتی علاقے میں جمیل کے قریب واقع قصبے کے جس گھر میں رہتا تھا، وہ اس کے کاشت کار باپ نے تعمیر کروایا تھا۔ اب گھر کی حالت بھی بہت مخدوش ہو چکی تھی۔ ایک تو اس کی پشت بہت قلیل تھی، دوسرا یہ کہ آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ پھر لیرا کی بیماری..... اس کے پاس اتنے پیسے ہی نہیں تھے کہ گھر کی مرمت کروائے اس کے باوجود وہ مستقل مزاجی سے زندگی بسر کر رہا تھا۔

لیرا سے شادی کو تیس برس ہونے والے تھے لیکن وہ اس کے لیے اب بھی محبوبہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ مستقل بستر پر رہنے کی وجہ سے اس کی کمر پر چوڑے ہو چکے تھے۔ یوں لگی اور امراض بھی اسے لاحق ہو چکے تھے۔

ان کی..... ایک بیٹی اور بیٹا تھے۔ بیٹی فلوریڈا کی ایک یونیورسٹی کے..... پروفیسر سے شادی کر چکی تھی اور بیٹا وہیں ایک آرٹ گیلری میں کام کرتا تھا۔ مالی لحاظ سے بیٹی اور بیٹا بھی اس قابل نہیں تھے کہ وہ اپنے ماں باپ کی مالی مدد کر سکتے، البتہ سال میں ایک دوبارہ ان سے ملنے کے لیے ضرور آتے تھے۔

گزشتہ ایک ماہ سے وہ بہت زیادہ پریشان تھا۔ لیرا کی طبیعت کافی بگڑ چکی تھی۔ دس سال سے مستقل بستر پر رہنے کے باعث وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچا بن گئی تھی۔ ڈوکی نے بھی تقریباً گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہر وقت اس کے بیڈ کے کنارے کرسی ڈالے بیٹھا رہتا تھا۔ وہ درو کے مارے رات رات بھر کراہتی رہتی۔ اب اس میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی کہ بستر پر کروٹ بدل سکے یا کتے کے سہارے بیٹھ سکے۔ اب تو ڈاکٹروں کی دی ہوئی دوا بھی اس کے درد کی شدت کو کم کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ بیوی کو مل جل مرتا ہوا دیکھنا اس کے لیے بہت اذیت ناک تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنی اندرونی کیفیت کو چھپانے سیکھاتا ہوا اسے تسلیاں دینے کی کوشش کرتا رہتا۔ اس کے لیے یہ سوچنا ہی نہایت تکلیف دہ تھا کہ جب لیرا انہیں ہوگی تو وہ کیسے زندہ رہ

پائے گا۔ اولاد اپنی اپنی دنیا میں گئی تھی اور ہاڈو کی تو اس کی دنیا تو صرف لیرا تک ہی محدود تھی۔

وہ نومبر کی سرد و پھر تھی۔ کمرے میں موسم سرما کی نرم نرم دھوپ چمیلی ہوئی تھی۔ لیرا کا بیڈ عین کھڑکی کے سامنے تھا۔ اس نے سینے تک کھل اڑھا ہوا تھا۔ دھوپ اس کی آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ بیڈ کے ایک جانب کرسی پر ڈوکی بیٹھا ہوا تھا جبکہ دوسری طرف لیرا کی ماں اور انگل خاموش بیٹھے اُسے تک رہے تھے۔ کمرے کا ماحول نہایت افسردہ تھا۔

”کیا میں مر رہی ہوں؟“ اس نے آنکھیں کھولیں اور بڑی دقت سے دائیں جانب سرموڑتے ہوئے ڈوکی سے استفسار یہ لہجہ میں کہا۔

”نہیں میری جان ایسا کچھ نہیں ہو رہا۔ میں نے تمہیں نئی دوا کھلائی ہے۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ اس کے لہجے سے محبت جھلک رہی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی پلکوں سے ڈھلکنے کے لیے قہر آرائیوں کو روکتے ہوئے کہا۔

”تم یقین سے کہہ رہے ہو؟“ اس نے نقاہت سے اپنے سر کو تکیے پر تھوڑا اوپر اٹھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ڈاکٹروں کو اس بات کا پورا یقین ہے۔“ یہ سن کر لیرا نے اپنا سر تکیے پر ٹکادیا اور آنکھیں موندیں۔ ”تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ فصول کی باتوں میں ذہن کو الجھا کر خود کو بلکان مت کرو۔“ اس کا لہجہ نہایت نرم تھا۔ آواز بھرائی ہوئی تھی مگر پھر بھی وہ بڑی ہمت سے اسے دلاسا دے رہا تھا۔

”اوکے۔“ لیرا نے آہستہ سے کہا۔

”تم بہت جلد پوری طرح ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ ڈوکی کی بات سن کر لیرا نے ہلکا سا مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس پر کزوری غالب آئی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم کی تمام قوت سلب ہو چکی ہو۔ پہلے تو اسے اپنے شوہر کی بات پر یقین آ جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ جان ہی گئی کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ وہ اسے زندہ رہنے کے لیے جھوٹی تسلیاں دیتا ہے لیکن اس نے کبھی ایک بار بھی اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ جھوٹ کیوں بولنے لگا ہے اور وہ بھی اپنی بیوی سے۔ وہ جانتی تھی کہ ڈوکی کا یہ معصوم جھوٹ اُس کی خوشی کے لیے ہی ہے مگر نہ جانے کیوں آج وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ اب ڈوکی کو مزید جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ وہ جان

چکی تھی کہ وہ مر رہی ہے۔ اب اس کی سانسیں کچھ ہی دیر کے لیے اس کے جسم کی مہمان ہیں۔

کمرے میں بدستور افسردہ ماحول چھایا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کا درد بڑھنے لگا۔ درد بہت زیادہ تھا لیکن کمزوری اتنی زیادہ نہ تھی کہ اس کے منہ سے کراہنے کی آواز بھی نہیں نکل پاری تھی۔ صرف اس کے ہونٹوں اور چہرے کے تاثرات سے ڈوکی یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ اس وقت وہ شدید کرب سے گزر رہی ہے۔

لیرا کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے جسم کی مٹا بی کستی جا رہی ہیں۔ اس نے بڑی مشکل سے ایک بار اپنی آنکھیں کھول کر ڈوکی کو دیکھنا چاہا لیکن اُس کا چہرہ اتنا دھندلا گیا تھا کہ اس نے انگلی سے اسے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک اس کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ یہ دیکھ کر ڈوکی سخت پریشان ہو گیا۔ وہ کرسی سے اٹھا اور اس کے بیڈ کی بیٹی پر بٹک گیا۔ اس کا ہاتھ اُس کی نبض پر تھا۔ نبض بے ترتیب چل رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ اس کے منہ سے سانس لینے کے بجائے خرخرات جیسی آواز آنے لگی۔ اس سے پہلے کہ ڈوکی کچھ کرتا، اس نے دونوں ہتھکڑیاں لیں اور پھر سکت ہو گئی۔ اس کا سر ڈھلک گیا۔ ڈوکی نے ہاتھ بڑھا کر اس کی آنکھیں بند کیں۔ وہ سمجھ گیا کہ کچھ دیر پہلے لیرا راج کہہ رہی تھی کہ میں مر رہی ہوں۔

ڈوکی جب لیرا کی آنکھیں بند کر رہا تھا تو اُس کی ماں بھی سمجھ گئی کہ کیا حادثہ پیش آچکا ہے۔ اسے بھی بیٹی کی موت کا یقین تھا لیکن ایک ماں کی حیثیت سے وہ اس کی زندگی کے آخری لمبے تک کسی ایسے مجھے کے منتظر تھی جس سے اسے زندگی مل جائے گی۔ لیکن لیرا ای نہیں، اس کی امید بھی دم توڑ چکی تھی۔ وہ کافی دیر سے بیٹی کے سرہانے اپنے آنسو ضبط کیے بیٹھی تھی۔ ”ہائے میری بیٹی۔“ اُس نے زوردار چیخ ماری اور بے سندھ ہو کر کرسی پر ڈھس گئی۔

موت کے وقت اس کی عمر پچاس برس سے اوپر تھی۔ اس نے ڈوکی کے ساتھ زندگی کے تیس سال چٹائے تھے۔ اس کی بیماری کے بارے میں اس کی اولاد کو ابھی طرح علم تھا لیکن شاید وہ یہ بات نہیں جانتے تھے کہ ان کی ماں آخری سانسیں لینے والی ہے۔ دروازہ پہلے اس نے اپنی بیٹی اور بیٹے کو فون کر کے اُن کی ماں کی نازک حالت کے بارے میں بتادیا تھا لیکن آنے پر کوئی تیار نہیں ہوا۔ سب کے پاس مصروفیت کا بہانہ تھا۔ عمو ان کے بچے اگست میں ان سے ملنے آتے تھے

لیکن اب اگست میں بھی اُن دونوں میں سے کوئی نہیں آیا تھا۔ اس بات کا لیرا کو بہت دکھ تھا۔ البتہ ڈوکی نے اس کی بوڑھی ماں کو اطلاع کر دی تھی جو اپنے بھائی کے ساتھ فوراً چلی آئی تھی۔ جب لیرا نے آخری سانسیں لیں تو وہ دونوں اس کے سرہانے موجود تھے۔

ماں کو دیکھ کر لیرا بہت خوش ہوئی۔ شاید اس لیے کہ کوئی تو خوشی رشتہ ہے جو اُس وقت اس کے پاس موجود ہے، جب وہ دنیا کو چھوڑ کر جانے والی ہے۔

لیرا کی ماں بدستور صدمہ میں تھی۔ اسے ہوش آ گیا تھا۔ وہ دبے دبے لہجے میں رورہی تھی۔ وہ لیرا کے ٹھنڈے پڑتے جسم کو بدستور چھو چھو کر دیکھ رہی تھی۔ ستر سالہ بوڑھی ماں، جسے یقین نہیں تھا کہ وہ اپنی کوکھ سے جنم لینے والی اولاد کو اپنی آنکھوں کے سامنے یوں دنیا چھوڑ کر جاتا ہوا دیکھ سکے گی۔

ڈوکی اپنی بیوی کو بہت چاہتا تھا۔ اس نے پوری زندگی اسے ہر ممکن عیش و آرام مہیا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ اس کی موت کے وقت اُس کی مالی حالت بہت پگھل گئی، جب اور بینک اکاؤنٹ، دونوں خالی تھے لیکن اس کے باوجود اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کی تدفین نہایت شان سے کرے گا۔

لیرا کا انتقال سب سے پہلے کے وقت ہوا تھا۔ موت کے دو گھنٹے بعد میت قصبے کے اسپتال کے سرد خانے میں رکھوائی جا چکی تھی جہاں سے اُسے جیمیز وٹکین کرنے والا ادارہ لے جاتا۔ فی الحال اس نے ایک ہفتے بعد تدفین کا فیصلہ کیا تھا۔ ادارے کو تدفین کے لیے تیار کرنے کی غرض سے میت ایک دن پہلے چاہے تھی۔ ڈوکی کو یقین تھا کہ اس دوران میں وہ کسی نہ کسی طرح میسے کا انتظام کر لے گا۔

ڈوکی نے لیرا کی تدفین کے لیے جس طرح کا تاہوت بنوانے اور میت کو تیار کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا، اس کے لیے پانچ ہزار ڈالر زوردار تھے۔ اس نے ادارے سے کہا تھا کہ وہ جس دن میت لائیں گے، اُسی دن وہ انہیں رقم ادا کر دے گا لیکن اب اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ آن کھڑا ہوا تھا کہ وہ پانچ ہزار ڈالر زوردار کا انتظام کس طرح کر پائے گا؟

☆☆☆

البوم گارن و سبوع ریلیس سوئنگ پول کے گرد گھوم پھر کر اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ پانی کی سطح پر دومرہ میمنڈک اور کچھ مے ہوئے خشرات الاوش تیرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ گارن کی عمر ستر سال تھی۔ وہ بہت ہی موٹا آدمی تھا۔

گاؤرن، ڈوسکی کا بہت پرانا دوست تھا۔ وہ دونوں ہاربر موہاگل پارک کمپن میں ملازمت کرتے تھے۔ ڈوسکی کی وجہ سے ہی ریٹائرمنٹ کے بعد گاؤرن نے بھی اسی قصبے میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ گاؤرن، ڈوسکی کا یادِ غم گسار سنا سکتا تھا۔

سینٹر کے ریستوران میں آ گئے۔

خاموش ہوتے دیکھا تو چونک کر کہا۔

”ایک حل ہے....“ کافی دیر بعد گارٹن نے خاموشی توڑی۔

کامٹے ہوئے کہا۔

”تم جو لائف جیکٹ پہنے ہوئے تھے، اُس نے تم دونوں کو بچایا تھا۔“ گارٹن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

لیرا غی تدفین کے لیے اخراجات پر ہونے والی گفتگو نے ماحول پر نہایت تنجیدگی طاری کر دی تھی لیکن گارٹن نے نہایت عقل مندی سے کام لیتے ہوئے ماحول پر چھایا ہوا تناؤ ختم کر دیا۔ اس بات سے ڈوکی کی توجہ بھی کچھ دیر کے لیے ہٹ گئی۔ یوں اس پر طاری ذہنی دباؤ بھی کسی حد تک کم ہو گیا۔

”بارش دگ چکی ہے۔ کیا خیال ہے ایک، ایک کپ کافی اور پی لیں پھر چلتے ہیں؟“ گارٹن نے کہا۔

”یہ ٹھیک ہے۔“ ڈوکی نے جواب دیا۔ ”ویسے کیا کام کرنا ہے اب ہمیں؟ چلو میرے گھر چلتے ہیں۔“

”ابھی نہیں، یہ سوئمنگ پول جہاں میں آج ہی صاف کرنا ہے، فیجر کا حکم ہے۔ ویسے بھی کل کچھ خاص لوگ یہاں آ رہے ہیں۔“

”کون لوگ ہیں؟“ ڈوکی نے پوچھا۔

”فیڈرل ویٹیرن ڈیپارٹمنٹ والے ہیں اور ان کے ساتھ کچھ این جی اوز کے لوگ ہوں گے۔“ گارٹن نے بے یقینی سے بتایا۔

کافی پینے کے بعد وہ دونوں اٹھے۔ ابھی وہ ریسٹوران سے نکلے ہی تھے کہ فیجر آتا ہوا دکھائی دیا۔ ”اے گارٹن..... میں تمہاری طرف ہی آ رہا تھا۔“ جیسے ہی اس کی نظر اُس پر پڑی، وہ چلایا۔

”خیریت تو ہے مسٹر اینس؟“ گارٹن نے پوچھا۔ اتنی دیر میں وہ اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا مرد بھی تھا۔ اس نے بیس بال کیپ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں جو گزرتھے، نی شرت کے اوپر سیاہ چمڑے کی جیکٹ اور جینز پہنی ہوئی تھی۔ اس کے کاندر سے سیاہ تھیلانگ رہا تھا۔ علیے سے وہ ایسا شخص نظر آ رہا تھا جو مدتوں بعد مصطل اعبصا کو سکون پہنچانے کے لیے اکیلا چھٹاں گزارنے کے لیے گھر سے نکلا ہو۔ ویسے ڈوکی کو وہ پہلی ہی نظر میں تیار محسوس ہوا تھا۔

”یہ مسٹراڈورڈ ہیں۔ جمیل کی سیر کرنے کے لیے خاص طور پر یہاں آئے ہیں۔“ فیجر نے اپنے ساتھ آنے والے شخص کا تعارف گارٹن سے کرواتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”ہمارے تھے کہ وہ بہت پہلے اس جمیل پر آئے تھے اپنے والدین کے ساتھ۔ بچپن میں برس بعد ایک بار پھر وہ اپنے بچپن کی یادیں تازہ کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔“

شام کو انہیں واپس جانا ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ کشتی پر ایک دو گھنٹے کھوتے ہوئے گزار دیں۔“

”بہت اچھا..... مگر اس سلسلے میں، میں ان کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ گارٹن نے سوال کیا۔

”بوٹ میں چھٹی پر ہے۔ ویسے بھی یہ آف سیزن ہے۔ یہاں کوئی اور ایسا نہیں کہ جو بوٹ چلا سکے۔ بہتر ہے کہ تم انہیں سیر کرا دو۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر میں نے سوئمنگ پول اب تک صاف نہیں کیا ہے۔ مجھے تو اُس میں ہی سارا دن لگ جائے گا۔“ اس نے فیجر کو مخاطب کر کے کہا۔ ”یہ سن کر اس نے سر پکڑ لیا۔ وہ آدمی بھی پریشان نظر آنے لگا۔ اچانک فیجر کی نظر ڈوکی پر پڑی۔

”آپ کو بھی تو بوٹ چلانا آتی ہے۔ پلیز! آپ ہی انہیں گھما لائیں۔“ فیجر نے اس کی طرف اکتھا بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ کی مہربانی ہوگی۔“ فیجر کی بات سن کر ڈوکی سوچ میں پڑ گیا لیکن جب ایڈورڈ نے یہ کہا تو اس کا دل فوراً بیچ گیا۔

”چلیے۔۔۔“ اس نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے ڈوکی..... تم جاؤ۔ میں تو چلا سوئمنگ پول صاف کرنے۔“ یہ کہہ کر گارٹن مست ہانسی کی طرح جھوسا ہوا چل دیا۔ ڈوکی فیجر اور مہمان کے ساتھ ساتھ بوٹ کی طرف چل پڑا۔

آدھا گھنٹا گزر چکا تھا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بارش کے بعد ہوا میں عجیب طرح کی مسکورگن خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ چھوٹے سے انجن والی کشتی پر ایڈورڈ اور ڈوکی بیٹھے ہوئے تھے۔ کشتی کا انجن بند تھا اور وہ پانی پر ڈوبتی ہوئی جا رہی تھی۔ جب وہ کشتی لے کر جمیل میں تھوڑا آگے بڑھا تھا، جب ہی ایڈورڈ نے یہ کہہ کر انجن بند کروا دیا تھا کہ کشتی چھوڑنے کے ذریعے ہی چلائی جائے۔ انجن کی آواز نہ صرف کانوں کو بُری لگ رہی ہے بلکہ اس سے اُس کا ذہنی سکون بھی خراب ہو رہا ہے۔ ڈوکی نے اس کی بات مانتے ہوئے انجن بند کر دیا۔ اب جمیل کے پانی پر یہ کشتی ڈول رہی تھی۔

جمیل کا خوب صودت ماحول ڈوکی کے ذہن پر بہت اچھا اثر ڈال رہا تھا۔ بیوی کی موت اور تدفین کے مسائل کے باعث وہ کئی روز سے ذہنی طور پر سخت پریشان تھا لیکن اس وقت دل فریب موسم نے اس کی طبیعت پر خاصا خوش گوارا کیا تھا۔ قدرتی نظارے اور پانی سے ٹکرائی ہوا کی آواز اُسے

عظمت

بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور ایڈورڈ پر نظر ڈالی۔ وہ نہایت اٹھانک سے پانی کو دیکھ رہا تھا۔ ”کیسا لگ رہا ہے یہ سب کچھ؟“ ڈوئسکی نے چوہے چلاتے ہوئے اشتیاق سے پوچھا۔

”بہت اچھا۔۔۔۔۔ اس وقت مجھے وہ لمحے یاد آ رہے ہیں جب میں بھلی بار اپنے والدین کے ساتھ یہاں چھٹیوں کے کچھ دن پٹانے کے لیے آیا تھا۔“ اس کا بوجھ بھلیا کھو یا تھا۔ چہرے پر طہانیت اور ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جیسے کہ وہ اپنی نظروں کے سامنے کچھ ایسا دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا ہے جسے شاید وہ مدتوں بعد آج دیکھ پایا تھا۔

”لگتا ہے کہ بہت ہی خاص یا دیر واپست ہیں اس جمیل سے۔“ ڈوئسکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کچھ ایسا ہی ہے۔“ اس نے چونک کر گہری سانس لی اور چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری بہت پرانی خواہش تھی کہ اس جمیل کی سطح پر کئی کتنے گزاروں، اپنی یادیں تازہ کروں اور بس۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر وہ نکلا اور کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور ڈوئسکی کی طرف دیکھتے ہوئے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ”مگر بہت دیر کر دی یہاں آنے میں۔“

”دیر کیوں کی یہاں آنے میں؟“ ڈوئسکی نے پوچھا۔ اس کے ساتھ بیٹہ گھر بھی کچھ دیر کے لیے اپنی ساری پریشانیوں اور لیرا کی موت کا دکھ بھلا چکا تھا۔ ”ہر بار یہ سوچ کر ناتواں رہا کہ کروں گا، چلا جاؤں گا۔۔۔۔۔ مگر جب پتا چلا کہ اب جانا پھر گیا ہے تو پتا تاخیر کیسے چلا آیا۔“

”کسی اور ملک میں جا کر آباد ہونے والے ہو؟“ ڈوئسکی نے استفسار یہ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے۔ ”ہاں۔۔۔۔۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”بہت دور ایک ملک ہے، وہاں جا کر رہنے والا ہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا لیکن اس کے لہجے سے دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔

”کہاں ہے یہ ملک؟“ ڈوئسکی جہاں دیدہ شخص تھا۔ اس کے لہجے میں پوشیدہ درد کو بھانپ گیا۔ اسی لیے اُس نے حیرت سے پوچھا۔

”تم کچھ دیر کے لیے چچا جانا بند کر دو۔“ اس نے سنی اُن ہی کرتے ہوئے نرم لہجے میں حکم دیا۔ ”بس۔۔۔۔۔ یہاں کتنی روک لو۔ میں کچھ دیر کے لیے یہاں سکون سے رکنا چاہتا ہوں۔“

بٹنے کی گنجائش تھی۔ وہ چوہے رکھ کر سکون سے بیٹھ گیا۔ ایڈورڈ اُس سے چھٹک کی دوری پر میٹھا ہوا تھا۔ وہ نہایت اشتیاق بھری نظروں سے آسمان کو تنگ رہا تھا۔ بارش کے بعد ایک بار پھر سورج نکل آیا تھا لیکن اس کے باوجود اب بھی نیلے نیلے آسمان پر کہیں کہیں ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ منظر نہایت دلکش تھا۔ ڈوئسکی بھی ماحول سے لطف اندوز ہونے لگا۔ کافی دیر تک دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ گرمیوں کے موسم میں عموماً روزانہ پھیل پر خاصا رش رہتا تھا۔ اگر گرمیاں ہوتیں تو اس وقت پھیل پر درجنوں کشتیاں تیر رہی ہوتیں لیکن اس وقت وہاں دور دور تک کوئی کشتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اچانک ایڈورڈ نے اپنی لائف جیکٹ اتار دی۔ اب وہ صرف ٹی شرٹ میں تھا۔ ”کیا ہوا۔۔۔۔۔ کیوں اتار دیا اسے؟“ ڈوئسکی نے حیرت سے پوچھا۔

”اُجھن ہو رہی تھی۔“ اس نے ہیزاری سے کہا۔ یہ دیکھ کر ڈوئسکی پریشان ہو گیا۔ جمیل انتظامیہ کے قواعد کے مطابق سیاح کو کشتی میں بیٹھے ہونے کی صورت میں لائف جیکٹ پہنے رکھنا لازمی تھا۔ اسے جیکٹ اتارنا دیکھ کر ڈوئسکی تھوڑا سا ڈر گیا تھا، تبھی اس نے پوچھا۔ ”تمہیں تیرنا تو آتا ہے نا؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“ اس نے بڑے سکون سے جواب دیا اور تھوڑا سا جھک کر پانی میں اپنا ہاتھ ڈال کر چوہے کی طرح چلانے لگا۔ ”تمہیں تیرنا نہیں آتا تو اسے پہن لو ورنہ کوئی حادثہ پیش آ گیا تو تم ڈوب کر مر بھی سکتے ہو۔“ اس کے لہجے میں تنبیہ تھی۔ ”مجھے بھی تیرنا نہیں آتا۔ اگر کچھ اُلٹا سیدھا ہو گیا تو دونوں مارے جا سکتے گے۔“

”مگر تم نے تو لائف جیکٹ پہنی ہوئی ہے۔“ اس نے ڈوئسکی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے ڈوب کر مرنے سے ڈر لگتا ہے۔“

”مگر مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا۔“ اس نے ڈوئسکی کے چہرے پر نظریں گڑاتے ہوئے کہا۔ ”وہی بھی مجھے اب کسی قسم کی لائف جیکٹ مرنے سے نہیں بچا سکتی۔ البتہ تمہاری بات دوسری ہے۔ تم اسے پہنے رہو۔“ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔

”تم مجھے کچھ پریشان لگتے ہو؟“ ڈوئسکی نے کہا۔ ”ہوسکتا ہے کہ تم بھی پریشان ہو۔ کون سا ایسا شخص ہے جو پریشان نہیں۔“ اس نے غلامش گھورتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی زندگی بھر طرح طرح کی پریشانیوں میں گھرا رہا ہوں مگر

اب یہ کچھ میں آیا کہ وہ سب کچھ فضول تھا۔“

”تمہاری یہ بات تو ٹھیک ہے کہ میں پریشان ہوں لیکن۔۔۔۔۔“

”لیکن تمہیں میری بات سمجھ نہیں آ رہی۔“ یہ کہہ کر وہ ہنس دیا۔

”شاید نہیں۔۔۔۔۔ ڈوئسکی نے کہا۔“ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم نے غلط کہا ہو۔“

”چھوڑو یہ باتیں۔“ اس نے اپنا ہونڈ بیگ کھولتے ہوئے کہا۔ بیگ کے اندر سے اس نے سگریٹ کا پیکیٹ اور لائسنس نکال کر باہر رکھا اور پھر بیگ کے اندر ہاتھ ڈال دیا۔ جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں بٹوا دیا ہوا تھا۔ اس نے بٹوے کے اندر کچھ تلاش کرنا شروع کیا۔ ڈوئسکی کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے کچھ دیر تک نوکوش کی اور پھر بٹوے کی ہر چیز نکال کر باہر رکھنے لگا۔ ڈوئسکی نے دیکھا کہ اس کے بٹوے میں ڈائریز بھرے ہوئے تھے۔ آخر اس کے چہرے پر پھر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے بٹوے کی ایک جیب سے پلاسٹک میں لپیٹی کوئی نہ نکالی۔ یہ ایک بڑی گولی جتنی کوئی چیز تھی۔ اس کے بعد اس نے ایک ایک کر کے دوبارہ سب چیزیں بٹوے میں رکھیں اور اسے پھیلے میں ڈال کر واپس اپنے قدموں کے قریب رکھ دیا۔

ڈوئسکی کی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ تم سے بھرا ہوا اس کی جیب میں تھا لیکن پھر بھی وہ زندگی سے بیزاری کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اسے لگ رہا تھا کہ شاید اسے کوئی بہت بڑا دکھ پہنچا ہے۔

”بیو گے؟“ وہ ایڈورڈ کی بات سن کر چونکا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ”بیو گے؟“ اس نے سگریٹ اس کی طرف کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

”میں تمہارا کوئی نہیں پیتا۔“

”تمہا کوکا لون پوچھ رہا ہے؟ میں تو کہہ رہا ہوں جس چیز سے گے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ ڈوئسکی نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ”جیسے تمہاری مرضی۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور پھر جس سے بھرا سگریٹ تیار کرنے لگا۔ ڈوئسکی نے نظریں دوسری طرف کیں اور لاعلمی سے سامنے دیکھنے لگا۔

کچھ دیر بعد صاف ستھری فضا میں جس کی ناخوش گوار بو پھیل گئی۔ وقفے وقفے سے ایڈورڈ کی کھاسی کی آواز بھی سنائی دیتی رہی۔ کئی منٹ گزر گئے، تب ایڈورڈ نے پکارا۔ ”تم نے بھی جس پانی ہے؟“ اس کے بعد اسے کھاسی کا

ایک زودار ٹھکانا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ ڈوئسکی نے سادگی سے جواب دیا۔

”میں نے بھی آج بھلی بار پانی ہے؟“

”کیا؟“ ڈوئسکی نے حیرت سے کہا۔ ”مطلب یہ کہ تم نے اس سے پہلے بھی جس نہیں لی؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ ایڈورڈ نے کہنا شروع کیا۔ ”بس۔۔۔۔۔ ایک خواہش تھی وہ بھی برسوں سے کہ کسی دن خوش گوار موسم

میں تنہا بیٹھ کر سکون سے اس کے چندش کے گرد بیٹھوں تو یہی کہ آخر یہ کیا چیز ہے۔“ اس وقت بھی وہ رہ رہ کر اسے کھاسی کے ٹھکے اٹھ رہے تھے۔ اس نے تھکلا کھول کر پانی کی بوتل نکالی اور چند گھونٹ پانی پیا۔

”تم خوش نصیب ہو کہ آج کے دن تمہاری دو خواہشیں پوری ہو گئیں۔“ پانی پینے کے بعد اس کی کھاسی کے ٹھکے رگ گئے تب ڈوئسکی نے کہا۔

”یہ آخری دو خواہشیں تھیں۔“ اس نے بظاہر مسکراتے ہوئے لیکن افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب؟“ وہ اس کی سنی خیز بات سن کر چونک گیا۔

”مطلب یہ کہ میں مرنے والا ہوں۔“ ایڈورڈ کے چہرے پر افسردہ کردینے والی مسکراہٹ طاری تھی۔

”تم کیا کہہ رہے ہو؟“ ڈوئسکی ٹھک کر اس کے قریب آ گیا۔

”وہی۔۔۔۔۔ جو تم نے سنا ہے۔“

”تمہارے ساتھ ایسا کیا ہوا ہے جو اس عمر میں مرنے کی بات کر رہے ہو؟ میرے خیال سے تو تم ابھی صرف پینتیس چالیس سال کے ہی ہو گے۔“

”ٹھیک پچھانا۔ میری عمر ابھی صرف اڑتیس سال ہے۔“

”تو پھر۔۔۔۔۔ یہ تو تمہاری جوانی کے دن ہیں۔ کھاؤ پیو اور ہر غم ہنسی میں اڑا دو۔“ ڈوئسکی نے اس کی دل جولی کرتے ہوئے کہا۔ ”نہن کر اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور خالی خالی لگا ہوں سے آسمان کو گھورنے لگا۔

اس کی حالت دیکھ کر ڈوئسکی سمجھ گیا کہ اس وقت وہ کسی شدید جذباتی صدمے سے دوچار ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی گرل فرینڈ نے اسے چھوڑ دیا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی بیوی بھاگ گئی ہو یا پھر اس نے طلاق لے لی ہو۔ ممکن ہے کہ اس کی نوکری ختم ہو گئی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اسے کاروبار میں بدترین خسارہ ہوا ہو جس کی وجہ سے وہ زندگی سے بیزار ہو کر ایسی باتیں کر رہا ہے۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اس نے اپنے دل میں

سوچا۔ مجھے اس کی دل جوئی کرنا چاہیے۔ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا۔ اس وقت جمیل کی سطح بالکل سناں تھی۔ دور دور تک نہ تو کوئی کشتی تھی اور نہ ہی انسان۔۔۔۔۔ اس کی باتیں سن کر وہ دل ہی دل میں ڈوب رہی رہا تھا کہ کہیں یہ اپنی خودکشی کی نیت سے تو یہاں نہیں آیا ہے جو ایسی بھکی بھکی باتیں کر رہا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے جمیل میں چھلانگ لگا دی تو وہ اسے بھیجا نہیں پائے گا۔ اسے تو خود تیرنا نہیں آتا تھا۔

”یہ جیکٹ پہن لو۔“ اچانک ڈوکی کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ اگر وہ پانی میں چھلانگ لگا دیتا تو اس کا بیچنا حال تھا۔ وہ خود ہی اسے یہ بتا چکا تھا کہ اسے تیرنا نہیں آتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے جیکٹ اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔

”یہ لو، اسے پہن لو۔“ اس نے بڑی اپنایت سے کہا۔

”رہے دو۔ روح میں سرسراہٹ پیدا کرتی ہے یہ ہوا مجھے اچھی لگ رہی ہے۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے جیکٹ کو دور کرتے ہوئے کہا۔ ابھی اس نے یہ بات کہی تھی کہ اچانک ایک سرد ہوا کا جھونکا آیا۔ اس نے جھرمجھری کے گرد و فوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔

”جیسے تمہاری سرخسی۔“ ڈوکی نے جیکٹ رکھتے ہوئے کہا۔

”ناراض کیوں ہو رہے ہو؟“ وہ ڈوکی کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر بھانپ گیا کہ وہ اس کی بات پر کچھ خفا ہوا ہے۔ ”میں تو بس ذرا اس موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس کو نہیں پہننا چاہ رہا ہوں۔ ویسے بھی یہ پہن کر ایسا لگتا ہے جیسے انسان خطرات کے سمندر میں داخل تو ہونا چاہتا ہے لیکن اس بات کی ضمانت کے ساتھ کہ وہ ہر خطرے سے محفوظ رہے گا۔“

”لگتا ہے کہ تم بہت بڑھے لکھے ہو۔“

”یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ اس نے ہنس کر بات ٹال دی۔

”ایک گھنٹے سے میں تمہارے ساتھ ہوں مگر اب تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ تمہاری شخصیت کس وجہ سے اس خاد کا شکار ہے؟“ آخر وہ اپنے دل کی بات زبان پر لے آیا۔ ”مجھے دیکھو۔۔۔۔۔ میں بھی اس وقت ایک شدید نوعیت کے مسئلے سے دوچار ہوں لیکن پھر بھی تمہیں میرے گردانے کے لیے یہاں آگیا ہوں۔ غرور خانے میں میری بیوی کی لاش پڑی ہے۔ اتوار کو اس کی تدفین ہے۔۔۔۔۔“

”یہ کوئی خاص بات نہیں۔۔۔۔۔ میں اور تم بھی کسی دن یونہی مردہ خانے میں پڑے ہوئے دفن ہو جانے کے منتظر ہوں گے۔“

”تم تو یہ بات یوں کہہ رہے ہو جیسے کسی کا مرجانا کوئی بات ہی نہیں ہے۔“ ڈوکی نے فوراً جواب دیا۔

”تمہیں اگلے برس تک جینے کی امید ہے؟“ اچانک ایڈورڈ نے انکو سوال کر دیا۔ وہ ہنسا گیا۔

”امید تو ہے۔“ کافی دیر سوچنے کے بعد ڈوکی نے جواب دیا۔

”تمہیں وجہ ہے کہ تم اپنی بیوی کی موت کا ذکر اس درد بھرے لمحے میں کر رہے ہو۔“ ایڈورڈ نے اچھے اچھے لہجے میں کہا۔ ”جب تمہیں اپنی موت کا وقت معلوم ہو جائے گا تو پھر تم کسی کی موت پر افسردہ نہیں ہو گے۔“ یہ کہہ کر وہ اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

”اگر ناراض نہ ہوتو کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے ساتھ ایسا کیا غلط ہوا ہے کہ تم زندگی سے اتنے بیزار دکھائی دے رہے ہو؟“ کافی دیر بعد ڈوکی نے منہ پر سے لہجے میں اس سوال کیا۔

”میں مرنے والا ہوں۔۔۔۔۔ اس نے یہ سنتے ہی اتنی جلدی کہا کہ ڈوکی سمجھ بھی نہ پایا کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔

”اودھ میرے خدا۔۔۔۔۔ نہیں تم۔۔۔۔۔“

”تم غلط سوچ رہے ہو میرے دوست۔“ اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نہ تو زندگی سے بیزار ہوں اور نہ ہی اپنے ہاتھوں اس کا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔“

”تو پھر؟“ ڈوکی نے اس کی بات کا نکتہ ہونے کہا۔

”مجھے خون کا کینسر ہے اور میں زیادہ سے زیادہ ہفتہ دس دن یا پھر شاید ایک مہینے کا مہمان ہوں اس دنیا میں۔“

”اودھ خدا۔۔۔۔۔“ اس کی بات سنتے ہی ڈوکی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تھمتھیا یا مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔ اسے لیرا کے وہ آخری الفاظ یاد آئے جو مرنے سے کچھ دیر پہلے اس نے نہایت جہت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے۔۔۔۔۔ ”کیا میں مری رہی ہوں؟“

ڈوکی اس کو تسلی دینا چاہتا تھا لیکن وہ اس سے کیسے کہہ سکتا تھا کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ وہ ”ہوئی،“ کو جھوٹی تسلی دے کر کیسے ”ابوئی“ کر سکتا تھا۔ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ وہ بولنا چاہتا تھا لیکن اسے لگا جیسے اس کی گویائی کی طاقت سلب کی جا چکی ہو۔۔۔۔۔ وہ دونوں بالکل خاموش تھے۔ ہوا چلنا بند ہو گئی تھی۔ پانی ساکت تھا اور ماحول یک لخت افسردہ ہو چکا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور ایڈورڈ کے سامنے بیٹھ گیا۔ پھر

اس نے اپنی ساری ہمت مجتمع کی اور دھیمے لہجے میں کہا۔ ”یہ سب کچھ کیسے ہوا؟“

”معلوم نہیں۔۔۔۔۔“ ایڈورڈ نے بھی آہستہ سے جواب دیا۔ کافی دیر تک دونوں خاموش رہے۔ آخر اس نے بتانا شروع کیا۔ ”میں نیویارک کے ایک بینک میں اعلیٰ عہدے پر کام کرتا ہوں۔ کوئی دو ماہ پہلے کی بات ہوگی۔ مہینا بھر پہلے اچانک طبیعت متحیل رہنے لگی۔ میں اکیلا رہتا ہوں۔ بیوی بچے نہیں ہیں۔ پہلے تو سمجھا کہ شاید کام کاج کی زیادتی اور کسی دوست کے نہ ہونے کی وجہ سے ڈپریشن کا شکار ہوا ہوں لیکن جب طبیعت میں مسلسل گراؤن رہنے لگی تو ڈاکٹر کے پاس گیا۔ بہت سارے ٹیسٹ ہوئے۔ آخر انہوں نے یہ بتایا کہ مجھے خوں کا کینسر ہو گیا ہے جو آخری اسٹیج پر ہے اور اب میں شاید کچھ ہی دنوں کا مہمان ہوں۔“ اس نے ایک سرد آہ بھری اور جبکہ کربانی میں ہاتھ ڈال دیا اسے چو کی طرح چلانے لگا۔

”مجھے شدید افسوس ہوا ہے کہ میں۔۔۔۔۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”مگر اب تو جانا تھا کہ یہ بھڑک چیز افسوس۔“

”اب تم کہاں جاؤ گے؟“

”ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ میں اسپتال میں داخل ہو جاؤں گا۔ اپنی آخری سانسیں سن سکوں۔“

”کتنے دن باقی بچے ہیں؟“ ڈوکی نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

”ہفتہ، دس دن۔“ اس نے بدستور پانی میں ہاتھ چلاتے ہوئے کہا۔ ”یہاں دو بار آئے کی بہت خواہش تھی۔ آج بہت خوش ہوں کہ یہ خواہش پوری ہوئی۔ بس۔۔۔۔۔ آج رات ہی نیویارک کے لیے نکل جاؤں گا۔ پرسوں صبح اسپتال میں داخل ہونا ہے۔“ وہ اپنی دھن میں کہہ چلا جا رہا تھا۔

”ڈاکٹر چاہتے ہیں کہ موت کے آخری لمحات میں ان کی دوا میں شاید میری تکلیف کو کچھ کم کر دیں کی ورنہ تو اسپتال کے ہیڈ پرلٹ کر موت کا انتظار کرنا میرے نزدیک ویسا ہی ہے جیسے کسی کو موت کا انتظار کر دینے کے لیے سزا دی گئی دن پہلے الیکٹرک چیئر پر بٹھا کر، اسے اکیلا چھوڑ دیا جائے۔“ اسی لمحے اسے ایک بار پھر گھبراہٹ کا شکار لگا۔ اس نے پانی سے ہاتھ باہر نکالا۔ ڈوکی نے آگے بڑھ کر اسے پانی کی بوتل پکڑادی۔ اس نے دو گھونٹ پانی پیا اور ایک بار پھر کشتی کے کنارے سے اپنا اوپری دھڑ باہر کر کے جھکا اور پانی میں ہاتھ ڈال کر چو کی طرح چلانے لگا۔

ڈوکی خاموشی سے بیٹھا ہوا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اسے

ایڈورڈ سے شدید ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اتنی کم عمری میں ہی یہ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ ہیڈ پرلٹ کر موت کا انتظار کرنے والی بات سن کر اسے ایک بار پھر لیرا یاد آگئی۔ اس نے دس برس نہایت بے بسی کے عالم میں بستر پرلٹ کر زندگی کی خواہش کے پردے میں موت کا انتظار کیا تھا۔ لیرا کا خیال آتے ہی اس کا دل صدمے سے جھٹکنے لگا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

کافی دیر بعد ڈوکی نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ایڈورڈ بدستور جھکا ہوا پانی سے مکمل رہا ہے۔ اس نے اسے متوجہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں موند لیں اور کچھ سوچنے لگا۔ کافی دیر تک اس کے دل و دماغ میں شدید کشمکش طاری رہی۔ اس کے دماغ میں وہ کراہیڈ ورڈ کی باتیں گونج رہی تھیں اور لیرا کا خیال آ رہا تھا۔ آخر اس نے ہمت کر کے آنکھیں کھولیں۔ ایڈورڈ بدستور اپنے مکمل میں مگن تھا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ انہیں جمیل میں گھومتے ہوئے دو گھنٹے ہونے والے تھے۔ کشتی سچ جمیل میں رکی ہوئی تھی۔ اس نے بچہ اٹھائے۔ اچانک ”شوراب“ کی آواز گونگی۔ ایڈورڈ جمیل میں گر گیا تھا۔ ڈوکی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس طرف آیا جہاں ایڈورڈ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پانی کی سطح پر دیکھا۔ ایک بلرہ سطح آب پر نمودار ہوا اور پھر اگلے ہی لمحے غائب ہو گیا۔ کچھ دیر بعد دوبارہ اس کا سر پانی کی سطح پر نمودار ہوا۔ اس بار ڈوکی نے اس کی طرف لائف جیکٹ اچھا دی لیکن یہ کوشش بے ثمر رہی۔ وہ ایک بار پھر پانی کے نیچے چلا گیا۔ ڈوکی نے کشتی کا انجن اسٹارٹ کیا۔ جس جگہ وہ گرا تھا، وہاں دیکھا اور پھر آہستہ سے کہا۔ ”معاف کرنا دوست، ویسے بھی تمہیں تیرنا نہیں آتا۔“ یہ کہہ کر اس نے کشتی کا رخ موڑا اور سینٹر کی طرف جانے لگا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ایڈورڈ کی لاش جمیل سے نکالی جا چکی تھی۔ پولیس نے لاش کو مردہ خانے منتقل کیا۔ ڈوکی نے پولیس کو جو بیان دیا تھا، اس کے مطابق وہ جانے حاشہ پر لگ جھگ ڈیڑھ دو گھنٹے سے موجود تھے۔ اس نے پولیس کو یہ بھی بتایا کہ اس نے لائف جیکٹ اتار دی تھی اور اس کے اصرار کے باوجود اسے پہننے سے انکاری رہا۔ سینئر کے فیصلے کے بیان دیا کہ ڈوکی یہاں اپنے دوست سے ملنے کے لیے آیا تھا اور میرے اصرار پر وہ مہمان کو سر کر دینے لے گیا۔

یہ سیدھا سادہ حادثہ تھا۔ کشتی میں اس کے ملنے والے بیگ سے پولیس کو بیس ہزار ڈالرز، اس کے شاختی کاغذات، اور اسپتال کی رپورٹیں ملیں جن سے تصدیق ہوتی تھی کہ وہ

صرف چند دنوں کا مہمان تھا۔

دو دن تک تفتیش جاری رہی۔ پولیس نے نو یا رک میں بھی متعدد راپٹے کے تاہم اس کے کسی وارث کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ بالآخر پولیس نے کس کو اتفاقاً حادثہ قرار دے کر تفتیش بند کی اور اس کے پاس سے ملنے والی رقم قصبے کے سینٹ وولیم چرچ کو دے کر، انہیں اس کی شاندار تدفین کی دے داری سوچی۔ تدفین اتوار کی سہ پہر کو ہوئی تھی۔

☆☆☆

حادثے کو تیسرا دن تھا۔ لیرا کی تدفین کی تیاریوں کے باعث ڈوکی بہت مصروف ہو چکا تھا۔ تدفین میں شرکت کے لیے اس کی بیٹی، داماد اور بیٹے سمیت کئی قریبی رشتے دار پہنچ چکے تھے۔ دوسری طرف میت کے لیے تابوت بنایا جا رہا تھا۔ ڈوکی اپنی نگرانی میں تابوت تیار کروا رہا تھا۔ اس دوران میں ایک بار بھی ڈوکی کا گارن اس سے ملنے آیا اور نہ ہی اس نے اُسے فون کیا۔

آخر تدفین کا دن آیا پہنچا۔

اتوار کے دن صبح سویرے سے ہی اس کے گھر میں خاصی چہل پھل نظر آرہی تھی۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب میت کو گھر پر لایا گیا۔ جس نے بھی میت کو دیکھا، اس نے ڈوکی کی تعریف کی کہ اس نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کیا ہے۔

اتوار کے دن دوپہر کا وقت تھا، جب لیرا کی تدفین کے بعد قصبے کے باہر سے آنے والے تمام مہمان اور عزیز و اقارب گھر لوٹ آئے لیکن ڈوکی کا کہیں پتا نہیں تھا۔ کوئی یہ بات نہیں جانتا تھا کہ وہ قبرستان سے سیدھا سینٹ وولیم چرچ چلا گیا تھا۔

ڈوکی جب چرچ میں پہنچا تو وہاں گنتی کے ہی چند لوگ موجود تھے۔ پارٹی فادر آلفنڈ آخری رسومات ادا کروا رہا تھا۔ ڈوکی کو دیکھتے ہی ان کے لبوں پر ہلکی سے مسکراہٹ آئی۔ دراصل اس نے فادر کو حادثے کی روداد بتا کر پہلے ہی درخواست کی تھی کہ وہ بطور وارث نہ صرف تدفین کے امور کی انجام دہی کی نگرانی کرے گا بلکہ اس کی تدفین بھی ایسے ہی انجام دے گا جیسا کہ ایک باپ اپنے بیٹے کی کر سکتا ہے۔ ویسے بھی مرنے والا اس کے بیٹے کی عمر کا ہی تھا۔

شام کے چار بجے تھے جب ڈوکی گھر لوٹا۔ مہمان واپس جانا شروع ہو گئے تھے۔ آخر ایک ایک کر کے سب چلے گئے۔ شام تک گھر میں ڈوکی، اس کا بیٹا، بیٹی، داماد اور گارن ہی رہ گئے تھے۔ گارن، اس گھر کے ایک فرد کی

حیثیت رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈوکی اپنی بیوی سے کتنی محبت کرتا تھا۔ اس لیے ویسے بھی وہ اسے فی الحال تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔

ڈنر کے بعد ان پانچوں نے لیونگ روم میں بیٹھ کر کافی پی۔ اس دوران میں وہ سب لیرا کی باتیں کرتے رہے۔ رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے جب گارن نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ”رات کافی ہو گئی ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔“ اس نے ڈوکی کو مخاطب کر کے کہا۔

ڈوکی، گارن کو چھوڑنے کے لیے باہر تک آیا۔ گیٹ پر پہنچ کر گارن ٹکا۔ کچھ دیر تک وہ اسے سوالیہ نگاہوں سے تنکٹا رہا اور پھر اس سے بغل گیر ہو گیا۔ ”تم نے جیسا کہا، ویسا کر دکھایا۔ بڑی ہمت ہے تمہاری۔“ اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ یہ سن کر وہ خاموش رہا۔ کچھ دیر تک گارن بدستور اس کے گلے سے لگا کھڑا رہا۔ آخر اس سے الگ ہوا اور ”گڈ بائے“ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ڈوکی کی آنکھ سے دو آنسو ڈھلک گئے۔ اس نے آستین سے آنکھیں صاف کیں اور پھر سرے سرے قدموں سے چلتا ہوا گھر میں آ گیا۔

☆☆☆

ڈوکی گھر میں تنہا رہ گیا تھا۔ تدفین کے بعد بیٹی، داماد اور بیٹا وہاں جا چکے تھے۔ وہ گنتی دن سے گارن سے بھی نہیں ملا تھا۔ وہ بھی اُس رات کے بعد سے گھر پر نہیں آیا تھا۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے جب وہ گارن سے ملنے کے لیے کیونٹی سینٹر پہنچا۔ وہ اس کی تلاش میں دھڑا دھڑ نظر میں گھما رہا ہوا ریسٹوران کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ وہ اسے برآمدے میں کرسی پر آنکھیں موندے ہوئے نیم دراز نظر آ گیا۔

”اے مولے۔۔۔“ ڈوکی نے اسے دیکھتے ہی چلا کر کہا۔ یہ سنتے ہی اس نے آنکھیں کھولیں اور ہاتھ سے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد دونوں ریسٹوران کے اندر بیٹھے ہوئے کافی پی رہے تھے۔ گارن کچھ بجا بجا سا نظر آ رہا تھا لیکن ڈوکی اس کی حالت کو نظر انداز کرتا رہا۔

”اور سنا۔۔۔ اب کیا مصروفیات ہیں؟“ گارن نے کافی کا خالی گلاس پر ہاتھ رکھتے ہوئے رکی لہجے میں پوچھا۔

”لیرا کے بعد کسی مصروفیت؟“ ڈوکی ایک دم اداس نظر آنے لگا۔ ”گھر بالکل خالی ہو گیا ہے۔ میرا تو وقت ہی نہیں کھتا۔ وہ ہوتی تھی تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔“

”تیس برس کی عادتیں، تین دن میں تو نہیں بدل سکتیں۔“ سن کر گارن نے جواب دیا۔ ”سچ بات ہے۔“ اس نے کہا۔

”میں چلے آیا کرو، کم از کم کچھ مصروفیت تو رہے گی۔“ ”ہاں۔۔۔۔۔ ٹھیک کہتے ہو۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”خیر، یہ بتاؤ کل صبح کیا کر رہے ہو؟“

”اب تک تو کچھ خاص بات نہیں ہے۔ کیوں سب خیر تو ہے؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ کچھ خاص ہے یا یوں کہہ لو کہ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے یا پڑ سکتی ہے۔“

”بتاؤ۔۔۔۔۔ کیا بات ہے؟“ گارن نے اس کی مبہم بات سن کر پریشانی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”فی الحال تو کچھ نہیں بتا سکتا۔“

”تو تم کل صبح کا کیوں پوچھ رہے تھے؟“ گارن نے سوال کیا۔

”کل صبح تمہیں میرے گھر آنا ہوگا۔“

”آج جاؤں گا مگر بتاؤ تو کسی بات کیا ہے؟“

”یہ تو کل ہی بتا چکی۔“ ڈوکی نے جواب دیا۔

”کیا نئی شادی کر رہے ہو جو اتنی رازداری برتی جا رہی ہے؟“ گارن نے مسکرا کر کہا۔

”تم بے تاب نہ ہو۔ کل بتا دوں گا۔ ویسے بھی میرا کون سا ایسا ہم راز ہے جو تمہیں نہیں، اُسے بتاؤں گا۔“ ڈوکی نے مسکرا کر جواب دیا۔

”صبح کتنے بجے؟“

”جب ناشا کر کے تیار ہو جاؤ تو گھر آ جانا۔“

”ٹھیک ہے۔“ ڈوکی نے جواب دیا۔

”ہاں سنو۔۔۔۔۔“ ڈوکی نے اُسے کہا جیسے اچانک اسے کوئی بات یاد آگئی ہو۔ ”اگر میں گھر کے باہر نہ لوں تو سیدھے بیدار ہوں میں آ جانا۔ سو رہا ہوں تو جگا دینا۔“

”اتنی تاکید کیوں کر رہے ہو؟“ وہ یہ سن کر مسکرایا۔

”اس لیے کہ تم شریف آدمی ہو۔ صبح کے چار بجے ہی بستر سے نکل پڑتے ہو مگر میں ایسا نہیں ہوں۔“ ڈوکی نے شرارت سے جواب دیا۔ ”ویسے بھی جلدی اٹھ کر کیا کروں گا؟“

”اور اگر موصوف بستر پر بھی نہ ملے تو کیا کروں؟ یہ بھی سمجھا دوں۔“

”پھر بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر دیکھ لیتا۔ تمہارے لیے پیغام لکھ کر چھوڑ جاؤں گا کہ تمہیں اب کیا کرنا ہوگا۔“ اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”فی الحال تو میں چلتا ہوں۔ ایک دو ضروری کام نمٹانے ہیں۔“ یہ کہہ کر ڈوکی اٹھا اور اسے۔۔۔

گنبدے کے کہہ کر بازاری طرف چل دیا۔

پھولوں کی دکان سے اس نے دو شاندار گلہ دستے خریدے اور قبرستان چلا آیا۔ پہلے وہ ایڈورڈ کی قبر پر گیا۔ گلہ دستہ رکھا اور چھ منٹ تک دو زانو ہو کر دعا پڑھتا رہا۔ پھر وہ لیرا کی قبر پر گیا۔ قبر کے سر ہانے گلہ دستہ رکھا اور قبر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا۔ اس وقت اس کے کونام میں لیرا کے ساتھ گزاری ہوئی زندگی کا ایک ایک لمحہ کی طرح چلتا رہا۔ لگ بھگ ایک گھنٹے کے بعد وہ اٹھا اور گھر کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

صبح کے سات بج رہے تھے جب گارن، ڈوکی کے گھر میں داخل ہوا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا مگر وہ اسے نظر نہیں آیا۔

”اے ڈوکی!“ اس نے گھر کے اندر پہنچ کر آواز دی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ ”کم بخت سو رہا ہوگا اب تک۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا اس کے بیدار ہونے کی طرف بڑھا۔ سامنے بیڈ پر ڈوکی کیل اڑے سو رہا تھا۔ ”مجھے صبح بجا بولا اور خود میرے لیے کافی بنانے کے بجائے یہاں پڑا سو رہا ہے۔“

گارن نے بڑبڑاتے ہوئے اس کے چہرے پر سے مکمل اٹھایا مگر اگلے ہی لمحے اسے زوردار جھٹکا لگا۔ ایک ہل کے لیے اسے کچھ نہیں سمجھ آیا۔ وہ لوکھڑاتا ہوا چند قدم پیچھے ہٹا اور کرسی پر ڈھس گیا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد جب اس کے اوسان ذرا بحال ہوئے تو وہ اٹھا اور ایک بار پھر ڈوکی کے بستر کے قریب پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔

ڈوکی کا چہرہ تیار ہو رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھ چکی تھیں۔ اس کے کھلمنہ پر جھاگ کے نشان تھے۔ ”اوہ میرے خدا۔۔۔۔۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ گارن نے بھرتی ہوئی آواز میں کہا۔

اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے گردن موڑ کر سائڈ ٹیبل پر دیکھا۔ وہاں ایک سفید لفافہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے لفافہ اٹھایا اور اسے کھول کر دیکھا تو اس میں سو سو ڈالر کے بہت سارے نوٹ اور ایک خط لکھا ہوا تھا جس نے خط لکال کر لفافہ وہیں رکھا اور کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھنے لگا۔

”بیارے گارن۔۔۔۔۔“

لیرا کے بعد میں جس شخص پر۔۔۔ سب سے زیادہ بھروسہ کرتا تھا، جس سے ہر بات شیئر کرتا تھا۔۔۔۔۔ وہ صرف تم ہو۔ تمہارے سامنے میری پوری زندگی کھلی کتاب کے مانند ہے۔ میری زندگی کا کوئی راز تم سے چھپا ہوا نہیں۔ ویسے بھی میری



شیطان کتی موت شرعباس

نیکی اور بدی کی قوتیں ازل سے انسان کی دشمن ہیں اور اب تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گی... پراسرار ماحول کی پروردہ مکروفریب کہانی جس کے کردار انسان اور انسانیت کے دشمن تھے...

اس شخص کا قصہ جس کی ذات افواہوں کی گہری دھند میں لپٹی ہوئی تھی

جب صبح کے چار بجے ڈپٹی شریف میری نے شتی پر آکر کین کا دروازہ کھٹکنا یا تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت آپ کسی اچھی خبر کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ میں نے فوراً ہی بستر سے چھلانگ لگائی اور لمحہ بھر میں باہر آگیا۔ میری آنکھیں اندھیرے میں میری کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں کیونکہ اس وقت وہ یونیفارم میں نہیں تھا۔ ”مائیک! تم ٹیلی فون کیوں نہیں اٹھا رہے؟“ اس نے اس طرح کہا جیسے اپنے آنے کی وجہ بیان کر رہا ہو۔ ”شریف تم سے اسی وقت اسٹاک آئی لینڈ پر ملنا چاہتا ہے۔“ کی ویسٹ سے نکلے وقت پل پار کرنے کے بعد یہ

تھی۔ البتہ اب میں ہر مجبوری سے آزاد ہو چکا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میں نے موت کا یہ دن کیوں چننا؟ آج میری پینکھوں میں سالگرہ ہے۔ شادی کے بعد ہمیشہ رات بارہ بجے ہی لیرا مجھے مبارک باد دیتی تھی۔ رات ٹھیک بارہ بجے میں نے زہر لیا۔ اب میں لیرا سے ملنے اور ہمیشہ اس کے پاس رہنے کے لیے جا رہا ہوں۔

ہاں، ایک اور بات.... میں نے ایڈورڈ کے بیوے سے گیارہ ہزار ڈالر بھی نکالے تھے۔ چھ ہزار ڈالر تدفین پر خرچ ہو گئے۔ باقی پانچ ہزار ڈالر اس لفافے میں ہیں۔ اس میں سے میری تدفین پر چھٹا کم خرچ ہو سکے، کرنا اور باقی اپنے آخری وقت کے لیے رکھ لیتا۔ میں نے پولیس کے لیے بھی خوشی کا ایک خط تیار کر لیا ہے۔ وہ خط میری جیب میں ہے لیکن اس میں وہ کچھ نہیں لکھا جو تمہیں بتا رہا ہوں۔ یہ باتیں اگر راز ہی رہیں تو اچھا ہوگا ورنہ اب میں جہاں جا رہا ہوں، وہاں اس راز کے افشا ہونے سے بھی کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے امید ہے کہ تم سب کچھ سمجھ چکے ہو گے۔ درخواست نہیں کرتا لیکن اگر ہو سکے تو معاف کر دینا۔

”چلہارا گناہ گار دوست....“

گارٹن کی چمکیں بھینگ چکی تھیں۔ خط پڑھ کر وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے اپنی جیب سے لائٹر نکالا اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر خط کو آگ لگا دی۔ کچھ دیر بعد جلے ہوئے خط کی راہ ہوا میں اڑ چکی تھی۔

گارٹن پلٹا۔ اس نے سامنے ٹیبل پر رکھا ہوا لفافہ اٹھا کر دروازے میں رکھا اور فون اٹھا کر پولیس کو اطلاع دینے لگا۔

فون رکنے کے بعد وہ پلٹا اور بیڈ کے سر ہانے آکر تھوڑا سا جھکا اور اپنا چہرہ ڈوکی کے چہرے کے نزدیک لا کر کہنے لگا۔ ”معاف کرنا دوست.... مجھے اس رقم کی ضرورت نہیں۔ البتہ تمہاری شان دار تدفین کا خرچ میں ادا کروں گا۔ آخر تم میرے واحد دوست تھے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی پٹلیں ایک بار پھر مڑ گئیں۔ ”ویسے میں یہ سب کچھ سمجھ چکا تھا، اگر تم یہ بتائے بغیر مر جاتے تو شاید میں تمہیں معاف نہیں کرتا۔“ اس نے ڈوکی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے ایسے کہا جیسے وہ اس کی بات سن رہا ہے۔ پھر اس نے لاش کے چہرے پر کپل ڈالا اور پلٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے پولیس کے آنے کا انتظار تھا۔

زندگی کا کوئی راز تھا ہی نہیں مگر پھر بھی ایسی کوئی بات نہیں ہے جو تم سے پوشیدہ ہو، ماسوائے اس ایک بات کے۔ یہی وہ بات ہے جس کے لیے میں نے تمہیں آج صبح یہاں بلا یا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ میں جیتے جی یہ بات تم سے نہیں کہہ پاؤں گا اور نہ ہی میں یہ بوجھ اپنے سینے پر ساتھ لے کر اس دنیا سے جانا چاہتا تھا، اس لیے میں یہاں تم سے وعدہ لیتا ہوں کہ سب کچھ جاننے کے بعد مجھے معاف کر دو گے۔ تم جانتے ہو کہ جس دن میں شتی لے کر جمیل پر گیا تھا، اس دن میں تدفین پر آنے والے اخراجات کے بارے میں کتنا زیادہ پریشان تھا مگر پھر بھی تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ کیا یا جو کچھ ہوا، اس میں میری بری نیت کا بہت زیادہ عمل دخل نہیں تھا۔

ایڈورڈ موت کے بالکل قریب تھا۔ جب اس نے مجھ سے نہایت بڑے بے بسی کے لہجے میں یہ کہا کہ اسے پرسوں اسپتال میں داخل ہو کر موت کا انتظار کرنا ہے تو یہ سن کر میں بہت افسردہ ہو گیا لیکن جب اس نے یہ کہا کہ اسپتال کے ہیڈ پرلٹ کر موت کا انتظار کرنا تو میرے لیے ویسا ہی ہے جیسا کہ کسی حکومت کا انتظار کروانے کے لیے سزا کی کسی دن پہلے، الیکٹرک چیر پر بٹھا کر اکیلا چھوڑ دیا جائے.... تو یہ سن کر میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ مجھے یہ دہرہ کر لیرا اور اس کی وہ تکلیف یاد آنے لگیں جو اس نے بستر پر پڑے پڑے برداشت کی تھیں۔ میں کافی دیر سوچتا رہا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ اس جیسے شخص کو بستر پر مرنے کے بجائے تکلیف اٹھائے بغیر، جیتے مکرانے ہوئے زندگی کو الوداع کہنا چاہیے۔ وہ پانی میں اتھوڑا کر کھیل رہا تھا کہ میں نے چپ سے اس کے کانڈھے پر چوٹ ماری۔ وہ توازن پر قائم رہا نہ رکھ سکا اور جمیل میں گر کر ڈوب گیا۔ اس کے ڈوبنے کے بعد میں نے لائف جیکٹ پانی پر پھینک دی اور پولیس کو جھوٹی کہانی سنائی کہ وہ خود گر گیا تھا۔

میں تمہیں ایک بار پھر یقین دلاتا چاہتا ہوں کہ جو کچھ ہوا، اس کے پیچھے اصل جذبہ ہمدردی کا تھا لیکن ساتھ ہی میری ضرورت بھی پوری ہو گئی۔ میں نے بھی کسی سے جھوٹ نہیں بولا، ماسوائے لیرا کے۔ اس جھوٹ کے پیچھے بھی ہمدردی کا جذبہ پوشیدہ تھا۔ میں ہمیشہ جھوٹ بول بول کر اسے صحت یابی کی امید دلاتا رہا اور وہ بے چاری آخری وقت تک میرے جھوٹ کو سچ سمجھتی رہی۔ میں ایڈورڈ سے بھی یہی کہنا چاہتا تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا لیکن نہیں کہا۔ میں اس جھوٹ سے تھک چکا ہوں۔ پولیس کے سامنے جھوٹ بولنا مجبوری

پہلا جزیرہ ہے۔ اس کا کچھ حصہ شہر کی ملکیت ہے جبکہ بڑے حصے کا تعلق کاؤنٹی سے ہے۔

”جیسے؟“ میں نے بجایا لیے ہوئے کہا۔

”ہاں، اس نے مجھے گھر آ کر چکا یا اور کہا کہ تمہیں ساتھ لے کر یا فوجی اسٹریٹ کے آخر میں واقع اولڈ میٹین میں پہنچ جاؤں۔ ابھی اور اسی وقت۔“

”کیوں؟“ میں نے اپنے سر پر ٹوپی جھاتے ہوئے کہا۔

”یہ تو میں نہیں جانتا۔“ میری منہ بناتے ہوئے بولا۔

”لیکن لگتا یہی ہے کہ کوئی فوری نوٹیت کا معاملہ ہے۔“

کاؤنٹی شریف باب پرل مین سے میرے ریکی تعلقات ہیں اس لیے اس وقت بلائے جانے پر مجھے تجسس ہو رہا تھا۔ میرا اب تک کا تجربہ یہی جاتا ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے صحافیوں کو ہر معاملے سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس وقت تک تو معاملہ اس کے برعکس نظر آ رہا تھا۔

”بھری جی تمہیں کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہوگا۔“ میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

”آج میری چھٹی ہے اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ لوگ کس مسئلے پر کام کر رہے ہیں۔“ وہ اکتانے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تم میرے ساتھ چلو۔ ہو سکتا ہے کہ راستے میں ریڈیو پر کچھ تفصیل سننے کو مل جائے۔“

☆☆☆

”کیا تم اسے جانتے ہو؟“ شریف پرل مین نے مجھ سے پوچھا۔ اس وقت ہم ایک خستہ حال میٹین کے لیونگ روم میں کھڑے ہوئے تھے۔

میں نے جھک کر اس لڑکی کے چہرے کو غور سے دیکھا لیکن وہ میرے لیے اچھی تھی۔ میں نے ٹی میسر بلا دیا۔

”اچھی طرح دیکھو۔“ شریف نے تنبیہ کی ہے۔

”اس کا تعلق بھی تمہارے قبیلے سے ہے۔“

میں اس کی بات سن کر چونک گیا۔ کیا وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس لڑکی کو میں نے قتل کیا ہے؟

”یہ ٹریسی کا کس ہے اور یہ بھی تمہاری طرح صحافت سے وابستہ تھی۔“ اس نے سر دھچکے میں کہا۔

☆☆☆

میرا اصلی نام لاہ مرنٹی ہے لیکن کالج کے دنوں سے ہی مائیک مرنٹی کے نام سے پکارا جاتا ہوں۔ پیشے کے لحاظ سے صحافی ہوں اور فلور یڈا کے قصبے ویسٹ میں اپنی شہریت

پر رہتا ہوں۔ شریف کا خیال تھا کہ صحافی ہونے کے ناتے میں اور ٹریسی ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے جبکہ ایسا نہیں تھا۔ ہم دونوں کے کام کی نوعیت مختلف تھی۔ وہ طویل قسم کے تحقیقاتی مضامین لکھا کرتی تھی جو اکثر کتابوں کی شکل میں شائع ہوا کرتے تھے جبکہ میں ہفت روزہ میگزین کے لیے فچر لکھتا یا میا میا نیوز سروس کے لیے رپورٹنگ کرتا تھا۔ میرا زیادہ وقت اپنی شہریت پر ہی گزرتا تھا۔

”مجھے یہاں خون نظر نہیں آ رہا؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”اسے کسی اور جگہ قتل کر کے یہاں لایا گیا ہے۔“

شریف نے حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا۔

”اگر تم مجھ سے ہو کہ کسی ویسپائر نے اس کا خون پی لیا ہے تو ایسا نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ شاید کوئی اخبار سسٹنی پھیلانے کے لیے اسے دوسرا رنگ دے دے۔“

میں نے دوبارہ لاش کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”ٹریسی کے بال سنہرے تھے۔ میں اس سے کافی عرصے پہلے ایک ایوارڈ ڈنر میں ملتا تھا۔ یہ وہ نہیں ہے۔“

شریف بتاؤ ٹیسی سے بولا۔ ”یہ وہی ہے۔ میں اس سے ایک مہینہ پہلے میا میا میں مل چکا ہوں اور اس کے سیاہ بال ہی تھے۔ ایف بی آئی نے تمام قصابات کے شریف کو ایک تقریب میں مدعو کیا تھا اور یہ بھی وہاں مہمان کے طور پر موجود تھی۔“

”اسے مہمان کے طور پر کیوں بلا یا گیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

شریف مجھے دوسرے کمرے میں لے گیا کیونکہ وہاں دوسرے لوگوں کی آمد شروع ہو چکی تھی جو جائے واردات سے متعلق معلومات جمع کر رہے تھے۔

”وہ ہمیں چوروں کے ایک گروہ سے ہوشیار رہنے کے بارے میں بتا رہے تھے۔ ٹریسی نے ہی یہ کہانی سنائی تھی۔ اس نے اخبار میں شائع ہونے سے پہلے ہی ایف بی آئی کو اس گروہ کے بارے میں مطلع کر دیا تھا اور اس کے بعد وہ گروہ زیر زمین چلا گیا۔ ٹریسی کا خیال تھا کہ یہ گروہ فلور یڈا میں ایسی وارداتیں کر سکتا ہے۔“

یہ کمرہ کسی زمانے میں لائبریری رہا ہوگا لیکن اب اس کی خالی الماریاں گرد سے اتنی ہوتی تھیں۔ میں نے کمرے کا جائزہ لینے کے بعد اکتانے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یہ گروہ کس نوعیت کی چیزیں چراتا ہے؟“ اس وقت مجھے

شدت سے اپنے ہنسنے میں جانے کی خواہش ہو رہی تھی۔

”جسمانی اعضا؟“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”جسمانی اعضا۔“ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ یہ سننے ہی میری نیند اڑ گئی تھی۔

”ہاں۔“ اس نے ٹیسی سے کہا اور پھر پوری کہانی سنا دی۔

☆☆☆

نیو یارک، میامی، لاس اینجلس اور دوسرے بڑے شہروں میں ایسے کلب وجود میں آ چکے تھے جہاں ویسپائر کے ماننے والوں کا ہجوم اٹھا ہوتا تھا اور یہ لوگ ان کہانیوں پر اندھا یقین رکھتے تھے جو ٹی وی پروگراموں اور فلموں کے ذریعے ان تک پہنچتی تھیں۔ ان کہیوں کی شہرت سینہ بہ سینہ لوگوں تک منتقل ہو رہی تھی اور انہیں اپنی پیدائی کے لیے کوئی ساٹھ بورڈ لگانے یا اشتہار دینے کی ضرورت نہیں تھی۔

گزشتہ سال ان شہروں میں کئی ایسی لاشیں دریافت ہوئیں جن کے جسمانی اعضا مثلاً گردے، جگر، دل اور یہاں تک کہ آنکھیں بھی غائب تھیں اور یہ سب وہی لوگ تھے جو ان کہیوں میں جایا کرتے تھے۔ ٹریسی نے اس معاملے کی تحقیقات کی اور اس نے نیو یارک میں ایسے کلبوں کا پتا چلا جہاں ویسپائر کے پرستار درندوں جیسے مصنوعی دانت لگا کر ایک دوسرے کا خون پیا کرتے تھے۔ اس نے ویسپائر کے ایک ایسے ہی پیلے کا پتا لگایا۔ اس کہانی کے شائع ہوتے ہی نہ صرف وہ کلب بند ہو گیا بلکہ ویسپائر کا چہلا بھی غائب ہو گیا۔ اس پر ایک پندرہ روزہ اخبار نے ٹریسی کو ویسپائر کے قاتل کے خطاب سے نوازا۔

”اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ میں نے کرا میں جھانکتے ہوئے کہا جہاں ٹریسی کے جسم کو چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا اور اب وہ میڈیکل ایگزامینٹر کا انتظار کر رہے تھے۔

”تم ایک صحافی ہو، ہر جگہ جاسکتے ہو اور ہر ایک سے بات کر سکتے ہو۔ تمہیں صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ یہاں تو ایسا کوئی کلب موجود نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہمارے بچے اس وبا میں گرفتار ہو کر اپنے اعضا سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔“

☆☆☆

میں صرف ایک ایسے لڑکے کو جانتا تھا جس کا تعلق گوٹھک نسل سے تھا۔ اس کے آباؤ اجداد کسی زمانے میں مشرقی جرمنی سے ہجرت کر کے امریکا آ گئے تھے۔ میں نے

ہمیشہ اسے سیاہ لباس میں دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور ناک، کان چمکے ہوئے تھے لیکن پچھلے چند ماہ کے دوران میں اس میں کافی تبدیلی آ گئی تھی۔ جب میں اس سے ملنے گیا تو وہ اپنی شہریت میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ میں نے اسے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”ایلیکس! کیا تم مجھے کچھ وقت دے سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں۔ اوپر آ جاؤ۔“ وہ کتاب بند کرتے ہوئے بولا۔

”تم اسکول جاتے ہو؟“ میں نے کتاب پر نظر ڈالتے ہوئے کہا، وہ کوئی درسی کتاب تھی۔

”نہی کالج۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

میں ایلیکس کے بارے میں تو بڑا اہمیت جانتا تھا۔ اس کی عمر پندرہ سال ہوئی۔ اس نے دو سال پہلے یہ شہر خریدی تھی۔ وہ خاموش طبع اور اپنے آپ میں کمن رہنے والا تو جوان تھا۔ کبھی کبھی وہ ہماری پارٹیوں میں شریک ہوتا جن میں گھر کے بچے ہوئے کھانے اور سستی شراب دہی جاتی۔ کبھی کبھار وہ ہمارے ساتھ کھانے پینے میں شامل ہو جاتا

ور نہ کچھ دیر بیٹھ کر چلا جاتا۔

میں نے بات کو آگے بڑھانے کے لیے کہا۔ ”تم نے اپنے لیے کون سا مضمون منتخب کیا ہے؟“

”شاید بیالوجی۔“

میں جانتا تھا کہ وہ جموٹ بول رہا ہے کیونکہ میں اس کے ہاتھ میں کوئی اور ہی کتاب دیکھی تھی۔

”اگر میں تمہیں بیچ دوں تو تم مجھ پر ہنسو گے نہیں اور نہ ہی کسی اور کو کچھ بتاؤ گے۔“

”بے فکر رہو۔ یہ بات ہم دونوں کے درمیان ہی رہے گی۔“

”پولیس سائنس۔“ وہ منہ ہی منہ میں بولا۔ ”میں نے پولیس اکیڈمی میں داخلہ لے لیا ہے اور جلد ہی پولیس والا بن جاؤں گا۔“

”واہ، یہ تو بڑی زبردست بات ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہاں کے لوگ مجھے پولیس کی وردی میں دیکھ کر حیران رہ جائیں گے اور شاید ڈر کے مارے مجھ سے بات بھی نہ کریں۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو تمہاری موجودگی میں زیادہ محفوظ تصور کریں۔“ میری بات سن کر وہ جواب میں مسکرایا۔

”کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟“ میں نے لہجہ بھر وقت

کے بعد قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔
”کس سلسلے میں؟“ وہ تھوڑا سا حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”کیا اس قیس میں کوئی گوتھ کلب ہے؟“
”تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ اس نے مشتبه انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
”میں نے اسے ٹریس کیا کس کے قتل کے بارے میں بتایا اور کہا کہ اس کا تعلق بھی اسی نوعیت کے کسی کلب سے جوڑا جا رہا ہے۔“

”میں نے اس کی کچھ کہانیاں پڑھی ہیں۔ کیا تم اسے جانتے تھے؟“
”ہاں!“ میں نے جھوٹ بولا۔ ”میں جانتا چاہتا ہوں کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ تم مجھے بتاؤ کہ یہ کلب کہاں واقع ہے؟“
اس نے میرے لیے کافی بنائی اور بتایا کہ گزشتہ دو ماہ سے ایک پرانا چھوٹا جہاز کرسٹری آئی لینڈ پر لنگر انداز ہے اور وہیں یہ لوگ جمع ہوتے ہیں۔
”نصف شب کے بعد ایک چھوٹی کشتی تمہیں وہاں لے جائے گی۔“ اس نے کہا۔ ”میں وہاں دو مرتبہ جا چکا ہوں لیکن جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ اب میرا رجحان کسی اور جانب ہے۔“

”کشتی والے کو یہ کیسے معلوم ہوتا ہے کہ کن لوگوں کو لے کر جاتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
اس نے مجھے غور سے دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔
”وہ تمہیں ہرگز لے کر نہیں جائے گا جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ تمہارا تعلق بھی اسی کلب سے ہے۔“
میں اس سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ وہ دوسرے وہاں کیسے چلا گیا لیکن مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ ہتھے سے نہ اٹھ جائے اس لیے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم جانتے ہو کہ وہ جہاز کس کی ملکیت ہے جہاں یہ سب لوگ جمع ہوتے ہیں؟“

”وہ عمر میں تم سے بڑا ہے جبکہ وہاں آنے والے سب لوگ نوجوان ہوتے ہیں۔ وہ شخص وہاں کیڑے کی طرح ریگتا رہتا ہے جیسے اسے یقین ہو کہ وہی ڈریکولا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اب میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔
”اس کا رنگ مجھ سے بھی زیادہ سفید ہے۔ بڑے

بڑے کھیلے دانت اور ہسٹونی لہجے میں بولتا ہے۔ گزشتہ بار میں ایک انگریز لڑکی کے ساتھ وہاں گیا تھا۔ اس شخص نے پارٹی کے دوران چند چکر لگائے اور پھر غائب ہو گیا۔“
”اس کی غیر موجودگی میں پارٹی کون چلاتا ہے؟“
”دو خوب صورت لڑکیاں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اس کے علاوہ میں نے وہاں محافظوں کی موجودگی بھی محسوس کی تھی لیکن ان کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔“

”میں وہاں ضرور جاؤں گا۔“ میں نے اپنی دائرہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”ممکن ہے اس کے لیے مجھے اپنے بالوں کا رنگ تبدیل کرنا پڑے۔“
”مجھے بتاؤ کہ تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟ میں آج رات ہی وہاں جاؤں گا۔“

میں نہیں جانتا تھا کہ کوئی میرے معاملے میں ٹانگ اڑائے لیکن اس کی بات میں بھی وزن تھا۔ میں کسی طرح بھی اس پارٹی میں فٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ میری وہاں موجودگی انہیں شک میں مبتلا کر سکتی تھی۔ وہ وہاں سے غائب ہو سکتے تھے یا ممکن ہے کہ ان کے پاس مجھ جیسے صحافیوں سے منسنے کا کوئی اور طریقہ ہو۔

☆ ☆ ☆
میں نے ڈیول اسٹریٹ کے اختتام پر واقع بندرگاہ کے حصے سے اس جہاز کا جائزہ لینے کی کوشش کی جس کے بارے میں ایلیکس نے بتایا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی لمبائی ایک سو فٹ ہوگی۔ اس کا عرش بہت بڑا تھا جس کے ساتھ یقیناً ایک بڑا ہال ہوگا اور پیچھے رہائی کیبن اور انجن روم ہوگا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ میرے عقب سے ایک آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا تو پاورے تھامس کھڑا تھا۔ وہ آئر لینڈ کا رہنے والا تھا اور اس کا تعلق ایک مشنری تنظیم سے تھا لیکن وہ کسی وجہ سے اپنے مشن کو چھوڑ کر یہاں آ گیا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ بے تماشیا سرگیت پیتا اور ایک پرانی ہائیکل پر قیسمہ کا چکر لگاتا رہتا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ فرشتے اسے آنے والے حالات کے بارے میں باخبر رکھتے ہیں۔

”پاورے تھامس۔“ میں نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم یہاں کیسے؟“
”میں جانتا تھا کہ تم یہیں ملو گے۔“ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تم کیا کرنے جا رہے ہو؟“

میری مجھ میں نہیں آیا کہ اسے میرے ارادے کی بھنگ کیسے پڑ گئی۔ میں نے انجان بننے ہوئے کہا۔ ”کس بارے میں؟“
اس نے مسکراتے ہوئے جہاز کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”خوب صورت جہاز ہے۔“
”وہاں شیطان رہتا ہے۔“ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”جو لوگ کچھ کر سکتے ہیں، وہ اس معاملے کو دیکھ رہے ہیں۔“
”اب یہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔“ وہ تجویزی سے بولا۔ ”اور وقت تیزی سے نکلتا جا رہا ہے۔“

☆ ☆ ☆
اگلے روز صبح پانچ بجے میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف سے ایلیکس بول رہا تھا۔
”آدھ گھنٹے کے اندر مجھ سے ڈیویں میں ملو۔“
”ایلیکس! جانتے ہو، کیا وقت ہوا ہے؟“ میں نے نیم غصہ کی حالت میں کہا۔

اس نے زوردار تہقہ لگایا اور بولا۔ ”خون پینے والی بلاؤں کے خاتمے کا یہی وقت ہے۔ اسے ساتھ کاغذ اور پینسل بھی لیتے آنا۔ تمہارے پاس صرف آدھ گھنٹہ ہے۔“

میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور اپنی پرانی سفید جیب میں سوار ہو کر ڈیویں پہنچ گیا۔ صبح کا وقت ہونے کی وجہ سے مجھے پارکنگ میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ مجھے اندر داخل ہونا دیکھ کر کینے کا مالک رون مسکرایا۔ میں نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنی سن پندہ کافی کا آرڈر دیا اور ایلیکس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ پہلے سے ہی کافی کے گھونٹ لے رہا تھا۔

”شاید تمہیں میری بات پر یقین نہیں آیا۔“ وہ طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم کاغذ اور پینسل ساتھ لائے ہو؟“

میں نے کاغذ کا رول اور دو پینسلیں میز پر رکھ دیں۔ ہم نے ناشتے کا آرڈر دیا اور ایلیکس نے کاغذ پر لکھیں کھینچنا شروع کر دیں۔ وہ کاغذ پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

”معاملات قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔“
”وہ کیسے؟“ میں نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔
”میں نے تمہیں ان دو لڑکیوں کے بارے میں بتایا تھا۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ ”وہ میرا خون

چینا چاہ رہی ہیں۔ میں نے انہیں ایک سے زائد مرتبہ لڑکے اور لڑکیوں کی گردن اور بازوؤں سے خون پیتے ہوئے دیکھا ہے۔“ اس نے ایک کاغذ پر اپنا کام مکمل کر لیا تھا اور دوسرے پر لکھیں کھینچنا شروع کر دیں۔

”وہ جہاز پر موجود ہر شخص سے یہی کہہ رہی تھیں کہ کیا وہ ماسٹر کے لیے خون کا عطیہ دینا چاہیں گے؟ وہ اس شخص کو ماسٹر کہتی ہیں۔“

”خون کا عطیہ!“ میں چونکتے ہوئے بولا۔ ”مگر کیسے؟“

”جس طرح اسپتالوں میں خون لیا جاتا ہے۔ وہ تمہارے بازو میں سوئی پیچھیں گے اور ایک ٹکلی کے ذریعے خون ٹکلی میں منتقل ہونا شروع ہو جائے گا۔“

”کیا ان کے پاس کوئی خون لینے والا بھی ہے؟“
”یقیناً ہوگا۔“ اس نے ناشتا شروع کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں خون دینے کے لیے کشتی کے نچلے حصے میں جانا ہوگا۔“

”وہاں ایسی کیا خاص بات ہے؟“
”مجھے نہیں معلوم کیونکہ میں نے خون نہیں دیا۔ حالانکہ وہ لڑکیاں بہت خوب صورت ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں ہمیشہ انکشن لگوانے سے پرہیز کرتا ہوں اور خاص طور پر ایسی سوئی کو تو بالکل برداشت نہیں کر سکتا جو ایک سے زائد بار استعمال ہو چکی ہو۔“

اس نے پہلا کاغذ میری طرف بڑھایا۔ اس پر اس نے جہاز کے گراؤ کا نقشہ بنایا تھا۔
”میں نے اندازے سے اس کی پیمائش لکھی ہے۔ ضروری نہیں کہ تم اس پر یقین کر لو۔“ یہ کہہ کر اس نے دوسرا کاغذ بھی میری طرف بڑھا دیا جس پر اس نام نہاد ماسٹر کا خاکہ بنایا گیا تھا۔ وہ اپنے لیے کھیلے اداتوں کے ساتھ بناوٹی انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس خاکے کو دیکھ کر میرے ذہن میں ڈریکولا کا نقشہ ابھرنے لگا۔

☆ ☆ ☆
میں شریف پریل میں اور پولیس چیف رچرڈ ڈولی کے ہمراہ ایک دوسری کشتی سن سٹ کے عرشے پر کھڑا ہوا تھا جہاں سے ہمیں کرسٹری آئی لینڈ اور وہ جہاز صاف نظر آ رہا تھا۔ شریف اور پولیس چیف کے پاس ایلیکس کے بنائے ہوئے خاکوں کی نقول بھی تھیں۔ وہ جہاز ساحل سے کافی فاصلے پر لنگر انداز تھا اور شہر کی پولیس یا شریف کو اس تک پہنچنے کے لیے سمندری کشتی نیم یا کوٹ گاؤ کی مدد لینا

انہیں جہاز پر چھاپا مارنے کے لیے وارنٹ کی ضرورت تھی جو کسی ثبوت کے بغیر نہیں مل سکتا تھا۔ البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ پولیس نصف شب کے بعد وہاں جانے والوں کی نگرانی کرے۔ ان سے پوچھ گچھ کی صورت میں کسی مشتبہ فرد کی نشاندہی ہو سکتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ ان میں سے کسی کے خلاف غشیات کے استعمال یا کم عمری میں شراب نوشی کے جرم میں وارنٹ جاری کر دیا جائے۔

ہم نے اس امکان پر بھی گفتگو کی کہ کوسٹ گارڈ کے کیپٹن فنن سے جہاز کے بارے میں معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اسے سمندر میں جانے کا سرٹیفکیٹ ملا ہوا ہے؟ اور یہ کہ کیا اس کے حفاظتی آلات درست حالت میں ہیں؟ کوسٹ گارڈ کا عملہ پینکنگ کے بہانے اس جہاز پر جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی ہم نے دیگر امکانات پر غور کیا۔

شیرف نے میرا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ وہ مجھے اپنی تحقیقات سے باخبر رکھے گا۔ میں نے اس کے کہنے پر یقین نہیں کیا اور شاید اسے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ شیرف کے مقابلے میں رچرڈ مجھے زیادہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے چہرے کے تناؤ سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اس بارے میں خاصا متشکر ہے۔ کچھ یہی کیفیت میری بھی تھی۔ ایک صحافی ہونے کے ناتے میرے کچھ اصول تھے۔ اسٹوری تلاش کرو اور اسے پوری سچائی کے ساتھ سامنے لاؤ۔ اس اسٹوری کے حصول کے لیے مجھے قانون کی مدد درکار تھی اور نہ ہی ان کی پابندیاں میرا راستہ روک سکتی تھیں۔ اس کام کے لیے میں اکیلا ہی کافی تھا۔

ماسٹر کے ہسپانوی لہجے نے مجھے شک میں مبتلا کر دیا تھا چنانچہ میں اس کی اصلیت جاننے کے لیے کھوج میں لگ گیا۔ میں نے اخبارات کی فائلوں اور گوگل سے اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر میں نے اپنے ایک ذریعے کو آزمانے کا فیصلہ کیا جو اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ جنس ایک ڈرنک کے عوض مجھے اپنی کہانیوں کے لیے مواد فراہم کر چکا تھا۔

☆☆☆

باب پیرس کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ وہ اسی شہر میں پلا بڑھا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی غیر قانونی دھندوں میں مصروف رہا لیکن اپنا کام بڑی ہوشیاری سے کرتا تھا۔ اس لیے کبھی پولیس کی نظروں میں نہیں آیا۔ انگریزوں اور کشتی کی

دوڑ میں حصہ لینے والوں سے اس کے خصوصی تعلقات تھے۔ میں نے اسے ایک بار میں آنے کی دعوت دی اور اس کی خاطر تواضع کرنے کے بعد پناہ عیاں کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے ایک شخص کے بارے میں معلومات درکار ہیں اور میرے خیال میں تم یہ کام بہتر طور پر کر سکتے ہو۔“

باب نے مشتبہ انداز میں مجھے دیکھا اور مسکرایا۔ میں نے ایلکس کی بنائی ہوئی تصویر اس کے سامنے رکھ دی جسے دیکھتے ہی وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”ڈریکولا۔“

”اس کے ٹیکلے دانتوں کو بھول جاؤ۔ یہ بتاؤ کہ اس چہرے کو پہچانتے ہو؟“

”دیکھنے میں تو آدمی کا بچہ ہی لگتا ہے۔“ وہ تصویر مجھے واپس کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن یہ ہے کون؟“

”یہی تو میں جانا چاہتا ہوں۔“

”کیوں؟“ اس نے اپنے اطمینان کے لیے پوچھا کیونکہ وہ اتنی جلدی کسی پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔

”اگر مجھے اس کا پس منظر معلوم ہو جائے تو ایک بہت اچھی اسٹوری بن سکتی ہے۔“

”میں نہیں ایک کہانی سنا ہوں۔“ اس نے بیڑ کا طویل گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”یہاں ایک ایسا شخص بھی ہے جو کیوبا سے مہاجرین کو لے کر آتا ہے۔ تم اسے چھوٹے سے جہاز کا کپتان کہہ سکتے ہو۔ یہ سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب اس کی گرل فرینڈ نے اپنے خاندان کو یہاں لانے کی فرمائش کی۔ پھر کسی اور نے مقبول معاوضے کے عوض اپنے رشتے داروں کو یہاں لانے کے لیے کہا۔ اس کے بعد اسے چیموں کا لالچ ہو گیا اور وہ پوری طرح اس کام میں ملوث ہو گیا۔“

میں سمجھ گیا کہ یہ اسی کی کہانی ہے جسے وہ اپنے انداز میں سنا رہا ہے لیکن میں نے دل انداز کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”ایک روز کسی شخص نے اس سے رابطہ کیا اور اپنے کام کے لیے بھاری معاوضے کی پیشکش کی۔“ وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم سمجھ سکتے ہو کہ ایسی پیشکش کسی ناجائز کام کے لیے ہی کی جاتی ہے۔“

”ظاہر ہے۔“ میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”کپتان نے ایک اصول یہ بنا رکھا تھا کہ وہ صرف لوگوں کو لے کر آتا تھا اور ان کے ساتھ کوئی قاتل سامان نہیں ہوتا تھا لیکن زیادہ چیموں کے لالچ میں آکر وہ اپنا اصول

توڑنے پر تیار ہو گیا۔ اس شخص کی ہدایت کے مطابق وہ ایک مخصوص دن، ایک مخصوص بار میں کچھ لوگوں سے ملا جو کیوبا کی بندرگاہ میرینا ٹینگو پر واقع ہے اور انہیں اپنے ساتھ لے کر چند گھنٹوں بعد سر لینڈ بیچ گیا۔ تم جانتے ہو کہ کسی کیوبا کے باشندے کے لیے سوٹ کیس کے ساتھ اس بندرگاہ کی چیک پوسٹ سے گزرنا مشکل ہے؟“

”میرے خیال میں تو یہ ناممکن ہے۔“ میں نے کہا۔

”بہر حال، سر لینڈ بیچ کر ملاقات ایک اور شخص سے ہوئی جو ایک دین میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کپتان کو معاوضے کی بقدر نصف رقم ادا کی اور اس طرح یہ مشن مکمل ہو گیا۔“

”اچھی کہانی ہے لیکن اس کا اس بندے سے کیا تعلق جتا ہے؟“ میں نے تصویر والا کاغذ لہراتے ہوئے کہا۔

”کپتان نے اس کے بعد بھی اس شخص کے لیے چند اور چکر لگائے۔ پھر ایک روز کپتان سے کہا گیا کہ اسے اس بار صرف ایک آدمی کو لے کر آنا ہے اور اس کام کے عوض اسے پوری کشتی کے مسافروں کے کرائے کے برابر معاوضہ دیا جائے گا۔ کپتان یہ سن کر حیران رہ گیا کہ اتنے چھوٹے سے کام کے لیے اتنا بھاری معاوضہ کیوں دیا جا رہا ہے۔“

اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”اگر ڈریکولا کے چہرے پر لمبے دانتوں کے بجائے مونچھیں بنا دی جائیں تو یہ اس شخص سے ملتی جلتی تصویر کہلا جائے گی۔“

”یہ کتنی پرانی بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”شاید دو سال یا اس سے بھی زیادہ۔“

”کپتان نے بھی اس بارے میں سوچا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”اب تم مجھ سے پوری کہانی سنا چاہ رہے ہو۔ کیونکہ میں جانتے تھے کہ کپتان کو ہسپانوی زبان آتی ہے لہذا وہ اس کی موجودگی میں بھی آپس میں بے تکلفانہ گفتگو کرتے تھے۔ ان کی باتوں سے کپتان کو اندازہ لگانے میں یہ دشواری نہیں ہوئی کہ یہ لوگ اس شخص کے احسان مند تھے۔ وہ ان سے کوئی معاوضہ نہیں لیتا تھا البتہ اس کے عوض وہ اسے اپنا ایک گروہ دینے پر تیار ہو جاتے تھے۔ اس کام کے لیے ڈاکٹر بھی کیوبا سے ہی آیا تھا۔“

”کپتان نے آخری بار کیوبا کا چکر کب لگایا تھا؟“

”ایک سال ہو گیا۔“ اس نے بیڑ کا آخری غونٹ لیتے ہوئے کہا۔

”کیا کپتان کو معلوم ہے کہ اس ڈاکٹر سے کیسے رابطہ کیا جاسکتا ہے؟“

”اس کا نام تو معلوم نہیں لیکن کپتان کی یادداشت بہت اچھی ہے۔ وہ اسے دیکھتے ہی پہچان لے گا۔ گوکہ اس نے احتیاط کے طور پر دین کی نمبر پلیٹ بھی اتار دی ہے لیکن وہ ایک چھوٹے اسپتال کے نام پر رجسٹرڈ ہے۔“

”ان معلومات کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔“

”صرف شکریہ سے کام نہیں چلے گا۔“ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”کھانا کھاؤ۔ مجھے بہت زور کی بیجوک لگی ہے۔“

کھانے کے دوران میں، میں نے باب سے اسپتال کا نام، پتا اور فون نمبر معلوم کر لیا۔ باقی معلومات گوگل سے حاصل کی جاسکتی تھیں۔ اتنا تو اندازہ ہو گیا کہ اس اسپتال کا تعلق کسی نہ کسی طرح اس کشتی سے تھا۔ اب مجھے اس کی تفصیلات جانا تھیں۔

☆☆☆

مجھے یہ ساری معلومات رچرڈ یا شیرف پرل میں کو بتا دینی چاہیے تھیں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا بلکہ خود ہی گوگل سے اسپتال کے اسٹاف کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں۔

پاور سے تھامس سے میری ملاقات ایک بار میں ہوئی جسے میں نے اپنے کام کے سلسلے میں بلا یا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ”مائیک! وقت تیزی سے گزرتا جا رہا ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے اسپتال کے میڈیکل اسٹاف کی فہرست والا کاغذ اس کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ”گوکہ ہمارے کام کی رفتار سست ہے لیکن تھوڑی بہت پیش رفت ہوئی ہے۔“

”کیا یہ ٹریسی کے کاغذات ہیں؟“ اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں ٹریسی کے کاغذات کس طرح حاصل کر سکتا تھا؟“

”میں نے سوچا کہ شاید تم اس کے گھر گئے ہو گے۔“ اس کے الفاظ سن کر میں چونک پڑا۔ ”کیا تم جانتے ہو کہ وہ کہاں رہتی تھی؟“

”ہاں۔“ اس نے اپنا سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔

”وہ جب پہلی بار یہاں آئی تو میں نے اس سے رابطہ کیا

کبھی کبھی وہ اسی طرح حیران کر دیتا تھا جس سے سامنے والا یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا کہ واقعی اس کے قبضے میں جنت ہیں جو اسے پل پل کی خبریں دیتے رہتے ہیں۔ میں نے اس پر اپنی حیرانی ظاہر نہیں ہونے دی اور کہا۔

”کیا وہ پرانے شہر میں رہتی تھی؟“

”ہاں، قبرستان سے دو بلاک کے فاصلے پر اس کا کنبچ ہے۔“

☆☆☆

دو کروڑ پر مشتمل یہ کنبچ انجیلا اسٹریٹ پر واقع تھا۔ مجھے اس کا تالا کھولنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ لیونگ روم کا کنبچ بھی مکان کی طرح پرانا ہی تھا۔ دوسرے کمرے کو ٹریسی نے اپنا دفتر بنایا ہوا تھا۔ میز پر اس کا لیپ ٹاپ رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس کا بین دبایا تو اسکرین پر ٹریسی کی تصویر نمودار ہوئی۔

”ہم یہاں کس چیز کی تلاش میں آئے ہیں؟“

تھامس نے دروازے میں کھڑے کھڑے پوچھا۔

میں کوئی جواب دینے کے بجائے ٹریسی کی میز پر بیٹھ گیا اور لیپ ٹاپ کا بین دبا کر مختلف فائلیں دیکھنے لگا لیکن مجھے مایوسی ہوئی کیونکہ وہ سب اس کی کتابوں سے متعلق تھیں۔

”ہمیں اس کی یو ایس بی تلاش کرنی چاہیے۔“ میں نے میز کی درازنٹولے ہوئے کہا۔

”ممکن ہے کہ وہ اس کے پرس میں ہو۔“ تھامس نے خدشہ ظاہر کیا۔

”میں نہیں جانتا لیکن اس نے اپنا مواد ایک دو جگہ ضرور محفوظ کیا ہوگا۔ ممکن ہے کہ احتیاط کے طور پر اس نے اسے کہیں چھپا دیا ہو۔“

ہم نے کھرکی ایک ایک چیز کھنگال ڈالی۔ یہاں تک کہ تھامس نے یکن میں رکھی ہوئی خالی بوتلیں، جارا اور برتن بھی دیکھ ڈالے لیکن مطلوبہ شے کہیں نہیں ملی۔ پھر اچانک ہی تھامس نے بیڈ روم کے سرہانے رکھا ہوا لائٹر اٹھایا اور اس سے سگریٹ سلگانے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ کام نہیں کر رہا تھا۔

”شاید اس کی گیس ختم ہو گئی ہے۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا اور ماچس سے سگریٹ سلگائی۔

میں نے اس کے ہاتھ سے لائٹر لے کر اسے کھولا۔ ایک چھوٹی سی یو ایس بی اس کے اندر رکھی ہوئی تھی۔ میں

نے سرت آ میر نگرہ لگایا۔ ”مل گئی۔“

میں نے وہ یو ایس بی لیپ ٹاپ میں لگائی اور ٹریسی کی فائلوں کو دیکھنے لگا۔ ٹریسی نے تمام نوٹس بڑی تفصیل سے درج کیے تھے۔ ان میں تاریخ، معلومات کا ذریعہ اور کس مقصد کے لیے معلومات حاصل کی گئیں، سب کچھ موجود تھا۔ میں اس کے کام سے بہت متاثر ہوا۔ پھر مجھے اس اسپتال کے بارے میں بھی مواد مل گیا جو ٹریسی نے خفیہ طور پر حاصل کیا تھا۔ وہ جانتا چاہ رہی تھی کہ ماسٹر کی ڈور کون بلا رہا ہے اور یہ کہ وہ ان جسمانی اعضا کا کیا کرتا ہے۔ اسے شبہ تھا کہ یہ کوئی حیوانی رسم ہے۔

”تھامس! تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے لیپ ٹاپ بند کیا اور یو ایس بی اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

”وہ اس شیطان کے قریب پہنچ چکی تھی لیکن اس نے اسے مار ڈالا۔“

”یہ ایک فرد کا کام نہیں بلکہ پورا گروہ اس میں شامل ہے۔“ میں اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”اور نہ ہی میں اسے دھیان نہ رہتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ کوئی گمراہ ڈاکو یا کاروبار ہے۔ یہ لوگ گروے کی طرح کچھ کام رہے ہیں۔“

☆☆☆

اپنی شہتی پرواہیں آ کر میں نے ایک بار پھر ٹریسی کی یو ایس بی لیپ ٹاپ میں لگائی اور اس میں سے اپنے مطلب کے کچھ پریش نکال لیے اور عرشے پر جا کر انہیں بڑھنے لگا۔ ٹریسی نے جو کچھ لکھا تھا، اس میں اپنی معلومات کو جمع کیا تو میں کسی نتیجے پر پہنچنے کے قابل ہو گیا۔

پولیس کا کہنا تھا کہ کسی ثبوت کے بغیر وہ جہاز پر چھاپا نہیں مار سکتے۔ مجھے کسی وارنٹ یا تلاشی کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے تو صرف وہاں تک پہنچنے کے لیے راستہ چاہیے تھا تا کہ میں اپنے شک کو حقیقت کا رنگ دے سکوں۔

”تم اس وقت باہر کھڑے کیا کر رہے ہو؟“ ایلکس نے پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے پوچھا۔

میں ان نوٹس کو پڑھتے وقت اپنے گروڈیش سے غافل ہو گیا تھا اس لیے جو کچھ بتا دیا۔ ”کچھ نہیں، بس یونہی کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا۔ تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”میں شہر سے آ رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”کوئی خاص بات معلوم ہوئی؟“

”نہیں لیکن میں اس پر کام کر رہا ہوں۔“

”میری مدد کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔“

یہ کہہ کر وہ کشتی پر آ گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ماسٹر کے جہاز پر جانا چاہتا ہوں۔ کیا وہ اس کے لیے کوئی راستہ نکال سکتا ہے تاکہ میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر جہاز کے نچلے حصے میں جا سکوں۔

”انجمن روم کے برابر میں ہی ایک تہ خانہ ہے جہاں سامان رکھا جاتا ہے اس لیے وہاں جانے کے لیے انجمن روم میں کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہوگا۔ یہ تہ خانہ ان سٹور روم کے عقب میں ہے۔ میں نے وہاں کوئی تالا نہیں دیکھا لیکن ممکن ہے کہ وہ اندر سے بند رہتا ہو۔“

”وہاں روشنی کا کیا انتظام ہے؟“

”کمروں کی کھڑکیوں سے آنے والی روشنی ہی کافی ہے۔ تاہم لنگر کی جانب بھی ایک لائٹ لگی ہوئی ہے۔ شاید انہیں یقین ہے کہ باہر کا کوئی شخص اس کشتی پر نہیں آ سکتا۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں مسکراتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

میرا منصوبہ بہت سادہ تھا البتہ اس کا مشکل حصہ وہ تھا جب میں عرشے پر پہنچ جاتا۔ ایلکس میری مدد کرنے کے لیے بہت بڑبڑاتا لیکن میں نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ گوکہ کوئی مشکل پیش آنے کی صورت میں اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ میں نے اپنے ایک دوست برٹ کو فون کر کے کہہ دیا کہ وہ مجھے جہاز تک پہنچانے کے لیے ایک چھوٹی کشتی لے کر آجائے جبکہ ایلکس نے اپنے لیے اسی کشتی کا انتخاب کیا جس کے ذریعے وہ پہلے بھی جہاز پر جا چکا تھا۔

رات ڈیڑھ بجے کے قریب برٹ نے مجھے اپنی کشتی کے ذریعے جہاز تک پہنچا دیا اور جوہنی ایلکس نے سب ٹھیک ہے کا سگنل دیا تو میں جہاز سے نکلتی ہوئی ری کی سیڑھی کے ذریعے عرشے پر پہنچ گیا۔ میں نے سر سے پاؤں تک سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ بیروں میں ٹین شوز اور سر پر ٹوپی بھی لگائی تھی۔ میرے پاس ایک خود کار یو ایو، چھوٹی ٹارچ اور انجمن روم کا دروازہ کھولنے کے لیے ایک سلاخ بھی تھی۔

میں دے پاؤں انجمن روم کے دروازے کی جانب بڑھا۔ وہاں اتنی روشنی تھی کہ مجھے اپنا کام کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور کمروں سے موسیقی کی آواز آرہی تھی۔ میں نے سلاخ کی مدد سے آسانی تالا توڑ دیا۔ اس کے دو بولٹ زمین پر گر گئے جن کی آواز پیدا ہوئی۔ کوئی بھی اس جانب متوجہ ہو سکتا تھا۔ میں کچھ دیر دم

سادھے کھڑا رہا اور جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ کسی نے یہ آواز نہیں سنی تو دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اب مجھے تاریک انجمن روم میں راستہ تلاش کرنے کے لیے ٹارچ کی ضرورت تھی۔ وہاں سے ایک دروازہ جہاز کے ہال وے اور کمروں کی جانب کھلتا تھا۔ ہال وے کے دونوں جانب دو اور اس کے اختتام پر ایک دروازہ تھا۔ سیلون کو جانے والی سیڑھیوں کے پاس لوگوں کے باتیں کرنے کی اور موسیقی کی آوازیں آرہی تھیں۔

مجھے ابھی تک یقین نہیں تھا کہ یہاں کیوں آیا ہوں لیکن میں جانتا تھا کہ ایک بار مجھے اپنا نشان کار مل گیا تو اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگے گی۔ اور ایک بار میں نے ثبوت فراہم کر دیا تو تلاشی کے وارنٹ کے حصول میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی، تاہم یہ معلوم نہیں تھا کہ مجھے کیا ثبوت چاہیے۔ میں اور ٹریسی دونوں ہی اس حوالے سے شک میں مبتلا تھے۔

میں نے انجمن روم کے قریب ترین دروازے کو کھولنے کی کوشش کی۔ وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں دو برتھیں لگی ہوئی تھیں۔ پھر میں نے ہال کے اختتام پر واقع دروازہ کھولا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے ٹول کر دیوار پر نصب سوئچ تلاش کیا اور دوسرے ہی لمحے کمر روشن ہو گیا۔

میرے سامنے وہ ثبوت موجود تھا جس کی پولیس کو ضرورت پڑ سکتی تھی۔

اس بڑے کمرے کے وسط میں بستر پر ایک نوجوان شخص کھنکھناتے ہوئے لیٹا ہوا تھا۔ اس نے اپنا روبرو نکال کر دروازہ بند کر دیا۔ کمرے کا بغور سے جائزہ لینے پر اندازہ ہوا کہ دو چھوٹے کمروں کو ملا کر اسپتال کی طرز پر ایک بنایا گیا ہے جس میں لوہے کی الماریاں، چھت میں لگے بلب، آبی دی اسٹینڈ اور مختلف ٹرے رکھی ہوئی تھیں۔ اس بڑے کے بستر کے پاس دی کی دھڑکن دیکھنے کے لیے ایک مانیٹر لگا ہوا تھا اور اسٹینڈ پر لگی گلوکز کی بوتلی سے پتا چل رہا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ میں نے اس کی تسلی بخش حالت دیکھ کر وہ سوئی نکال دی جس کے ذریعے اسے گلوکز دیا جا رہا تھا۔ وہ یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اگر اس کے دل کی دھڑکن رک جاتی تو مانیٹر کا الارم بج اٹھتا اور کوئی نہیں بیٹھا اس کی نگرانی کر رہا ہوتا تو معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ میں نے وقتی طور پر اسے تنہا چھوڑ دیا اور وہاں سے ہٹ گیا۔ اس خیال کے آتے ہی میں پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے چھت اور دیواروں پر نظر دوڑائی لیکن مجھے وہاں کوئی کسر نظر نہیں آیا۔

میں نے دو تین بار اس کے چہرے کو تھپتھپایا لیکن اس

نے کوئی حرکت نہیں کی۔ اس کے سیاہ کپڑے سیٹے سے تڑکے کرسی پر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے جیبوں کی تلاشی لی لیکن کوئی بنا برآمد نہیں ہوا۔ صرف چند ڈالر اور تھوڑے سے سکے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے چھت پر لگی لائٹ آف کر کے ہاتھ روم کی جلی جلا دی تاکہ دروازے سے روشنی باہر نہ جا سکے۔

میں نے رچرڈ کو فون کر کے سوتے سے جگا دیا۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں کہاں ہوں اور میں نے کیا دیکھا ہے تو وہ ناراض ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ فکر بھی تھی کہ وہ میری مدد کے لیے پولیس نہیں بھیج سکتا تھا۔ بہر حال، اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ فوراً ہی شیف پرل مین اور کوسٹ گارڈ کے کپٹن فون کو فون کر رہا ہے، وہی اس سلسلے میں کچھ کر سکیں گے۔

میں نے کمرے کا دروازہ کھول کر راہداری کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ واپس آکر دوبارہ اس لڑکے کے گال چھپتے پائے لیکن اس نے ڈرا سی بھی حرکت نہیں کی۔ میں اسے اٹھا کر اوپر نہیں لے جا سکتا تھا کیونکہ وہ خاصا وزنی تھا۔ البتہ اسے انجن روم میں ہی کئی جگہ چھپایا جا سکتا تھا تاکہ وہ ماسٹر اور اس کے چیلوں سے محفوظ رہے۔

میں نے انجن روم کے ساتھ بنے ہوئے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اس میں ایک بستر، ٹی وی اور چھوٹا سا میز بیو موجود تھا۔ پھر میں نے اس لڑکے کے کپڑے اٹھائے اور اسے اپنے کندھے پر لا کر اس کمرے میں پہنچا دیا اور خود عرشے پر چھپ کر کوسٹ گارڈ کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ پھر میں دوبارہ کمرے میں گیا اور وہاں کی لائٹ جلا دی۔

”تم کون ہو؟“

کمرے کے وسط میں بستر کے پاس ماسٹر کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ وہ دبلا پتلا، طویل قامت اور سیاہ لباس میں ملبوس تھا اور جب وہ بولا تو مجھے اس کے نکیلے دانت دکھائی دیے۔ یہ منظر میرے لیے ناقابل یقین تھا۔

میں نے ریو اور نکال کر اسے اپنے نشانے پر لے لیا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بے ہوش لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”تم اسے بچانے کے لیے یہاں آئے ہو؟“

”لو لڑکے سے دور رہو۔“ میں نے اس پر ریو اور نشانے ہوئے کہا۔

وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور زہریلی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے بولا۔ ”تم اس کے اس طرح لے جا سکتے ہو۔ میرے

آدمی تمہارا راستہ روکیں گے اور جہاز پر موجود دوسرے اہلحق بھی ان کا ساتھ دیں گے۔ تمہارا راج کھٹنا بہت مشکل ہے۔“

”ہم تینوں کو سٹ گارڈ کے آنے تک یہیں رکھیں گے۔“ میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے بعد میں تمہیں ان کے حوالے کر دوں گا۔“

”کیا وہ آرہے ہیں؟“

”ہاں، میں نے انہیں بلانے کے لیے فون کر دیا ہے۔“

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”تم دونوں کے ساتھ اور بھی کئی لوگ مارے جائیں گے۔“

”میں تمہاری دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ اپنی جگہ خاموش کھڑے رہو۔“

”میرے لوگ اس کمرے کی نگرانی کر رہے ہیں اور جانتے ہیں کہ ایسی صورت حال میں انہیں کیا کرنا ہے۔“ وہ عیاری سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم مجھے مار ڈالو گے؟ اب مجھے اس جسم کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا ساتھ نہیں دے سکتا۔“ وہ میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”ڈرا سو گھو۔“

”مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔ میں نے اسے وارننگ دی۔“ درندہ کوئی مار دوں گا۔“

”مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تم سمیت بہت سے لوگ اس آگ میں جل کر مر جائیں گے۔“

وہ میری طرف آ رہا تھا۔ میں نے اسے روکنے کے لیے ایک فائر کیا لیکن وہ نہیں رکا۔

”تمہیں اپنا نشانہ بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔“ اس نے اپنے نکیلے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کے سینے میں دو گولیاں اتار دیں لیکن وہ مسکرا تا رہا۔

”ہم بہت جلد ملیں گے۔“ اس کی آواز بہت صاف اور واضح تھی پھر وہ عرش پر گرا اور مر گیا۔

میں نے یہ دیکھنے کے لیے دروازہ کھولا کہ فائر کی آواز سن کر کہیں کوئی اس طرف تو نہیں آ رہا۔ مجھے کمرے سے لوگوں کے چلانے اور دھواں اٹھنے کی بو محسوس ہوئی۔ میں نے جلدی سے اس لڑکے کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور تیزی سے بیڑھیوں کی جانب بڑھا۔ میرے ایک ہاتھ میں ریو اور تھا تاکہ اگر ماسٹر کے آدمی مجھے روکنے کی کوشش کریں تو ان کا مقابلہ کر سکوں۔ بہت سے لڑکے بیڑھیاں اتر کر نیچے آ رہے تھے۔ ایلیکس بھی ان میں شامل تھا۔

”انہوں نے ہمیں کمرے میں بند کر دیا تھا۔“ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم نیچے ہو۔“

میں نے اسے بتایا کہ کوسٹ گارڈ والے پہنچنے ہی والے ہیں اور پوچھا کہ ماسٹر کے ساتھی کہاں ہیں۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ اس نے جواب دیا اور ان لڑکوں اور لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگا جو ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے ایک لڑکے کا بازو پکڑ کر پوچھا۔ ”کیا تم نے یہاں کوئی آگ بجھانے والا دیکھا ہے؟“

اس نے مجھے دکھا دیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ عرشے پر آگ کے شعلے اٹھتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور کمرے میں دھواں داخل ہونے لگا تھا۔

”اسے لے جاؤ۔“ میں نے بے ہوش لڑکے کا بوجھ ایلیکس کے کندھوں پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے آگے بڑھ کر دروازے کا شیشہ توڑ دیا تاکہ لوگوں کو باہر نکلنے کا راستہ مل سکے۔

”فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔“ میں نے چلاتے ہوئے کہا۔

آگ کے شعلے تیزی سے عرشے پر پھیل رہے تھے۔ میں نے ایلیکس سے کہا۔ ”برٹ کی شقی نیچے موجود ہوگی۔ تم اس لڑکے کو لے کر اس میں سوار ہو جاؤ۔“

”پھر تم کیا کرو گے؟“

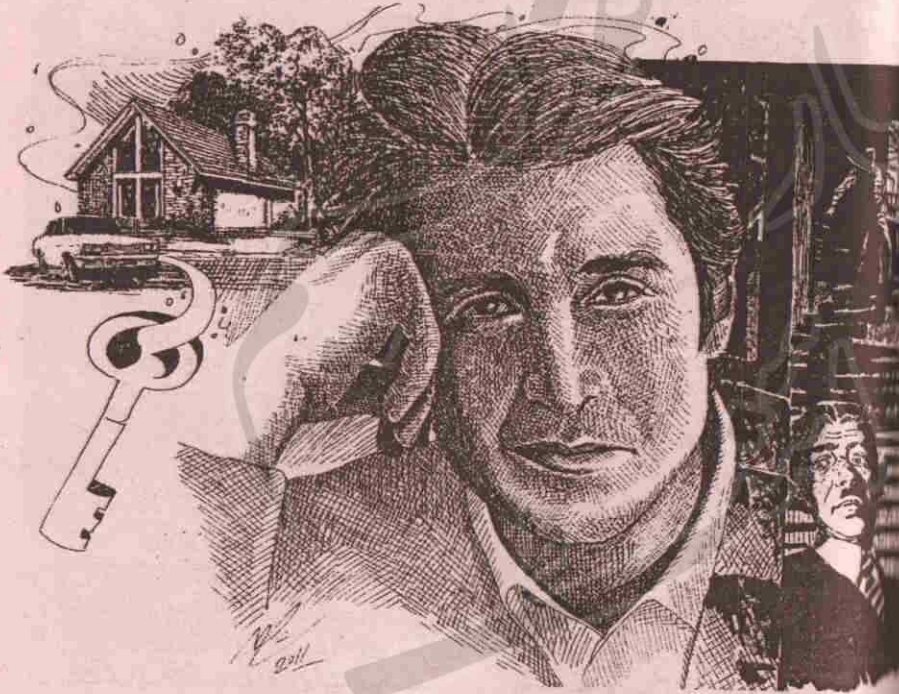
”میری فکر چھوڑو۔ پہلے اسے بچاؤ۔“ ایلیکس نے کچھ تامل کیا۔ شاید وہ مجھے اس صورت حال میں چھوڑ کر جانا نہیں چاہ رہا تھا لیکن میں اسے دھکیلتے ہوئے جہاز کے دائیں حصے کی جانب لے گیا جہاں نیچے جانے کے لیے سیڑھی موجود تھی۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ ایلیکس اس لڑکے کو لے کر برٹ کی شقی تک پہنچ چکا ہے تو میں واپس جہاز کے اندرونی حصے کی طرف آ گیا۔ سیلون میں دھواں بھر گیا تھا اور میرے کانوں میں ان لڑکوں اور لڑکیوں کی آوازیں آرہی تھیں جو مدد کے لیے پکار رہے تھے لیکن دھوئیں کی دیر چادر کی وجہ سے میں انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میری آنکھوں میں پانی بھر گیا اور سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔ میں ریٹکتا ہوا دھوئیں سے دور ہونے کی کوشش کرنے لگا۔

میرا پورا جسم جھل گیا تھا اور کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ اب میں عرشے کے اس کونے پر کھڑا ہوا تھا جو ابھی تک آگ سے محفوظ تھا۔ میرے چاروں طرف آگ کے شعلے

صبح بخیر سریم کے حنان

بقائے زندگی کی جنگ پر شخص کا بنیادی حق ہے... اس شخص کو بھی یہی کنہن صورت حال درپیش تھی... اپنے آپ کو اس دلدل سے نکالنے کے لیے اس نے ہر راہ سے گزر جانے کا حتمی فیصلہ کر لیا...

اس شخص کا ماجرا جس نے حصول مقصد کے لیے طویل انتظار کیا تھا



ہے۔ اسے منانے میں بہت وقت اور رقم خرچ کرنا پڑتی ہے اس لیے میری کوشش ہوتی ہے کہ اسے خفا ہونے کا موقع نہ دوں۔
میرا تعلق میامی پولیس ڈیپارٹمنٹ کے ہوی سائڈ اسکوڈ سے ہے۔ صبح میں اور میرے ساتھی فارغ بیٹھے تھے۔ یعنی کسی طرف سے مرنے مارنے کی کوئی اطلاع نہیں آئی

اس روز مجھے گھر جانے کی جلدی تھی کیونکہ آج روزی کی سالگرہ تھی اور ہم اسے منانے کے لیے باہر جا رہے تھے۔ روزی میری بیوی ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں لیکن اس سے تھوڑا ڈرتا بھی ہوں۔ وہ غصے کی تیز ہے، خاص طور سے اگر میری طرف سے کوئی کوتاہی ہو جائے تو اس کا غصہ دیکھنے والا ہوتا ہے۔ ایک بار وہ ناراض ہو جائے تو بڑی مشکل سے مانتی

”لیکن وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کر رہا تھا۔ لوگ اپنی مرضی سے گردے نہیں عطیہ کرتے تھے بلکہ وہ اس طرح ان سے غیر قانونی طور پر اس پر کالانے کا معاوضہ لیتا تھا۔“
”مجھے تمہاری بات پر یقین ہے لیکن ہم اسے ثابت نہیں کر سکتے۔“

”اس لڑکے کے بارے میں کچھ معلوم ہوا جو مجھے وہاں ملا تھا؟“

”اسے کچھ یاد نہیں۔ بس اتنا جانتا ہے کہ ان لڑکیوں کے ساتھ اندر گیا تھا اور جب آگے کھلی تو اس نے اپنے آپ کو تمہاری شہتی میں پایا۔ بہر حال، اب وہ گھر جا چکا ہے۔“

کچھ لمحے خاموشی رہی پھر رچرڈ بولا۔ ”مائیک! تم نے بہت سی زندگیاں بچائی ہیں۔ اس کے لیے میں ذاتی طور پر تمہارا احسان مند ہوں۔“

”کیا میں اس کے کمپیوٹر سے حاصل ہونے والی معلومات دیکھ سکتا ہوں تاکہ ٹریسی کے کاغذات سے ان کا موازنہ کر سکوں؟“

”فی الحال کوسٹ گارڈ والے معاملے کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ شاید فن اور پریل میں تم سے بھی اس روز پیش آنے والے واقعات کے بارے میں پوچھ گچھ کریں کیونکہ تمہاری گولی سے ہی ماسٹر ہلاک ہوا تھا۔“

یہ کہہ کر اس نے میرا شانہ تھپتھپایا اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد پاورے تھامس میرے پاس آیا۔ وہ کچھ فکر مند نظر آ رہا تھا جبکہ میرے خیال میں تو اسے خوش ہونا چاہیے تھا۔

”تم اتنے اداس کیوں ہو؟“ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس شیطان نے کہا تھا کہ وہ تم سے جلد ہی ملے گا۔ یہی بات مجھے پریشان کر رہی ہے۔“

”میں نے اسے مار دیا ہے۔ اب وہ کبھی نظر نہیں آئے گا۔“

”تم شیطان کو نہیں مار سکتے مائیک!“ وہ ننہیدگی سے بولا۔ ”وہ کسی اور شکل میں واپس آ سکتا ہے۔ وہ کہہ چکا ہے کہ تم سے جلد ملے گا۔“

”اور تم نے اس پر یقین کر لیا؟ میں نہیں تو میری جگہ کوئی اور اس شیطان کا مقابلہ کرنے کے لیے موجود ہوگا۔ ٹیکل اور پی کی جنگ ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گی۔“

نظر آ رہے تھے اور میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ جس طرح جہاز پر آیا تھا، اسی طرح واپس لوٹ جاؤں۔ میں عرصے کی رینک پر چڑھا اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔ ”تم نے آئے میں بہت دیر لگا دی۔“ برٹ مجھے دیکھ کر چلایا۔ اس نے مجھے چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے کئی کومیرے قریب لے آیا جو پہلے ہی خوف زدہ بچوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس دوران میں آگ بجھانے والی مشین بھی پہنچ چکی تھی جبکہ دوسری کشتیاں زندہ رہ جانے والوں کو تلاش کر رہی تھیں۔

☆☆☆

اس حادثے میں ماسٹر سمیت نو افراد مارے گئے جن میں سے چھ بچے مل کر اور دو ڈوب کر ہلاک ہوئے جبکہ ماسٹر کی موت میری گولی سے ہوئی تھی۔ اس واقعے کے چند روز بعد میں پولیس چیف رچرڈ اور پاورے تھامس کے ساتھ ساحل پر کھڑا جہاز کے محلے ہوئے ڈھانچے کو دیکھ رہا تھا۔

”یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون تھا؟“ رچرڈ کا اشارہ ماسٹر کی جانب تھا۔ انھیں کے نشانات بھی نہیں مل سکے۔ البتہ ہم نے اس کے کمپیوٹر سے کچھ معلومات حاصل کی ہیں اور ایف بی آئی کے لوگ ایورگڈ ٹیکنک کے عملے سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔“

”اس کے چیلوں اور ان دو لڑکیوں کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟“ میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا انہوں نے ہی وہاں سے فرار ہوتے ہوئے آگ لگائی تھی؟“

”اس بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔“ رچرڈ نے کہا۔ ”ہمارا اندازہ یہی ہے کہ وہ آگ لگنے سے پہلے ہی جہاز سے جا چکے تھے کیونکہ تمام لاشوں کی شناخت ہو چکی ہے اور وہ سب نوجوان طالب علم تھے۔ اس لیے یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ ماسٹر کے آدمیوں نے ہی فرار ہونے سے پہلے آگ لگائی ہوگی۔“

”کمپیوٹر سے کیا معلومات حاصل ہوئیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ان میں کوئی ایسی بات نہیں جسے ہم اس کے خلاف استعمال کر سکیں۔“ رچرڈ نے بے بسی سے ہتے ہوئے کہا۔ ”پھر وہ سب کیا ہو رہا تھا؟“ میں نے دوبارہ سوال کیا۔

”وہ ان نوجوانوں کے خون کو جسمانی اعضا کا عطیہ دینے والوں کے لیے استعمال کرتا تھا اور یہ کوئی غیر قانونی کام نہیں ہے۔ آپ کسی کوئی ایسا گروہ عطیہ کر سکتے ہیں۔“

تھی۔ پوش خوش تھا، اس نے لچ کے دوران میں مجھ سے کہا۔
 ”شکر ہے کسی نے صبح جیج کل ہونے کی کوشش نہیں کی۔“
 میں نے اس سے اختلاف کیا۔ ”حالانکہ صبح کا وقت ہی
 ایسے کاموں کے لیے بہترین ہے، دیکھو ہم تازہ دم ڈیوٹی پر
 آتے ہیں اور اگر بھاگ دوڑ کرنی پڑ جائے تو کوئی مشکل نہیں
 ہوتی۔“

پوش نے مصنوعی جھانسی لی۔ ”مجھے تو بہت ہوتی ہے اور
 میری خواہش ہے جس نے بھی غیر طبعی موت مرنا ہو وہ شام یا
 رات کو مرے۔“

تو جوان پوش میرا پانٹو تھا۔ عمر میں مجھ سے دس سال کم تھا
 اور غیر شادی شدہ بھی تھا۔ اس لیے زندگی اس کے لیے بہت
 آسان تھی۔ مجھے شام کے وقت کام کرنا بہت کھلتا تھا۔ دوپہر
 کے بعد میں دعا مانگنے لگا کہ اب کوئی کام نہ آئے۔ ورنہ شام
 غارت ہو جاتی تھی۔ دیر سے گھر جاتا تو روزی کا پھولا منہ دیکھنا
 پڑتا۔ ہماری ڈیوٹی شام چھ بجے ختم ہو جاتی اور اس کے بعد میری
 بلا سے کچھ بھی ہوتا رہے۔ چار بجے میں دعا مانگ رہا تھا کہ باقی
 وقت بھی خیریت سے گزر جائے مگر اس روز دعا قبول نہیں
 ہوئی۔ میں کافی لینے کی نیت سے اٹھا تھا کہ لیفٹیننٹ کارل کی
 طرف سے بلاوا آ گیا۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ کوئی اطلاع آگئی
 تھی ورنہ کارل مجھے طلب نہ کرتا۔ میں بوجہل قدموں سے اس
 کے دفتر پہنچا تو میرا ساگی اور جوڑی دار پوش وہاں پہلے سے
 موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کارل نے کہا۔

”پال فوراً دو سوئس مارٹھ ویسٹ میاں پہنچ جاؤ۔“
 ”وہاں کیا ہوا ہے؟“ میں نے فکر مندی سے پوچھا جبکہ
 پوش سکون سے بیٹھا ماجر کی تکی چارہا تھا۔ وہ ایسا گر سکتا تھا
 کیونکہ اسے شام میں کام کرنا اچھا لگتا تھا۔

”کسی فرائنڈ کارک نے اطلاع دی ہے کہ اس کے
 بلٹ رائیڈ ورڈ میسن نے خودکشی کر لی ہے۔“ لیفٹیننٹ کارل بولا۔
 ”وہاں جا کر حالات دیکھو اور مجھے رپورٹ کرو۔“

”مارٹھ ویسٹ میاں۔“ میں نے اعتراض کیا۔ ”وہاں
 پہنچنے میں ایک گھنٹا لگ جائے گا اور تم چھ بجے اٹھ جاؤ گے۔“
 ”میں دفتر میں موجود ہوں گا۔“ کارل سرد لہجے میں
 بولا۔ ”اور کیا چھ تم ہمیں بجا دو گے؟“

میں اور پوش باہر آئے اور..... کار میں بیٹھ کر روانہ ہو
 گئے۔ شام کے وقت میاں سے باہر جانے والی تمام سڑکوں پر
 رش بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ مجھے کئی جگہ ٹریفک سے گزرنے
 کے لیے پولیس سائرن کا سہارا لینا پڑا حالانکہ یہ کام مجھے سخت
 ناپسند ہے۔ پوش نے اندازہ لگایا۔ ”شاید آج تم روزی سے کوئی

وعدہ کر کے آئے ہو۔“

”اس کی سال گرہ ہے اور ہمیں باہر جانا ہے۔“ میں نے
 گراہ کر کہا۔

”مجھے تم سے ہمدردی ہے۔“ پوش مسکرایا۔ ”ایسا کرو تم
 پہلے ہی روزی کو بتا دو، وہ تیار ہوگی تو تمہیں زیادہ مشکل کا سامنا
 کرنا پڑے گا۔“

”ممکن ہے معاملہ سیدھا سا ہو۔“ میں نے امید سے
 کہا۔ ”بٹلر نے سچ خودکشی کی ہو۔“

”اگر اس نے سچ سچ خودکشی کی ہے تب بھی ہم معاملے کو
 اتنی جلدی نہیں نرٹا سکتے۔“ پوش نے حقیقت پسندی سے کہا۔
 ”اس لیے بہتر ہے تم اسے آگاہ کر دو۔“

میں نے سوچا اور ٹی میں سر ہلایا۔ ”میں یہ رسک نہیں
 لے سکتا۔ دوسری صورت میں بھی روزی اتنی ہی ناراض ہوگی
 اس لیے پہلے سے مصیبت اپنے گلے میں ڈالنے کی کیا ضرورت
 ہے؟“

پوش نے شانے اچکائے۔ ”جیسے تمہاری مرضی۔“
 ایک گھنٹے بعد ہم ٹیس مارٹھ ویسٹ میاں پہنچ گئے۔ یہ
 ساحل کے کنارے ایک چھوٹی سی پہاڑی کے آخری سرے پر
 واقع عالی شان علاقہ تھا۔ یہاں سے سمندر اور دور پہلے میاں کی شہر کا
 شاندار نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ یقیناً اس ولا کی قیمت کئی ملین ڈالر
 میں تھی۔ پولیس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ جب ہم کار سے
 اترے تو ایک پٹرول آفیسر پاس آیا۔ اس نے تعارف کرایا۔
 ”میرا نام کارٹین ہے سر۔“

”لاش تم نے دیکھی تھی؟“ میں نے پوچھا۔
 ”میں سر..... سب سے پہلے میں اور میرا ساتھی یہاں
 پہنچے تھے۔“ اس نے سر ہلایا۔
 ”اطلاع کس نے دی؟“

ولا کے مالک فرائنڈ کارک نے اس واقعے کی اطلاع دی
 تھی۔ وہ ولا کے لان میں موجود تھا اور نگار منظر آ رہا تھا۔ میں
 اور پوش اس کے پاس پہنچے۔ تعارف کے بعد میں نے سوال
 کیا۔ ”تم نے لاش کب دیکھی؟“

”پولیس کو کال کرنے سے پانچ منٹ پہلے..... شاید
 تین بج کر چھتالیس منٹ پر۔“ اس نے جواب دیا۔ ”فرانک
 تقریباً پچاس برس کا صحت مند شخص تھا۔ اس کے گھرے ہاں
 لیے اور گدی سے نیچے آ رہے تھے اور چہرے مہرے۔
 دولت مندی کے آثار واضح تھے۔“

”تم یہاں اکیلے رہتے ہو؟“ میں نے لان کا جائزہ
 جو اس وقت اجڑا ہوا لگ رہا تھا۔ شاید اس کی باقاعدگی سے

عقلمند
 انسان

بھال نہیں کی جاتی تھی۔

”صرف میں اور ایڈورڈ رہتے ہیں۔۔۔۔۔“ اس نے ہجج کی۔ ”در اصل میرے مالی حالات درست نہیں ہیں اس لیے میں اب زیادہ ملازم نہیں رکھ سکتا۔“

”کیا تم ایڈورڈ کو بھی فارغ کرنے کا سوچ رہے تھے؟“ بوش نے پوچھا۔

وہ ہچکچایا لیکن پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ”جی ہاں بات ہے

میں ایسا ہی سوچ رہا تھا۔“

”کیا تمہاری سوچ کا ایڈورڈ کو علم تھا؟“ فرمائز نے

سرد آہ بھری۔ ”اس ولا کی فروخت کی کارروائی جاری ہے۔“

لاش لیونگ روم میں تھی۔ اندر سے یہ ولا بہت عالی شان

تھا۔ بہترین فرنیچر سے بھرا ہوا تھا۔ بٹریڈ ورڈ چڑے کے کاؤچ

پر نیم دراز تھا اور اس کے بائیں ہاتھ میں وہ بیٹولی دبا ہوا تھا

جس سے اس نے اپنی کپڑی پر کوئی مار کر خود کشی کی تھی۔ موت

فوری واقع ہوئی تھی اس لیے زیادہ خون نہیں نکلا تھا اور یہ صاف

ستھری موت تھی۔ ایڈورڈ کے جسم پر لہا کوٹ تھا اور اس کے سر

کے بال چھوٹے چھوٹے تھے۔ وہ تقریباً آٹھ فٹ کی عمر کا لیکن کسی

قدر کمزور صحت کا مالک تھا اس لیے ہلکا خاصہ صحت کوٹ اس کے

جسم پر جموں ہوا جس سے اس کے گال اندر دھنسنے ہوئے

تھے اور ہاتھ پاؤں متورم لگ رہے تھے۔ میں نے چھو کر

دیکھا۔ ان میں ورم نہیں تھا، ان کی قدرتی ساخت ایسی تھی جیسا

کہ زیادہ آرام کرنے والے افراد کی ہوا جاتی ہے۔ اس کی ٹوند

اس نے سر ہلایا۔ ”اس کے اخراجات بہت زیادہ ہیں اور میں مالی لحاظ سے خاتمے کے قریب ہوں۔“

”اس کی وجہ؟“ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس نے گہری سانس لی۔ ”اسٹاک مارکیٹ میں میرے

کئی ملین شیئرز تھے اور پچھلے دنوں کیا ہوا ہے، تمہیں اچھی طرح

معلوم ہے۔“

”لیکن اب تو شیئرز کی قیمت بہتر ہو رہی ہے۔“

”مجھ پر شیئرز کا قرض بھی تھا، اس کی ادائیگی کے لیے

میں نے اونے پونے شیئرز فروخت کر دیے اور اب میں خالی

ہاتھ ہوں۔“

پورے ملک میں بلکہ دنیا میں ریکل اسٹیٹ پیٹنٹ مینیجری ہے

اور خاص طور سے بڑی مائیت کے سودے نہ ہونے کے برابر رہ

گئے ہیں۔ اس کا دل انہیں بیک رہا تھا تو اس میں قہر کی بات نہیں

تھی۔ لیکن میں اس کی دکھ بھری داستان نہیں آیا تھا۔ یہاں

ایک آدمی مرا تھا اور مجھے اس کی تعظیم کرنا تھی، میں نے اس سے

کہا۔ ”مجھے تمہارا بیان درکار ہے اس بارے میں تم جو جانتے ہو

بتا دو گوئی بات چیلانے کی کوشش مت کرنا۔“

”مجھے چیلانے کی ضرورت بھی نہیں ہے، یہ سیدھا سادہ

خود کشی کا کیس ہے اور ایڈورڈ کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں

نے سوچ کر کہا۔ ”میں صبح سے تو اس کی ملازمت کے اخراجات دیکھ کر ہی بتا سکتا ہوں لیکن تقریباً بیس سال ہو گئے ہیں۔“

”بیس سال ایک طویل عرصہ ہے اس کا مطلب ہے تم

اس کی خدمات سے مطمئن تھے اور جب ہی تم نے اسے ملازم

برقرار رکھا؟“

”سو فی صد۔“ وہ زور دے کر بولا۔ ”ایڈورڈ بہت اچھا

اور تربیت یافتہ بنکر تھا۔ میں اس کی خدمات سے پوری طرح

مطمئن تھا اور میرا ارادہ تھا کہ اگر یہ ولا اچھی قیمت پر بیک گیا تو

میں اس کی ملازمت برقرار رکھوں گا۔“

”اس کے بیوی بچے ہیں؟“

فرمائز نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں، اس نے شادی نہیں کی

اور نہ ہی میرے علم میں اس کا کوئی رشتہ دار ہے کیونکہ نہ تو وہ

کسی سے ملنے گیا اور نہ ہی بھی کوئی اس سے ملنے آیا۔“

”کوئی دوست جانے والا؟“

”نہیں، میرے علم میں ایسا کوئی فرد نہیں ہے جسے میں

ایڈورڈ کا دوست کہہ سکوں۔ وہ کسی سے بھی نہیں ملتا تھا۔“

”تمہاری پسند آتی تھی؟“

”تم کہہ سکتے ہو شاید وہ اپنی ذمہ داریوں میں خوش

رہتا تھا۔“

”زیادہ توجہ نہیں دی۔“

”ایڈورڈ کے کسی عورت سے تعلقات تھے؟“

”نہیں، میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کیونکہ نہ

تو کبھی کوئی عورت اس سے ملنے آئی اور نہ ہی وہ میرے علم میں

لا کر کسی سے ملے گیا۔“

”اسے مالی مسئلہ تھا؟ کوئی ایسی لت جس کی وجہ سے وہ

مالی پریشانی کا شکار ہو گیا ہو؟“

”تمہارا مطلب ہے کہ اسے جوئے یا شراب کی لت تھی

تو میرے علم میں ایسی کوئی بات بھی نہیں ہے۔“ فرمائز نے نفی

میں سر ہلایا۔ ”میں اسے تنخواہ مانا دیتا آیا ہوں اور مجھے نہیں یاد

کہ اس نے مجھ سے بدھتی تنخواہ کا مطالبہ کیا ہو، اس کا مطلب

ہے اس کی مالی حالت خراب تھی۔“

”تنخواہ کیسے دیتے تھے، اس کا کوئی بینک اکاؤنٹ

ہے؟“

فرمائز نے اس بار بھی نفی میں سر ہلایا۔ ”میں اسے ہمیشہ

کیش تنخواہ دیتا تھا۔“

”تم نے بتایا وہ تمہاری پسند تھا تو کیا اس میں خود کشی کا

رجحان تھا؟ اس نے اس سے پہلے کبھی خود کشی کی کوشش کی یا

نے لیونگ روم میں آکر کاؤچ پر لیٹ کر اپنے سر میں گولی مار لی۔ میں نے پوچھا۔ ”اس نے جس پستول سے خودکوش کیا، وہ کس کا ہے؟“

”میرا ہے لیکن یہ عام طور سے ایڈورڈ کی جوتلی میں رہتا ہے کیونکہ اس کی دو چابیاں ہیں ان میں سے ایک ایڈورڈ کے پاس ہوتی ہے۔“

”میری اسٹری میں میز کی دراز میں ہے۔ یہ دراز منتقل رہتی ہے لیکن اس کی دو چابیاں ہیں ان میں سے ایک ایڈورڈ کے پاس ہوتی ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ یہ واقعی خودکشی کا کس تھا۔ پانچ بج کر پچیس لیس منٹ ہو چکے تھے۔ اگر میں فون پر لیفٹیننٹ کارل کو بتا دیتا کہ یہ خودکشی کا کس ہے تو اس کے ساتھ میری جان بھی چھوٹ جاتی اور میں ذرا تاخیر سے کئی لیکن گھر پہنچ جاتا اور روزی کو کالوں کا خبر نہ ہوتی۔ وہ جتنی میں ٹریفک جام کی وجہ سے تاخیر سے آیا ہوں۔ اس دوران میں اندر سے بوش آیا۔

”ڈاکٹر نے لاش دیکھ لی ہے اب تم چاہو تو ایک نظر اسے دیکھ سکتے ہو۔“

”اوتے تم ذرا مسٹر کارکر سے مپ شپ کرو، میں اسے دیکھ کر آتا ہوں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

کیونکہ ڈاکٹر اور فارنسک والوں نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا اور لاش کی تصویریں بھی لی جا چکی تھیں اس لیے اسے اٹھنے ملتے میں کوئی حرج نہیں تھا میں نے سب سے پہلے اس کے لباس کی تلاشی لی۔ کوٹ کی جیب سے ایک بٹوا نکلا اور اس میں سوائے چند سو ڈالر کے کچھ نہیں تھا۔ بندہ رائیونگ لائنس اور نہ سوشل سکیورٹی کارڈ اور نہ ہی کوئی کریڈٹ یا ڈیٹ کارڈ۔ ایک جیب سے چابیاں کا ایک بڑا گھبارا آمڈ ہوا جو یقیناً اس ولا کی تھیں اور بٹلر کی حیثیت سے ان کو نبھانا ایڈورڈ کی ذمہ داری تھی۔ اس کے جسم پر مزید کوئی نشان نہیں تھا اور اس نے جو گولی چلائی تھی وہ بھی سر کے اندر ہی تھی۔ میں زخم کا معائنہ کر رہا تھا کہ مجھے لگا جیسے اس نے حال ہی میں بالی ترشوائے ہوں یہ چھوٹے اور سر سے چپکے ہوئے بال تھے۔ اس کا ہاتھ بال اٹھنے سے فراخ ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کے ناخنوں کا معائنہ کیا لیکن وہ بھی صاف ستھرے اور نفاست سے ترشے ہوئے تھے۔ میں نے فارنسک انچارج مارجرٹ ہینسن سے کہا۔ ”اس کے خون کا ٹیسٹ کر کے مجھے جلد از جلد رپورٹ دو۔“

”کل میج تک مل جائے گی۔“ اس نے بے نیازی سے کہا اور اپنے عملے سمیت رخصت ہو گیا۔ جی بھی لاش لے کر رخصت ہو گیا۔ اب وہاں میں اور بوش تھے یا پٹرول آفیسر

کارنگن اور اس کا ساتھی۔۔۔۔ میں لان میں آیا اور فرائڈ سے کہا۔

”میں ایڈورڈ کی رہائش گاہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ مجھے اور بوش کو ولا کے عقبی حصے میں لایا۔ یہاں دو کمرے ایڈورڈ کے لیے مخصوص تھے۔ ان میں ایک اس کا بیڈروم تھا اور دوسرا لیونگ روم۔۔۔ مجھے خیال آیا کہ جب اسے ذاتی لیونگ روم میسر تھا تو اس نے ولا کے لیونگ روم میں خودکشی کیوں کی؟ لیونگ روم تھوڑے لیکن بیش قیمت فرنیچر سے سجا ہوا تھا۔ البتہ بیڈروم میں ایک معمولی سائڈ اور ایک الماری کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں نے بوش کو بینک تلاش کرنے کو کہا اور خود الماری کی طرف بڑھا۔

”تین پتوں والی الماری تھی اور اس کے سارے دروازے لاک تھے۔ میں نے ایڈورڈ کے پاس سے ملنے والی چابیاں نکالیں اور انہیں الماری کے لاک میں آزمانے لگا لیکن ان میں سے کوئی چابی اس میں نہیں لگی۔“

”اس کی چابیاں کہاں ہیں؟“ میں نے فرائڈ کی طرف دیکھا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ اس نے پریشان ہو کر کہا۔ ”یہ ایڈورڈ کا کمرہ ہے اور وہی چابیاں کہیں رکھ سکتا ہے۔“

میں نے لاش کی مکمل تلاشی لی تھی۔ پھر اس کمرے کو بھی کھنگال ڈالا اور لیونگ روم کو بھی دیکھا لیکن الماری کی چابیاں کہیں نہیں تھیں۔ بوش نے خیال ظاہر کیا۔ ”ممکن ہے ایڈورڈ نے ولا میں کہیں رکھ دی ہوں۔“

”میں اسٹری میں دیکھنا چاہیے۔“ میں نے ایک خیال کے تحت کہا اور ہم فرائڈ کی رہنمائی میں اسٹری میں آئے۔ یہ خاصی بڑی اور آراستہ اسٹری تھی۔ چاروں طرف الماریوں کی کتاہیں سجی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ میز کی ایک دراز سے چابیوں کا ایک گچھا جمول رہا ہے۔ دراز کی چابی کی تھی اور باقی چابیاں مجھے ایڈورڈ کی الماری کی لگ رہی تھیں۔ میرے ہاتھ میں رہ کر باریک دستانے تھے اس لیے میں نے بلا جھک چابیاں نکال لیں۔ دراز کے علاوہ اس میں ایک جھسی ساخت کی تھیں چابیاں تھیں۔ اس کے ساتھ ایک کی ہولڈر تھا جس کی ہتھ کے سرے پر سرمزید کا سو گرام بنا ہوا تھا۔

”کیا یہی ایڈورڈ کی چابیاں ہیں؟“ فرائڈ نے شانے ہلانے۔ ”شاید۔۔۔۔ میں یقین نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں نے بھی اس کی چابیوں کو دیکھا نہیں ہے۔“

”ابھی پتا چل جاتا ہے۔“ میں نے کہا اور ہم دوبارہ ایڈورڈ کے کمرے میں آئے اور جب۔۔۔۔ الماری پر چابیاں

آزمائیں تو اس کے تالے کھل گئے۔ ایک خانے میں اس کے کپڑے رکھے تھے میں نے تمام کپڑے ایک ایک کر کے نیچے گرا دیے۔ اس خانے میں سوائے کپڑوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ دوسرے خانے میں کپڑوں کے ساتھ کچھ دستاویزات بھی ملی تھیں، یہ ایڈورڈ کے سرٹیفکیٹس تھے۔ اس نے ایک ایجنے ادارے سے بٹلر کا کورس کیا ہوا تھا اور یہ کورس ڈپلوما کے برابر تھا۔ وہ آج سے تین سال پہلے فرائڈ کی ملازمت میں آیا تھا اور اس سے پہلے اس نے صرف تین سال ایک خاتون مارٹھا رچیل کے پاس ملازمت کی تھی۔ مارٹھا نے اسے سرٹیفکیٹ بھی دیا تھا۔ لیکن اس خانے میں نہ تو اس کا سوشل سکیورٹی کارڈ تھا اور نہ ہی مزید کوئی اور دستاویز تھی۔ وہ بڑی خاموش اور فقر پر بارپوش کی زندگی گزار رہا تھا فرائڈ اسے تنخواہ نقد دیتا تھا اور ظاہر ہے وہ اس پر ٹیکس بھی ادا نہیں کرتا ہوگا۔ سوشل سکیورٹی نہ ہونے کا ایک مطلب یہ بھی تھا۔ الماری سے نقد رقم بھی نہیں ملی تھی۔ میں نے فرائڈ سے پوچھا۔

”تم تنخواہ اسے نقد کیوں دیتے تھے؟“

”اس کے اصرار پر۔“ فرائڈ نے توقع کے مطابق جواب دیا۔ ”اس کا کوئی بینک اکاؤنٹ نہیں تھا۔“

”اس کا مطلب ہے وہ بیکس چوری کرتا تھا؟“ فرائڈ پریشان نظر آنے لگا۔ ”دیکھو وہ میرا ملازم تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اس کے ہر فعل کا ذمہ دار ہوں۔“

”ہم تمہیں ذمہ دار نہیں سمجھتے رہے ہیں۔“ بوش نے اسے تسلی دی۔ اسی اثنا میں میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ یہ روزی تھی۔ میں لیونگ روم میں آ گیا اور کال ریسپونڈ کی تو روزی نے کات دار لہجے میں کہا۔

”پال تم کہاں ہو؟“

”ہی میں دفتر سے نکلنے والا تھا کہ۔۔۔۔“

”کوئی کیس آ گیا۔“ اس کا لہجہ مزید سرد ہو گیا۔ ”ابھی تم کہاں ہو؟“

”تھوڑا دیر سیامی۔“ میں نے کمزور لہجے میں کہا۔

”چھینج کر پانچ منٹ ہو رہے ہیں۔۔۔۔ اگر تم ابھی وہاں سے نکلو تو سات بجے سے پہلے گھر نہیں آ سکتے اور جہاں میں۔۔۔۔“

”ہاں ہے وہ جگہ بھی یون گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔ یقیناً تم ابھی وہاں سے فوراً نہیں نکل سکو گے۔“

”ہی مجبوری ہے۔۔۔۔ میں نے کہنا چاہا۔“

”سوائے بیوی کے ساری دنیا تمہاری مجبوری ہے۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے گہری سانس لی اور ایڈورڈ

کودل ہی دل میں کوسا جس نے خودکشی کے لیے یہ وقت منتخب کیا تھا اگر وہ دو گھنٹے کی تاخیر سے خودکشی کرتا تو اس میں مشکل میں نہ پڑتا۔ مجھے معلوم تھا روزی کا موڈ کئی دن تک خراب رہے گا۔ میں ایڈورڈ کے بیڈ روم میں واپس آیا اور فرمائے کہ۔ ”یہ حصہ اور تمہارے ولا کا یونگ روم فی الحال سب ہوگا اور اس جے میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوگی۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے جان چھوٹے پر گویا سکھ کا سانس لیا۔

مجھے الماری کے تیسرے پٹ کا خیال آیا اور میں نے اسے کھولا۔ اس جے میں دو عدد درازیں اور کچھ خانے تھے لیکن ان میں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی تصویر اور نہ ہی کوئی کاغذ، پر فیوم کی ایک عدد پیشی جی جس میں زرد سیال بالکورے لے رہا تھا۔ اس جے کی تلاشی لیتے ہوئے میں دل ہی دل میں حساب لگا رہا تھا کہ یہاں سے نکل کر اگر میں ہائی وے کا راستہ چڑوں تو چالیس منٹ میں گھر پہنچ سکتا تھا اور اس کے بعد دس منٹ میں روزی کو منانا کر ہم باہر جا سکتے تھے۔ دس منٹ کی مشکل ہوئی اس کے بعد مجھے کئی دن کا سکون مل جاتا۔ میں نے الماری کے پٹ دوبارہ سے لاک کیے اور فرمائے کہ۔

”نکل میں تمہارا تفصیلی بیان لوں گا۔“

”میں یہیں ملوں گا۔“ اس نے کہا۔ میں اور یوش باہر آئے، میں نے آفسر کا ریگن سے کہا۔

”ایڈورڈ کا رہائشی حصہ اور وقوعہ والی جگہ سیل کر دو اور اپنی رپورٹ ہوئی سائنڈ کوروانہ کر دینا۔“

”ییس سر۔“ اس نے کہا اور ہم باہر آ گئے۔ یوش سوچ میں گم تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

”ہم نے کیس کچھ زیادہ جلدی نہیں بھگتا دیا؟“ اس نے کہا۔

میں لیفٹیننٹ کارل کورپورٹ کرنے جا رہا تھا لیکن یوش کی بات سن کر میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ ”کیا مطلب.....“

”کیا تم نے کوئی خاص بات محسوس کی ہے؟“

”نہیں کیس تو خودکشی کا ہی لگ رہا ہے لیکن تم نے محسوس نہیں کیا کہ یہ کچھ زیادہ ہی صاف شفاف کیس ہے..... کہیں ٹھک کا کوئی دھبہ نہیں ہے؟“

”جی بات ہے میرے ذہن پر روزی سوار ہے اور میں اس بارے میں زیادہ سوچنا نہیں چاہتا۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ”میری ایک بات یاد رکھو کہ کام اہم ہوتا ہے لیکن

ازدواجی معاملات اس سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔“ یوش مسکرانے لگا۔ وہ ابھی تو جوان تھا اور جوشیلا بھی تھا لیکن ہماری اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ کام کہیں بھاگ نہیں جا رہا ہے لیکن وقت نکل گیا تو بیوی کو منانا مشکل ہو جائے گا۔“

میں ہنسا۔ ”اب تم سمجھ گئے ہو۔“

میں نے یوش کو راستے میں ایک جگہ اتارا اور پھر ہر ممکن تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے امید تھی کہ روزی ابھی تک تیار ہوگی اور اس نے لباس نہیں بدلا ہوگا۔ میرا اندازہ درست نکلا وہ عمل تیاری اور غضب کی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے منانے میں مجھے دس منٹ لگے اور اس کے بعد ہم سال گرہ منانے کے لیے روانہ ہو گئے اور رات جب واپس آئے تو روزی کا موڈ بہت خوش گوار تھا۔ اپنی تنگ و دو کا مجھے بہت اچھا اصرار ملا تھا۔

صبح میں دفتر پہنچا تو ایڈورڈ کی پوسٹ مارٹم اور لیب کی رپورٹ آ گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں سوائے اس کے اور کوئی خاص بات نہیں تھی کہ ایڈورڈ کی موت تین بج کر تیس منٹ سے تین بج کر چالیس منٹ کے درمیان ہوئی تھی۔ گویا جس وقت فرمائے لاش دریافت کی ایڈورڈ نے اس سے کچھ دیر ہی پہلے خود کو شوٹ کیا تھا۔ لیب کی رپورٹ البتہ کام کی تھی۔ ایڈورڈ کے خون میں الکحل کی بہت زیادہ مقدار پائی گئی تھی جس وقت اس نے خودکشی کی وہ نشے میں تھا۔ میں کیس کی کڑیاں آپس میں جوڑنے لگا۔ ابھی تک یوش نہیں آیا تھا۔ اس کا ڈیوٹی پر آد کا وقت صبح دس بجے ہوتا تھا۔ کارمین کی رپورٹ بھی آ گئی تھی لیکن اس میں کوئی بھی خاص بات نہیں تھی اور یہ ظاہر یہ خودکشی کا کیس لگ رہا تھا۔ میں نے اپنے پاس موجود ایڈورڈ کی الماری کی چابیاں دفتر میں آتے ہی نشانہ اتارنے کے لیے لیب بھیج دی تھیں۔ یوش کے آنے تک مجھے اس کا نتیجہ مل گیا۔

پھر میں نے اب تک حاصل شدہ معلومات کا تجزیہ کیا اور اس کے بعد میں نے یوش کو کال کی۔

”پارکنگ میں آ جاؤ۔“

”کیوں؟“ اس نے اعتراض کیا۔ ”ابھی تو میں دفتر آیا ہوں۔“

”میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ کام کرنے کا بہترین وقت صبح کا ہوتا ہے اور ہم فرمائے کے پاس چل رہے ہیں۔“

میں پارکنگ میں پہنچا تو یوش وہاں کھڑے اجماعیاں لے رہا تھا اس نے رات یقیناً کہیں مصروف گزاری تھی اور اس کی فہم پوری نہیں ہوئی تھی۔ ہم فرمائے کے ولا کی طرف روانہ ہوئے۔

عقلمند

میں نے ایک پولیس کار کو وہاں پہنچنے کی ہدایت کی تو بوش چونکا۔
 ”لگتا ہے کوئی خاص بات ہے؟“
 ”خاص بات تو ہے۔“ میں نے ناتھ ویسٹ کی طرف
 جانے والی سڑک پر مڑتے ہوئے کہا۔
 ”کیا یہ خودکشی نہیں ہے اور فرانڈ نے اپنے بلٹر کو قتل کیا
 ہے؟“

”تمہارا خیال ہے؟“ میں نے اس سے سوال کر لیا۔
 ”میں نے کہا تھا کہ معاملہ کچھ زیادہ ہی صاف لگ رہا ہے
 لیکن کل تم نے میری بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔“ اس نے شکوہ
 کیا۔
 ”شام کا وقت کام کے لیے یقیناً اچھا نہیں ہوتا۔“
 میں نے کہا۔
 ”لیکن زیادہ تر قتل شام اور رات میں ہوتے ہیں۔“
 اس نے نکتہ اٹھایا۔

”اور زیادہ تر قاتل پکڑے بھی اسی وجہ سے جاتے ہیں
 کیونکہ اس وقت کے جانے والے قاتل اپنے پیچھے کوئی مذکورہ قسم
 چھوڑ جاتے ہیں جو قاتل کی طرف اشارہ کرتے ہیں اس کے۔۔۔
 برعکس صبح کے وقت کیے جانے والے قاتل بہت کم پولیس کی گرفت
 میں آتے ہیں۔“
 ”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔“ اس نے بیزار سے
 کہا۔ حالانکہ کل شام وہ بہت پُر جوش ہو رہا تھا اور میرا اس کے
 برعکس حال تھا۔ جیسا کہ اس وقت میں چاق و چوبند تھا اور وہ
 بیزار تھا۔ ”اب اس کیس کے بارے میں بتاؤ۔“
 ”اس میں کئی ایسی چیزیں ہیں جو مشکوک ہیں۔“ میں
 نے کہا۔ ”ایک تو ایڈورڈ کے پاس سے کوئی شاختی چیز نہیں نکلی
 ہے۔“

”یہ کوئی مشکوک بات نہیں ہے۔ بہت سارے لوگ
 ڈرائیونگ نہیں کرتے۔۔۔ اس لیے وہ ڈرائیونگ لائسنس بھی
 نہیں بنواتے ہیں اور اسے سوشل سیکوریٹی کارڈ بنوانے کی
 ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ نکل ادا نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس لیے
 اسے پینشن بھی نہیں ملتی۔“

”دوسرے اس نے اپنی ذاتی چابیوں میں اس دراز کی
 چابی کیوں لگا رکھی تھی جس میں فرانڈ کا پتول رکھا ہوا تھا؟“
 ”یہ بھی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کئی بار اسے ولا کی
 چابیاں کہیں رکھنا پڑتی ہوں لیکن حافظہ کی حیثیت سے پتول
 ہمہ وقت اس کی جوبل میں ہونا چاہیے اس لیے اس نے دراز کی
 چابی اپنی ذاتی چابیوں کے ساتھ لگا لی۔“
 ”اس کے پاس ولا میں ذاتی جگہ موجود تھی اور آدمی

خودکشی جیسا کام ہمیشہ اپنے ماحول میں کرنا پسند کرتا ہے لیکن وہ
 ولا کے ایک لیونگ روم میں خروہ پایا گیا۔“
 ”میرے خیال میں تو سرے والے آدمی کو اس سے کوئی
 فرق نہیں پڑتا۔۔۔۔۔ کہ وہ کہاں مر رہا ہے۔“
 ”ایک اہم بات اور ہے جسے ہم نے نظر انداز کر
 دیا تھا۔ لیکن یہ بات میں وہیں پہنچ کر بتاؤں گا۔“ میں نے
 کہا۔

بوش مسکرایا۔ ”یعنی روایتی جاسوس کی طرح سپنس
 پھیلاؤ گے۔“
 ہم جلدی فرانڈ کے ولا پر پہنچ گئے وہاں پولیس کار پہلے
 سے باہر موجود تھی۔ میں نے اس میں موجود پولیس والوں سے
 کہا۔ ”جیسے ہی تمہیں ریڈیو پر اشارہ ملے، اندر آ جانا۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ ایک پولیس افسر نے کہا۔
 ہم اندر آئے۔ کال بیل کا بزن دبانے پر فرانڈ خود آیا۔۔۔
 ہمیں دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”مسٹر کارک، ہم
 تمہارا بیان لینے آئے ہیں۔“
 ”اندر آ جاؤ۔“ اس نے کہا اور ہمیں پاس کی نشست گاہ
 میں لے آیا۔ یہاں شاندار قسم کے وکٹورین اسٹائل کے صوفے
 تھے۔ میں نے بیٹھنے ہی سوالات کا آغاز کر دیا۔
 ”مسٹر کارک! تمہارے خیال میں ایڈورڈ نے اپنے
 رہائشی حصے میں خودکشی کرنے کے بجائے اس کام کے لیے ولا
 کے ایک لیونگ روم میں یہ کام کیوں کیا؟“ میرے اچانک
 سوال پر وہ گڑبڑا گیا۔

”وہ۔۔۔۔۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“
 ”اس کے پاس کوئی شاختی چیز موجود نہیں ہے، تم نے
 کیسے یقین کر لیا کہ وہی ایڈورڈ ہے۔“
 ”وہ ایڈورڈ کیوں نہیں ہو سکتا؟“ اس نے انسا سوال کیا۔
 ”اس کے پاس اس کے سر ٹیکٹائش تھے۔“
 ”لیکن اس کے پاس کوئی شاختی چیز نہیں ہے۔“
 ”میں نے بھی اس پر توجہ نہیں دی۔“ فرانڈ نے بے
 پرواہی سے کہا۔ ”مجھے اس پر اعتماد تھا اور اس نے بھی میرے
 اعتماد کو نہیں ٹھیس پہنچائی۔“

”تمہاری اسٹری کی دراز کی چابی اس نے اپنے ذاتی
 چابیوں کے گچھے میں لگا رکھی تھی، کیوں؟“
 ”اس بارے میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“
 ”کیا یہ بات تمہارے علم میں تھی؟“
 ”نہیں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔
 ”تم اسے تنخواہ ہمیشہ نقد دیتے تھے؟“

”ہاں میں نے کل بھی بتایا تھا اس کا کوئی بینک اکاؤنٹ
 نہیں ہے۔“ فرانڈ کا لہجہ راجتیز ہو گیا۔
 ”ٹھیک ہے، تم اسے تنخواہ نقد دیتے تھے۔ اس نے
 بیس سال تمہارے پاس کام کیا ہے اور یقیناً تم اسے اچھی تنخواہ
 دیتے ہو گے۔ کم سے کم پچاس ہزار سالانہ دیتے ہو گے؟“
 ”اتھاون ہزار ڈالرز سالانہ۔“ فرانڈ نے مرے
 ہوئے انداز میں کہا۔ ”بلٹر عام طور سے اس سے زیادہ ہی
 لیتے ہیں۔“

”اتھاون ہزار ڈالرز سالانہ اچھی خاصی رقم ہے اور اس کا
 کوئی خاص خرچ بھی نہیں ہوگا؟“
 ”ہاں رہائش اور اس کے بلز میری ذمہ داری تھے۔
 کھانا بھی میرے اخراجات میں شامل تھا۔“
 ”تم نے بتایا کہ اسے جوئے، شراب یا عورت کا شوق
 نہیں تھا اس لحاظ سے اس کے پاس کئی لاکھ ڈالرز کی جمع پونجی
 ہونی چاہیے۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ اس کے پاس سے نہ تو کوئی رقم
 نکلی اور نہ ہی کوئی ایسی چیز جس سے پتا چلے کہ اس نے نہیں
 سرمایہ کاری کر رکھی ہے؟“

فرانڈ ایک لمحے کے لیے سستہ رہ گیا پھر اس نے
 سنبھل کر کہا۔ ”میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں اس
 کے معاملات میں دخل نہیں دیتا تھا۔“
 ”تم نے بتایا کہ تم نے بھی اس کی چابیاں نہیں دیکھیں
 اور تمہیں نہیں معلوم تھا کہ اسٹری کی دراز والی چابی اس کی ذاتی
 چابیوں کے گچھے میں تھی؟“
 ”درست ہے۔“ اس نے بیزار سے کہا۔

”اس کا مطلب ہے ان چابیوں پر صرف ایڈورڈ کی
 اگلیوں کے نشانات ہونے چاہئیں؟“
 میرے اس سوال پر فرانڈ کا رنگ سفید ہو گیا اور اس
 نے اچانک اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن بوش تیار تھا اس نے
 اسے نشست گاہ کے دروازے پر پہنچنے سے پہلے جکڑ لیا اور پھر
 اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی۔ یہ کام کر کے اس نے باہر
 موجود پولیس والوں کو طلب کیا اور مجھ سے کہا۔ ”اس کا مطلب
 ہے کہ اس نے اپنے بلٹر کو قتل کیا ہے تاکہ اس کی جمع پونجی ہتھیاء
 نہ ہو۔“

”مسٹر کارک کو یہ گھٹیا کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی
 کیونکہ وہ اس پلٹن ڈالرز ولا کا مالک تھا۔“
 بوش نے میرے الفاظ پر غور کیا۔ ”کیا۔۔۔
 طلب۔۔۔۔۔ یہ ابھی بھی ہے۔“
 ”افسوس کہ تم اب بھی نہیں سمجھ۔“ میں نے سر ہلایا۔

”برخوردار یہ خود بلٹر ہے اور اس نے اپنے مالک کو قتل کیا ہے۔
 کیوں مسٹر ایڈورڈ میں وہ ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“
 لیکن وہ جواب دینے کے بجائے اپنے ہونٹ کا قفا
 رہا۔ اس کے بعد اس نے ہمارے تمام سوالوں کا جواب
 خاموشی سے دیا۔ البتہ اس شام تک اس نے پولیس اسٹیشن
 میں اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ بیس سال
 سے فرانڈ کے پاس ملازم تھا لیکن اس نے اس کی خدمات کی
 پروا کیے بغیر اسے ملازمت سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس
 کساد بازاری میں اسے دوسری ملازمت کہاں ملتی۔ پھر اسے
 فرانڈ کے رویے کا بھی دکھ تھا اس نے اسے قتل کر کے اس کی جگہ
 لینے کا فیصلہ کیا۔ اتنے عرصے اس کے ساتھ رہ کر وہ اس کے
 سارے معمولات سے واقف ہو گیا تھا۔ اس نے فرانڈ کے
 سائن کی مشق کر لی تھی۔ اس کے ڈیوٹ کارڈ اور انٹرنیٹ
 بینکنگ کے پاس ورڈ جان گیا تھا۔ فرانڈ اس ولا کو بچ رہا تھا۔
 وہ سارا کام خود سامنے اپنے بغیر کر رہا تھا اس لیے ایڈورڈ کے
 لیے اس کی جگہ سنبھال کر ولا فروخت کر دینا اور رقم لے کر کہیں
 اور چلے جانا آسان تھا۔

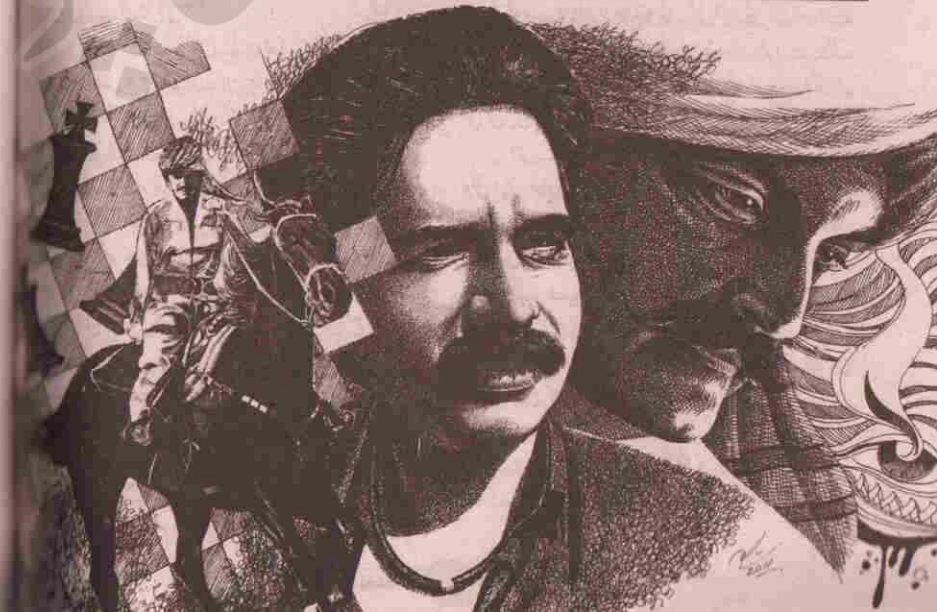
فرانڈ کا کوئی قریبی رشتے دار نہیں تھا اور نہ ہی اس کا
 کوئی ایسا دوست تھا جو اس سے ملے آتا۔ اس لیے ایڈورڈ
 نے اسے راہ سے ہٹانے کا سوچ لیا۔ اس نے پہلے فرانڈ کو تیز
 شراب دی اور جب وہ نشے میں دھت ہو گیا تو اس نے اس
 کے بال تراش کر بلٹر کی طرح چھوڑے کر دیے اور اس دوران
 میں وہ خود اپنے بال بڑھا چکا تھا۔ بال تراشنے کے بعد اسے
 صاف کر کے اور اپنا لباس پہنا کے ایڈورڈ نے اسے لیونگ
 روم کے کاؤچ پر ڈالا اور پتول اس کے ہاتھ میں پھنسا کر اس
 کی کن پٹی پر گولی مار دی۔

اس سے چند غلطیاں ہوئیں۔ ایک تو اس نے اپنی جمع
 پونجی اپنی الماری سے غائب کر دی کہ وہ پولیس کی جوبل میں
 نہ جانے دوسرے اس نے اسٹری کی دراز کی چابی اپنے ذاتی
 گچھے میں لگا دی جو اصول کے خلاف تھی اور پھر اپنے کاغذات
 بھی غائب کر دیے جن پر اس کی تصویر ہو سکتی تھی اس نے
 ڈرائیونگ کے بارے میں جھوٹ بولا کہ اس کے پاس
 ڈرائیونگ لائسنس نہیں ہے اور اس کے چابیوں کے گچھے میں
 بھی سرسبز پڑ کا لوگوں کا ہوا تھا۔ اسے ڈرائیونگ آتی تھی۔ ممکن
 ہے وہ شام کے بجائے صبح کے وقت یہ کام کرتا تو اس سے اتنی
 غلطیاں نہ ہوتیں اور وہ صاف بچ لگتا۔ دو ہفتے بعد اسے ایک
 جیوری نے فرسٹ ڈگری مرڈر قرار دے دیا تھا۔



ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ
ڈور ہاائر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی
بدل کے رہ جاتے ہیں..... مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی
کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و
تشریح ٹھہرتی ہے..... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر
ہوتی ہے..... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا
نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی
جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے
..... پھنستا رہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت
نہ تو روایتوں کو مانتی ہے..... نہ طبقوں میں
تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب
کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے
اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے
آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے
دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں..... کبھی بازی ہلت بھی
جاتی ہے۔ بیٹا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے..... اس
وقت تک ہلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے..... جرم
، افسر شاپی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا
آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

نقدیر کی فہم گری، قسمت کی چال بازی یا مقدر کا کھیل..... تلے اور پھڑ جانے والوں کی کہانی



طرح چگاے جانے پر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور خوف زدہ نظروں سے اسلم کے چہرے کو دیکھنے لگی جہاں عجیب سا بیجان نظر آرہا تھا۔

”لگ... کیا ہوا؟“ وہ یہ مشکل ہی اس سے یہ سوال کر سکی۔

”کچھ لوگ اس مکان کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تم جا کر حادراؤ اور مقصود کو چگا دو۔“ اس نے خوفناک لہجے میں اسے اطلاع دینے کے ساتھ ہدایت بھی دی۔

”کون لوگ...؟ کون ہیں وہ لوگ؟“ وہ قدرتی طور پر سرا سہ ہوئی۔

”مجھے نہیں معلوم؟ نہ ہی میں اس وقت ان سوالوں کا جواب دے سکتا ہوں۔ بس تم سے جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔

میں واپس چھت پر جا کر حالات کا جائزہ لیتا ہوں۔“ اس نے جھنجھلاہٹ بھرے لہجے میں جواب دیا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

ماہ بانو بھی اب پوری طرح نیند کے خمار سے باہر نکل آئی تھی چنانچہ اپنا دو ٹاسسٹائی ہوئی گھر کے اندرونی حصے کی طرف دوڑی۔ اس کا رخ انیلا اور مقصود کے کمرے کی

طرف تھا کیونکہ دن کے وقت اس نے کچھ دیر اسی کمرے میں آرام کیا تھا، اس لیے اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ خواب گاہ ان

دونوں کے زیر تصرف ہے۔ خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ کر اس نے زوردار دنگ دی۔ اندر سے فوراً ہی ریڑھ ٹھٹھک کر

”کون؟“ نیند کے خمار میں ڈوبی یہ آواز انیلا کی تھی۔

”میں ماہ بانو ہوں انیلا۔ ذرا مقصود بھائی کو جلدی سے باہر بھیج دو۔“ اس نے وقت ضائع کیے بغیر اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

جواب میں اندر سے کچھ آہستہ سنا دیں اور ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں دروازہ کھول دیا گیا اور مقصود کا

چہرہ نظر آیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں نیند کی سرخی تھی۔ یعنی طور پر وہ گہری نیند سے جاگا تھا۔

مقصود کے پیچھے ہی حیران پریشان سی انیلا کھڑی تھی۔

”مجھے اسلم نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کچھ لوگ آپ کے گھر کو گھیرنے کی کوشش کر رہے

ہیں۔“ دونوں میاں بیوی کے کوئی سوال کرنے سے قبل ہی اس نے انہیں اطلاع دی جسے سن کر مقصود کے چہرے پر

سراسیمگی کے تاثرات پھیل گئے۔

اسے لگا کہ اس کی بصارت اسے دھوکا دے رہی ہے۔ وہ جس قسم کے حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچا تھا،

اس میں اس قسم کا فریب نظر ناممکنات میں سے بھی نہیں تھا۔ زندگی کی بقا کے لیے دشمنوں سے بھگتنا محض تو اپنے سامنے

سے بھی بھڑکنے لگتا ہے اور ہر ہر آہٹ پر چونک جانا جانے دشمن کی طرف سے وار کرنے آٹھرا ہوا ہے۔ چنانچہ حادراؤ

کے مکان کو گھیرے میں لینے کی کوشش کرتے وہ سامنے بھی اسے اگر اپنا بھری دھوکا لگ رہے تھے تو کچھ غلط نہیں تھا۔ وہ

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گرد دیکھتا خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ جو وہ محسوس کر رہا ہے وہ درست نہیں ہے

لیکن ساریوں کی بڑھتی تعداد نے اسے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ جو کچھ اسے دکھائی دے رہا ہے، وہی حقیقت ہے اور وہ

کسی قسم کے اشتباہ نظر کا شکار نہیں ہوا ہے۔ اس یقین کے بعد اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسانہٹ سی دوڑتی ہوئی محسوس

ہوئی۔ جانے وہ کون لوگ تھے اور ان کے عزائم کیا تھے؟ اگر وہ حادراؤ سے کسی دشمنی کے باعث اسے یا اس کے اہل خانہ

کو نشانہ بنانا چاہتے تھے تو اب بھی وہ خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ حادراؤ اس کا محسن تھا۔ اس شخص نے اسے

اور ماہ بانو کو اپنی چھت کے نیچے پناہ دی تھی۔ وہ خود کو اس کے تنگ کا مقروض سمجھتا تھا، چنانچہ یہ تو کسی طور ممکن ہی نہیں تھا کہ

اپنے محسن کو مشکل حالات میں تنہا چھوڑ دے۔

چار دیواری سے دور ہٹ کر وہ تیزی سے واپس پلٹا اور سڑھیاں اترتا چلا گیا۔ کوئی بھی قدم اٹھانے سے قبل حادراؤ اور مقصود کو آگاہ کرنا اور ان سے مشورہ لینا ضروری تھا۔

سڑھیاں اتر کر نیچے پہنچنے کے بعد اس کے قدم ٹھنک سے گئے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ حادراؤ اور مقصود کی خواب گاہیں

کون سی ہیں اور ایک ایسے گھر میں جہاں کی خواتین نے اس کے سامنے آنے سے مکمل طور پر گریز کیا تھا، وہ آزادانہ

حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اس مسئلے پر ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے اپنے اور ماہ بانو کے لیے مخصوص کی گئی خواب گاہ کا رخ

کیا۔ ماہ بانو اب بھی اپنے سابقہ انداز میں سو رہی تھی لیکن اب اس کی اندرونی کیفیات بدل چکی تھیں۔ سر پر منڈلاتے

خطرے کے بادلوں نے ساری لطیف حیات کو سلب کر کے بتا کی جدوجہد کرنے پر مجبور کر دیا تھا چنانچہ ماہ بانو کے ہوش

ربا وجود نے اس کے اندر کوئی پھیل پیدا نہیں کی اور اس نے بیٹے کے قریب پہنچ کر ماہ بانو کا بازو پکڑ کر اسے چھوڑ ڈالا۔ اس

جاسوسی ڈائجسٹ

بارہو خاندان سے تعلق رکھنے والا شہر یار عادل ایک پر جوش بھرا ہے جس کی بطور اسٹنٹ کمزیر پہلی پوسٹنگ ہوئی ہے۔ اس کے ذہن پر ٹھیکس خلع کے سب سے بڑے گاؤں جیڑا باد کو چھری اختیار کرنا ایک رواجی جاگیر دار ہے جو شہر یار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا ہے اور دونوں کے

درمیان خاصیت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جیڑا باد کا رہائشی مسٹر آفتاب جو عمر سے گاؤں کے رہائشی اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہر یار کا سہارا کر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چھری کی نفاس پسند بنی شہر یار آفتاب کو مدد دیتی ہے تو اس کی محبت میں جکڑا ہوا جاتی ہے۔ آفتاب اور کوشش کا

لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا خلع بھی جیڑا باد سے ہے۔ چھری کی نفاس پسند بنی شہر یار آفتاب کو مدد دیتی ہے تو اس کی محبت میں جکڑا ہوا جاتی ہے۔ آفتاب اور کوشش کا

لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا خلع بھی جیڑا باد سے ہے۔ چھری کی نفاس پسند بنی شہر یار آفتاب کو مدد دیتی ہے تو اس کی محبت میں جکڑا ہوا جاتی ہے۔ آفتاب اور کوشش کا

لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا خلع بھی جیڑا باد سے ہے۔ چھری کی نفاس پسند بنی شہر یار آفتاب کو مدد دیتی ہے تو اس کی محبت میں جکڑا ہوا جاتی ہے۔ آفتاب اور کوشش کا

لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا خلع بھی جیڑا باد سے ہے۔ چھری کی نفاس پسند بنی شہر یار آفتاب کو مدد دیتی ہے تو اس کی محبت میں جکڑا ہوا جاتی ہے۔ آفتاب اور کوشش کا

لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا خلع بھی جیڑا باد سے ہے۔ چھری کی نفاس پسند بنی شہر یار آفتاب کو مدد دیتی ہے تو اس کی محبت میں جکڑا ہوا جاتی ہے۔ آفتاب اور کوشش کا

لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا خلع بھی جیڑا باد سے ہے۔ چھری کی نفاس پسند بنی شہر یار آفتاب کو مدد دیتی ہے تو اس کی محبت میں جکڑا ہوا جاتی ہے۔ آفتاب اور کوشش کا

لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا خلع بھی جیڑا باد سے ہے۔ چھری کی نفاس پسند بنی شہر یار آفتاب کو مدد دیتی ہے تو اس کی محبت میں جکڑا ہوا جاتی ہے۔ آفتاب اور کوشش کا

لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا خلع بھی جیڑا باد سے ہے۔ چھری کی نفاس پسند بنی شہر یار آفتاب کو مدد دیتی ہے تو اس کی محبت میں جکڑا ہوا جاتی ہے۔ آفتاب اور کوشش کا

لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا خلع بھی جیڑا باد سے ہے۔ چھری کی نفاس پسند بنی شہر یار آفتاب کو مدد دیتی ہے تو اس کی محبت میں جکڑا ہوا جاتی ہے۔ آفتاب اور کوشش کا

لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا خلع بھی جیڑا باد سے ہے۔ چھری کی نفاس پسند بنی شہر یار آفتاب کو مدد دیتی ہے تو اس کی محبت میں جکڑا ہوا جاتی ہے۔ آفتاب اور کوشش کا

لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا خلع بھی جیڑا باد سے ہے۔ چھری کی نفاس پسند بنی شہر یار آفتاب کو مدد دیتی ہے تو اس کی محبت میں جکڑا ہوا جاتی ہے۔ آفتاب اور کوشش کا

لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا خلع بھی جیڑا باد سے ہے۔ چھری کی نفاس پسند بنی شہر یار آفتاب کو مدد دیتی ہے تو اس کی محبت میں جکڑا ہوا جاتی ہے۔ آفتاب اور کوشش کا

لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا خلع بھی جیڑا باد سے ہے۔ چھری کی نفاس پسند بنی شہر یار آفتاب کو مدد دیتی ہے تو اس کی محبت میں جکڑا ہوا جاتی ہے۔ آفتاب اور کوشش کا

لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا خلع بھی جیڑا باد سے ہے۔ چھری کی نفاس پسند بنی شہر یار آفتاب کو مدد دیتی ہے تو اس کی محبت میں جکڑا ہوا جاتی ہے۔ آفتاب اور کوشش کا

لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا خلع بھی جیڑا باد سے ہے۔ چھری کی نفاس پسند بنی شہر یار آفتاب کو مدد دیتی ہے تو اس کی محبت میں جکڑا ہوا جاتی ہے۔ آفتاب اور کوشش کا

لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا خلع بھی جیڑا باد سے ہے۔ چھری کی نفاس پسند بنی شہر یار آفتاب کو مدد دیتی ہے تو اس کی محبت میں جکڑا ہوا جاتی ہے۔ آفتاب اور کوشش کا

لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا خلع بھی جیڑا باد سے ہے۔ چھری کی نفاس پسند بنی شہر یار آفتاب کو مدد دیتی ہے تو اس کی محبت میں جکڑا ہوا جاتی ہے۔ آفتاب اور کوشش کا

”اور پچھت پر“ اس نے مختصر بتایا۔

”میں بھی وہیں جاتا ہوں۔ تم ابھی کو چگا کر انہیں بھی وہیں بھیج دو۔“ مقصود نے انہی کی طرف دیکھ کر کہا اور جلّت میں چھت پر جانے والے راستے کی طرف دوڑ گیا۔

انہی اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے لیے آگے بڑھ گئی۔ اس کا رخ اس کمرے کی طرف تھا جہاں آج کل حامد راؤ نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ چپ سے انہی کی ماں یعنی شفقت راؤ کی بیوی یہاں رہ رہی تھی، اس کی خواب گاہ اس کے اور اس کی اپنی بیوی کے زیر استعمال تھی۔ ذہنی ابتری کا شکار انہی کی ماں کو اتنا ہوش نہیں تھا کہ خود اپنا خیال رکھ سکے یا اپنے معمول کے کام انجام دے سکے، اس لیے حامد راؤ نے اپنی بیوی کو مستقل طور پر اس کے ساتھ بستی کر دیا تھا۔ ان کی آپس کی رشتے داریاں اور پیش اتنی گہری تھیں کہ اس کی بیوی کو یہ ذمہ داری بری نہیں لگی تھی اور وہ بڑی محبت اور خلوص سے اپنی زندگی کا خیال رکھ رہی تھی۔

”کیا بات ہے انہی پتر۔ تو کچھ پریشان لگ رہی ہے۔ تیری ماں کی طبیعت تو شکم ہے نا؟“ انہی کو رات کے اس پہر اپنے دروازے پر دیکھ کر حامد راؤ نے پریشانی سے پوچھا۔

”ماں شکیک ہیں ماموں جان لیکن ایک دوسری گڑبڑ ہے۔ کچھ لوگ ہمارے گھر کو گھیرے میں لے رہے ہیں۔ ماہ بانو کا شوہر اور مقصود اور پچھت پر سے جائزہ لینے گئے ہیں اور آپ کو بھی وہیں بلایا ہے۔“ اس نے تیز تیز بولتے ہوئے ایک ہی سانس میں اطلاع دی جس نے حامد راؤ کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ البتہ وہ زبان سے کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے چل پڑا۔ گھبراہٹ ہوئی انہی بھی وہیں پلٹ گئی۔ آج کل جو کچھ ہو رہا تھا، انوکھا ہی ہو رہا تھا۔ صداقت کی موت کے بعد ان کی زندگیوں میں کچھ بھی تارل نہیں رہا تھا۔ نوجوان بھائی کی موت کے بعد اس نے ماں کے پاگل پن کا صدمہ ہی کس طرح سہا تھا، یہ وہ خود ہی جانتی تھی۔ ان مشکل حالات سے غصے آچانک ہی اسلم اور ماہ بانو سے ملاقات ہو گئی اور ان کی آمد کے ساتھ ہی ایک اور تکلیف وہ انکشاف ہوا کہ پیر سامیں کے ٹھکانے کو آگ لگنے میں اس کے اپنے باپ کا ہاتھ تھا۔ یہ خبر آج ہی چند گھنٹے قبل مقصود نے سونے سے پہلے اسے سنائی تھی اور اب وہ آدھی رات کو اس اطلاع کے ساتھ چگاکی گئی تھی کہ ان کے گھر کو کچھ لوگ گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ گھر جس کی چار دیواری میں وہ خود کو محفوظ و مامون

سمجھتی آئی تھی، اچانک ہی غیر محفوظ ہو گیا تھا تو اس کا گھبراہٹا ہوا تھا۔ گھبراہٹ اور سرایتگی کی اس کیفیت میں گھری وہ اپنے کمرے کے سامنے پہنچی تو ماہ بانو اب بھی وہیں کھڑی تھی۔

”میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ مجھے اپنی رائفل چاہیے۔“ انہی کا شکل دیکھتے ہی اس نے مطالبہ کیا۔ اس گھر میں داخل ہوتے وقت وہ رائفل کو بڑی سی چادر میں چھپا کر لائی تھی لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ اتنے بڑے ہتھیار کو گھر کے مالکان سے پوشیدہ رکھا جاسکا۔ اس نے یہ بہانہ بناتے ہوئے کہ بے سفر میں اپنی حفاظت اور چاندروں کے شکار کے لیے یہ رائفل ساتھ رکھنی پڑی ہے، رائفل لانا انہی کے پاس رکھوا دی گئی۔ موجودہ حالات واضح نہیں تھے لیکن رات کے اندھیرے میں پوری جیسے ہونے والے محاصرے نے اس کے دل میں یہ خدشہ ضرور پیدا کر دیا تھا کہ یہاں محاذ آرائی کی ضرورت پیش آسکتی ہے چنانچہ دستیاب ہتھیاروں کا تیار رکھنا مناسب تھا۔

”کیا یہاں لڑائی جھگڑا ہونے والا ہے؟“ اس کے مطالبے پر انہی نے سبے ہوئے کچھ میں پوچھا۔

”ارے نہیں، بس میں احتیاطی تم سے رائفل مانگ رہی ہوں۔“ انہی کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر اسے ہمت نہیں ہو سکی کہ اسے اپنے خدشات سے آگاہ کرے چنانچہ نظر چراتے ہوئے اسے جھوٹی تسلی دینے کی کوشش کی ورنہ خود اس کے اپنے اندر جانے کو ان کوں سے اندیشہ سرشار رہے تھے۔ وہ مسلسل محاصرین کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ کون ہو سکتے ہیں۔ ایک امکان تو یہی تھا کہ وہ ان کے میزبان حامد راؤ کے کوئی دشمن رہے ہوں جبکہ دوسرا امکان اس سے زیادہ خوف ناک تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اسلم کی ڈاکوئی حیثیت ان کے لیے مصیبت نہ بن گئی ہو۔ وہ ایک ایسا مفروضہ ڈاکو تھا جو صرف پولیس ہی سے نہیں بلکہ اپنے ساتھیوں سے بھی بھاگا ہوا تھا اور ان میں سے کوئی بھی ایک اس کی تلاش میں یہاں پہنچ سکتا تھا۔ پولیس سے تو خیر مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن اگر آنے والے اسلم کے پرانے ساتھی تھے تو پھر ان سے مقابلہ کرنا ضروری ہو جاتا۔ ان لوگوں سے زیر ہو جانے کا نتیجہ ہلاکت یا اسلم کی گروہ میں واپسی کی صورت میں ہی نکل سکتا تھا اور یہ دونوں ہی صورتیں نا قابل قبول تھیں۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ایسا کچھ نہیں ہونے دے گی اور اپنے حوصلے کی آخری حد تک مقابلہ کرے گی۔

”یہ لو۔“ اپنے خیالوں میں گم اسے خبر بھی نہیں ہو سکی کہ انہی اک وہاں سے گئی اور رائفل لے آئی۔ اس کے مخاطب

کرنے پر وہ چونکی اور رائفل دونوں ہاتھوں سے تمام لی۔ ٹھنڈے لوہے کے کس نے اس کے اندر عجیب سی آگ بھڑکی۔ اس وقت وہ مارو دیا یا مر جاؤ والی کیفیت میں مبتلا تھی۔ زندگی میں در آنے والے فرار۔۔۔ نے اسے تھکا کر رکھ دیا تھا۔ مصائب تھے کہ کسی طور ہم تو ہونے کا نام نہیں لیتے تھے۔ ایک احتقان ختم نہیں ہوتا تھا کہ دوسرا سامنے آکھڑا ہوتا تھا۔ اب بھی جبکہ وہ ایک بہت بڑا سمجھوتا کرنے کے بعد اسلم کے ساتھ کھڑی زندگی گزارنے کا خواب دیکھنے لگی تھی، ایک اور مصیبت سامنے آکھڑی ہوئی تھی اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس مشکل کا ڈٹ کر مقابلہ کرے گی۔ اس عزم کے بعد اپنے اندر ایک نیا جوش و ولولہ سامحوس کرتی وہ کسی سپاہی کی شان سے چل پڑی۔ اندھیرے کے باوجود اس نے چھت پر جانے والی سیڑھیاں بڑے اعتماد سے طے کیں اور کھلی چھت پر پہنچ کر تاروں کی چھاؤں میں نظر آنے والے تینوں سایوں کا جائزہ لینے لگی۔ اگرچہ اسلم اس وقت مقصود کے کپڑوں میں لمبوس ہونے کی وجہ سے ان دونوں باپ بیٹی کی طرح شلوار ٹیٹس ہی پہنا ہوا تھا پھر بھی اسے اسلم کو کچھ پائے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ سیدھی اس کی طرف بڑھتی گئی۔

”کچھ معلوم ہوا کہ کون لوگ گھر کو گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟“ اسلم کے قریب پہنچ کر اس نے سرگوشی میں استفسار کیا۔

”یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکا۔ روشنی نہ ہونے کے برابر ہے اس لیے کسی کی شکل دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ ہم لوگ یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ وہ تعداد میں نہیں بائیس کے قریب ہیں اور حامد راؤ کے مطابق اپنے لباس اور چال ڈھال سے اسی گاؤں کے رہائشی لگتے ہیں۔ ہم نے فی الحال ان میں سے کسی کو چھیڑنے کی کوشش نہیں کی ہے اور خاموشی سے یہ دیکھتے رہے ہیں کہ وہ کس کس پوزیشن پر موجود ہیں۔“ اس نے ماہ بانو کے قدموں کی موہوم کی چاپ محسوس کر لی تھی اس لیے قریب پہنچ کر اس کے استفسار کرنے پر بنا چوٹے اسے جواب دینے لگا۔

”گاؤں کے رہائشی۔۔۔“ اس کا جواب سن کر ماہ بانو نے ایک پُرخیال ہنکارا بھرا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ وہ ہمارے دشمن نہیں ہیں۔“

”وہ ہمارے دشمن ہیں۔“ اسلم نے پُر زور لہجے میں اس کی تردید کی۔ ”میں اپنے دشمن کے دشمن کو بھی اپنا ہی دشمن سمجھتا ہوں۔“

”مہیں سمجھتا بھی چاہیے۔ میں نے جو بات کہی تھی

اس کا مقصد خود کو صورت حال سے الگ رکھنا نہیں تھا۔ میں بس اس بات پر اطمینان کا اظہار کر رہی تھی کہ ہمیں گھیرے میں لینے والوں کا تعلق پولیس یا ڈیکوئوں سے نہیں ہے۔“ اس نے اپنی صفائی پیش کی۔ اس سے قبل کہ اسلم جواب میں کچھ کہتا، نیچے دروازے پر زوردار دستک ابھری۔ دستک اتنی زوردار تھی جیسے دستک دینے والا سوتے ہوؤں کے بجائے مردوں کو جگانے کی کوشش کر رہا ہو۔

”اوپر سے جواب مت دینا۔ نیچے جا کر معلوم کرو کہ کون ہے؟“ انہیں معلوم نہیں چلنا چاہیے کہ ہم ان کی نقل و حرکت سے پہلے ہی واقف ہو چکے ہیں۔“ اسلم نے مقصود کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے سرگوشی میں ہدایت دیں جنہیں سن کر وہ تابع داری سے سر ہلاتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ دوسری طرف حامد راؤ کی ڈھکی چھکی کی طرح چھت پر ٹپک لگا رہا تھا۔

”میں ان میں سے کسی کو کچھوڑوں گا نہیں۔ یہ جو بھی لوگ ہیں، انہوں نے حامد راؤ کے گھر کی طرف نظر ڈال کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔“ ایک دیواری منڈیر پر لگی جالیوں میں سے اطراف کا جائزہ لینے کے بعد دوسری دیواری کی طرف جاتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔ اس کا مخاطب کوئی نہیں تھا لیکن اسلم اور ماہ بانو دونوں ہی نے اس کے الفاظ سے تھے۔ اسلم کے لیے حامد راؤ کا وہ روپ حرمت انگیز تھا۔ اس گھر میں قدم رکھنے کے بعد اس نے ہر لمحے اسے بہت نرم خوا اور صلح جو انسان پایا تھا جسے اپنے دوست، کزن اور بہنوئی شفقت راؤ سے تمام تربیت کے باوجود اس کے اقدام سے اختلاف تھا۔ جو بھٹتا تھا کہ شفقت راؤ کو انتقام کی اندھی راہ پر چلتے ہوئے براہ راست ٹھکرنے یا ہمدردی لگانے کے بجائے انصاف کے لیے قانون سے رجوع کرنا چاہیے تھا۔ اب وہی قانون پسند حامد راؤ غیظ و غضب میں مبتلا تھا۔

”میں گاؤں والوں کا قاتل نہ بن کر آیا ہوں۔ گاؤں والوں کا مطالبہ ہے کہ شفقت راؤ کی بیوی اور بیٹی کو ان کے حوالے کیا جائے تاکہ ہم ان سے شفقت راؤ کے جرم کا حساب لے سکیں۔“ نیچے مقصود دروازے پر پہنچ چکا تھا اور یقیناً اس نے آنے والے سے اس کی آمد کے بارے میں استفسار کیا تھا جس کے جواب میں انہیں یہ مطالبہ سننے کو مل رہا تھا۔

”یہ کیا نکوسا کر رہے ہو؟ تم اپنے ہوش میں تو ہو۔“ مقصود نے یقینی طور پر دروازہ کھولنے کی حماقت نہیں کی تھی لیکن وہ باہر موجود شخص کے مطالبے پر اتنی بری طرح چراغ پا ہوا تھا کہ اس کی بلند عسلی آواز انہوں نے اوپر چھت تک سنی تھی۔ باہر کھلے میں موجود شخص کی آواز تو چھت پر سنائی دینا

کچھ بڑی بات نہیں تھی لیکن گھر کے دروازے کے اندر موجود مقصود کی آواز سنائی دینا اس کے غصے کا گراف بلند ترین ہونے کی نشانی تھی۔

”بوس میں تو ہم اب آئے ہیں۔ ہمیں ملوم ہی نہیں تھا کہ ہم خانقاہ کو آگ لگانے والے جس غیثی شیطان کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں، وہ اپنے ہی گاؤں کا اتنا عزت دار آدمی نکلے گا۔ شفقت راؤ نے جو جرم کیا ہے، اسے ہم کسی صورت ماف (معاف) نہیں کر سکتے۔ اسے تو خیر ہم بعد میں ڈھونڈ کر سخت سزا دیں گے ہی لیکن پہلے اس کی دہی اور گھر والی کو ہمارے حوالے کرو۔ جب ہم اس کے گھر کی عورتوں کو گھجاکر کے سر عام ان کے سروں پر جوتے برسائیں گے تو شفقت راؤ کی ساری عزت داری مٹی میں مل جائے گی۔ اسے ملوم ہو جائے گا کہ جس پنڈے کو لوگوں نے اسے عزت دے رکھی تھی، ان کے ساتھ دھوکا کرنے کا کیا نتیجہ...“ باہر موجود شخص شاید کوئی پرجوش یا تفریر کرنے کے موڈ میں تھا لیکن فضا میں گونجنے والی فائز کی آواز نے اسے اس کا جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔ یہ حامد راؤ تھا جو اوپر آنے سے پہلے اپنا بڑے بورکار یا اور مساجد لے کر چڑھا تھا۔

”اپنی زبان بند کر سکتے۔ اب اگر تو نے اپنی ناپاک زبان سے اس گھر کی عورتوں کا ذکر کیا تو اگلی کوئی تیرے بیچے میں لگے گی۔“ حامد راؤ کی آواز میں تہررس رہا تھا۔

”تبی اس ماطے سے الگ رہو حامد راؤ صاحب! ہمیں ملوم ہے کہ شفقت نے جو کچھ کیا، تبی اس میں شامل نہیں تھے۔ ہم آپ کو ہر آپ کے گھر والوں کو کچھ نہیں کہیں گے۔ ہماری دشمنی شفقت ہو اس کے گھر والوں سے ہے۔ ہور انہیں ہم کسی صورت میں ماف نہیں کریں گے۔ آپ کے لیے بہتر ہے کہ آپ خاموشی سے ایک طرف ہو جاؤ ورنہ خانقاہ (خونخواہ) زد میں آ جاؤ گے۔“ وہ کوئی بہت ہی منہ پھٹ اور بدخیز آدمی تھا جو نہایت اچلے بچے میں حامد راؤ سے کہہ رہا تھا۔

”تم باہل الوکے پٹھے ہو جسے یہ بھی نہیں معلوم کہ جن عورتوں کا مطالبہ کر رہے ہو، وہ صرف شفقت ہی کی نہیں میرے گھر کی بھی عزت ہیں۔ اپنی بہن اور بہو کو کس کیسے بے عزتی کے لیے تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔ اور اگر ان سے میرا رشتہ نہ ہوتا تب بھی میں اپنے دوست کی عزت تمہارے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔ اگر شفقت نے کوئی جرم کیا ہے تو جا کر اسے تلاش کرو اور سزا دو لیکن اس طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا ورنہ اپنی آنکھیں کھو بیٹھو گے۔“ بوڑھا شیر پوری قوت کے ساتھ گرج رہا تھا۔

”تھاڈی مرضی راؤ صاحب! اب ہم سے کوئی شکوہ نہ کرنا۔“ اسی اجڑا آدمی نے جواب دیا لیکن پھر فوراً ہی فضا میں اس کی زوردار گونج گئی۔ حامد راؤ نے اسے مزید کوئی موقع دے بغیر اس کی گستاخی کا مزہ چکھنا ہی چاہا۔ یقینی طور پر وہ بڑھ چڑھ کر بولنے والا اس وقت خاک و خون میں لوٹ رہا تھا۔ ان میں سے کسی کے پاس بھی حامد راؤ کے شکاری حالت دیکھنے کی مہلت نہیں رہی تھی۔ پہلا فائز ہوتے ہی دوسری طرف سے گولیوں کی برسات کر دی گئی تھی۔ وہ تعداد میں کئی تھے اور متفرق اسلحے سے لیس تھے۔ ان لوگوں کے مقابلے میں انہیں صرف ایک برتری حاصل تھی کہ وہ چار دیواری میں محفوظ ہونے کے علاوہ حملہ آوروں کی پوزیشنز سے اچھی طرح واقف تھے۔ اپنی دانست میں تو وہ بے خبری میں ان پر شب خون مارنے آئے تھے لیکن محض اتفاقاً اسلم کے چھت پر پہنچ جانے کی وجہ سے ان کی سازش ٹل اڑ وقت بے نقاب ہوئی اور ان لوگوں کو مقابلے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہونے کی مہلت مل گئی۔

فائزنگ شروع ہونے کے بعد مقصود بھی اوپر چھت پر ہی چلا آیا تھا۔ دروازے کی طرف سے دونوں باپ بیٹے کو اطمینان تھا کہ وہ اتنا مضبوط ہے کہ اسے توڑ کر گھر میں ٹھننا ممکن نہیں ہوگا۔ پھر وہ لوگ کسی کو دروازے کے قریب پھسلنے کی مہلت دیتے تو کوئی دروازہ توڑنے کی کوشش کرتا بھی۔ تعداد میں کم ہونے کے باوجود ان کی طرف سے بہت بڑے تلے فائز کیے جارہے تھے جس کا ثبوت وہ جیشیں اور کراہیں تھیں جو باہر سے وقتاً فوقتاً سنائی دے رہی تھیں۔ فائزنگ کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے اسلم نے اپنا مکمل ماہ بانو کے حوالے کر کے اس سے داخل لے لی تھی۔ اس کی آزمودہ رائل اس وقت سب سے زیادہ تہررا گل رہی تھی۔ وہ جین چین کرکین گا ہوں میں چپے دشمنوں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ اچھا خاصا نقصان اٹھانے کے بعد حاصرہ کرنے والوں کو اندازہ ہو سکا کہ ان کی کمین گاہیں پوشیدہ نہیں ہیں اور انہیں تاک تاک کر نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ وہ بوکھلاہٹ میں اپنی پوزیشن تبدیل کرنے کی کوشش کرنے لگے اور اس کوشش میں مزید ایکسپوز ہو گئے۔ ان لوگوں نے حملہ آوروں کی اس بوکھلاہٹ سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا لیکن بہر حال وہ تعداد میں زیادہ تھے اور انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ جن میں بھیجیں کو وہ دیکھ سکے تھے، ان کے علاوہ بھی مزید مک چلے جی بھی چنانچہ ان کی کو نشانہ بنالینے کے باوجود ان کا پلڈ ہماری نہیں ہو سکا تھا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ مکمل تعداد اور محدود اسلحے کے باوجود بہترین دفاع کر رہے تھے۔

”ہم بہت زیادہ دیر تک ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں اپنی جائیں بچانے کے لیے یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔ کیا تمہارے پاس ایسی کوئی ترکیب ہے جس کی مدد سے ہم یہاں سے نکل سکیں؟“ اسلم کو سب مقابلوں کا تجربہ تھا اس لیے وہ اس مقابلے میں اپنی پوزیشن کا اندازہ کر سکتا تھا۔ مقابلے پر موجود لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اسے تشویش میں مبتلا کیا تو وہ ہلکتا ہوا مقصود کے قریب پہنچ گیا اور اس خیال سے اس سے پوچھا کہ گھر کا مالک وکیلین ہونے کی وجہ سے وہ یہاں سے فرار کا راستہ جانتا ہوگا۔

”مکان کی پچھلی دیوار سے ملنا ہمارا گودام ہے۔ وہاں ایک سوزو کیپک اب بھی موجود ہے۔ مکان اور گودام کے درمیان دروازہ بھی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم یہاں کا محاذ چھوڑ کر وہاں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ یہاں فائزنگ رکے گی تو وہ لوگ گھر پر چڑھ دوڑیں گے؟“ مقصود نے چڑھے ہوئے سانس کے ساتھ اس کے سوال کا جواب دیا جو بڑا حوصلہ بخش تھا۔

”ہم یہ محاذ ایک ساتھ نہیں چھوڑیں گے بلکہ ایک ایک کر کے یہاں سے جائیں گے۔“ اسلم نے پہلے ایک فائز داغا پھر اس کی بات کا جواب دیا۔

”ایسا کرو کہ پہلے تم نے بچے جاؤ اور گھر کی خواتین کو لے کر گودام میں پہنچو۔ وہاں پہنچ کر گاڑی میں بیٹھنے میں تمہیں کتنی دیر لگے گی؟“ اسے ہدایت دینے کے ساتھ ساتھ اس نے سوال بھی کیا۔

”زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔“ اس نے جواب دیا۔

”او کہ تو پھر جاؤ اور اپنا ہتھیار بھی میرے حوالے کر دو۔ پانچ منٹ بعد میں ماہ بانو کو بھیجیں گا۔ البتہ جانے سے پہلے ہمیں گودام کے دروازے کی لوکیشن بتا دو تاکہ ہم پھسکیں نہیں۔“ اس کی عقلی نظر میں مسلسل باہر کا جائزہ لے رہی تھیں پھر بھی وہ مقصود کی طرف متوجہ تھا۔

”اگر میں پہلے اباجی کو نیچے بھیج دوں تو...؟“ مقصود تذبذب کا شکار تھا۔

”میں نے سوچ سمجھ کر تمہارا نام لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم گودام میں پہنچتے ہی اپنی پک اپ کا انجن اسٹارٹ کر دو اور باہل ریزہ رہو کہ جیسے ہی ہم میں سے آخری فرد بھی وہاں پہنچتا ہے، فوراً گاڑی باہر نکل لو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان حالات میں راؤ صاحب کے لیے ڈرائیونگ کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ وہ اس وقت طیش میں ہونے کی وجہ سے بے خشک

بہت پرجوش نظر آ رہے ہیں لیکن کسی بھی لمحے ان کی ہمت جواب دے سکتی ہے۔“ اس نے مقصود کو مکمل وی تو وہ اس کی ہدایات پر عمل کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مقصود کے بعد ماہ بانو کی باری تھی جس نے بنا کسی تیل و جھٹ کے پانچ منٹ بعد نیچے کا رخ کر لیا۔ راستہ تو انہیں مقصود بتائی چکا تھا۔ ماہ بانو کی روانگی کے بعد اس نے حامد راؤ سے نیچے جانے کو کہا۔ اس دوران وہ چھت پر ادھر ادھر گھوم کر مختلف ستون سے فائز کر چکا تھا۔ فائزنگ کرتے ہوئے اس نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اپنے اور مقصود دونوں کے ہتھیار باری باری استعمال کرے تاکہ اگر حملہ آوروں میں کوئی اسلحے کا ماہر ہو تو اسے چھت پر موجود نفری میں کسی کا احساس نہ ہو۔ فائز وہ پہلے ہی سنبھل کر محدود تعداد میں کر رہے تھے اس لیے فائزنگ کے سلسل میں کسی کا احساس کرنا مشکل تھا۔ ان کی نیچی تلی فائزنگ نے حملہ آوروں کو خشک ٹھاک نقصان پہنچایا تھا لیکن اب وہ بھی سنبھل چکے تھے اور بی پوزیشنز لے لی تھیں اس لیے کوئی نقصان نہیں اٹھا رہے تھے۔

”میں آخر میں جاؤں گا، تم پہلے جاؤ۔“ اس کی طرف سے نیچے جانے کی ہدایت سن کر حامد راؤ نے جواب دیا۔ یقیناً وہ اپنی روایات اور وضع داری نبھانے کے لیے مہمان کے تحفظ کو مقدم رکھ رہا تھا۔

”یہ وقت بحث کا نہیں ہے راؤ صاحب! آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مجھے اسلحہ استعمال کرنے میں آپ سے زیادہ مہارت حاصل ہے۔ آپ نہ تو میری طرح بیک وقت دو ہتھیار استعمال کر سکتے ہیں اور نہ ہی میری جتنی پھرتی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ آپ میری نگر کے بغیر آرام سے نیچے جائیں اور گاڑی میں بیٹھیں۔ میں انشاء اللہ دو تین منٹ میں آپ تک پہنچ جاؤں گا۔“ اس نے بنا کسی گلی لپٹی کے صورت حال حامد راؤ کے سامنے رکھ دی جس سے وہ یقیناً انکار نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ جھجکا کر نیچے کا رخ کر لیا۔ اب چھت پر صرف اسلم موجود تھا جو دوڑ کر بھی ایک دیوار کے عقب سے فائز کرتا تھا، بھی دوسری۔ اس کی یہ ترکیب کارگر تھی اور حملہ آور ہر طرف سے فائز آتا دیکھ کر گھر کے زیادہ نزدیک آنے کی ہمت نہیں کر پارہے تھے۔ آخر تیسرے منٹ پر اس نے بھی چھت چھوڑ دی اور تیزی سے سیڑھیاں عبور کر کے گودام کی طرف جانے والے راستے پر دوڑ پڑا۔ تیسرا منٹ ختم ہونے سے پہلے وہ گودام میں موجود تھا جہاں مقصود نے پک اپ کا انجن اسٹارٹ کر رکھا تھا اور وہ لوگ اندر بیٹھے اسی کی راہ دیکھ رہے تھے۔

”میں گودام کا دروازہ کھولوں ہوں، تم گاڑی نکالنے چلے جاؤ۔ میں چلتی گاڑی میں ہی سوار ہوجاؤں گا۔“ اس نے مقصود کی طرف دیکھتے ہوئے اسے ہدایت دی اور پھر حامد راؤ کی طرف متوجہ ہوا۔

”آپ ہتھیار تیار رکھیے گا راؤ صاحب! اگر دروازے کے باہر کوئی موجود ہو تو آپ کو ہی اس سے نمٹنا پڑے گا۔“ اس نے اپنی رائل پک اپ کے فرش پر پھینک دی لیکن مظل سے نہیں چھوڑا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دیکھا جاتا تو اس وقت اس کی جان سب سے زیادہ خطرے میں تھی لیکن وہ غیر معمولی جرأت مندی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ شاید ایسا اس لیے تھا کہ آج وہ کسی کو لوٹنے کے بجائے ایک بے گناہ خاندان کی حفاظت کے خیال سے میدان کارزار میں اترتا تھا۔ حامد راؤ نے سوتے ہوئے چہرے کے ساتھ سر ہلا کر اس کی ہدایات پر عمل پیرا ہونے کا اشارہ دیا تو وہ گودام کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ یہ دروازہ بھی کافی بھاری اور مضبوط تھا اور خاصی آواز کے ساتھ کھلتا تھا لیکن امید کی جا سکتی تھی کہ باہر پافارنگ کے شور میں یہ آواز سنائی نہیں دی تھی ہوگی۔

اس کے دروازہ کھولنے ہی مقصود تیزی سے پک اپ لے کر باہر نکلا۔ وہ بے مثال پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا پچھلے حصے سے لنگ گیا۔ آگے حامد راؤ مقصود کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ پک اپ کے باہر نکلنے ہی بدترین خدشات جج ہو کر سامنے آ گئے۔ اس طرف بھی حملہ آور موجود تھے چنانچہ گاڑی کے باہر نکلنے ہی ان پر فائر کیا گیا۔ اس فائر کا حامد راؤ نے فوراً جواب دیا۔ دوسری طرف اسلم بھی پیچھے نہ رہا اور بے پناہ مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف ایک ہاتھ کی مدد سے لٹکے لٹکے دوسرے ہاتھ سے جوانی فائر داغ دیا۔ اس موقع پر مقصود کی کارکردگی بھی لائق تحسین تھی۔ اس نے کسی بھی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر ڈرائیونگ جاری رکھی اور گاڑی کو وہاں سے نکالنا چلا گیا۔ خوش قسمتی سے اس جانب ایک دو سے زیادہ افراد موجود نہیں تھے اس لیے انہیں وہاں سے نکلنے میں بہت زیادہ مشکل پیش نہ آئی اور سوز و گداز اپنے مسافروں کو لیے رات کے اندر میرے میں آگے بڑھتی چلی گئی۔

☆☆☆

حویلی میں صف ماتم بچھی تھی۔ صنوبر اور تاجور اپنی ماں کی موت کے غم میں پچھڑائیں کھا رہی تھیں۔ کشور کی ماں چودھرائن ایک جانب ساکت سی بیٹھی تھی۔ اصولاً اسے آج اپنی سوکن اور حویلی میں سب سے بڑی حریف کی موت پر

آسودہ ہونا چاہیے تھا لیکن وہ سکتہ زدہ تھی اور اس قابل بھی نہیں رہی تھی کہ چودھرائی کی واحد زندہ بیوی کی حیثیت سے سارے کاموں کی نگرانی کر سکے۔ اپنی اس بے نیازی پر اسے بعد میں چودھرائی کے عتاب کا نشانہ بھی بننا پڑ سکتا تھا، اس کے باوجود اس میں حوصلہ نہیں تھا کہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کچھ کر سکے۔ وہ تو زبانی احکامات جاری کرنے سے بھی معذور تھی اور ایسا شاید اس لیے تھا کہ آج اس کے سامنے دوڑی چودھرائن کا تابوت میں بند بے جان جسم رکھا ہوا تھا۔ وہ دوڑی چودھرائن جس کے حکم کا سکھ پوری حویلی پر چلتا تھا، آج بے بسی کی تصویر بنی لوگوں کے کندھوں پر اپنی آخری آرام گاہ تک پہنچانے جانے کی منتظر تھی۔

چودھرائن تھامید نے حویلی میں دوڑی چودھرائن کے اقتدار کا سورج پوری طرح جگمگا تا اور پھر ڈوبتا ہوا دیکھا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ حویلی کی کوئی عورت دوڑی چودھرائن کی عسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی یہاں تک کہ وہ خود چودھرائی کی بیوی ہونے کے باوجود اپنی سوکن کے برابر حقوق کی حق دار نہیں تھی۔ لیکن پھر اس نے بھی دیکھا تھا کہ دوڑی چودھرائن، چودھرائی کے زیر عتاب آئی تو سر بری طرح گر گئی۔ دوڑی چودھرائن کے حویلی کے تھانے میں قید کیے جانے کا واقعہ خود اس کے اپنے علم میں بھی تھا لیکن اس سے آگے وہ وہی کہانیاں سنتی رہی تھی جو چودھرائی حویلی میں پھیلا رہا تھا۔ اسے ان میں سے کسی ایک کہانی پر بھی یقین نہیں تھا لیکن یہ بھی نہیں سمجھتی تھی کہ وہ اس حد تک پہنچ جائے گا کہ دوڑی چودھرائن کی جان ہی لے لے گا۔ وہ دوڑی چودھرائن کے قتل کی ایک طرح سے واقفانی گواہی لیکن لب کشائی کی ہمت نہیں رکھتی تھی اور مہر پر لب بیٹھی اس بڑے سے ہال میں ہوئی گریہ و زاری سن رہی تھی۔ تاجور اور صنوبر کے علاوہ بھی وہاں رونے والی عورتوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ ان میں سے کچھ رشتے دار عورتیں تھیں اور بہت سی گاؤں کی وہ بے حیثیت و عسرت زدہ عورتیں جنہوں نے دوڑی چودھرائن کی زندگی میں جانے اس کی کتنی جھڑکیاں سنی تھیں اور اس کے بے رحمانہ فیصلوں کا شکار ہوئی تھیں۔ ان مظلوم عورتوں کو اس کی موت پر غمغمو ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ بغیر ہی رو رہی تھیں کہ صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں بکراؤ زن یہی جانتا تھا کہ انہیں اپنے آقاؤں کی موت پر غم کا اظہار کرنا ہے، پھر ایک پہلو یہ بھی تھا کہ انہیں معلوم تھا کہ اس اہم موقع پر جبکہ حویلی کی جملہ خواتین غم سے نڈھال نظر آ رہی ہیں، کچھ نادیہ لگا ہیں ان پر نگراں ہوں گی اور بعد میں کسی وقت وہ صرف اس وجہ

سے بھی معتب قرار دی جا سکیں گی کہ انہوں نے دوڑی چودھرائن کی موت پر آنسو نہیں بہائے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی قلبی کیفیات کی پروا کے بغیر پوری شدہ سے اظہار غم میں مصروف تھیں۔ گاؤں کی ان نادار عورتوں کو مستقل طور پر ہال میں رکھنے کی اجازت نہیں تھی بلکہ وہ ٹولیوں کی صورت میں وہاں آتی تھیں اور تھوڑی دیر آہ و بکا کرنے کے بعد باہر روانہ کر دی جاتی تھیں۔

اس ماحی فضا کا رنگ اس وقت اور بھی گہرا ہو گیا جب مراد شاہ اور اس کی بیوی اپنی بیٹی سمیت وہاں پہنچے۔ بہنیں، بھائی اور بھانوج کو سامنے پا کر ان سے پٹ نکلیں اور دھاڑیں مارنے لگیں۔ وہ دونوں خود بھی غم زدہ تھے لیکن پھر بھی روٹی بھلتی بہنوں کو سوسنانے لگے۔ دور دیں سے آنے والے بھائی کو اپنا اتنا قرض تو ادا کرنا ہی تھا۔ کہنے کو تو اس حویلی میں ایک بھائی اور بھانوج اور بھی تھے لیکن ذہنی معذور بہن اور شاہ کی بساط ہی کیا تھی کہ بہنیں اس سے اپنا غم بانٹیں۔ رہی اس کی نام نہاد بیوی فریدہ تو اسے بھی حویلی میں کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہیں تھا۔ وہ اچھوتوں کی طرح حویلی کی بالائی منزل تک محدود رہی جاتی تھی اور بظاہر بھراؤ شاہ کی بیوی ہوتے ہوئے چودھرائی کے ہاتھوں کھلونا بنی رہی تھی۔ اس وقت فریدہ بھی اس وسیع و عریض ہال میں موجود تھی لیکن اس کے چہرے پر غم کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ جس عورت نے اسے اس کی کوکھ میں موجود بچے سمیت ہلاک کرنے کی سازش کی تھی، اس کی موت پر اسے معصومی دکھ کا اظہار کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یہاں بیٹھ کر کبھی وہ اپنے بچے میں مگن تھی اور چودھرائن کی گریہ و زاری کرتی اولاد سے قطعی بے نیازی تھی۔ اس نے ان میں سے کسی سے اظہار تحریت نہیں کیا تھا۔ تاجور اور صنوبر نے اس کی اس بے نیازی کو بتوئی محسوس کیا تھا اور وہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی تھیں۔ فی الوقت اسے کچھ کہنا مناسب نہیں تھا۔ نہ ہی وہ اسے یہاں سے اٹھا سکتی تھیں، البتہ یہ بات خوب محسوس کر رہی تھیں کہ فریدہ درحقیقت دوڑی چودھرائن کی میت میں شرکت کے لیے نہیں بلکہ خود کو حویلی کی بہو باور کر دانے کے لیے وہاں موجود ہے اور افسوس کے لیے آنے والی ہر قابل ذکر عورت سے خاص طور پر یوں بڑھ چڑھ کر مل رہی ہے جیسے وہ حویلی میں بڑا خاص مقام رکھتی ہو۔

دل ہی دل میں دونوں بہنیں فریدہ سے بعد میں منسنے کا عزم باندھ کر موجودہ صورت حال کو بھار رہی تھیں۔ دیکھنے والی ہر آنکھ نے دیکھا تھا کہ ماں کی موت بیٹیوں کے لیے کتنے غم کا

سبب بنی ہے۔ اللہ اللہ کہ کے آخریت اٹھنے کا وقت آیا۔ چودھرائن کا تابوت اپنی آخری آرام گاہ کے لیے روانہ کیا گیا تو گویا کبرام سانچ گیا۔ غم زدہ تاجور اور صنوبر ایسی بے حال ہو گئیں کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ تاجور تو شدت غم سے بے ہوش ہی ہو گئی۔ عورتوں نے بڑی تدبیریں کر کے اسے ہوش دلایا پھر کسی کے شور سے پریشان آرام کے لیے الگ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس موقع پر شاہدہ نے رشتے دار خواتین سے درخواست کی کہ انہیں کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیا جائے تو دونوں بہنوں کو آرام کا موقع مل جائے گا۔ اپنی بھانوج پر اس لمحے دونوں بہنوں کو بڑا پیارا آیا۔ وہ خود بھی دل سے تنہائی کی منتھی تھیں کہ دور دور کر سرد سے پچھتا جا رہا تھا اور اب دل شدت سے آرام کا خواہاں تھا۔ مراد شاہ کی بیوی شاہدہ انہیں بند کمرے میں چھوڑ کر باہر نکلی تو دونوں نے سوکن کا سانس لیا۔

”تو بے رہا۔ دور دور حلق خشک ہو گیا۔ ذرا فرج میں سے جھانک کر دیکھ کر کوئی جوس وغیرہ پڑا تو منجھے دے۔ اتنی دیر کی محنت سے جان آدمی ہو کر رہ گئی ہے۔“ تاجور نے فوراً ہی نرم گرم کمر بستہ پر دراز ہوتے ہوئے چھوٹی بہن سے فرمائش کی جسے سن کر اس نے مذہب تو بنایا لیکن انکار نہیں کر سکی اور روم ریلفیر بیڑ کھول کر اس میں جھانکا۔ اندر اپیل جوس کا ڈبا رکھا ہوا تھا۔ اس نے ایک گلاس بھر کر بہن کو دیا اور دوسرا خود لے کر بیٹھ گئی۔

”تو نے جنازہ اچھتے وقت اباجی کی شکل دیکھی تھی؟ ایسی رونی صورت بنائی ہوئی تھی جیسے وہ خود ہی سب سے زیادہ غم زدہ ہوں۔“ جوس کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر تاجور نے صنوبر سے دریافت کیا۔

”تم تو اس وقت بے ہوش ہو گئی تھیں تمہیں کیسے معلوم؟“ صنوبر نے حیرت سے پوچھا۔

”اباجی کی صورت دیکھ کر ہی تو منجھے بے ہوش ہونے کا خیال آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب اباجی جیسا آدمی اماں کی موت پر ایسی غم ناک شکل بنا کر بیٹھا ہے تو میں تو خیر دھی ہوں۔ میرے صرف رونے دھونے سے کام نہیں ہے گا اس لیے بے ہوش ہو گئی۔“ تاجور نے مزے سے بتایا۔

”ہیں... تو تو اداکاری کر رہی تھی؟“ صنوبر کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

اماں کی سوکن بنا کر چھوڑتے۔“ تاجور نے بے رحمی سے جواب دیا۔

”سو تو ہے۔“ صور فوراً ہی قائل ہو گئی۔ ”اباجی کو کبھی بھی اماں سے محبت نہیں رہی۔ اگر اماں کا یہ کام مضبوط نہ ہوتا تو جانے اباجی ہو ر کون کون سے گل کھلاتے۔ کس تو خیر انہوں نے اب اباجی کوئی نہیں چھوڑی تھی۔ بس اتنا تھا کہ اماں کا حویلی میں راج تھا اور ان کے ہوتے کسی سوکن میں اتنا دم نہیں تھا کہ ان کے مقابلے پر کھڑی ہو سکتی۔ ہماری ایسی دینک اماں کیسے چٹ پٹ ہو گئی، ذرا خیر نہیں ہو سکی۔ مجھے تو اس معاملے میں کوئی گڑبڑ ہی لگتی ہے۔“ صور نے دھیمی آواز میں اپنے شبہات کا اظہار کیا۔

”گڑبڑ تو خیر ہے۔ اباجی، اماں سے ناراض تھے۔ یہ اطلاع تو پچی ہے، یہ اطلاع دینے والی کو ساری تفصیلات معلوم نہیں ہیں۔ اماں کب بیمار ہوئیں، اس کو یہ بھی خبر نہیں۔ نہ ہی اس نے انہیں علاج کے لیے حویلی سے باہر جاتے دیکھا۔ اس کا یہی کہنا ہے کہ سارے نوکر چاکر حیران ہیں کہ وڈی چودھرائن کو ایسی سی بیماری ہو گئی کہ انہیں کاٹوں کان خبر بھی نہیں ہوئی اور انہیں علاج کے لیے حویلی سے روانہ کر دیا گیا۔“ تاجور نے اس کے شبہات کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا۔ وہ دونوں ہی یہ نہیں اپنے گھر کی تھیں لیکن حویلی میں ان کا جاسوسی کا کیا کیا سانیٹ ورگ موجود تھا۔ حویلی کی بعض ملازماؤں کے ذریعے انہیں یہاں کے حالات کی خبر ملتی رہتی تھی۔ چودھرائن کے علاج کے لیے بیرون ملک مقیم ہونے کا سن کر انہوں نے بہت کوشش کی کہ اصل صورت حال سامنے آجائے لیکن وہ کوئی قابل ذکر یا ٹھوس معلومات حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔

”مجھے تو لگتا ہے کہ اباجی کی ناراضی کا فریہ والے معاملے سے تعلق ہے۔ وہ جب اسپتال میں داخل تھی، تب اس کا بھرا حویلی بھی آیا تھا۔ اس کے واپس جانے کے بعد ہی ملازموں نے اباجی کو غصے میں دیکھا تھا۔ ہو فیرا چانک اماں حویلی سے غائب ہو گئی۔“ صور کا دماغ بہتر کام کر رہا تھا اس لیے اس نے حالات کا بہت واضح نہج لیکن ٹھیک ٹھاک تجزیہ کر ڈالا۔

”تیری گل دل کو لگتی ہے۔ میرا تو دل ہول رہا ہے۔ اگر اباجی کو اس گل کی چمک پڑی ہے کہ اماں نے جان بوجھ کر فریدہ کو یز جیوں سے گردایا تھا تو فیر ہو رہی بہت کچھ معلوم ہو گیا ہوگا۔ یوں سمجھ لے کہ اب اماں کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں کی بھی خیر نہیں ہے۔“

”ایسے ہول بھی نہ دلاؤ ڈی آپا۔“ صور برہمن کی بات سن کر تھرائی۔

”ہول تو خود میرے اٹھ رہے ہیں۔ چلو اماں کی تو کوئی گل نہیں۔ اس نے تو دنیا میں سب دیکھ لیا تھا، خوب جی بھر کر حویلی پر راج بھی کیا تھا ہو راولا دوں کی اولادیں تک دیکھ لی تھیں۔ ہمارے تو ابھی اپنے بچے چھوٹے چھوٹے ہیں۔ تیرے کا کے نے تو ابھی دودھ پینا بھی نہیں چھوڑا۔ ذرا سوچ ایسی بھری جوانی میں دنیا چھوڑنی پڑی تو کتنا دل دیکھے گا۔“ وہ اپنی متوجہ موت کے خیال سے اپنی رنجیدہ ہو گئی تھی کہ گلاس میں موجود سب کے جوس کا آخری گھونٹ پینا بھی بھول گئی تھی۔ سنجیدگی اور رنجیدگی کی اس ملی جلی کیفیت میں دونوں بہنوں کے چہرے خاص منحنیہ خیز لگ رہے تھے لیکن انہیں ہوش نہیں تھا۔ البتہ اوپر کہیں وڈی چودھرائن کی روح تڑپ تڑپ کر بے حال تھی کہ جس اولاد کی خاطر اس نے سازشوں کے جال بنے، اپنی راج دھانی سے محروم ہوئی اور اذیت ناک موت کو گلے لگایا، وہ اولاد خود مرضی کی اس انتہا پر پہنچی ہوئی تھی کہ ماں کے مرنے کا سرے سے کوئی غم نہیں تھا۔ جتنے آنسو بہائے گئے تھے دنیا دکھاوے کے لیے بہائے گئے تھے اور اب اپنی فکر دامن گیر تھی۔

☆☆☆

کاغذ پر قلم چلاتے چلاتے اس نے نظر اٹھا کر وال کلاک کی طرف دیکھا۔ اس کے اندازے کے مطابق اب تک مشاہیرم خان کو واپس آ جانا چاہیے تھا۔ مشاہیرم خان اس کے حکم پر کالے میاں سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں ٹاہلی والا کی صورت حال معلوم کرنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ ٹاہلی والا کے پیڑسائیں کا جو مشکوک کردار سامنے آیا تھا، اس نے شہر یار کے دل میں تجسس پیدا کر دیا تھا۔ اسے شک تھا کہ پیرسائیں بھی کہیں شاہنواز اور مولوی غلام محمد جیسے لوگوں میں سے نہ ہو جو مذہبی شخصیت کا مقدس لبادہ اوڑھ کر سیدھے سادے معصوم لوگوں کے ذہنوں کو تباہ کرنے کے مشن پر مامور تھے۔ اپنے اس شک اور تجسس کی وجہ سے اس نے مشاہیرم خان کو ٹاہلی والا روانہ کر دیا تھا کہ وہ وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر خاموشی سے واپس آجائے۔ مشاہیرم خان ایک عام زائر کی طرح وہاں گیا تھا اس لیے اس نے ذاتی گاڑی کے بجائے بس سے سفر کیا تھا۔ اسے پیرسائیں کی خانقاہ پہنچ کر صرف اتنا کرنا تھا کہ خود کو مصیبت میں مبتلا ایسا شخص ظاہر کر کے جو پیرسائیں کی شہرت سن کر حاجت روائی کے لیے وہاں آیا ہو، کچھ دیر خانقاہ میں رکنے کا انتظام

عقلمند

کر لے۔ اپنے قیام کے اس مختصر عرصے میں اسے زبان بند رکھ کر صرف آنکھیں اور کان کھلے رکھنے تھے۔ اگر وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاتا کہ خانقاہ کی آڑ میں کوئی غیر قانونی کام کیا جا رہا ہے تو پھر شہر یا رہائے آئندہ کا لائحہ عمل طے کرتا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ اپنے علم میں آ جانے والے ایسے کسی فرد کو جو ملک و قوم کا دشمن ہو، ذمیل دینے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ جیری فقیر کی آڑ میں چھوٹی موٹی جہلنازیاں کرنے والوں کو طرح دے جانا اور بات بھی لیکن ملک دشمن عناصر کی بیخ کنی نہ کرنا یا ان سے صرف نظر کر جانا اس کی دانت میں ایک ایسا جرم تھا کہ جس کے بعد وہ خود اپنے آپ سے نظر ملانے کے قابل نہ ہو یا تا، چنانچہ ذرا سا شبہ ہونے پر ٹاہلی والا کے پیر سائیں کی بو بھگ گیا تھا۔

پیر سائیں کے معاملے میں اسے آئندہ فیصلے مشاورت خان کی رپورٹ پر کرنے تھے اور اسے لگتا تھا کہ وہ اپنے ساتھ بہت سی سستی خیز خبریں لے کر آنے والا ہے۔ صبح سویرے موہاں فون پر ہونے والی گفتگو میں اس نے پیمان زدہ لہجے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ خیریت ہے اور جلد واپس لوٹ کر اسے بہت سی حیرت انگیز باتیں بتائے گا۔ اپنے گرد و پیش سے مطمئن نہ ہونے کی وجہ سے اس نے تفصیلی گفتگو کرنے سے معذرت کر لی تھی، چنانچہ اب وہ شدت سے مشاورت خان کے واپس لوٹنے کا منتظر تھا۔ سوئے اتفاق اس وقت عبدالمنان بھی دفتر میں موجود نہیں تھا۔ وہ اس کے ساتھ صورت حال پر تبادلہ خیال کر کے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتا۔ عبدالمنان کو اس نے خود چودھری افتخار کی بیوی کے جنازے میں شرکت کے لیے پیر آباد بھیجا ہوا تھا۔ چودھری سے اس کی نفرت اپنی جگہ لیکن بہر حال وہ اس علاقے کا سب سے زیادہ بااثر شخص تھا چنانچہ اس کے ساتھ ہونے والے کسی ایسے کو مکمل طور پر نظر انداز کر دینا مناسب نہیں تھا۔ وہ خود شادیاتی مصلحت پسندی سے کام نہ بھی لیتا لیکن عبدالمنان نے صبح اس سے اچھی خاصی بحث کر کے اس معاملے میں قائل کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ صرف اس حد تک قائل ہو سکا تھا کہ عبدالمنان اس کے نمائندے کی حیثیت سے اظہارِ افسوس کے لیے پیر آباد چلا جائے۔ اس کام کے لیے اس نے خاص طور پر اس کا انتخاب اس لیے بھی کیا تھا کہ بے شک وہ خود تو بھی نہ بھی تبادلہ ہو کر یہاں سے کسی دوسرے ضلع میں چلا جاتا لیکن عبدالمنان کو تو پیر حال میں رہنا اور کام کرنا تھا اس لیے اس کا یہاں کسی سے مکمل گٹھ مناسبت نہیں تھا۔

انہی سوچوں میں غلطیاں اس نے اپنی توجہ دوبارہ کام

کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی۔ ابھی اس کے قلم نے کاغذ پر مزید کسی نئے لفظ کا اضافہ بھی نہیں کیا تھا کہ انتر کام بج اٹھا۔ اس نے رسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے مشاورت خان کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ اسے فوری طور پر اندر بھیج دینے کی ہدایت کرنے کے بعد وہ فائل بند کر کے کرسی پر سیدھا ہوا بیٹھا۔ مشاورت خان کے آنے کی اطلاع کی تو طبیعت بالکل ہی اچاٹ ہو گئی چنانچہ اس نے اسے ایک طرف رکھ دیا۔ مشاورت خان کو اس کے کمرے تک پہنچنے میں ڈیڑھ دو منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا۔ کمرے کے دروازے پر دستک دے کر اجازت ملنے کے بعد وہ اندر آیا تو شہر یار نے اس کی آنکھوں کی سرخی دیکھ کر ہی اندازہ کر لیا کہ وہ رات بھر جاگتا رہا ہے۔ یعنی گزشتہ شب جو اس نے ٹاہلی والا میں گزار دی تھی، کافی سستی خیز رہی تھی اور مشاورت خان کی ایسے کام میں مصروف رہا تھا کہ اسے ذرا دیر بھی سونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ ایسا مضبوط آدمی تھا کہ اگر ایک ڈیڑھ گھنٹے کی نیند بھی لے لیتا تو تازہ دم ہوتا۔ اب بھی صرف اس کے چہرے پر رت جکے کے آثار تھے ورنہ اپنی حرکات و سکنات سے وہ پوری طرح چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔

”لگتا ہے خاصی گرم گرما گرم خبریں لے کر آئے ہو۔“ اس نے سلام کا جواب دینے کے ساتھ ہی اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے مٹی خیز لیے تھیرا دیا۔

”بالکل سہ! گرما گرم خبریں ہیں اور آپ کے اندازے سے بھی زیادہ حیرت ناک۔“ مشاورت خان کے جواب نے اس کے جس کومزید بھڑکا دیا۔

”تو پھر شروع ہو جاؤ اور بلا کم و کاست سب بتا ڈالو۔“

”انکشافات کا سلسلہ ٹاہلی والا میں قدم رکھتے ہی ہو گیا تھا اور کچھ سوالوں کے جواب بھی مل گئے تھے۔ ٹاہلی والا پنڈ میں ٹاہلی کے بہت سے درخت ہیں جن کی وجہ سے اس پنڈ کو یہ نام دیا گیا ہے۔ آبادی کے اعتبار سے وہ گاؤں پیر آباد سے چھوٹا ہے۔ کالے میاں کے پیر سائیں کی خانقاہ پنڈ میں داخل ہونے کے تحوڑی دیر بعد ہی سامنے آ گئی تھی لیکن میں اس خانقاہ کو دیکھ کر بھوکھا رہ گیا اور کھنگھوڑا ہوا کہ کسی غلط جگہ پہنچ گیا ہوں۔ حالانکہ میں شیک انہی نشانوں کے مطابق وہاں تک پہنچا تھا جو کالے میاں نے مجھے بتائی تھیں۔“ مشاورت خان نے بڑے ڈرامائی انداز میں تفصیلات کا آغاز کیا۔

”غیر ضروری سستی پھیلانے کے بجائے ٹوڈی پوائنٹ بات کرو۔“ مشاورت خان کے طرزِ بیان پر انھیں محسوس کرتے

ہوئے اس نے فوراً ہی اسے ٹوکا۔

”معافی چاہتا ہوں صاحب۔“ وہ فوراً ہی سنبھل گیا اور مزید تفصیلات بتانے لگا۔

”کالے میاں نے مجھے خانقاہ کا جو پتا سمجھایا تھا، وہاں خانقاہ کی جگہ ایک جلی ہوئی عمارت کا ڈھانچا موجود تھا۔ میں نے وہاں موجود افراد میں سے ایک سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ چند روز قبل کسی نے رات کی تاریکی میں بیٹروں چمڑک کر لمبے میں آگ لگا دی تھی جس کی وجہ سے عمارت کے ساتھ ساتھ وہاں موجود ایک بیروں سے معذور زائر بھی جل کر خاک ہو گیا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ معذور شخص بالابو گا۔“ انکشاف کی کوشش کرنے کے باوجود وہ خود کو رائے زنی سے نہیں روک سکا جس پر شہر یار نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور خاموشی اختیار رکھی۔ مشاورت خان اپنی سناٹا رہا۔ ”حادثے کا سن کر میں نے اس شخص کے سامنے کہہ دیکھا کہ اظہار کیا اور بتایا کہ میں بہت دور سے صرف پیر سائیں کی شہرت سن کر اپنے مسئلے کے حل کے لیے یہاں آیا ہوں۔ میں نے خود کو اتنا غریب آدمی ظاہر کیا جس کے پاس کرانے کی رقم کے علاوہ مزید کسی خرچ کے لیے رقم موجود نہ ہو۔ میری اداکاری نے اس شخص پر بڑا اثر کیا اور اس نے مجھے بتایا کہ بے شک خانقاہ جگہ ملتی ہے لیکن پیر سائیں اور ان کے تمام مرید محفوظ ہیں۔ وہ خود بھی پیر سائیں کا مرید تھا جو خانقاہ کی انسر نو تعمیر کے لیے جائزہ لینے آنے والی ایک ٹیم کے ساتھ وہاں تک آیا تھا۔ اس نے مجھ سے رہائش اور پیر سائیں سے ملاقات کا وعدہ کیا اور اپنے ساتھ ایک ایسے گھر میں لے گیا جو اپنی تعمیر کی وجہ سے پنڈ کے چند گنے چنے گھروں میں سے ایک تھا اور جسے دیکھتے ہی یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ گھر کے مالکان خاصے صاحب حیثیت لوگوں میں سے ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ گھر شریف نامی ایک آدمی کی ملکیت ہے جس نے خانقاہ کی بربادی کے بعد پیر صاحب اور ان کے مریدوں کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے۔ مجھے بھی اس گھر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں جگہ مل گئی۔ مجھے لے جانے والے آدمی نے کھانا پیتا بھی فراہم کر دیا لیکن پیر سائیں سے فوری ملاقات کروانے سے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ فی الحال پیر سائیں کسی بہت اہم معاملے میں الجھے ہوئے ہیں اس لیے اگلے دن ہی میری ان سے ملاقات ہو سکے گی۔ اس کا جواب سن کر میں افسردگی کا اظہار کرتے ہوئے چارپائی پر لیٹ گیا اور یوں ظاہر کیا کہ جیسے شدید تنگی کی وجہ سے مجھے نیند آ رہی ہے۔ میرا مزید بیان میری حالت دیکھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں بستر سے اتر گیا اور دروازے کی جھری

سے جھانک کر باہر کا جائزہ لینے لگا۔ میں جب وہاں پہنچا تھا تو بھی کافی پچھلی سی محسوس کی تھی لیکن صرف اس لیے نظر انداز کر دیا تھا کہ مریدوں کی بھڑ بھڑ کی وجہ سے وہ پچھلی کوئی ایسی انوکھی بات نہیں تھی لیکن دوبارہ چھپ کر جائزہ لینے پر مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں کچھ غیر معمولی حالات ہیں۔ احاطے میں موجود لوگوں میں سے اکثر کے ہاتھوں میں ہتھیار نظر آ رہے تھے اور چروں پر ایسا جوش تھا جیسے وہ کسی ہم کے لیے پروانہ ہو رہے ہوں۔ میں سن کن لینے کے لیے کمرے سے باہر نکل گیا لیکن باہر نکلنے ہی ایک آدمی نے مجھے جتنی سے ٹوک کر واپس اندر جانے کا حکم دیا۔ میں نے حاجت کا بیان بنا کر تحوڑی دیر کی مہلت حاصل کر لی لیکن سب افراد کو دیکھنے کے سوا کچھ اور معلوم نہیں کر سکا۔ مجھے کمرے میں واپس جانے کا حکم دینے والا سامنے کی طرح مسلسل میرے ساتھ ساتھ تھا اس لیے مجھے شرافت کا مظاہرہ نہ کرتے ہوئے واپس کمرے میں جانا پڑا۔ کچھ دیر بعد میں نے دروازہ چیک کیا تو معلوم ہوا کہ اسے باہر سے کٹڈی لگا کر بند کر دیا گیا ہے۔ یعنی عملی طور پر میں وہاں قید ہو چکا تھا اور آپ کے لیے کارآمد معلومات حاصل کرنے سے قاصر تھا۔ بے بسی کی اس کیفیت میں بھی میں نے اپنے کان کھلے رکھے اور دھڑکی سے باہر کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا رہا۔ رات گئے مجھے گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور آہستہ آہستہ وہاں موجود لوگوں کی آوازیں بھی معدوم ہوئی چلی گئیں۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ گھر میں موجود تمام افراد چانک ہی نہیں روانہ ہو گئے ہوں اور گھر میں چند ایک افراد کے علاوہ کوئی باقی نہ ہو۔ مجھے خیال آیا کہ دروازہ بجا کر کسی کو بلاؤں اور اس سے اس وقت رواجی کے بارے میں پوچھوں لیکن پھر میں نے انجان بنا کر مٹائی مناسب سمجھا۔ سب افراد کی رواجی کو مشکل سے آدھا گھنٹا ہی گزرا تھا کہ پنڈ کی فضا دھماکوں کی آواز سے گونج اٹھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی مسلح گروپ نے اچانک ہی پنڈ پر حملہ کر دیا ہو۔ کافی دیر تک فائرنگ کا سلسلہ جاری رہا پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مکان میں دوبارہ پچھل شروع ہوئی۔ آوازوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ ہم پر جانے والے واپس آ گئے ہیں اور اپنے ساتھ مردوں اور زخمیوں کو بھی لے کر لوٹے ہیں۔ بہت دیر تک مکان میں جھنجھو پکار، بھاگ دوڑ اور ایک دوسرے کو ہدایات دینے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ میں کمرے میں قید رہے بس سب اس معاملے کی سن کن لینے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن پھر کے قریب مجھے نیند آ ہی گئی۔ تقریباً گھنٹے سوا گھنٹے کی نیند لینے کے بعد میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو وہاں تک پہنچانے والے کو اپنے کمرے میں پایا۔ وہ مجھے نیند سے جگانے اور ناشتے کا پوچھنے آیا تھا۔

میں ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتا کرنے بیٹھا تو اس سے رات ہونے والی پہلے اور فائزنگ کا ذکر پچھڑا دیا۔ وہ میرا بیٹھا تھا اور اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر پتا چل رہا تھا کہ رات بھر اس نے ایک لمحے کے لیے بھی پلک نہیں جھپکی۔ میرے سوال کرتے ہی اس نے بتایا کہ خانقاہ کو آگ لگانے والے شخص کے بارے میں علم ہو گیا ہے۔ وہ پنڈ کا ہی ایک معزز آدمی تھا جو کئی روز سے غائب تھا لیکن کسی نے اس بات کو اس لیے نوٹ نہیں کیا تھا کہ وہ شخص اپنے کاروبار کے سلسلے میں عموماً پنڈ سے غائب ہی رہتا تھا۔ شہقت راؤ نامی اس شخص کے بارے میں انہیں اس طرح معلوم ہوا تھا کہ شریف صاحب نے شہقت راؤ کے کزن اور سہمی حامد راؤ کے گھر آنے والے ایک مشکوک جوڑے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے وہاں گھر لیو کام کرنے والی ایک عورت کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ نوہ لے کر بتائے کہ بالکل اچانک مہمان بن کر وہاں آنے والے وہ لوگ کون تھے؟ عورت نے ان کی توقع سے بڑھ کر معلومات حاصل کر ڈالیں۔ حامد راؤ اور اس کے مہمانوں کی گفتگوں کر اسے معلوم ہوا کہ خانقاہ کو آگ لگانے والا شخص شہقت راؤ تھا۔ یہ اطلاع پا کر پیر سائیں کے مرید چرخ پا ہو گئے اور انہوں نے حامد راؤ کے گھر دھاوا ڈالنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان کا خیال تھا کہ بے شک حامد راؤ بے قصور ہے لیکن اس کے گھر میں مقیم شہقت کی بیوی اور بیٹی کو نشانہ عہد بنا کر شہقت سے انتقام کا سلسلہ شروع کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے رات کی تاریکی میں بہت منظم طریقے سے حامد راؤ کے گھر کا محاصرہ کیا اور اس کے سامنے اپنا مطالبہ پیش کیا لیکن حامد راؤ نے اس مطالبے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ عورتیں صرف شہقت کی بیوی اور بیٹی ہی تھیں، حامد راؤ کی بہن اور بہو بھی تھیں۔ اس انکار کے بعد نوبت گولیاں چلنے لگ جانے لگی۔ پیر سائیں کے مریدوں کو اندازہ نہیں تھا کہ ان کی فائزنگ کا اتنے منظم طریقے سے جواب دیا جائے گا۔ انہیں بالکل یوں محسوس ہوا کہ مقابل ان کی کمین گاہوں سے بخوبی واقف تھے اور تاک تاک کر انہیں نشانہ بنا رہے تھے۔ میرے میزبان کے مطابق ان کے تین آدمی ہلاک اور کئی شدید زخمی ہوئے پھر بھی کچھ ہاتھ نہ آیا اور حامد راؤ اپنے اہل خانہ اور مہمانوں سمیت پنڈ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے میزبان کا خیال تھا کہ حامد راؤ کے اس فرار کو کامیاب بنانے میں اس کے مہمانوں نے کلیدی کردار ادا کیا ہوگا ورنہ حامد راؤ اور اس کا بیٹا اتنے تیز لوگ نہیں ہیں کہ اتنے منظم طریقے سے مقابلہ کر پاتے۔ اس نے ملازمہ کے ذریعے

معلوم ہونے والے مہمانوں کے نام بھی مجھے بتائے تھے جنہیں سن کر میں ششدر رہ گیا۔

روانی سے تفصیلات سناتا ہوا مشاہیرم خان اس مقام پر آکر چپ ہو گیا۔ شہر یار کو محسوس ہوا کہ وہ کوئی بڑا انکشاف کرنے والا ہے۔ ویسے بھی ٹامبلی والا سے موبائل فون پر اس نے اسے یہی پیغام دیا تھا کہ واپسی میں وہ اپنے ساتھ بہت سے سوالوں کے جوابات اور کچھ انکشافات لے کر آئے گا۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس کی سنائی گئی تفصیلات میں کئی اہم باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ ان تفصیلات کو سن کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ خانقاہ میں جل کر مر جانے والا شخص باللا ہوگا۔ عرصے تک چودھری کے مطالعہ کا ساتھ دینے والا بالا جو ہاتھ پیروں سے سلامت رہا تو اپنے ہی جیسے لوگوں کی زندگیاں دیکھ کر تارباہ، زندگی کے آخری دنوں میں ہجرت کا نشان بن کر رہ گیا تھا۔ اس بے تمیز آدمی کی موت بھی بڑی بھیاں ہو گئی۔ یقیناً بے بسی کے عالم میں آگ کا اندھن بنے ہوئے اس نے وہ ساری چیزیں، آہیں اور سسکیاں سنی ہوں گی جن کا سبب اس کی ذات بنی تھی۔ شاید وہ ان دردناک لمحات میں اللہ کے آگے معافی کے لیے گڑ گڑائی بھی ہو لیکن شہر یار کو پورا یقین تھا کہ اس کی کوئی دعا اور اچھا قول نہیں کی گئی ہو اور مظلوموں کی بددعا میں بدروحوں کی طرح اس سے چٹ کر رہ گئی ہوگی۔

مشاہیرم خان کی سنائی گئی تفصیلات سے اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ پیر سائیں کے پڑے جانے والے مرید کالے میاں کی کوئی کال اس کے ساتھیوں کی طرف سے کیوں وصول نہیں کی جا رہی تھی۔ خانقاہ میں آگ لگنے کے بعد وہ سب یقیناً افراتفری میں اپنی جاکیں بچا کر وہاں سے نکل بھاگے ہوں گے۔ اتنے نازک لمحات میں ان میں سے کسی کو اپنے موبائل فون کا خیال بھی نہیں رہا ہوگا اور نتیجتاً آگ نے انہیں چاٹ کر تار کا رہ کر دیا ہوگا۔ ان تفصیلات میں ابھی یہ وضاحت ہونا باقی تھی کہ شہقت راؤ کون تھا اور اس نے خانقاہ کو آگ کیوں لگائی تھی؟ اگر مشاہیرم خان اپنی گفتگو کا آخری جملہ ادا نہ کرتا تو وہ یقیناً اس سے پہلا سوال اس سلسلے میں کرتا لیکن جس انداز میں اس نے اپنے آخری فقرے ادا کیے تھے، شہر یار کو اپنے پورے وجود میں عجیب سی سنسنی دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اتنی بری طرح مضطرب ہو گیا تھا کہ زبان سوال کرنے سے بھی معذور ہو گئی اور یہ کام اس نے اپنی آنکھوں سے لیا تھا۔ مشاہیرم خان نے بھی اس کے ممبر کا زیادہ امتحان نہیں لیا اور دھیمی آواز میں بتائے لگا۔

”ان دونوں کے نام ماہ بانو اور اسلم بتائے گئے ہیں۔

تھوڑا بہت حلیہ وغیرہ بھی جو میں معلوم کرنے میں کامیاب ہوا ہوں، اس سے بھی یہ تصدیق ہو رہی ہے کہ یہ وہی ماہ بانو اور اسلم ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں۔“ بالآخر مشاہیرم خان نے دھماکا کر دی دیا جس نے شہر یار کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ ماہ بانو کی تلاش میں اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ ڈاکوؤں کی سرکوبی کے نام پر جنگل میں کیا جانے والا آپریشن بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی لیکن اپنی ساری بھاگ دوڑ کے نتیجے میں بھی وہ ماہ بانو کی گردن تک کو بھی نہیں پاسکا اور اب ایک غیر متعلقہ قصبے میں اس کا نام اس طرح سامنے آیا تھا کہ وہ ڈاکو اسلم کی ساتھی کی حیثیت سے ٹامبلی والا میں پائی گئی تھی اور اب وہاں بھی موجود نہیں تھی۔ وہاں سے بھی وہ کسی ماہ معلوم سمت میں روانہ ہو چکی تھی۔

”کیا اسلم نے اسے یرغالی بنا رکھا تھا؟“ اس کا ذہن ماہ بانو کو کسی ڈاکو کا ساتھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے اس نے یہ سوال کیا۔

”کچھ کہنا مشکل ہے۔ جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کے مطابق وہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے حامد راؤ کے گھر میں موجود تھے۔“ مشاہیرم خان کی آواز کچھ اور بھی دھیمی ہو گئی۔ یہ بات بتاتے ہوئے اس نے شہر یار کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کیا تھا۔ وہ اتنے دنوں سے اس کے ساتھ تھا۔ ماہ بانو کے اس تک پہنچنے سے لے کر بار بار غائب اور بازیافت ہونے کا ہر واقعہ اس کے علم میں تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ شہر یار کی طرح اس لڑکی کے تحفظ کے لیے بے چین اور فکر مند رہتا تھا۔ کافی دنوں تک ماہ بانو بلتستان میں اس کے اپنے گھر میں رو پڑی رہتی تھی۔ شہر یار کی وفاداری اور اس لڑکی کی ہمدردی میں وہ اپنے بھائی اکرم خان کو گنوا بیٹھا تھا اور صدے سے کوئے میں چلی جانے والی اس کی ماں آج بھی اسلام آباد کے ایک اسپتال میں زندگی اور موت کے درمیان لگی ہوئی تھی۔ شہر یار اپنے جذبات کے اظہار سے لاکھ گرہیں اٹھاتی، پر عشق اور رشک چھپائے نہیں چھپتے۔ مشاہیرم خان کو بھی کسی حد تک اس کی قلبی کیفیات کا اندازہ تھا اس لیے وہ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے بہت محتاط تھا۔ شہر یار کا ملازم ہونے کے ناتے اس سے وفاداری تو اپنی جگہ تھی ہی، وہ بہ حیثیت انسان بھی اسے بے پناہ پسند کرنے کی وجہ سے اس سے محبت کرتا تھا اس لیے اس کے جذبات کو گھٹس گھٹس سے خائف بھی تھا۔

”ہو سکتا ہے اسلم نے ماہ بانو کو یرغالی بنا رکھا ہو اور وہ وہی کچھ کرنے پر مجبور ہو جو اسلم اس سے کہتا ہو۔“ خامسے

توقف کے بعد شہر یار نے کہا۔

”شاید یہی بات ہو۔“ مشاہیرم خان نے اس سے اختلاف کرنا مناسب نہیں سمجھا ورنہ اسے ٹامبلی والا سے جو خبریں ملی تھیں، ان میں ایسی کوئی بات شامل نہیں تھی جس سے یہ اشارہ ملتا ہو کہ ماہ بانو کی حیثیت کسی یرغالی کی ہی ہو اور وہ مجبوراً اسلم کے ساتھ موجود ہو۔ اسے مزید طور پر اسلم کی ساتھی بتایا گیا تھا۔

”خیر جو بھی بات ہوگی، کبھی نہ کبھی سامنے آجائے گی۔ فی الحال تم ٹامبلی والا توجہ دو اور دو چار دن بعد دوبارہ وہاں چکر لگا کر مرید بن گن لینے کی کوشش کرو۔ یہ پیر سائیں مجھے بڑا گڑبڑ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اللہ والوں کے مرید یوں کسی کی ماں بہن کی بے عزتی کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ ہی کسی کے گھر پر رخ جھکنے کی صورت میں حملہ کرتے ہیں۔ یہ تو کچھ بھرانہ ذہنیت کی عکاسی ہو رہی ہے۔ تم دوبارہ وہاں جاؤ تو خاص طور پر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ شہقت راؤ نامی شخص نے خانقاہ میں آگ کیوں لگوائی۔ وہ گاؤں کا باشندہ تھا اور بے شک پیر سائیں کا معتقد رہا ہو لیکن اس بات سے تو واقف ہوگا کہ گاؤں میں پیر سائیں کے کتنے عقیدت مند موجود ہیں اور اس کی حرکت کے رد عمل میں کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ کسی معزز آدمی کے اتنی خطرناک حرکت کرنے کا محرک معمولی نہیں ہوتا۔ شہقت راؤ کی حرکت کے پیچھے بھی کوئی بڑی وجہ رہی ہوگی۔ تمہیں پوری کوشش کر کے وہ وجہ معلوم کرنی ہوگی تاکہ پیر سائیں کا کردار واضح ہو سکے۔“ ماہ بانو سے متعلق ملنے والی خبر نے اسے خاصا شدید ذہنی جھٹکا لگایا تھا پھر بھی حالات کا بالکل درست تجزیہ کرتے ہوئے وہ مشاہیرم خان کو ہدایات دے رہا تھا۔

”ٹھیک ہے صاحب! میں اس گتھی کو سلجھانے میں اپنی پوری جان لڑا دوں گا۔“ حسب معمول مشاہیرم خان میدان عمل میں اترنے کے لیے دل و جان سے راضی تھا۔

”گڈ! مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ شہر یار نے اسے سراہا اور پھر کھلی فائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مشاہیرم خان ملاقات ختم ہونے کا اشارہ پا کر باہر نکل گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد شہر یار نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح فائل کی طرف توجہ مرکوز کر سکے لیکن ذہن منتشر رہا۔ ماہ بانو کا اسلم ڈاکو کے ساتھ اس کی بیوی کی حیثیت سے پایا جانا اتنا غیر اہم واقعہ نہیں تھا جسے وہ آسانی سے نظر انداز کر سکتا۔ اسے تھوڑی ہی دیر میں اپنی کیفیت کا ادراک ہو گیا اور وہ فائل بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنی منتشر ذہنی کیفیت میں یہاں بیٹھنے سے بہتر

”خیر، آج اتنی جلدی کیسے واپس آئے؟“ اس نے وقت گھر میں موجود پاکر اس کے سوال کیا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر کوٹ اتارنے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ اس چھوٹے سے کام کا انجام دینے میں اس کا انداز اتنا دلربا تھا کہ وہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا اور دل ہو گنگنے والی تازہ چوٹ کے باوجود اس سے ہمروتی پر ہنسنے کے بجائے آہستہ سے بولا۔ ”طبیعت کچھ بو جمل ہی تھی سر میں درد سمحوس بود یا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ گھر چل کر کچھ دیر آرام کروں۔“

”تھینک گاڈ کہ آپ کو اپنے بارے میں اس طرح سوچنے کا خیال آیا ورنہ مجھے تو لگتا ہے کہ آرام کا لفظ آپ کی ڈکشنری میں ہے ہی نہیں اور آپ نے کام کو ہی اپنا اوزھنا چھوٹا بنا رکھا ہے۔“ بیویوں والے مخصوص لب ولہجے میں خشکی کا اظہار کرتے ہوئے ناریانے اس کی غائی کی ٹات ڈھیلی کر کے اسے گردن سے نکالا اور پھر اس کا بازو قدام کر بیڈ کی طرف لے گئی۔ اس سارے عمل میں وہ اس کے استعزایہ قریب ہی تھی کہ وہ بہ خوبی اس کے بدن سے انتہی وجہی سی پاؤں اسپرے کی خوشبو محسوس کر رہا تھا۔ جس سی اس خوشبو میں کچھ ایسا جاودہ تھا کہ وہ مسحور سا ہونے لگا اور حسب معمول فوری طور پر لباس تبدیل کر کے فریش ہونے..... کے بجائے چاپ چاپ ماریا کے اشاروں پر عمل کرنے لگا۔ بیڈ کے قریب پہنچنے پر ماریانے اس کے دونوں شانے تمام کر اسے کنارے پر بٹھا دیا اور خود نیچے اس کے قدموں میں پیڑے کر اس کے جوئے اتارنے لگی۔

ہوتا تھا کیا کوشور ہر کے پیروں سے جوتے اتارنے کا کام۔
 ”میں وہی کر رہی ہوں جس سے میرے دل کو خوشی ملتی
 ہے۔ آپ مجھے روک کر میری خوشی سے محروم نہ کریں۔“ اس
 نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ آگے بڑھائے، اس بار شہر یار نے
 خود کو بے بس مایاں کیا۔ جوتے اتارنے کے بعد ماریا اپنی نرم و
 ملائم انگلیوں سے آہستہ آہستہ اس کے پیروں کو پہلانی لگی۔
 اس کی تحریک انگلیوں کی ہر برجش میں اتنی شافی تھی کہ
 شہر یار نے اپنے پورے وجود میں سرور کی لہریں سی دوڑتی
 ہوئی محسوس کیں۔ اپنے کام کو جاری رکھتے ہوئے ماریا نے
 آہستہ سے اپنا سر اس کے گھٹنوں پر ٹکا لیا اور خود سے لہجے میں
 بولی۔ ”مجھے معلوم ہے کہ آپ نے حالات کے جبر کے تحت
 مجھے اپنا یا ہے لیکن اس کے باوجود میرا اور آپ کا رشتہ اصل
 ہے۔ میں ہمیشہ کوشش کرتی ہوں کہ ذہن سے ہر ناخوشگوار یاد
 کو کھینچ کر حال میں جی سکوں۔ میں نے آپ کے اور اپنے
 رشتے کو دل و جان سے قبول کر لیا ہے اور بیوی کی حیثیت سے
 اپنے سارے حقوق و فرائض ادا کرنے کی خواہش مند ہوں۔
 مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں اور کسی
 عام آدمی کی طرح اپنی بیوی کو زیادہ وقت اور توجہ نہیں دے
 سکتے لیکن مجھے اتنا توقع دیا کریں نا کہ قسمت سے جو تھوڑا
 بہت وقت مجھے مل جائے اس میں، میں اپنے اور آپ کے
 رشتے کو محسوس کر سکوں۔“ اس کے بے حد نرمی سے کیے
 شکوے نے جہاں شہر یار کو شرمندہ کیا، وہیں دل میں ایک
 ٹپس سی بھی اٹھی۔ اسے آج تک وہ رات نہیں بھولی تھی جب
 ماریا کے ساتھ لاہور کی طرف عازم سفر تھا اور اچانک ہی
 ماریا کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے انہیں ایک تھوڑے
 کلاس سے ہوٹل میں رونا پڑا تھا۔ اس ہوٹل کے کمرے میں
 اس کے ساتھ رات گزارتے ہوئے جانے اسے کیا ہوا تھا کہ
 عمر بھر کا رزم پارسانی جاتا رہا اور وہ ہر حد پھیلاگ کر اپنی ہی
 نظروں میں مجرم ٹھہرا۔ اس جرم کی تلافی کے لیے اس نے
 ماریا سے شادی کر ڈالی لیکن ابھی تک وہ اپنے اور اس کے
 رشتے کو اس طرح سے قبول نہیں کر رہا تھا کہ ماریا کے ساتھ
 گرم جوشی سے پیش آتا۔ اس کی کاماریا اکثر اس سے شکوہ
 کرتی تھی اور وہ خود کو شرمندہ محسوس کرتا تھا۔ اس وقت بھی ایسا
 ہی ہوا اور وہ اپنے گھٹنوں پر ٹکے ماریا کے سر کے بالوں میں
 اٹکیاں پھیرتے ہوئے نرمی سے بولا۔

بیوی ہونے تو اس بات کو چھٹا یا جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ تمہارے ہوتے کسی دوسری عورت کو یہ مقام حاصل ہو سکے۔ انہیں مجھ پر کم از کم اتنا اعتماد ضرور کرنا چاہیے کہ جتنا مجھی کم کی سبکداری میں صرف انہیں میسر ہوں اور تمہارے حقوق میں کوئی اور حصے دار نہیں ہے۔“

”میں نے بھی آپ کے کردار پر شک کیا بھی نہیں لیکن بس کبھی کبھی اس احساس کہ آپ نے مجبوراً مجھے اپنی زندگی میں شامل کیا ہے، اتنی شدت اختیار کر لیتا ہے کہ میں آپ کے ہر رویے کو اسی کے تناظر میں دیکھنے لگتی ہوں اور دھبی ہو جاتی ہوں۔“ اس نے اپنا سر کچھ اس انداز سے شہر مار کے کھنٹوں پر ٹکا رکھا تھا کہ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن آواز کے پھول بن سے ظاہر تھا کہ وہ رورہی ہے۔

”بلاؤ خود کو تانائیس کرنا محنت ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی حساسیت بھی انسان کا جینا دشوار کر دیتی ہے۔ چلو شاہاش اشاور مجھے کوئی پتہ نہ ملے تو تاکو میں اپنے سر درد سے نجات حاصل کر سکوں۔“ اس نے مار یا کو دو نوں شاہاشوں سے تمام کر سہا کیا تو پتہ نہ چڑھ کر کے لیے نظر میں اس کے چہرے پر بھی ہی رہ گئیں۔ تم ناک چلوں کے ساتھ آنکھوں میں تیرے گلابی ڈوروں اور تاک کی سرخ پڑتی نوک نے اس کے حسن کو نیا ہی روپ دے دیا تھا۔ شہر یار نے اپنا دل اس کے لیے گداز ہوتا محسوس کیا۔ وہ جیسے بھی سہی، اس کی بیوی بھی لیکن بد قسمتی سے وہ اسے خوش رکھنے میں ناکام تھا۔

”جسٹ آئٹ۔“ میں ابھی آپ کو کوئی اچھی سی میڈیسن دیتی ہوں۔“ اس کی قلبی کیفیت سے امتحان مار یا بولتی ہوئی اس کے قدموں سے ابھی اور پھرتی سے ایک دراز میں سے ٹیبلٹ نکال کر پانی کے گلاس سمیت اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ شہر یار نے اس کی پتیلی پر دھری ٹیبلٹ اٹھا کر منہ میں رکھی اور پانی کے ساتھ نگل گیا۔

”اب آپ لیٹ جائیں۔“ ماریا نے پیار سے اسے ہدایت دی۔

”پہلے میں بیچ کر لوں ورنہ مجھے طلعی نیند نہیں آئے گی۔“ شہر یار نے کہا تو اس بار اس نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا اور خود بیڈ کے کنارے پر تک کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ ٹھوڑی ہی دیر میں شہر یار ڈھیلے ڈھالے آرام وہ کپڑوں میں ملبوس واپس آگیا۔ وہ ان لوگوں سے تھا جنہیں مردانہ وجہت کا شاہکار قرار دیا جاتا ہے اور جو کچھ بھی پہن لیں، ان پر چن جاتا ہے۔ اگر وہ ٹھوڑی دیر پہلے فارمل ڈریسنگ میں بے حد وجہ رنگ رہتا تھا تو اس وقت بھی اس کی

وجاہت میں کوئی کی نہیں آئی تھی۔ اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ وہ مضبوط قدموں سے چلتا ہوا بینک کی طرف بڑھتا ہوا ریاری کو اس کا بر قدم اپنے دل پر بڑھتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی قلبی حالت سے بے خبر وہ مگن سا آکر بستر پر دراز ہو گیا اور ماریا بے ساختہ ہی اس کے قریب سرک آئی۔ قریب بیٹھ کر اس نے شہریار کا سراپے زانو بڑھ کر لیا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ کچھ دوا کا اثر تھا اور کچھ ماریا کی مشتاق انگلیوں کی حرکت کہ اس نے اپنے سر کا پو بھل پن مگن ہوتا محسوس کیا۔ ماریا کی انگلیاں مہارت سے اس کے سر میں حرکت کرتی رہیں اور پھر ان انگلیوں نے بہت آہستگی سے آگے کا سفر شروع کر دیا۔ نشیبوں سے رخسار، چھوڑی اور گردن کا سفر طے کرتی اس کی متحرک انگلیاں بہت آہستگی سے سینے تک پہنچ چکیں اور وہاں موجود گھنے بالوں میں الجھنے لگیں۔ انگلیوں کی اس جادو اثر حرکت کے ساتھ ساتھ اس کے شاداب بدن سے آہستگی دھیمی دھیمی مہک نے بھی آہستہ آہستہ شہریار کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا۔ ویسے بھی وہ رخم خوردہ تھا اور عورت کے فراق میں رخم خوردہ مرد کے لیے عورت سے بڑھ کر کوئی مرہم نہیں ہوتا۔ وہ بھی وقتی طور پر کسی، بہلکا جا رہا تھا اور بھٹنے کے لیے بہلکا ضروری ہوتا ہے۔ وہ شراب نہیں پیتا تھا کہ اس کے نشے میں بہک جانے کا انتظام کر سکا لیکن ماریا اس وقت اس کے لیے نشے سے بھری چھتکتی بول ہی بتی ہوئی تھی جو بڑی فراخ دل سے اسے فیض یاب کر رہی تھی۔ اسے حسن سے فیض یاب ہوتا اس وقت وہ بڑا مسرور تھا لیکن جانے دل کے ایک گوشے میں کیسی کہکشی جو کسی صورت پہنچا چھوڑ ہی نہیں تھی۔ جھپکنے اور بھٹکنے کے عمل سے گزرتے ہوئے بھی وہ اس کہک کو محسوس کر سکتا تھا۔

☆☆☆

”رب کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں حفاظت سے یہاں تک پہنچا دیا پر آگے کچھ سوچا ہے راؤ صاحب! آگے ہم کیا کریں گے؟“ اس وقت وہ لوگ شہر میں موجود حامد راؤ کے دو کمرؤں کے فلیٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ فلیٹ دورانِ تعلیم مقصود کے زیرِ استعمال رہا تھا۔ اب بھی اس کا یا حامد راؤ کا کسی کام سے شہر آنا ہوتا تو وہ وہیں قیام کرتے تھے چنانچہ رات کے اندھیرے میں جب وہ لوگ ٹاہلی والا سے اپنی جاکیں بچا کر فرار ہوئے تو سیدھے یہیں کا رخ کیا۔ دو کمرؤں کا وہ فلیٹ اتنا چھوٹا تھا کہ خواتین کا مکمل پردہ کرنا ممکن نہیں رہا تھا اس لیے حامد راؤ کی بیوی اس وقت اٹلم کی موجودگی میں ہی اس سے بات کر رہی تھی۔ ویسے ان بے جاری خواتین کا

پردہ تو اسی وقت ٹوٹ گیا تھا جب وہ باہلی والا سے افرانقری میں فرار ہو رہے تھے۔ وہ لحاظ اتنے نہیں تھے کہ کسی کو کچھ ہوش ہی نہیں رہا تھا۔۔۔ تو پھر بے چاری خوف زدہ خواتین پردے کا کیا خاک خیال رکھ پائیں۔

”ہم کیا اور ہماری بساط کیا؟ جس رب نے جان بچانے کا احسان کیا ہے، وہ آگے کے معاملات بھی خود ہی سنوار دے گا۔“ حامد راؤ نے اپنی بیوی کو تسلی دی اور پھر مقصود کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”مقصود پتہ! تھوڑی دیر میں باہر جا کر کھانے پینے کا سامان لے آتا۔ یہاں تو کچھ ہوگا نہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ تمہاری چھٹی جھوک کی کتنی جگہ ہے۔ نیند سے جاگے کی تو کھانے کے لیے شور مچا دے گی۔“ حامد راؤ نے اپنی جیب سے رقم نکال کر مقصود کے حوالے کی۔ یہ تھوڑی سی رقم اتفاق سے ہی اس کی جیب میں بڑی رقم بھی دوہرہ وہ لوگ جتنی افرانقری میں وہاں سے لٹکے تھے، کسی کو کچھ بھی ساتھ لیتا یاد نہیں رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ مقصود کی جیبیں بھی خالی ہوں گی اس لیے اسے رقم تمنا کی تھی اس سے اس کے اندازے کی تصدیق طرح وہ رقم تمام کی تھی اس سے اس کے اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی تھی۔ بہر حال، یہ کوئی تشویش ناک بات نہیں تھی۔ مقصود کسی وقت جا کر شفقت راؤ کے منبر سے مل لیتا تو یہ مسئلہ منوں میں حل ہو جاتا۔ وہ شفقت راؤ کا داماد تھا اور اپنے داماد کو اس نے اتنی حیثیت تو دے رکھی تھی کہ اس کے مطالبے پر منبر بے چون و چرا مطلوبہ رقم اس کے حوالے کر دیتا۔

”اگر رقم کا کوئی مسئلہ ہے تو میں بھی تھوڑی بہت رقم آپ کو دے سکتا ہوں۔“ اسلم کی گہری نظروں نے بھی فوراً مقصود کی خالی جیب کا اندازہ لگالیا تھا اس لیے اس نے پیشکش کی۔ حامد راؤ کے گھر سے افرانقری میں فرار ہونے کے باوجود وہ بالکل بے سرو سامانی کا شکار اس لیے نہیں تھا کہ ڈیرے سے روانہ ہوتے وقت ہی اس نے اپنے پاس موجود جمع پونجی ایک چری تھیلے میں رکھ کر اسے لباس کے نیچے جم سے باندھ لیا تھا اور وہ چری تھیلا مستقل اس کے ساتھ ساتھ ہی تھا۔ تھیلے میں خاصی مقول رقم موجود تھی۔ اگر اس نے ماہ بانو کی حفاظت کے لیے اسے صرف اپنے لیے مخصوص کرنے کا مطالبہ کر کے سردار کو منہ مانگی رقم کی پیشکش نہ کی ہوتی تو اس وقت وہ اتنی بڑی رقم کا مالک ہوتا کہ شہر کے کسی بھی حصے میں گھر خرید کر وہاں ماہ بانو کے ساتھ اپنی نئی زندگی کا آغاز کر سکتا تھا۔ بہر حال، اب بھی وہ اس لائق تو تھا ہی کہ وقتی طور پر گزارہ کرنے میں کوئی پریشانی نہیں محسوس اس نے اپنے محسن

حامد راؤ کو بہت کلمے دل سے رقم کی پیشکش کی تھی۔

”نہیں صاحب زادے! رقم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کچھ رقم موجود ہے اور مزید بھی ضرورت کے مطابق منگوائی جاسکتی ہے۔ البتہ تمہاری پُر خلوص پیشکش کے لیے میں دل سے تمہارا شکر گزار ہوں۔“ حامد راؤ نے بڑے سجاوے سے اسے جواب دیا اور پھر اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس سے بولے۔

”بھئی لوگ! میرا خیال ہے کہ تم دونوں بھی تھوڑی دیر جا کر آرام کرو۔ ناشتے پانی کا مقصود بازار سے انتظام کر دے گا اس لیے اس طرف سے بے فکر رہنا۔“

”چنگی گل ہے راؤ صاحب!“ حامد راؤ کی سیدھی سادی فرماں بردار بیوی نے اس کا اشارہ پا کر اٹھنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔ ماہ بانو کو بھی اس کی پیروی کرنی پڑی۔ انیلا اور اس کی ماں تو پہلے ہی دوسرے کمرے میں تھیں چنانچہ ان دونوں کے جاتے ہی کمرے میں صرف مردانہ نفری ہی رہ گئی۔ اس پہلے اسلم نے محسوس کیا کہ حامد راؤ اسے کچھ جانچتی ہوئی نظروں سے گھور رہا ہے۔ وہ اس کی نظروں سے بے چینی ہی محسوس کرنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ حامد راؤ اس سے کوئی خاص بات کرنے والا ہے لیکن جب کئی منٹ گزر جانے کے بعد بھی وہ زبان سے کچھ نہ بولا تو اسلم کی بے چینی الفاظ کا روپ دھار گئی۔

”کیا بات ہے راؤ صاحب! آپ میری طرف ایسی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ کہیں مجھے سے آپ کی شان میں کوئی گستاخی تو نہیں ہو گئی؟“ اس نے کچھ گھبراہٹ کے عالم میں سوال کیا۔

”تم کون ہو؟“ حامد راؤ نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے نہایت تنجیدگی سے پوچھا۔

”مم۔۔۔ میں۔۔۔ میں آپ کو اپنے بارے میں بتا تو چکا ہوں۔“ اس نے گزبڑا کر جواب دیا۔

”لیکن مجھے شک ہے کہ تم نے مجھے اپنے بارے میں سچ نہیں بتایا ہے۔“ وہ بڑے بے تلافی انداز میں بولے۔

”لیکن کیوں؟ میں نے ایسا کیا کیا ہے؟“ اس نے پست آواز میں احتجاج کیا۔

”دیکھو بر خوردار! بات یہ ہے کہ بے شک میں ایک چھوٹے سے پنڈت کا رہنے والا عام سا آدمی ہوں لیکن بہر حال میں نے بے بال و حجب میں سفید ٹیڈ کے ہیں۔ میں نے زندگی کو تم سے کہیں زیادہ برتا ہے اس لیے میرا تجربہ بھی وسیع ہے۔ اور میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ تم نے اپنے بارے میں میں سب کچھ نہیں بتایا ہے۔ تمہاری اصلیت اب تک پردے میں ہے۔“

”میں پھر پوچھوں گا کہ آپ کس بنیاد پر ایسا کہہ رہے ہیں؟“ اندر ہی اندر لرزنے کے باوجود اس نے اپنا جھجڑا مضبوط کر کے سوال اٹھایا۔

”باہلی والا میں گزرنے والے آخری لحظات کی بنیاد پر۔ ہتھیار میرے اور مقصود کے پاس بھی تھے لیکن تم جس منظم انداز میں ہتھیار استعمال کر رہے تھے، اس سے صاف ظاہر تھا کہ تمہیں ان کھلونوں سے کھیلنے کا وسیع تجربہ ہے۔ پھر تم جس بے خوفی اور بے جگری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں وہاں سے نکال لائے، وہ کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں۔ ایسی جہارت دو ہی طرح کے لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اول قانون کے محافظ، دوم قانون کے دشمن۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارا تعلق کس گروہ سے ہے؟“ انہوں نے نیا تلسا تجزیہ اس کے سامنے رکھا تو وہ کتنی ہی دیر تک کچھ بولنے کے قابل نہ ہو سکا پھر نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں پوچھا۔

”آپ کا کیا اندازہ ہے؟ آپ مجھے کس گروہ کا آدمی سمجھتے ہیں؟“ اس بار حامد راؤ کے لیے فوری طور پر جواب دینا ممکن نہیں رہا اور وہ ذرا سے توقف سے گلہ کھنکھارتے ہوئے بولے۔

”اگر سچ پوچھو تو عقل اور تجربہ دونوں یہی کہتے ہیں کہ جو راہ راست پر ہوتے ہیں اور قانون کے دائرے میں رہ کر کام کرتے ہیں، انہیں دوسروں سے اپنی پہچان چھپانے کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ بہت فخر سے اپنی پہچان ظاہر کر سکتے ہیں لیکن دوسری طرف میں تمہاری روشن پیشانی اور سلیج ہوئی طبیعت کو دیکھتا ہوں تو دل تمہیں غلط ماننے پر راضی نہیں ہوتا۔ حالانکہ تم جن حالات میں مجھ تک پہنچے ہو وہ خاصے مشکوک تھے۔“ حامد راؤ کا جواب سن کر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ انہوں نے اس کے بارے میں جو تجربہ پیش کیا تھا، وہ بالکل درست تھا۔ وہ اس کے بارے میں بالکل جائزہ بند ب کا شکار تھے۔ قسمت کی ستم ظریفی نے اسے ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل کر دیا تھا جہاں سے اس نے ہتھیاروں کا استعمال اور لڑنے بھڑنے کا ہنر سیکھا لیکن تھا تو وہ شریف ماں باپ کی اولاد جس نے پڑھ لکھ کر ملک کی خدمت کرنے کا خواب آنکھوں میں سجا رکھا تھا۔ حالات کی زد میں آ کر اس کا یہ خواب اتنی بری طرح بکھرا کہ وہ خود بکھر کر رہ گیا اور پیشانی پر ڈاکو ہونے کا داغ سیا بیٹھا۔

”اگر تم مناسب نہیں سمجھتے یا ہمیں اپنے بارے میں نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ لیکن جھوٹ بولنے سے گریزی کرنا۔ تم جو بھی ہو، ہم نے تمہیں دل میں جگہ دی ہے اور اگر کبھی زندگی میں کسی مقام پر تمہارا بے جھوٹے ہونے کا علم ہوا تو بہت

دیکھ ہوگا۔“ حامد راؤ نے یہ الفاظ کہہ کر اپنے بالکل ہی بے بس کر دیا۔ اپنے ساتھ اتنا خلوص برتنے والے جس سے کوئی جھوٹ بولنے کا سوچ کر وہ پہلے ہی تذبذب کا شکار تھا اور اب تو ذرا بھی گھبراہٹ نہیں رہی تھی چنانچہ اپنی داستانِ حیاتِ اختصار سے سنا تا گیا۔ اس نے ماہ بانو کے ڈیرے پر پہنچائے جانے سے متعلق بھی سب کچھ بتا ڈالا اور اس کے لیے اپنی پسندیدگی بھی ظاہر کر دی البتہ اس مقام پر اس نے حامد راؤ سے ایک جھوٹ بولنا ضروری سمجھا اور وہ یہ کہ اس کی ماہ بانو کی ڈیرے پر شادی کر دی گئی تھی۔ یہ جھوٹ اس نے صرف اس لیے بولا تھا کہ ماہ بانو کی عزت پر کوئی حرف نہ آئے اور ان دونوں کے تعلق کے بارے میں کوئی غلط قیاس نہ کیا جاسکے۔

حامد راؤ نے اس کی داستان کا ایک ایک حرف پوری توجہ اور تنقید کے ساتھ سنا اور کہیں ان کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں ابھرا جس سے اسے گمان ہوتا کہ وہ اس کی سچائی پر شک کر رہے ہیں۔ البتہ مقصود کی آنکھوں میں ایک جہاں حیرت بھرا ہوا تھا۔ یعنی طور پر اس کے لیے اسلم کی داستان بہت دلچسپ اور حیرت ناک ثابت ہوئی تھی۔

”تمہاری داستان بہت دل کداز ہے اسلم! ہمارے معاشرتی رسوم و رواج کی بدصورتی اور لوگوں کی بے حسی نے نہ جانے تم جیسے نکتے کو جو انوکھے کو برادیا کیا ہے۔ تمہاری بہن کے سرسریوں نے تمہاری حیثیت سے زیادہ جہیز مانگ کر جس کم ظرفی اور لالچ کا مظاہرہ کیا تھا اس کی وجہ سے برائی کس حد تک بھیلی، شاید خود انہیں بھی اندازہ نہ ہو۔ ایک طرف اگر تم اور تمہارا گھرانہ برابر ہو تو دوسری طرف وہ لوگ خود کو ناساکھ میں رہے۔ جوان بیٹے کھلنے کے ان کی کمر بھی تو توڑ ڈالی ہوگی اور چچران متاثرین کا تو کوئی شاری نہیں ہے جو تمہارے ڈاکو بننے کے بعد تمہارے ہاتھوں لے ہوں گے۔ لٹنے والوں کی بھی اپنی اپنی داستانیں ہوں گی۔ کہیں کسی کی بیٹی کی شادی کے لیے رکھا ہوا اسباب لٹ گیا ہوگا تو کہیں کسی تیار کے علاج کے لیے رکھی رقم۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم نے بھی ایسی کسی رقم پر ہاتھ ڈال دیا ہو جو کسی بے بہار جوڑے نے اپنے بڑھاپے کے لیے سنبھال کر رکھی ہو یا پھر کسی نوجوان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجنے کے واسطے شخص ہو۔۔۔ اور اس کے خواب بھی تمہاری طرح بکھر گئے ہوں۔“ حامد راؤ کے الفاظ نے اسے گہری شرمندگی سے دوچار کر دیا۔ غصے اور انتقام کی آگ میں جلنے لگی اس نے اس انداز سے تو سوچا ہی نہیں تھا۔ اپنی نظر میں تو وہ اب تک اس معاشرے سے انتقام لینا رہا تھا جس نے اسے برادیا تھا لیکن اب ذرا

مختلف زاویے سے دیکھ رہا تھا تو اپنا کردار مظلوم سے بڑھ کر ظالم کا نظر آ رہا تھا۔ اگر کسی نے اس پر ظلم ڈھایا تھا تو وہ بھی تو کسی سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ خود کو برادرنے والے افراد کو تو وہ آسانی سے انگلیوں پر اٹھا کر مسکا تھا لیکن جو اس کے ہاتھوں برباد ہوئے تھے، ان کا اس کے پاس کوئی شمار تھا۔ ندامت کے شدید احساس سے اس کا سر جھکا ہی چلا گیا۔

”میں نے سب تمہیں شرمندہ کرنے کے لیے نہیں کہا ہے۔“ حامد راؤ اس کی کیفیت فوراً ہی بھانپ گئے۔ ”میں یہ سب اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے تمہاری داستان سن کر دی رنج ہوا ہے اور میں پوری شدت سے اس بات پر کڑھ رہا ہوں کہ تمہیں کسی کے لالچ کی وجہ سے کتنی بربادی ہوئی۔ تم تو خود حالات کا شکار ایک ستم رسیدہ نوجوان ہو۔ میں تم پر طنز کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا اور اب تو تم برائی کی اس دلدل سے نکل ہی آئے ہو۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ ایک برے ٹھکانے پر ہونے کے باوجود اللہ نے تم تک ایک ایسی عورت کو پہنچا دیا جو تمہارا ہاتھ تمام کڑھیں اس جہنم سے نکال لائی ورنہ عورت کے لالچ اور طرح کی بھی بڑی داستانیں بکھری ہوئی ہیں۔ ماہ بانو بیٹی قابلِ تعریف ہے کہ اس نے اپنے لیے ایک مشکل لیکن سیدھی راہ کا انتخاب کیا ورنہ اگر وہ لالچ میں مبتلا ہو جاتی تو ہو سکتا تھا کہ تم اس کی خاطر پہلے سے بھی بڑی بڑی وارداتیں کرنے پر مجبور ہو جاتے۔“ حامد راؤ بہت سجاوے سے اسے احساسِ شرمندگی سے نکلانے لگا۔

”شکر ہے راؤ صاحب! میں نے اپنے بارے میں آپ کو اتنی تلخ سچائی سے شاید اسی لیے آگاہ بھی کر دیا کہ آپ مجھے صاحبِ دل آدمی محسوس ہوئے تھے، ورنہ کوئی عام آدمی تو میرے ڈاکو ہونے کا سن کر ہی بدک جاتا۔“ اس نے رقت آمیز لہجے میں حامد راؤ کا شکر یہ ادا کیا۔

”یہ بتاؤ کہ اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟ اگر تم چاہو تو ہم تمہیں اپنے کاروبار میں شامل کر سکتے ہیں۔ ہمارے زراعت اور باغبانی سے متعلق کاروبار سے تو شاید تمہیں اتنی دلچسپی نہ ہو لیکن شفقت کے دفتر میں تمہارے مطلب کا کوئی نہ کوئی کام نکل ہی آئے گا۔ میں تمہیں وہاں کھپادوں کا تاجر تم اپنی بوی کے ساتھ باعزت زندگی گزار سکو۔“ انہوں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اس سے اس کا پروگرام جانتا چاہا اور ساتھ ہی ایک پیشکش بھی کر دی۔

”میں آپ کا بہت ممنون ہوں راؤ صاحب کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ میں آپ کی اس پیشکش کو یاد رکھوں گا لیکن فی الحال مجھے اپنی ماں سے ملنے گاؤں جانا ہے۔ میری

خفاؤں کی وجہ سے وہ آج تک مجھ سے ناراض ہے۔ میں اسے منانے کی کوشش میں بھی کامیاب نہیں ہو سکا لیکن اب مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے ناراض نہیں رہ سکے گی۔ ماہ بانو اسے منانے لگی۔“ اسلم کی آنکھوں میں ایک امید تھی۔

”ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔ میری دعا میں تمہارے ساتھ رہیں گی۔“ حامد راؤ نے جواب دیا تو اسلم کی آنکھیں جھلجھلا اٹھیں۔ آج جانے کتنے برسوں بعد کی کہ یوں سے اس نے اپنے لیے دعا سنی تھی۔ ماں کی ناراضی کے بعد تو وہ اس لغت سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ ماں اب بھی اس کے لیے دعا میں کرتی ہو لیکن وہ خود ان دعاؤں کو اپنے کانوں سے سن کر حاصل ہونے والی خوشی سے محروم ہو گیا تھا۔ شاید ماہ بانو کا اس کی زندگی میں چلے آنا اس کی ماں کی دعاؤں کا ہی ثمر ہو ورنہ جرم کی راہ پر قدم رکھنے کے بعد تو اسے اپنا ایسا کوئی عمل یاد نہیں تھا جس کے صلے میں وہ اتنی بڑی نعمت کا حق دار سمجھتا۔

”کیا سوچتے لگے اسلم بھائی؟“ اس کی خاموشی کو محسوس کر کے اب تک گفتگو میں دخل نہ دینے والے مقصود نے آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں، بس اپنی خوش قسمتی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اللہ نے اتنے برے حالات میں بھی اتنے اچھے لوگوں سے ملوا کر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔“ اس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”انسان اپنی نیت صاف رکھے تو اللہ خود ہی منزل آسان کر دیتا ہے۔ آپ نے برائی چھوڑنے کا سوچا تو دیکھیں اللہ نے بھی آپ کا ہاتھ تمام لیا۔ بس اب ہمیں انتظار رہے گا کہ آپ کب واپس آکر ہمیں جوآن کرہ کریں۔“ مقصود کے چہرے پر بھی بڑی بے ریا اور مخلص مسکراہٹ تھی۔

”اللہ کو منظور ہوا تو میں جلد تمہارے درمیان دوبارہ پہنچ جاؤں گا لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم نے خود اپنے بارے میں کیا سوچا ہے۔ ہم لوگ جس انداز سے گاؤں سے نکلے ہیں، اس کے بعد تو کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ پیرسائیں کے معتقدین رات کے اندھیرے میں تمہارے گھر کو گھیر سکتے ہیں تو ان سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اور کیا کچھ کر گزریں۔ پہلے تو وہ پھر بھی شفقت راؤ صاحب سے تالاں تھے اور ان کی فیملی کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے لیکن اب تو تم لوگ بھی ذریعہ عتاب ہو گے۔ ہماری طرف سے چلائی گئی گولیوں نے جانے ان کے کتنے آدمیوں کو زخمی یا ہلاک کیا ہوگا۔ انتقام وہ لوگ تمہارے گھر

اور زمینوں کو بھی نشانہ بنا سکتے ہیں۔ پیرسائیں کی حقیقت کچھ بھی ہو لیکن یہ طے ہے کہ گاؤں میں اس شخص کے بہت سے عقیدت مند موجود ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال تمہاری گھر کی ملازمہ ہے۔ پہلے میں فوری طور پر اس عورت کا کردار سمجھ نہیں سکا تھا لیکن بعد کے حالات سے ثابت ہو گیا کہ اس عورت نے ہم لوگوں کے درمیان ہونے والی گفتگوں کی بھی اس لیے تیاری کا بہانہ کر کے چھٹی لے کر چلی گئی۔ اس کی زبان سے یہ جان کر کہ خافہ کو آگ لگنے میں شفقت راؤ ملوث تھا، پیرسائیں کے معتقدین مشتعل ہو گئے ہوں گے اسی لیے انہوں نے رات کی تاریکی میں تمہارے گھر پر حملہ کر دیا۔ اگر انہیں اس حملے کا بھرپور جواب نہ ملتا تو وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب بھی ہو سکتے تھے۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ ہم سب محفوظ رہے لیکن بات پھر وہیں آ جاتی ہے کہ اب ٹاپلی والا میں حالات تمہارے لیے بہت خدشہ ہوں گے۔ ایسے حالات میں تم کیا کرو گے اور کس طرح اپنا کام جاری رکھو گے؟ میرا جہاں تک خیال ہے، اب تک تو وہ قانون کو بھی تمہارے خلاف متحرک کر چکے ہوں گے۔ ویسے بھی تم لوگوں نے ہی مجھے بتایا تھا کہ علالتے کا تھانے دار خود پیرسائیں کا معتقد ہے۔“ اس نے راؤ خاندان کو درپیش خطرات ان لوگوں کے سامنے رکھ دیے۔

”ان سب باتوں کا تو ہمیں بھی اندازہ ہے۔“ مقصود کے بجائے حامد راؤ نے لگاؤ کھنکھارے ہوئے جواب دیا۔

”وقتی طور پر تو میں نے سوچ لیا ہے کہ اپنے بیان میں ہم یہ موقف اختیار کریں گے کہ رات کتنے سچ افراد اپنے گھر کو گھیرے میں لے دیکھ کر ہمیں یہ گمان گزرا تھا کہ ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے چنانچہ ہم نے بھی جوانی کا رروائی کر ڈالی اور بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر نکلے میں کامیاب ہوئے۔ رہی متعلق افراد کے ہماری املاک کو نقصان پہنچانے کی بات تو اس معاملے کو میں اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ میں نصیب پر یقین رکھنے والا آدمی ہوں اور میرا ایمان ہے کہ جو شے میری ہے، وہ ہر حال میں مجھے ملتی ہے اور جو اللہ مجھے نہیں دینا چاہتا، وہ اس اپنا پورا زور لگا کر بھی حاصل نہیں کر سکتا۔“

”آپ کی سوچ بہت اچھی ہے۔ میں دعا کروں گا کہ جب میں اپنی ماں سے مل کر وہاں آؤں تو حالات اس بچ پر ہوں کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ کام کر سکوں۔ آپ کے ہاں ملازمت کرنے کو میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔“ وہ حامد راؤ سے بے حد متاثر ہو چکا تھا چنانچہ پورے دل سے بولا۔ آگے

کیا ہونے والا ہے، یہ فیصلہ تو بہر حال اس تقدیر سے ہی ہوتا تھا جس کا حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا البتہ اللہ کو ماننے والے اپنے حصے کی جدوجہد کرنے کے بعد اس پر شکر اور صبر سے کام لیتے ہیں کہ اسی میں حقیقی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔

☆☆☆

مشاہیر خان ایک بار پھر ٹاہلی والا میں تھا۔ شہر یار نے اسے پیرسائیں کے متعلق مزید تحقیق کرنے کی ذمہ داری سونپی تھی چنانچہ اس نے تاخیر مناسب نہیں سمجھی اور دوبارہ وہاں چلا آیا۔ پہلے اس کا ارادہ تھا کہ پیرسائیں سے ملاقات کا بہانہ کر کے ایک بار پھر اس کے اس مرید سے ملنے پہنچ جائے گا جس نے پہلی بار ٹاہلی والا آنے پر اس کی میزبانی کی تھی لیکن پھر خود ہی اپنا ارادہ بدل ڈالا۔ پچھلی بار ہی اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا میزبان پیرسائیں کا اندھا معتقد ہے۔ اس شخص سے اسے پیرسائیں کے متعلق جو بھی معلومات حاصل ہوئیں، وہ اتنی قابل اعتماد اس لیے نہیں ہو سکتی تھیں کہ عقیدت مند رنج بانی سے زیادہ اپنے اعتقاد سے کام لیتا چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ کسی ایسے شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کرے گا جو اسے درست معلومات فراہم کر سکے۔ اس چکر میں وہ ٹاہلی والا میں ادھر ادھر گھومتا پھر رہا تھا۔ خانقاہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہاں تعمیر نو کا کام بڑی سرعت سے جاری ہے لیکن اس نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور بغیر رکے سیڑھا آگے بڑھتا چلا گیا۔

ٹاہلی والا بھی دیگر دیہاتوں کی طرح ایک عام سا پنڈ تھا جہاں کچے اور نیم پنڈت مکانوں کی اکثریت تھی۔ پنڈت مکان بس چند ہی تھے جو یقیناً پنڈ کے صاحب ثروت لوگوں کی ملکیت تھے۔ ان میں سے ایک مکان چودھری شریف کا بھی تھا جہاں اس نے پچھلی بار قیام کیا تھا اور جہاں پیرسائیں نے بھی آج کل اپنا گھٹکانا بنا رکھا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر اس طرف کا رخ نہیں کیا کہ مبادا مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے کسی ایسے شخص سے ٹکراؤ ہو جائے جو اس کا صورت آشنا ہو اور پچھلی بار اس کے وہاں قیام سے آگاہی رکھتا ہو۔ چودھری شریف کے مکان کی طرف جانے والے راستوں سے مختلف سمت میں چلتا ہوا وہ ایک مقام پر پہنچ کر ٹھنک گیا۔ وہ ایک پنڈت مکان تھا جسے بری طرح آتش زنی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ مکان کی حالت دیکھ کر ہی اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہاں باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ آگ لگائی گئی تھی۔ مکان کی تعمیر میں استعمال ہونے والی گھڑی کا سرے سے نام و نشان ہی نہیں رہا تھا اور وہاں بغیر کھڑکیوں دروازوں کا بس

ایک ڈھانچا سا کھڑا رہ گیا تھا۔ عمارت کے اتنے بڑے انجام کو دیکھ کر اس بات کا تو تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ روزمرہ استعمال ہونے والے ساز و سامان میں سے کوئی شے سلامت رہی ہو۔ اگر اتفاق سے کچھ باقی بھی رہا ہوگا تو کسی بھی موقع پرست کے ہاتھ لگ گیا ہوگا۔ اسے مکان کی حالت دیکھ کر یہ اندازہ لگانے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی کہ مکان حاید راؤ نامی اس شخص کی ملکیت ہے جو خانقاہ کو آگ لگانے والے شخص شفقت راؤ کا کزن اور سہمی ہونے کے ناتے معتب ظہیرا تھا۔ اسی مکان میں بانو اور اسلم کی موجودگی کی بھی اطلاع ملی تھی۔ اب وہ دونوں اپنے میزبانوں سمیت جانے کہاں تھے لیکن اسے اس تباہ شدہ مکان کو دیکھ کر دلی افسوس ہو رہا تھا۔

حالات و واقعات بے شک مختلف تھے لیکن اس گھر کو دیکھ کر اسے اپنے گھر کا جز نایا یاد آ گیا تھا۔ کئی مہینوں بعد بھی مگر وہ بھی اپنے اس چھوٹے سے گھر جایا کرتا تھا جہاں اس کی ماں اور چھوٹا بھائی اکرم خان رہتے تھے۔ اکرم خان اس کی خاطر ماہانہ نوکی حفاظت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اپنی جان سے چلا گیا جبکہ ماں کو جوان بیٹے کی موت کا صدمہ ڈھا گیا۔ وہ آج بھی نیم مردہ حالت میں اسلام آباد کے ایک اسپتال میں داخل تھی اور وہ دل میں ان لوگوں کے لیے انتقام کی آگ لیے پھر رہا تھا جن کی وجہ سے اس کا گھر برباد ہوا تھا۔ اب ٹاہلی والا میں ایک بار پھر اس نے ایسی صورت حال دیکھی تھی کہ ایک نام نہاد پیر کے عقیدت مندوں نے اپنے ہی پنڈ کے رہائشی ایک عزت دار گھرانے کو بے گھر کر کے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔

حاید راؤ کے چلے ہوئے گھر کے سامنے سے وہ بڑی بھیجی کیفیت میں آگے بڑھا اور بے خیالی میں آگے بڑھتا ہی چلا گیا۔ چلتے چلتے وہ مکانوں کی حدود سے نکل کر مکمل علاقے میں پہنچ گیا۔ یہاں دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ان ہرے بھرے کھیتوں میں ہی اس نے کافی بڑے قطعہ اراضی کو اسی حال میں دیکھا جس حال میں وہ ابھی حاید راؤ کا گھر دیکھ کر آ رہا تھا۔ دوسرے کھیتوں کی طرح یقیناً یہاں بھی کھڑی فصلیں موجود ہوں گی لیکن اب تو بس راکھ کا ڈھیر ہی رہ گیا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ صدمے میں مبتلا ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ زمین کے سینے کو چیر کر اس میں سے کھیتی کوٹیل نکلنے اور پھر اس کوٹیل کے پٹنے تک کے مراحل اتنی آسانی سے طے نہیں ہوتے۔ کسان اپنا خون پینا ایک کرا ہے تب کہیں جا کر زمین وہ رزق دیتی ہے جو انسانوں کے پیٹ کا دوزخ بھر سکے۔ فصل کے تیار ہونے تک اپنے دل

عقلمندانہ

رات ایک کر دینے والا کسان اپنے بہت سے خواب اور امیدیں بھی ساتھ ساتھ ہی پروان چڑھاتا ہے۔ اگر حادر راؤ کا گھر تباہ ہوا تھا تو یہ صرف اس کا ذاتی نقصان تھا۔ صاحب حیثیت آدمی اس طرح کے نقصانات کو بعد میں کسی نہ کسی طرح پورا کر ہی لیتا ہے لیکن کھڑی فصلیں جلانے جانے کا مطلب تھا کہ وہ غریب مزارع بھی متاثر ہوئے ہوں گے جن کی روزی رونی ان کی کمیتوں سے وابستہ ہوگی۔ اسے اندازہ تھا کہ حادر راؤ اپنے خاندان کے ساتھ جہاں کہیں بھی ہوگا، کم از کم فاقہ کشی پر مجبور نہیں ہوگا لیکن اس کے کھیتوں پر کام کرنے والے کسانوں کے گھر تو جلد یا بدیر یہی توبت آنے والی تھی۔۔۔ اور یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ پیرسا میں کی عقیدت کا دم بھرنے والے وہ مشتعل افراد جنہوں نے یہ کارنامہ انجام دیا تھا، اپنے عمل کی تلافی کرتے ہوئے ان غریبوں کی کفالت کا ذمہ اٹھاتے۔

اس صورت حال پر اس کا دل بے حد پھول ہو گیا اور اس پھول دل کے ساتھ وہ واپس پلٹنے ہی لگا تھا کہ نظر ایک بوڑھے پر پڑی۔ بچی ہوئی بیان اور نیکی دھونی پہنے وہ بوڑھا دونوں ہاتھ سر پر رکھے جلے ہوئے کھیت کے درمیان اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ بوڑھے سے اس کا فاصلہ اچھا خاصا تھا اس کے باوجود وہ اس کے چہرے پر کبھی حسرت و یاس کی تحریر پڑھ سکتا تھا۔ اس کے قدم بے ساختہ ہی اس بوڑھے کی طرف اٹھ گئے۔ بوڑھا اس کی آمد سے خبر چلے ہوئے کھیت کے منظر میں اس طرح گم تھا کہ اسے ارد گرد کا کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ البتہ قریب جانے پر مشاہیرم خان کو وہ آنسو بھی نظر آگئے تھے جو بوڑھے کی نیل زدہ آنکھوں سے نکل کر بہتے ہوئے اس کی کچھڑی داڑھی میں گم ہو جاتے جارہے تھے۔ اچھے ہوئے بالوں والی وہ داڑھی گواہی کہ اس بے چارے نے اپنے شب و روز پینا بہاتے ہوئے اتنی مصروفیت میں گزرا ہے تھے کہ اسے اپنے وجود کی صفائی سترائی کی بھی مہلت نہ مل پاتی ہوگی۔ وہ بنا کوئی سوال کے بھی بوڑھے کا کھیت سے تعلق سمجھ رہا تھا چنانچہ دل میں اس کے لیے گہری ہمدردی محسوس کرتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر آہستہ سے دبا یا۔ بوڑھے کے وجود میں پہلی بار جنتیش پیدا ہوئی اور اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا البتہ لب لباب بھی خاموش ہی تھے۔

”اسلام علیکم بابا!“ مشاہیرم خان نے خود ہی گفتگو کا سلسلہ شروع کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں وہ بوڑھے کی آواز توبہ بن سکا البتہ اس نے سر کی جنتیش سے سلام کا

جواب دے دیا۔

”آپ کون ہو بابا اور اس جلے ہوئے کھیت میں کیوں بیٹھے ہو؟“ مشاہیرم خان نے ہمت نہ ہاری اور خود بھی بوڑھے کے سامنے بچوں کے مثل بیٹھ گیا۔

”جانے کیوں بیٹھا ہوں؟“ بوڑھے کے لب کھوئے کھوئے انداز میں متحرک ہوئے۔ ”سب بولتے ہیں کہ نور بخش! اب ادھر کچھ نہیں رہا۔ تو ادھر کیوں آتا ہے؟ پر میرا تو سب کچھ ادھر ہی تھا۔ لیکن ادھر نہ آؤں تو بیچھ نہیں آتا کہ کدھر جاؤں۔“

”کیا یہ کھیت تمہارے تھے بابا؟“ اس نے بوڑھے سے نور بخش کو کریدنے کے لیے اس سے سوال کیا۔

”میرے نہیں تھے پر میرے ہی تھے۔ میں نے کسی باپ کی طرح اس کے ایک ایک بولے کو پروان چڑھایا تھا۔ ادھر سے مجھے اپنی روزی ملتی تھی۔ یہ فصل کٹ کر منڈی میں کتنی تو مالک مجھے میری دھکی کے دیا ہے کے لیے روپے دیتا۔ مالک نے مجھ سے وعدہ کیا تھا ہر وعدہ کے باز اپنا چچا آدمی ہے، پر خالوں نے تو مالک کو اس کے کہنے کے ساتھ یہاں سے بھاگ ڈالا۔ اب میں کس کے سامنے جا کر ہاتھ پھیلاؤں کہ مجھے میری دھکی کے دیا ہے کے لیے روپے دو۔۔۔ ہور بابا چھ ہور جائیں جو گھر میں بیٹھی ہیں، ان کے پیٹ بھرنے کا بندوبست کرو۔ کوئی سننے والا ہے ہی نہیں بس اس لیے یہاں سینہ کوٹنے کے لیے آ جاتا ہوں۔ اس جلے ہوئے کھیت کو دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرے سامنے میرے جوان بیٹے کا لاش پڑا ہو۔“ نور بخش اور بھی زیادہ شدت سے رونے لگا۔ دہلے پٹے نور بخش کا جسم جھکیوں کے زور سے بری طرح ہل رہا تھا۔ قریب سے اسے دیکھتے مشاہیرم خان کو اندازہ ہور ہوا تھا کہ درحقیقت وہ اتنا بوڑھا نہیں ہے جتنا دور سے دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً غم و الم کی شدت نے اس کے حلیے پر وہ اثرات مرتب کیے تھے جن کی وجہ سے وہ بہت زیادہ عمر رسیدہ محسوس ہور ہوا تھا۔

”تمہارے مالک کے کھیت کیوں چلائے گئے؟ کیا وہ کوئی برا آدمی تھا اور اس کی کسی سے دشمنی تھی؟“ وہ ایسے رخ سے سوالات کر رہا تھا کہ بوڑھا خود ہی حقیقت اگلتا جائے۔ اس کی یہ حکمت عملی کامیاب رہی اور وہ ہلکا کر بولا۔

”نہ تو میرا مالک برا آدمی تھا ہر نہ ہی اس کی کسی سے دشمنی تھی۔ وہ چارہ تو بس رشتے داری ہر دوستی یاری کے چکر میں زد میں آ گیا۔ جو کچھ کیا تھا، اس کے سہمی نے کیا تھا لیکن پاگل لوگ اب و چارے کے گھر پر چڑھ دوڑے ہور اب الٹی

سیدھی کہانیاں بنا کر اسے بھی مجرم ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”ارے کہیں تم حادر راؤ کی توبت نہیں کر رہے؟“ مشاہیرم خان نے چونکنے کی اداکاری کی۔ ”میں نے سنا ہے کہ حادر راؤ کے چچا زاد بھائی اور سہمی شفتت راؤ نے خاٹھاہ میں آگ لگا دی تھی اور حادر راؤ نے اس کے گھر کی عورتوں کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی تھی اس لیے گاؤں والوں نے غصے میں اس کے گھر پر حملہ کر دیا۔“

”عورتوں کو پناہ دینی تھی تو کوئی جرم تو نہیں کیا تھا۔ وہ عورتیں اس کی بھی عزت تھیں۔ اگر کسی کو شفتت راؤ سے شکایت تھی تو جا کر اسے بکڑتا، بے گناہوں کے پیچھے سب ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے؟ ہور بچ پوچھو تو مجھے یقین بھی نہیں ہے کہ شفتت راؤ پر لگا الزام سچا ہے۔ وہ خود وہ چچا آدمی ہے۔ دو برس پہلے میرا پتر تیار پڑ گیا تھا تو اس نے اپنے خرچ پر شہر سے اس کا علاج کروایا تھا۔ وہ نیک آدمی و چارہ تو خود بڑا دھمی تھا۔ جوان پتر کی موت نے اس کا حال تباہ کر دیا تھا۔ ملوم نہیں صدے سے اس کا داغ الٹ گیا تھا یا کچھ ہو رہی چکر تھا؟ تھوڑی اڑتی پڑتی میرے کانوں میں ایسی گل پڑی تو بے جس کون کر لگتا ہے کہ خاٹھاہ میں کچھ گڑبڑ ہے۔“ نور بخش روانی میں بولنا شروع ہوا تو بولتا ہی چلا گیا۔ شاید غم و غصے کی شدت نے اس کو اتنی بری طرح متاثر کر رکھا تھا کہ وہ مشاہیرم خان کے اجنبی ہونے کے باوجود بھی تسلسل سے اس کے سامنے دل کی بھڑاس نکالتا جا رہا تھا۔

”کیا چکر تھا خاٹھاہ میں؟“ نور بخش سے ہونے والی گفتگو اتنے اہم موڑ پر آ گئی تھی کہ اسے اپنے آپ پر قافور کھٹا آسان نہیں رہا اور وہ حکیم ہی بنے باقی سے پوچھ بیٹھا۔

”اوئے تم کون ہو اور مجھ سے یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟“ اس کی بداحتیاطی نے آخر گڑبڑ کر ہی دی اور بڑی آسانی سے سب کچھ بتاتا نور بخش چونک کر اس سے پوچھنے لگا۔

”مم۔۔۔ میں تمہارا ہمدرد ہوں۔“ مشاہیرم خان شیشا گیا۔

”ہمدرد۔۔۔؟ کدھر سے آئے ہو؟“ بوڑھا پوری طرح بدکا ہوا تھا۔

”میری بات آرام سے سنو نور بخش بابا! میں حادر راؤ صاحب کے ہمدردوں میں سے ہوں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اصل میں یہاں کیا ہوا تھا۔ ہمیں خود بھی یہی شک ہے کہ خاٹھاہ میں کوئی غلط کام ہو رہا تھا جس کی وجہ

سے شفتت راؤ نے وہاں آگ لگا دی ورنہ اس کے بارے میں ہمارے پاس بھی یہی رپورٹ ہے کہ وہ بڑا اچھا آدمی ہے۔“ مشاہیرم خان نے فوراً ہی خود کو سنسجال لیا اور نور بخش کے شائوں پر اپنے دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر بہت طریقے سے رام کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”تم پولیس والے تو نہیں ہو۔۔۔؟“ بوڑھے نے اسے گھورا پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”ہمیں ماچھی (معانی) دے دو صاحب! ہم بہت گریب (غریب) آدمی ہیں۔ پہلے ہی ہمارا بہت کچھ برباد ہو چکا ہے۔ اب پولیس کو گواہی اور بیان دینے کے چکر میں پڑیں گے تو بالکل ہی برباد ہو جائیں گے۔ جو پاگل لوگ ہمارے مالک جیسے بڑے آدمی کا یہ حال کر سکتے ہیں کہ اس کا مکان اور کھیت جلادیں، وہ ہماری تو ٹکا بونی کر دیں گے۔ مالک تو یہاں سے نکل کر کہیں نہ کہیں پھر بھی آرام سے رہے ہی لگا، پر ہم اس پنڈے نکل کر کدھر جائیں گے؟ ہمیں تو مرنے کے لیے بھی یہاں کے سوا کہیں زمین نہیں ملے گی۔“ وہ کافی خوف زدہ لگ رہا تھا۔

”تم اس بات کی فکر نہ کرو کہ تمہیں کہیں گواہی یا بیان کے لیے بلایا جائے گا۔ تم مجھے جو کچھ بتاؤ گے، وہ بس میرے اور تمہارے درمیان رہے گا۔ میں کسی کو بھی یہ نہیں بتاؤں گا کہ تم نے مجھے کچھ بتایا تھا۔“ مشاہیرم خان اسے یقین دہانی کروانے لگا لیکن اس کے لب خاموش ہی رہے اور وہ ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ اپنے شائوں سے ہٹا کر کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا لیکن مشاہیرم خان نے اسے اس کی کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دیا اور مضبوطی سے اس کا بازو تھام لیا۔

”ہمیں ماچھی دے دو صاحب، ہور ادھر سے جانے دو۔“ وہ گڑبڑایا۔

”تمہیں۔۔۔“ مشاہیرم خان سختی سے بولا۔ ”تمہیں مجھے سچ بتانا ہوگا۔ اگر تم نے مجھے سچ نہیں بتایا تو جو ظلم ابھی ہوا ہے وہ بار بار ہوگا۔ تم اسے خود غرض نہ بنو کہ صرف اپنی گردن بچانے کے لیے ظالموں کے بارے میں زبان بند کر کے رکھ لو۔ پھر جب میں تمہیں اس بات کی ضمانت دے رہا ہوں کہ تمہارا نام سامنے نہیں آئے گا تو تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ نور بخش کے بازو پر اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ انگلیاں اس کی ہڈیوں میں گھسی جا رہی تھیں۔ نور بخش بے بس سا ہور دو بارہ وہاں بیٹھ گیا۔

”مجھے زیادہ کچھ ملوم نہیں ہے۔ بس میرے ڈٹے پتر نے اتناپ شاپ کچھ تھوڑا سا بتایا تھا۔ اب کون جانے کے

ہیں نے سچ بھی کہا تھا یا نہیں۔“ وہ گویا اب بھی تذبذب کا شکار تھا۔

”جہیں جو اور جتنا معلوم ہے مجھے بتا دو۔ باقی سچ جھوٹ معلوم کرنا میرا اپنا کام ہے۔“ مشاہیرم خان نے اپنے لہجے کی سختی برقرار رکھی۔ نور بخش اسے پولیس کا آدمی سمجھ رہا تھا تو اس نے اس کے انداز سے کی تردید کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ کچھ پولیس والوں جیسا ہی انداز اختیار کر کے اس کے حلق سے سچ اگوانے کی کوشش میں تھا۔

”میرے پتر ہور شفقت راؤ کے پتر صداقت میں تھوڑی دوتی تھی۔ شروع میں دونوں ادھر ہی اسکول میں پڑھتے تھے، بعد میں شفقت راؤ نے صداقت کو پڑھنے کے لیے شہر بھجوا دیا تو دونوں کا ملنا جلنا کم ہو گیا، پرم صداقت وڈا بیا بچہ تھا۔ جب بھی چینیوں میں پڑھتا تھا تو میرے پتر سے ضرور ملتا تھا۔ مجھ سے بھی دعا سلام ضرور کرتا تھا لیکن آخری بار وہ پڑھ آیا تو کسی سے ملا جلا ہی نہیں۔ فیر سا کہ اس پر کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہے اور خانقاہ میں پیر سائیں اس کا علاج کر رہے ہیں۔ یہی معلوم ہوا کہ پیر سائیں کے علاج سے اسے فیدہ ہوا ہے، ہور اس کا آسیب چلا گیا ہے۔ انہی دنوں میرے پتر کو پڑھنے سے ذرا پرے ادھر ملا جہاں سے آگے پہاڑ شروع ہو رہے ہیں۔ میرا پتر اصل میں صداقت کا پچھا کرتا ہوا ہی ادھر گیا تھا۔ اس نے ادھر دیکھا کہ صداقت جیب سے کوئی پڑیا نکال کر اسے سگریٹ میں بھر کر پی رہا ہے۔ اسے وڈی حیرت ہوئی کہ صداقت جیسا پڑھنے لکھنے والا منڈا سگریٹ کب سے پینے لگا۔ وہ تو کبھی شوق میں بھی پان چھالیا کھانا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے صداقت کو پکڑ لیا ہور سگریٹ کے بارے میں پوچھا۔ اس کے پوچھنے پر صداقت ہنسنے لگا اور بولا کہ یہ جادو کی پڑیا مجھے پیر سائیں نے دی ہے اور یہ سگریٹ میں ڈال کر پینے سے ہی اپنا اصل اثر دکھاتی ہے اس لیے میں بھورا سگریٹ پی رہا ہوں۔ میرے پتر نے اس سے پڑیا کے بارے میں بہت سوال کیے لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا بلکہ اپنی دوتی کا واسطہ دے کر کہا کہ یہ گل کسی کو نہیں بتانا اور یاد رکھنا کہ میرا آسیب اسی پڑیا سے قابو میں رہتا ہے۔ میرے پتر نے وعدہ کر لیا کہ جب صداقت کے مرنے کی خبر ملی تو وہ چپ نہیں رہے گا ہور میرے سامنے سارا قصہ بیان کر دیا۔ اس نے شک ظاہر کیا کہ صداقت شکر کرنے لگا تھا، پریس نے اس کی زبان سختی سے بند کر دی ہور بھی حکم دیا کہ کسی کو کچھ نہ بتائے کیونکہ مجھے علم تھا کہ اگر اس نے کسی ایسی ویسی گل کے ساتھ پیر سائیں کا نام لیا تو پیر سائیں کے مرید اسے زندہ

نہیں چھوڑیں گے۔ وہ سارے ہی وڈے جنونی ہیں۔ ایک واری پنڈ کے ایک لڑکے نے مذاق میں دوستوں میں بیٹھ کر پیر سائیں کو جلی پیر کھڑا تھا تو بعد میں اس کے مریدوں نے لڑکے کی زبان لکڑی سے کھینچ لی تھی۔ میرے پتر کو بھی وہ واقعہ یاد تھا اس لیے میرے منع کرنے پر اس نے اپنی زبان بند کر لی، پر مجھے لگتا ہے کہ شفقت راؤ کو بھی کسی نہ کسی طرح اس مالے کی خبر ہو گئی تھی اسی لیے اس نے خانقاہ کو آگ لگا دی۔ فیر اس کے بعد جو ہوا، وہ تو آپ کو بھی معلوم ہی ہے۔“

”ہوں۔“ مشاہیرم خان نے ایک زوردار ہنکارا بھرا۔ وہ جس سرے کی تلاش میں یہاں تک آیا تھا وہ اسے مل گیا تھا اور آخر کار شہر یار کے شک کے مطابق پیر سائیں کی شخصیت کے بارے میں ایک اہم انکشاف ہوئی گیا تھا۔

”تم نے کہا تھا کہ حامد راؤ کے گھر کو آگ لگانے کے بعد اب اس کے بارے میں غلط سلسلہ کہانیاں بنائی جا رہی ہیں۔ وہ کہانیاں کیا ہیں؟“

”پیر سائیں کے چاہنے والے اصل مالے کو چھپانے کے پکر میں ہیں۔ انہوں نے شفقت راؤ کا ذکر ہی کہانی سے نکال دیا ہے اور کہانی یہ بنائی ہے کہ حامد راؤ نے اپنے گھر میں ڈاکوؤں کو جیسا رکھا تھا۔ پنڈ والوں کو ملو ہوا تو انہوں نے حامد راؤ کا گھر گھیر لیا ہور اس سے ڈاکوؤں کو باہر نکالنے کا مطالبہ کیا، پر حامد راؤ نے یہ گل ماننے کے بجائے منہ لوگوں پر فائرنگ کر وادی۔ بندے مرے ہور زخمی ہوئے تو غصے میں لوگوں نے اس کے گھر اور کھیتوں کو آگ لگا دی۔ اب پولیس رپٹ میں حامد راؤ ہور اس کے گھر والے ڈاکوؤں کے ساتھی ہور قاتل بن گئے ہیں، پریس جانتا ہوں کہ میرا مالک حامد راؤ ایسا بندہ ہی نہیں ہے کہ اس کے ڈاکوؤں سے تعلقات ہوں۔ یہ ساری پکر بازی پیر سائیں ہور اس کے مریدوں کی ہے۔“

نور بخش نے بے لاگ تبصرہ کرتے کرتے اپنا سر اوپر اٹھا دیا تو اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں ہی لہرا گئیں۔ اس کی کیفیت کو محسوس کر کے مشاہیرم خان نے تیزی سے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں کامیاب ہونے سے قبل ہی اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی اور اس کا ذہن تیزی سے تاریکی کے اندھیروں میں ڈوبنے لگا۔ مکمل بے ہوشی طاری ہونے سے قبل اس کے کانوں نے جو آخری آواز سنی وہ گولی چلنے کے دھماکے کی تھی۔

یہ پریسیج و سنسنی خیز داستان جاری ہے مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیے



نشانہ

کاشف زبیر

انسانی فطرت کے کئی پہلو ایسے ہیں جو طویل رفاقت کے باوجود نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں... وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی تھے... مگر وقت کے ایک ہی جھونکے نے انہیں ہمیشہ کے لیے علیحدہ کر دیا... اُن اُن دیکھے جذبوں کی عکاسی جنہیں وقت کی دھول نے مٹنے نہیں دیا تھا...

قتل کی ایک سنگین واردات... قتل اور قاتل دونوں سمان کے تھے۔

تھی۔ ویسے بھی گورڈن جب سے پولیس کیٹین بنا تھا، تب سے سام کی کم بختی آتی رہتی تھی۔ سام دس سال سے میا کی پولیس کے ہومی سائز کے شعبے میں کام کر رہا تھا۔ جب وہ یہاں آفیسر بن کر آیا تو گورڈن اس وقت لیفٹیننٹ تھا اور بد قسمتی سے وہ اسی کی ماتحتی میں آیا تھا۔ تب سے گورڈن اسے ناپسند

قتل معائنہ کیا تھا۔ سام پورمین کی ڈیوٹی ختم ہونے والی تھی کہ اسے اطلاع ملی، میرین ٹیمز میں ایک آدمی کا قتل ہو گیا ہے۔ کیٹین گورڈن نے اسے وہاں جانے کا حکم دیا۔ سام کے پاس دو کیس تھے اور مزید کیس کی تفتیش کے لیے وقت نکالنا دشوار تھا لیکن حکم حاکم کا تھا اس لیے جانا مجبوری

کرنے لگا تھا۔ اگرچہ اس کی وجہ کوئی نہیں جانتا تھا لیکن یہ سب جانتے تھے کہ گورڈن سام کو پسند نہیں کرتا اس لیے جب وہ کپٹن بنا، تب ہی سب جان گئے تھے کہ اب سام یورین کی کمپنی آئے گی۔ پھر ایسا ہی ہوا۔

کیونکہ کپٹن نے اسے ابتدائی نقیش کی ذمہ داری سونپی تھی اس لیے سام نے مناسب سمجھا کہ ابھی احتجاج نہ کرے۔ ہاں اگر گورڈن کیس باضابطہ اس کے سپرد کرنا چاہتا تو وہ احتجاج کر سکتا تھا۔ ہوی ساڈ میں اس کے کئی ساتھی افسران فارغ بیٹھے تھے۔ گورڈن چاہتا تو ان میں سے کسی کو یہ ذمہ داری سونپ سکتا تھا مگر اس نے سام سے ہی کہا۔ یاد دل نا خواستہ وہ اپنے پانٹرمل کے ہمراہ میرین ٹیمز پہنچا۔ ٹیمز اور ڈیوڈ کی وکس عمارت ساحل سے کچھ ہی دور تھی۔ یہ اعلیٰ درجے کا ٹیمز تھا اور یہاں عام طور سے بڑے فن کاروں کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملتا تھا۔ تماشاخیوں میں پوش طبقہ اور درمیانی طبقہ شامل ہوتا تھا۔ یہاں کا گھٹ ہر آدمی نہیں لے سکتا تھا۔

جب سام اوپر مل وہاں پہنچے تو پولیس پہنچ چکی تھی اور اس نے حالات کو اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا۔ ٹیمز کی عمارت شاہین سے خالی ہو چکی تھی کیونکہ قتل کا انکشاف ہوتے ہی لوگ افراتفری میں وہاں سے نکل بھاگے تھے۔ البتہ ٹیمز کا محلہ اور فن کا مظاہرہ کرنے والے آرکسٹرا کے لوگ موجود تھے۔ پولیس نے ٹیمز کے سامنے پہلی پٹیاں لگا کر عام لوگوں کا داخلہ روک دیا تھا۔ سام اوپر مل سڑکیاں چڑھ کر عمارت میں داخل ہوئے۔ سام نے ہی ٹیمز مالک اور ٹیمز موجود تھے۔ سام اوپر مل ان کو نظر انداز کر کے ڈیوڈ پر موجود پیڑ ونگ آفسر کی طرف آئے۔ جیکمین سے سام واقف تھا، ایک زمانے میں وہ اس کے ساتھ بھی کام کر چکا تھا۔

”ہیلو جیک! کیا معاملہ ہے؟“ سام نے اس سے ہاتھ ملایا۔

”موسیقار ہنرک شیفیلڈ قتل کر دیا گیا ہے۔“ سام چونکا۔ ”ہنرک... یہ وہی موسیقار ہے جسے اس سال آسکر ایوارڈ کے لیے بھی نامزد کیا گیا ہے۔“

”بالکل وہی... اس نے فلم بلوئج کی موسیقی ترتیب دی تھی۔“ جیکمین نے سر ہلایا۔ ”جس وقت اسے قتل کیا گیا، وہ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔“

سام کے لیے یہ ایک اور چونکانے والی خبر تھی۔ گویا قتل ہزاروں افراد کے سامنے ہوا تھا۔ ”وہ کیسے؟“

معلوم ہوا ہے، اس کے مطابق ہنرک موسیقی کے لیے مخصوص اشارے دیتے ہوئے اچانک ڈانس سے گرا اور سناٹ ہو گیا۔ کچھ افراد نے جب اس کے پاس جا کر دیکھا تو وہ ختم ہو چکا تھا۔“

”یہ کیسے پتا چلا کہ اس کی موت قتل کا نتیجہ ہے؟“

”ڈاکٹر آگیا ہے اور اس نے بتایا ہے کہ کسی ذریعے سے اس کے جسم میں سائٹاؤ داخل ہوا ہے اور اس سے فوری موت واقع ہو گئی۔“

”جسم میں کیسے داخل ہوا... کیا کسی نے اسے کھلایا ہے؟“

”اس بارے میں تو ڈاکٹر ہی بہتر بتا سکے گا۔“ جیکمین نے کہا۔ وہ ہال میں داخل ہوئے جہاں موسیقار کی لاش سفید چادر سے ڈھک دی گئی تھی اور پاس ہی ڈاکٹر رابن براؤن موجود تھا۔ وہ شاید ابتدائی رپورٹ لکھ رہا تھا۔ سام اوپر مل اس کے پاس آئے۔

”کیا ہوا ہے؟“ سام نے لاش کی طرف دیکھا۔

”سائٹاؤ... ڈاکٹر نے مختصر جواب دیا۔

”کس طرح سے استعمال ہوا ہے؟“

”ابھی معلوم نہیں ہے۔“ ڈاکٹر رابن رکھائی سے بولا۔

”حتی رپورٹ پوسٹ مارٹم کے بعد ہی آسکے گی۔ بہر حال، منہ سے استعمال نہیں ہوا ہے۔“

ڈاکٹر رابن بھی سام کو نا پسند کرتا تھا۔ ایک کیس میں سام نے اسے کچھ سنا دی تھی کیونکہ اس نے لاش کا ٹھیک طرح سے معائنہ نہیں کیا تھا جس سے نقیش میں رکاوٹ آئی تھی اور بعد میں جب درست طبی رپورٹ سامنے آئی تو مجرم کی شناخت ہو چکی تھی، جب سے ڈاکٹر رابن اس سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ سام کو بھی اس کی پروا نہیں تھی۔ اس نے جواب سن کر لاش کے چہرے سے کپڑا ہٹایا۔ اس کی رنگت آنی دیر میں نیلی پڑی تھی اور آنکھوں کے ڈیلے نما ہاں طور پر سفید ہو رہے تھے۔ ہنرک ڈبلا پتلا شخص تھا۔ عمر بچپن سے زیادہ نہیں تھی۔ دیکھنے میں وہ بالکل بھی خوش رو نہیں تھا۔

چوہے جیسا چہرہ اور سامنے سے اڑنے والے بالوں نے رہی یہی کسر پوری کر دی تھی۔ سام کو موسیقی سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ ہنرک کے بارے میں نہ ہونے کے برابر جانتا تھا۔

ٹیمز میں اسٹیج پر غم دائرے میں آرکسٹرا ترتیب دیا گیا تھا اور ہنرک گھڑی کے ایک دو فٹ اونچے ڈانس پر اس طرح کھڑا ہوتا کہ اس کا دایاں حصہ تماشاخیوں کی طرف اور

بایاں حصہ آرکسٹرا کے سازندوں کی طرف ہوتا تھا اور اس کا منہ سامنے دی آئی بی باکسز کی جانب ہوتا۔ ویسے عام تماشاخی بھی اسے بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ وہ سازندوں کو اپنی مخصوص چٹری اور خالی ہاتھ کی مدد سے اشارے دے رہا تھا کہ اچانک وہ رک گیا اور اگلے ہی لمحے وہ دھڑام سے ڈانس سے نیچے اسٹیج پر گرا اور دائیں پہلو کے بل ساکت ہو گیا۔ وہ اس وقت بھی اسی انداز میں پڑا ہوا تھا، کسی نے اس کی پوزیشن تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جب تک دوسرے اس تک پہنچتے، اس کی رونق نفس غصری سے پرواز کر چکی تھی۔ پولیس فوگر افرنے لاش کی ہر زاویے سے تصویر لے لی تھی اور ڈاکٹر بھی اس کا معائنہ کر چکا تھا اس لیے اب اسے الٹے پلٹے اور اس کا معائنہ کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ سام نے دستانے پہنے اور لاش پر سے چادر مکمل ہٹا دی۔ ہنرک موسیقاروں کے مخصوص لباس میں تھا۔ یعنی لباس ساکٹ جو سامنے سے کھلا تھا اور پیچھے سے لٹکا ہوا تھا۔ اوپر مخصوص بواور شرٹ تھی۔ اس کا سر نہ صرف بالوں بلکہ کسی ٹوپی سے بھی بے نیاز تھا۔ سام نے جب سے حد سے نکالا اور اس کی مدد سے سب سے پہلے ہنرک کے جسم کے کپٹھنوں کا معائنہ کیا۔ اس کا چہرہ گردن تک لباس سے آزاد تھا۔ اس کے ہاتھوں میں سفید دستانے اور بیروں میں لیڈ رشوز تھے۔ گویا اگر اسے کسی دور مار چڑ سے زہر کا نشانہ بنایا گیا تھا تو صرف اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ لیکن یہ ضروری نہیں تھا... بہت طاقت سے چھینکی جانے والی نولادی سوئی مونے سے مونے کپڑے سے بہ آسانی گزر کر اس کے جسم تک رسائی حاصل کر سکتی تھی۔ سام نے اس کے چہرے کا معائنہ کیا، اسے کہیں کوئی نشان نہیں ملا۔ چہرہ بالکل صاف تھا۔ سام نے ڈاکٹر رابن کی طرف دیکھا۔

”اس کے لباس کا معائنہ کیا گیا ہے؟“

”ابھی نہیں لیکن ہیرا میڈک اسے اٹھانے سے پہلے معائنہ کریں گے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”یہ بہت ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ ایک لاش کا اور اضافہ ہو جائے۔ ممکن ہے کی طاقت ورائزکن سے زہر پیلی سوئی چھینکی گئی ہو اور وہ ابھی تک لباس میں موجود ہو۔“ مل نے کہا۔ ملٹی عمل آگیا تھا اور اب لاش کے سلسلے میں ڈاکٹر کی ہدایت کا منتظر تھا۔ سام نے اجازت دی تو ڈاکٹر نے فوری عمل کو احتیاطی تدبیر کے ساتھ لاش اٹھانے کا حکم دیا۔ انہوں نے مخصوص حفاظتی دستانوں کے ساتھ لاش کو احتیاط سے اسٹریچر پر منتقل کیا اور وہاں سے لے گئے۔ سام نے فی الحال اس کے لباس کی تلاشی لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بعد میں وہ

سامان دیکھ سکتا تھا جو پولیس کے پاس ہی آتا تھا۔ ٹیمز کا مالک اس وقت یہاں موجود نہیں تھا، وہ قتل کی اطلاع پر آیا تھا البتہ ٹیمز یہاں موجود تھا لیکن قتل کا جتنی گواہ وہ بھی نہیں تھا کیونکہ اس وقت وہ اپنے دفتر میں تھا۔ جتنی گواہ اسٹیج فیکر اور دوسرا عملہ تھا جو یہاں موجود تھا۔ ان کے علاوہ سازندوں اور ہزاروں دوسرے افراد نے ہنرک کو گرتے دیکھا تھا۔ سام نے سب سے پہلے اسٹیج فیکر سے بات کی۔ وہ ایک جوان آدمی تھا اور کسی قدر نروس تھا۔ سام نے اسے ایک گوشے میں بلا لیا۔ ٹیمز کے مالک اور ٹیمز سے بات کرنے کی ذمہ داری اس نے مل کو سونپ دی تھی۔ سام نے اسٹیج فیکر جان کلمر سے پوچھا۔

”تم نے کیا دیکھا تھا؟“

”وہی جو سب نے دیکھا۔ ہنرک موسیقی دیتے دیتے اچانک گرا اور مر گیا۔“

”اس کے پاس سب سے پہلے کون پہنچا تھا؟“

”میں پہنچا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیونکہ میں اسٹیج پر پردے کے پیچھے اس سے سب سے زیادہ نزدیک تھا۔“ اس نے آرکسٹرا والی جگہ کے عقب میں اشارہ کیا جہاں اسٹیج کے پردے کے پیچھے وہ موجود رہتا تھا۔ یہ اس کی ذمہ داری تھی۔ اسٹیج کے تمام میگزین کو وہی آپریٹ کرتا تھا۔

”تم سازندوں سے بھی زیادہ قریب تھے؟“

”نہیں، سازندے زیادہ قریب تھے لیکن وہ بیٹھے تھے اور اکثر کے ساتھ آلات تھے اس لیے وہ جلدی نہیں اٹھ سکتے یا ہنرک تک آ سکتے تھے، اس لیے سب سے پہلے میں اس کے پاس پہنچا۔“

”تم نے کیا دیکھا؟“

”ہنرک اسی طرح پہلو کے بل گرا ہوا تھا اور بالکل ساکت تھا۔ اس کا چہرہ اور سانس رکا ہوا لگ رہا تھا اس لیے میں نے سب سے پہلے گردن پر اس کی نبض چیک کی لیکن اس کی نبض رکی ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے، وہ گرتے ہی مر گیا تھا۔“

”تمہارے علاوہ اور کون کون اس کے پاس آیا تھا؟“

”مجھے صحیح سے یاد نہیں ہے، دو تین سازندے تھے پھر میری نائب جیڈ آئی تھی۔ وہ پردے کے پیچھے میرے ساتھ ہی تھی۔ اس کے بعد تو سب ہی آگئے تھے اور کسی کو اسٹیج کا پردہ گرانے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ پھر سازندوں میں سے کسی نے زور سے کہا کہ ارے... یہ تو مر گیا ہے۔ یہ سنتے ہی ہال میں افراتفری مچ گئی اور لوگ جلدی جلدی ہال سے باہر

جاسوسی ڈائجسٹ 197 دسمبر 2011ء

سامان دیکھ سکتا تھا جو پولیس کے پاس ہی آتا تھا۔ ٹیمز کا مالک اس وقت یہاں موجود نہیں تھا، وہ قتل کی اطلاع پر آیا تھا البتہ ٹیمز یہاں موجود تھا لیکن قتل کا جتنی گواہ وہ بھی نہیں تھا کیونکہ اس وقت وہ اپنے دفتر میں تھا۔ جتنی گواہ اسٹیج فیکر اور دوسرا عملہ تھا جو یہاں موجود تھا۔ ان کے علاوہ سازندوں اور ہزاروں دوسرے افراد نے ہنرک کو گرتے دیکھا تھا۔ سام نے سب سے پہلے اسٹیج فیکر سے بات کی۔ وہ ایک جوان آدمی تھا اور کسی قدر نروس تھا۔ سام نے اسے ایک گوشے میں بلا لیا۔ ٹیمز کے مالک اور ٹیمز سے بات کرنے کی ذمہ داری اس نے مل کو سونپ دی تھی۔ سام نے اسٹیج فیکر جان کلمر سے پوچھا۔

”تم نے کیا دیکھا تھا؟“

”وہی جو سب نے دیکھا۔ ہنرک موسیقی دیتے دیتے اچانک گرا اور مر گیا۔“

”اس کے پاس سب سے پہلے کون پہنچا تھا؟“

”میں پہنچا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیونکہ میں اسٹیج پر پردے کے پیچھے اس سے سب سے زیادہ نزدیک تھا۔“ اس نے آرکسٹرا والی جگہ کے عقب میں اشارہ کیا جہاں اسٹیج کے پردے کے پیچھے وہ موجود رہتا تھا۔ یہ اس کی ذمہ داری تھی۔ اسٹیج کے تمام میگزین کو وہی آپریٹ کرتا تھا۔

”تم سازندوں سے بھی زیادہ قریب تھے؟“

”نہیں، سازندے زیادہ قریب تھے لیکن وہ بیٹھے تھے اور اکثر کے ساتھ آلات تھے اس لیے وہ جلدی نہیں اٹھ سکتے یا ہنرک تک آ سکتے تھے، اس لیے سب سے پہلے میں اس کے پاس پہنچا۔“

”تم نے کیا دیکھا؟“

”ہنرک اسی طرح پہلو کے بل گرا ہوا تھا اور بالکل ساکت تھا۔ اس کا چہرہ اور سانس رکا ہوا لگ رہا تھا اس لیے میں نے سب سے پہلے گردن پر اس کی نبض چیک کی لیکن اس کی نبض رکی ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے، وہ گرتے ہی مر گیا تھا۔“

”تمہارے علاوہ اور کون کون اس کے پاس آیا تھا؟“

”مجھے صحیح سے یاد نہیں ہے، دو تین سازندے تھے پھر میری نائب جیڈ آئی تھی۔ وہ پردے کے پیچھے میرے ساتھ ہی تھی۔ اس کے بعد تو سب ہی آگئے تھے اور کسی کو اسٹیج کا پردہ گرانے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ پھر سازندوں میں سے کسی نے زور سے کہا کہ ارے... یہ تو مر گیا ہے۔ یہ سنتے ہی ہال میں افراتفری مچ گئی اور لوگ جلدی جلدی ہال سے باہر

جاسوسی ڈائجسٹ 197 دسمبر 2011ء

سامان دیکھ سکتا تھا جو پولیس کے پاس ہی آتا تھا۔ ٹیمز کا مالک اس وقت یہاں موجود نہیں تھا، وہ قتل کی اطلاع پر آیا تھا البتہ ٹیمز یہاں موجود تھا لیکن قتل کا جتنی گواہ وہ بھی نہیں تھا کیونکہ اس وقت وہ اپنے دفتر میں تھا۔ جتنی گواہ اسٹیج فیکر اور دوسرا عملہ تھا جو یہاں موجود تھا۔ ان کے علاوہ سازندوں اور ہزاروں دوسرے افراد نے ہنرک کو گرتے دیکھا تھا۔ سام نے سب سے پہلے اسٹیج فیکر سے بات کی۔ وہ ایک جوان آدمی تھا اور کسی قدر نروس تھا۔ سام نے اسے ایک گوشے میں بلا لیا۔ ٹیمز کے مالک اور ٹیمز سے بات کرنے کی ذمہ داری اس نے مل کو سونپ دی تھی۔ سام نے اسٹیج فیکر جان کلمر سے پوچھا۔

”تم نے کیا دیکھا تھا؟“

”وہی جو سب نے دیکھا۔ ہنرک موسیقی دیتے دیتے اچانک گرا اور مر گیا۔“

جاسوسی ڈائجسٹ 197 دسمبر 2011ء

جانے لگے۔ میں نے کوشش کی کہ ان کو روک سکوں لیکن اس وقت کوئی سننے کے لیے تیار نہیں تھا اور پھر کچھ لوگ باہر چلے گئے تو باقی کو روکنے کا جواز نہیں ملتا تھا۔ انتظامیہ کو بھی واقعے کی دیر سے اطلاع ملی۔ اس وقت تک تقریباً پورا ہال خالی ہو گیا تھا۔

”ہال میں اندازاً کتنے لوگ تھے؟“ سام نے نشیمن کی طرف دیکھا، ان کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ یہ خاصا بڑا ہال تھا۔

”میرا خیال ہے کہ ڈھائی ہزار سے اوپر ہوں گے۔ جب سے ہنرک آسکر اپوارڈ کے لیے منتخب ہوا ہے، اس کے شوزل چلنے لگے ہیں۔“

”کیا وہ آقا قادی سے یہاں شو کرتا تھا؟“

”تقریباً۔“ جان نے کہا۔ ”اصل میں وہ یہاں مینے میں پانچ شو کرتا تھا لیکن دن مخصوص نہیں تھے۔ عام طور سے وہ اتوار والے دن شو کرتا تھا لیکن اگر اسے کوئی اور مصروفیت ہو تو دن بدل بھی جاتا تھا۔“

”جیسے آج منگل ہے۔۔۔ یعنی اس نے اس اتوار کو شو نہیں کیا؟“

”ہاں، اس اتوار کو اسے اپنی اکلوتی بیٹی کے پاس جانا تھا۔ وہ اس کی سابق بیوی کے ساتھ رہتی ہے اس لیے اس نے اتوار کو شو نہیں کیا۔ اس کی جگہ آج کا شو ملے گا۔“

”شو کتنے دن پہلے طے ہو جاتا ہے؟“

”دس دن پہلے۔۔۔ کچھ تھیراؤ کنٹریوں کی بلنگ کا معاملہ ہوتا ہے اس لیے شو پہلے طے کرنا پڑتا ہے۔ اکثر اوقات دو مینے پہلے طے ہو جاتا ہے لیکن کبھی ایئر بھی آجائے، جب بھی کم سے کم دس دن پہلے شو کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔“ جان

اب پھر اعتماد تھا۔ اس کے بعد سام نے آج پر موجود سازندوں سے پوچھ گچھ کی۔ ان کی تعداد تیس سے زیادہ تھی اس لیے سب سے تفصیلی انٹرویو ممکن نہیں تھا۔ سام نے چند سوالات کیے اور تقریباً سب سے کسی خاص چیز کے بارے میں پوچھا لیکن ان میں سے کوئی کسی خاص چیز یا بات کی نشان دہی نہیں کر سکا۔ ان سب کا یہی کہنا تھا کہ سب معمول کے مطابق ہو رہا تھا کہ یہ واقعہ پیش آیا۔

بل نے تھیرز کے مالک اور منیجر سے جو گفتگو کی تھی، اس کے مطابق ان کے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو ہنرک کے قتل کی نشان دہی کر سکتی۔ ہنرک اپنے کام سے کام رکھنے والا اور مریخ مریجان قسم کا آدمی تھا۔ وہ دوسروں سے زیادہ گھٹا مٹا نہیں تھا بلکہ خاصی حد تک تنہائی پسند تھا۔ ریپرسل اور

شو کے علاوہ وہ زیادہ تر اپنے ڈرینگ روم میں رہتا پسند کرتا۔ اپنا کام ختم ہوتے ہی وہ تھیرز سے رخصت ہو جاتا۔ وہ میاں کی ایک عمارت کی سب سے اوپر کی منزل میں اپنے پینٹ ہاؤس میں اکیلا رہتا تھا۔ اس کی کسی سے دوستی نہیں تھی اور اگر اس کی کوئی گرل فرینڈ تھی تو اس کا علم ان دونوں کو نہیں تھا۔

ہنرک نے بارہ سال پہلے شادی کی تھی اور صرف دو سال بعد اس کی بیوی سے طلاق ہو گئی تھی۔ طلاق کی وجوہات کے بارے میں ہنرک اور اس کی سابق بیوی جولیا دونوں خاموش تھے۔ ان کی ایک بیٹی تھی اور وہ ماں کے پاس رہتی تھی۔ بیٹی کا خرچ اور جولیا کے اخراجات کی ذمہ داری عدالت نے ہنرک پر ڈالی تھی جسے وہ بخوبی ادا کر رہا تھا۔ مینے میں ایک پارے ایک دن اپنی بیٹی کے ساتھ گزرنے کی اجازت تھی۔ اس نے اپنی زندگی کا آخری اتوار اپنی بیٹی ناشا کے ساتھ گزارا تھا۔

لاش اٹھائی جا چکی تھی اور ڈاکٹر اپنے عملے سمیت چلا گیا تھا۔ موقع سے ہر چیز اٹھائی گئی تھی اور فارنکس والے بھی اپنا کام کر چکے تھے۔ البتہ تھیرز کے باہر میڈیا اور اخباری رپورٹرز کا ایک بہت بڑا جھوم تھا۔ وہ یہ مشکل اس سے جان چھڑا کر وہاں سے نکلے۔ سام گھر سے ناشا کر کے آیا تھا۔ اس کے بعد اسے کھانے کا موقع نہیں ملا تھا اور اسے زور کی جھوک لگ رہی تھی۔ تھیرز سے واپسی پر بل نے کار ایک فاسٹ فوڈ شاپ کے سامنے روک دی اور جا کر اندر سے برگر اور فریج فرائزر لے آیا۔ موسم کی مناسبت سے ساتھ میں گولڈ ڈرنکس بھی۔ یہ

ان کا ڈنر تھا۔ بل نے برگر کھاتے ہوئے سام سے پوچھا۔ ”تمہارے کیا خیال ہیں، قاتل کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟“

”کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ رقابت سے لے کر پیشہ ورانہ چٹیک تک کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قاتل نے قتل کیسے کیا ہے؟“

بل نے منہ بنایا۔ ”تم الٹی بات کر رہے ہو۔ جب قاتل ہاتھ آجائے گا تو وہ خود بخود بتا دے گا کہ اس نے قتل کیسے کیا ہے؟“

”جب تم قاتل کو کیسے تلاش کرو گے؟ اب تک جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان سے تو کسی کی طرف اشارہ نہیں ہوتا۔“

”ممکن ہے یہ وراثت کا پکڑ ہو۔ سنا ہے ہنرک نے بہت کمال کیا ہے اور اس کی دولت اب بلین ڈالرز کے قریب جانے والی تھی۔“

”تمہارا مطلب ہے، اس کی سابق بیوی ملوٹ ہو سکتی

ہے؟“ سام نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”تو لازمی ہے کہ ہنرک کی وارث اس کی اکلوتی بیٹی ہوگی اور اگر دولت اس کی طرف آتی ہے تو جولیا خود بہ خود اس سے بیٹھ یا ب ہوگی۔“

”کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟“

”بالکل ممکن ہے لیکن تب بھی جولیا نے ہنرک کو کس طرح قتل کیا؟“

اس سوال کا جواب فی الحال کسی کے پاس نہیں تھا کہ قاتل جو کوئی بھی تھا، اس نے ہزاروں لوگوں کے سامنے ہنرک کو کس طرح قتل کیا۔ بہر حال، ابھی قتل کو چند گھنٹے گزرے تھے اور ابھی تحقیق کا بڑا طویل مرحلہ باقی تھا۔

واپسی پر سام نے رپورٹ لکھ کر گورڈن کے دفتر بھجوا دی۔ وہ چھٹی کر کے چاچا تھا اور اب وہ صبح ہی رپورٹ دیکھتا اور اس کے بعد کیس کی کاپی پر دیتا۔ سام کی خواہش تھی کہ کیس کسی اور کو دیا جائے لیکن بل چاہتا تھا کہ کیس انہیں ملے کیونکہ اس میں میڈیا جہلپی کا بہت امکان تھا۔ سام کا کہنا تھا کہ انہیں پہلے ہی کئی کیسز میں خاصی پیسلی مل چکی ہے اور زیادہ پیسلی ان کے لیے اچھی نہیں ہوگی۔ اگلے دن گورڈن نے آتے ہی سام اور بل کو طلب کر کے ہنرک مرڈر کیس ان کے سپرد کر دیا۔ سام نے احتجاج کیا۔

”کیونکہ ہمارے پاس پہلے ہی دو کیس ہیں۔“

”وہ کوئی خاص نہیں ہیں۔“ گورڈن نے سر دلبے میں کہا۔ ”تم چاہو تو ان کو کسی اور کے سپرد کیا جاسکتا ہے۔“

سام کھول کر رہ گیا۔ جب انہوں نے کام کر کے کیسز کو تقریباً حل کر دیا تھا تو گورڈن انہیں کسی اور کے سپرد کرنے کی بات کر رہا تھا۔ سام نے سر آہ بھری۔ ”نہیں، ان کو بھی ہم ہی میٹل کر لیں گے۔“

گورڈن شاطرانہ انداز میں مسکرایا۔ ”مجھے بھی یہی توقع ہے۔ میرے شعبے میں سب سے بہترین آفیسرز تم دونوں ہی ہو، اس لیے میں انہیں تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم جلد ہنرک شیفلڈ کے قاتل کو تلاش کر لو گے۔“

”یہ ہمیں گدھا سمجھتا ہے۔“ سام نے باہر آ کر کہا۔

”بل کی ہاچیں کھلی ہوئی تھیں۔“ لیکن اس نے ہمیں سب سے بہتر بھی تو قرار دیا ہے۔“

”کام کرنے والے گمروں کو کبھی بھی دی جاتی ہے۔“ سام نے بد مزگی سے اپنے ساتھی کو دیکھا۔ ”اب رات دیکھو، تم کام کرنا ہو گا۔“

”وہ تو ویسے بھی ہمارا مقدر ہے۔“ بل نے بھی ٹھنڈی

سانس لی۔

سام نے اپنی ڈبیک سے ڈاکٹر برائن کو کال کی۔

”ڈاکٹر برائن! پوسٹ مارٹم رپورٹ آگئی ہے؟“

”ہاں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”میرا اندازہ ٹھیک نکلا، اسے سوئی کے ذریعے سائیکلڈ انجیکٹ کیا گیا تھا۔ یہ ہائڈروجن سائیکلڈ انجیکٹ کی ٹھوس شکل تھی۔ جسم کے درجہ حرارت پر یہ کیس کی صورت اختیار کر جاتا ہے اور خون میں شامل ہوتے ہی موت کا باعث بن جاتا ہے۔“

”سوئی ملی ہے؟“

”ہاں، اس کے سینے میں پیوست سوئی ملی ہے۔ سوئی صرف ایک انچ کی ہے اور چھوٹی انچ سینے میں اتر گئی تھی۔ اس سے لگتا ہے کہ اسے خاصی طاقت سے پھینکا گیا تھا۔“

”پوسٹ مارٹم رپورٹ کب ملے گی؟“

”اگر ہارڈ کاپی چاہیے تو آکر لے جاؤ، اس کا سامان بھی ہے۔“

ہنرک کا سامان انہیں قبضے میں لینا تھا اس لیے سام اور بل اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ پوسٹ مارٹم کے بعد ہنرک کو مردہ خانے منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس کا سامان ایک ٹرس نے کارڈن میں لا کر سام اور بل کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں ہنرک کا لباس، اس کی قیمتی گھڑی، جدید ترین آئی فون، اس کا پرس اور ایک کی چین شامل تھی جس میں اس کی مرید بڑ

کار کے علاوہ بھی کئی طرح کی چابیاں تھیں۔ سام نے اس کا پرس کھولا۔ اس میں تقریباً دو ہزار ڈالرز کی نقد رقم، دو عدد کریڈٹ کارڈز، اس کا ڈرائیونگ لائسنس، سوشل سیکورٹی کارڈ اور موسیقاروں کی عظیم کارڈز تھیں اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ بل نے رقم دیکھ کر سستی بھائی۔ ”اسے خاصی رقم رکھنے کی عادت تھی۔“

”حیرت کی بات ہے، اسپتال میں کسی نے یہ رقم پار نہیں کی حالانکہ ہمیں اس کا علم بھی نہیں تھا۔“ سام بولا۔

”ڈاکٹر برائن ایمان دار شخص ہے، ظاہر ہے وہ اپنا علم بھی ایسا ہی رکھنا پسند کرے گا۔“ بل نے کہا۔ انہوں نے لاش کو بھی ایک نظر دیکھا۔ خاص طور سے سام نے اس کے سینے پر سوئی کے نشے سے نشان کا معائنہ کیا۔ سام نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

”ابھی تک کسی نے لاش کی حواگی کے لیے رابطہ کیا ہے؟“

ڈاکٹر برائن نے سر ہلایا۔ ”ہاں، اس کی سابق بیوی جولیا نے رابطہ کیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ لاش کی حواگی

پولیس کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔
 ”اب اگر وہ رابطہ کرے تو لاش اس کے حوالے کر دیتا۔“ سام نے کہا اور ڈاکٹر برائن کے پیش کیے جانے والے اجازت نامے پر دستخط کر دیے۔ وہ باہر آئے تو بل نے اس سے کہا۔

”تم نے لاش حوالے کرنے میں کچھ زیادہ جلدی نہیں کی ہے؟“

”اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر جولیا کو لاش جلدی ملے گی تو وہ ہم سے بہتر تعاون کرے گی۔“ سام نے کہا۔ ”تم نے غور نہیں کیا، لاش کا مطالبہ اس نے کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے اس کے پاس شہس وجہ ہے۔“

”یعنی ہنرک کی وصیت وغیرہ؟“
 ”بالکل، ورنہ وہ اس کی حق دار نہیں بنتی۔“ سام نے کہا اور اپنی کار میں بیٹھ کر ہنرک کا آئی فون چیک کیا۔ خوش قسمتی سے اس پر کوئی پاس ورڈ نہیں لگا ہوا تھا۔ اس نے جولیا کا نمبر نکالا اور اسے اپنے میل سے کال کی۔ ”مس جولیا! میں ہومی سائنس سے آفیسر سام یورمین بات کر رہا ہوں۔ میں ہنرک مرڈر گیس کا انچارج ہوں۔“

”آفیسر! میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟“ جولیا نے سیٹ لہجے میں کہا۔ اس کی آواز سے دکھ یا کسی جذبے کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

”پہلے میں تمہارے سابق شوہر کی موت پر تعزیت کرتا ہوں۔ دوسرے مجھے تم سے ملنا ہے۔“
 ”تم میرے گھر آ سکتے ہو۔“ جولیا نے کہا اور اپنا پتا بتایا۔ ”میں اس وقت فارغ رہی ہوں۔“

وہ آدھ گھنٹے بعد سیٹی سے فورا دور ایک ساحلی قصبے میں واقع جولیا کے شان دار قسم کے گھر میں تھے۔ تقریباً نصف ایکڑ پر پھیلا یہ مکان خوب صورت اور قیمتی تھا۔ اس کے چاروں طرف سجا ہوا باغ تھا جس میں بے شمار اقسام کے پودے لگے ہوئے تھے۔ ساحل کی طرف سے تیز اور خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔ جولیا پورچ کے ساتھ باغ میں ان کی مختصر قسمی۔ سورج تیز تھا لیکن ہوا کی وجہ سے اس کی تیزی بھی بری نہیں لگ رہی تھی۔ جولیا خلاف توقع زیادہ عمر کی نہیں تھی۔ اس کی عمر شاید تیس برس تھی اور وہ ہنرک سے کم سے کم تیس برس چھوٹی تھی۔ یعنی جب اس نے ہنرک سے شادی کی تو وہ عمر میں اس سے دو گنا بڑا رہا ہوگا۔ وہ خوب صورت اور نازک اندام بھی تھی۔ سام کو حیرت ہوئی کہ وہ ابھی تک ایسی تھی جبکہ اسے ہنرک سے طلاق لیے ہوئے بھی دس سال ہو چکے

تھے۔ سام نے اپنا اور بل کا تعارف کرایا۔
 ”میں تمہارے تعاون کی شکر گزار ہوں۔“ جولیا نے کہا۔ ”تم نے لاش اتنی جلدی میرے حوالے کرنے کی اجازت دے دی ہے۔“

”پولیس کی ضرورت پوری ہو گئی ہے اس لیے لاش کو بلاوجہ روکنا ضروری نہیں ہے۔“ سام نے کہا۔ ”تم نے لاش کا مطالبہ کیا ہے، تمہارے پاس یقیناً اس کی معقول وجہ ہو گی؟“

جولیا نے سر ہلایا۔ ”ہنرک کا وصیت نامہ... اس کے مطابق اس کے انتقال کی صورت میں، میں اس کی ہر چیز کی نگران اور دتے دار ہوں گی۔ اس کی آخری رسومات کی بھی۔“

”کیا اس نے تمہیں اپنا وارث بنایا ہے؟“
 جولیا نے لمبی میں سر ہلایا۔ ”اگرچہ میں نے اب تک وصیت نہیں دیکھی ہے لیکن ہنرک نے مجھے بتایا ہے کہ میں صرف نگران ہوں گی اس کی تمام دولت اور جائیداد کی وارث اس کی بیٹی ناشا ہے۔“

”تمہیں اندازہ ہے کہ ہنرک کتنی دولت چھوڑ گیا ہے؟“

”نہیں۔“ جولیا نے سیٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”مگر یہ اتنی دولت ضرور ہے کہ ناشا کو ساری عمر کوئی مالی پریشانی نہیں ہوگی۔“

”ہنرک اتوار کو یہاں آیا تھا اور اس نے سارا دن یہاں گزارا تھا۔“

”ہاں لیکن اس نے یہ سارا دن اپنی بیٹی کے ساتھ گزارا تھا۔“ جولیا نے صحیح کرنے کے انداز میں کہا۔ ”جب ہنرک آتا تھا تو میں عام طور سے اپنے بیڈروم میں رہتی تھی یا کہیں چلی جاتی تھی۔ وہ عام طور سے اتوار کے دن آتا تھا اس لیے میں گھر پر ہی ہوتی تھی۔“

”تم جاب کرتی ہو؟“ بل نے پوچھا۔

جولیا نے سر ہلایا۔ ”میں شیڈوز بیکنر میں جاب کرتی ہوں۔“

شیڈوز بیکنر فلورڈیا کی چند بڑی کیمیکل کمپنیوں میں سے ایک تھی۔ بل نے پوچھا۔ ”تمہاری جاب کیا ہے؟“

”میں... کیمیکل اینالسٹ سپروائزر ہوں۔“ جولیا نے جواب دیا۔

”اوہ... تم تو اہم پوسٹ پر ہو۔“ سام نے سانس لہجے میں کہا۔ ”یقیناً تم اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں نے اپنے شعبے میں ماسٹر کی ڈگری لے رکھی ہے۔“
 ”ڈگری یقیناً تم نے ہنرک سے طلاق کے بعد لی ہو گی؟“

”جب میں نے ہنرک سے شادی کی تو اس وقت صرف ہائی اسکول تک پڑھا تھا۔ میں اس وقت بالکل نا تجربے کار اور نادان تھی اس لیے شخص جذبات میں آکر یہ فیصلہ کر بیٹھی۔“

”ہنرک تو نا تجربے کار یا نادان نہیں ہوگا؟“
 ”ہاں، اس نے مجھے جال میں پھنسا لیا تھا۔ دو سال بعد مجھے عقل آ گئی تھی۔“

”طلاق تم دونوں کی باہمی رضامندی سے ہوئی تھی؟“
 جولیا نے سر ہلایا۔ ”ہاں لیکن یہ بات اب ماضی کا حصہ بن چکی ہے۔ ہنرک کے قتل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”تمہیں کسی پر شبہ ہے کہ وہ ہنرک کو قتل کر سکتا ہے؟“
 ”نہیں کیونکہ گزشتہ آٹھ سال سے میں نے اس سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ ہمارے درمیان شاید ایک درجن بار بھی بات نہیں ہوئی ہوگی۔“

”اس کا مطلب ہے، تمہیں بالکل نہیں معلوم کہ اس کا کسی سے کوئی تنازع تھا؟“

”میں نے کہا نا، میں اس سے لا تعلق تھی۔ میرا اس سے واسطہ صرف ناشا کی حد تک تھا۔ ورنہ شاید میں اس کی صورت بھی دیکھنا پسند نہ کرتی۔“

”اس کے باوجود اس نے تمہیں اپنی دولت اور دوسرے امور کا نگران مقرر کر دیا؟“ سام نے کسی قدر چپچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

جولیا نے شانے اچکائے۔ ”یہ اس کا فیصلہ ہے حالانکہ میں نے انکار کیا تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ میں ناشا کے مفادات کا تحفظ کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ بہتر طور پر کر سکتی ہوں۔“

”طلاق کے بعد اس نے تمہیں ماہانہ رقم دینا جاری رکھی؟“

”اس کے لیے وہ عدالت کے فیصلے سے مجبور ہوا۔ جب تک میں دوسری شادی نہ کر لوں وہ اس کا پابند تھا۔ یہ مکان اور بہت کچھ میں نے اس کی دولت سے حاصل کیا ہے۔ میری ذاتی مالی پوزیشن بھی بہت اچھی ہے۔ اگر میں چاہوں تو ناشا کو خود بھی تمام سہولیات دے سکتی ہوں، اسے

باپ کی دولت کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر یہ اس کا حق ضرور ہے۔

بل نے معنی خیز نظروں سے سام کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر اس سے بات کرتے رہے لیکن ملاقات کے خاتمے پر انہیں احساس ہوا کہ ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا ہے۔ جویا کوئی ایسی بات نہیں بتا سکی جس سے قتل کی اس واردات پر روشنی پڑتی۔ جویا نے ان کی تقریر قبول کر لی تھی لیکن نہایت صاف گوئی سے انہیں بتا دیا تھا کہ اسے ہنرک کی موت کا کوئی انصاف نہیں ہے۔ وہ اس سے دلی تعلق برسوں پہلے ختم کر چکی تھی اس لیے اس کا جینا یا مرنا جویا کے برابر تھا۔ جب ہنرک قتل کیا گیا تو ناٹا الیت اپنے باپ کی اچانک موت سے ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو گئی تھی اور ڈاکٹر نے فی الحال اس سے اس موضوع پر بات کرنے سے منع کیا ہوا تھا۔ وہ باہر آئے تو بل نے کار میں بیٹھنے ہی کہا۔

”مجھے اس عورت پر شبہ ہے۔ یہ قتل میں کسی طرح ضرور ملوث ہے۔“

”تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”تم نے غور نہیں کیا، وہ ایک نیکیکل فرم میں کام کرتی ہے اور خود بھی نیکیکل اینالسٹ ہے۔ اس کے لیے ہائیڈروجن سائنکس کو مخصوص صورت میں حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں ہو گا۔۔۔ جبکہ عام آدمی کے لیے اس خطرناک زہر کا حصول بہت مشکل ہے۔“

”ٹھیک ہے، اس نے حاصل کر لیا لیکن استعمال کیسے کیا؟ جب ہنرک قتل ہوا تو وہ گھر میں تھی اور اس کے گواہ اس کا بھرا اور اس کی بیٹی ناٹا ہیں کہ وہ کل شام گھر سے نہیں نکلی تھی۔“

”یہ نامکن نہیں ہے۔“ بل نے اصرار کیا۔ ”ممکن ہے وہ کسی طرح سے نکل گئی ہو اور اس کا بھرا اور بیٹی بھڑے ہوں کہ وہ گھر میں ہے۔ اس کا گھر میرین ٹیئر سے مشکل سے بیس منٹ کی ڈرائیو پر ہے، یعنی وہ کام کر کے ایک گھنٹے میں گھر واپس آ سکتی ہے۔“

”فرض کر لو اس نے ایسا ہی کیا ہے، تب بھی اس نے قتل کس طرح سے کیا؟“

”زہر ملی سوئی کی بلو پائپ سے پھینکی گئی ہوگی۔“

”تمہارے خیال میں ایک عورت ہال میں بلو پائپ منہ سے لگا کر سوئی پھینکے تو کوئی اس کا نوٹس نہیں لے گا؟“

”ممکن ہے اس نے کوئی ایسی مشین استعمال کی ہو جس کی طرف کسی کی توجہ نہ جائے۔“ بل نے کہا تو سام نے گہری

سانس لی۔

”یہ کوئی جاسوسی فلم نہیں ہے جس میں اس قسم کی مشینیں استعمال کی جائیں۔۔۔ اور دوسرے تمام ترین بات نظر انداز کر رہے ہو۔ سوئی ہنرک کے سینے سے نکلی ہے۔ ہال میں بیٹھے تماشائیوں میں سے کوئی کسی صورت اس کے سینے میں سوئی نہیں اتار سکتا تھا۔“

”تب یہ کام گیلری میں بیٹھ کر کیا گیا ہوگا۔“ بل نے اصرار کیا۔ ”ہنرک گیلری کے بالکل سامنے تھا۔“

”مگر ڈاکٹر اس اور گیلری کے درمیان کوئی سوفا کا فاصلہ ہوگا۔“ سام نے کہا۔ ”اتنے فاصلے سے بلو پائپ یا کوئی اور پیشہ واری ڈیوائس استعمال کرنا آسان نہیں۔ دوسرے گیلری میں چند مخصوص لوگ بیٹھے ہیں اور ان کے بارے میں تھیر سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی گیلری میں بیٹھ کر یہ کام کر سکتا ہے۔“

”بل کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ زہق ہو رہا ہے۔“

”تب صرف سازندہ رہ جاتے ہیں۔“

”مگر جس زاویے سے سوئی ماری گئی ہے، وہ سازندوں کی سمت سے بھی نکل نہیں آ سکتا ہے۔“

اس بار بل بھٹا گیا۔ ”تب سوئی یقیناً آسمان سے آئی اور ہنرک کا کام تمام کر گئی۔“

سام بے ساختہ ہنس دیا۔ ”لگتا ہے تم اس کیس کو حل کرنے کے لیے زیادہ ہی بے تاب ہو۔“

”بل نے سر جھٹکا۔“ یہ عجیب کیس ہے۔ نہ تو قتل کی وجہ سمجھ میں آرہی ہے، نہ ہی قاتل کی طرف کوئی اشارہ ملا ہے اور نہ ہی قتل کا طریقہ سمجھ میں آیا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ ہمیں خیالی گھوڑے دوڑانے کے بجائے کچھ اور عملی کام کرنا چاہیے۔“

”مثلاً کیا کرنا چاہیے؟“ بل نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

”ہمیں تھیر جانا چاہیے۔“ سام نے جواب دیا۔

”مجھے لگ رہا ہے ہنرک کو اس کی دولت کی خاطر قتل کیا گیا ہے۔“

”تب تو شبہ صرف جویا پر جائے گا۔ اس کی بیٹی صرف گیارہ سال کی ہے اور یقیناً وہ اپنے باپ کو قتل نہیں کر سکتی۔“

”جویا کے خلاف یہ پوائنٹ بھی ہے کہ وہ نیکیکل اینالسٹ ہے اور اس کے لیے ہائیڈروجن سائنکس کو مخصوص صورت میں حاصل کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے جبکہ اس کی بہت معمولی سی مقدار درکار ہوگی۔“

سام نے اس کی بات پر غور کیا اور پھر سیل فون ڈاکٹر برائن کو کال کی۔ ”ڈاکٹر، یہ بتاؤ کہ ٹھوس صورت میں ہائیڈروجن سائنکس کی کتنی مقدار ایک شخص کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کافی ہوگی؟“

”مشکل سے چار ملی گرام۔“ اس نے جواب دیا۔

”اتنی مقدار اگر آدمی کے خون میں شامل ہو جائے تو اسے مرنے میں پانچ سیکنڈ لگتے ہیں۔“

”کیا سوئی کی نوک پر اتنا زہر آ سکتا ہے؟“

”بالکل آ سکتا ہے۔ یہ اس زہر کی بہت معمولی سی مقدار ہے۔ سوئی پر اس سے بھی زیادہ زہر آ سکتا ہے۔ اگر

چھبیس شبہ سے تو میں تصدیق کرتا ہوں کہ ہنرک کی موت اسی سوئی سے جسم میں زہر داخل ہونے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر نہ تو کوئی اور نشان ہے اور نہ ہی اس کے معدے میں زہر کے آثار پائے گئے ہیں۔“

”شکریہ ڈاکٹر! سام نے کہا۔ ”تم یہ سوئی فارنکس لیب بھجوا دو۔“

”میں بھیج دوں گا۔“

سیل فون بند کر کے سام نے بل سے کہا۔ ”موت کی وجہ سوئی ہے اور ڈاکٹر کے مطابق اسے بہت قوت سے پھینکا گیا ہے جس کی وجہ سے سوئی چھاتی انچ ہنرک کے سینے میں اتر گئی تھی۔“

”تب ڈیوائس والی تھیری درست ہو سکتی ہے۔ قاتل نے گیلری میں بیٹھ کر اپنا کام کیا اور کسی کو اس پر شک نہیں ہوا۔“

”اس کا چا تو وہاں پہنچ کر ہی طے گا۔ قاتل کا ہنرک سے تعلق ہونا ضروری ہے۔ کوئی اتنے جتن کر کے کسی کو بلا وجہ تو قتل نہیں کرتا؟“

”بل کا منہ بن گیا۔“ اس کا مطلب ہے تم میری بات پر یقین نہیں کر رہے؟“

”یقین نہ کرنے کی بہت ساری وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ اگر کسی کو کسی شخص سے کوئی عداوت ہو اور وہ اسے قتل کرنا چاہتا ہو تو اس کے لیے بہت ضروری ہے، وہ اس طرح قتل کرے کہ جائے واردات پر اس کی موجودگی ثابت نہ ہو سکے۔ اگر گیلری میں کوئی ایسا شخص نکل آیا جس کا ہنرک سے کوئی تنازع تھا تو وہ خود بخود غیب کی زد میں آ جائے گا اور میرا خیال ہے، اتنی ہوشیاری سے قتل کرنے والا کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔“

”تب وہ کون ہو سکتا ہے؟“

فاسٹ بلور نے انتہائی تیز گیند کرائی۔ ٹیس میں وکٹوں کے مین سلسلے تھا اور گیند پیچ رہی تھی۔

”ہاؤزیٹ۔“ ہالر نے اپنے سیل کی۔

”ناٹ آؤٹ۔“ اسپائر نے کہا۔

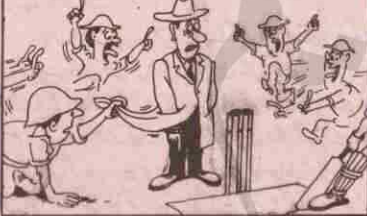
بارشدرت غیظ سے گنگ ہو کر رہ گیا۔ اس نے دوسری گیند اور تیز کرائی۔ اس بار گیند بیٹھ سے گنگ کر بہت اونچی اچھی اور سینکڑوں میٹروں میں کھڑے فیلڈز نے اسے پیچ کر لیا۔

اس بار تمام فیلڈز نے زوردار پیل کی۔

”ناٹ آؤٹ۔“ اسپائر نے فنی میں سر ملاتے ہوئے کہا۔

ہالر کے ساتھیوں نے اسے بڑی مشکل سے ٹھکرا لیا اس نے پھر اشارہ کیا۔ اس بار گیند بیٹھ سے بھی زیادہ تیز تھی۔

وہ گیند ٹیس میں کی گئی جس میں بالکل ٹھیک آئی۔ ٹینوں نے پس انکھروں کو روک دیا۔ ہالر نے اپنے اشارہ کی طرف مڑا۔ اسپائر کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے فنی میں سر ملایا اور آہستہ سے بڑبڑایا۔ کمال ہے کیا بال پچا ہے۔“



جونس جوانے کس رسم

اس موقع پر دلہا کی سالیان اپنے برادران لاگو جوئے اتار کر بیٹھے پر زور دیتی ہیں چنانچہ جب وہ جوئے اتارتا ہے تو موقع پا کر یہ سالیان جوئے غائب کر دیتی ہیں۔ بعد میں اس جوئے کی واپسی کے لیے دلہا کو مدامنی دام ادا کرنا پڑتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ جوئے چرانے کی یہ رسم شادی بیاہ کے علاوہ ہر شے کو مسجدوں کے باہر بھی ادا کی جاتی ہے اور یہ رسم سالیان ادا نہیں کرتیں۔ ممکن ہے کہ یہ رسم سالے ادا کرتے ہوں تاہم میں نے اس ضمن میں کوئی تحقیق نہیں کی۔

عطاء الحق کی کتاب سے اقتباس

”کوئی ایسا شخص جس پر شک نہ کیا جاسکے... یعنی یہ ظاہر اس کی ہنرک سے کوئی دشمنی نہ ہو۔ اس کی طرف کسی کا دھیان نہ جائے اسی وجہ سے میں کہہ رہا ہوں کہ ہمیں اصل میں کل کا طریقہ جاننا ہوگا کہ زہریلی سوئی کسی طرح ہنرک کے سینے میں بیوست گئی۔“

”میں سوچ میں پڑ گیا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ صبح کا وقت تھا اس لیے تھیں اور اس سے متعلقہ ہال ویران پڑے تھے۔ صرف ایک ہال میں کسی ڈرامے کی ریسرپل جاری تھی۔ اسٹینجیر جان انہیں اسی ہال میں نظر آیا۔“

”ہیلو آفسیر... کچھ پتا چلا ہنرک کے قاتل کا؟“

”ابھی تو ہم محرم ہی نہیں جان پائے ہیں۔“ مل نے استہزاء سے انداز میں کہا۔ ”تم قاتل کی بات کر رہے ہو؟“

”مسٹر جان! ہمیں اس ہال میں موجود لوگوں کے بارے میں جاننا ہے۔“ سام نے کہا۔ ”کیا تم گیلری میں بیٹھے افراد کے بارے میں بتا سکتے ہو؟“

”جان نے سر ہلایا۔“ کیوں نہیں، وہاں کل ایک درجن آئی پی باکس ہوتے ہیں اور یہ عام طور سے بک رہتے ہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔“

”جان انہیں اپنے دفتر میں لے گیا۔“ اس نے ان لوگوں کی فہرست نکالی جو اس رات گیلری میں موجود تھے جب ہنرک کا قتل ہوا۔ اتفاق سے یہ سارے بڑے نام تھے اور سام ان سے واقف تھا۔ ان کا شمار شہر کی اہم شخصیات میں ہوتا تھا اور اگر ان سے پوچھ کچھ کی جاتی تو معاملہ سیر کے دفتر تک بھی پہنچ سکتا تھا مگر ان سے بات تو کرنا تھی۔ بہر حال، سام ان سے بیان حاصل کر سکتا تھا۔ اگرچہ اسے اس کا کوئی قائمہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے جان سے کہا۔

”شوکی مووی بھی بنی ہوگی؟“

”بالکل جتنی ہے جناب۔ ایک ٹی وی چینل بعد میں شوکی نشر بھی کرتا ہے، اس کا ٹائم شو کوٹھ کرتا ہے۔“

”کیا یہ شوٹنگ یہاں دستیاب ہوگی؟“

”بالکل... اس کی ایک کاپی ہمیں بھی دی جاتی ہے جو ریکارڈ کا حصہ بنتی ہے لیکن ابھی تک ہمیں کاپی موصول نہیں ہوئی ہے۔“

سام کے خیال میں شاید اس مووی سے انہیں مدد مل سکتی تھی۔ اس نے جان سے مذکورہ چینل کا نمبر لیا اور اس کے ریکارڈنگ روم کے انچارج کو کال کی۔ پولیس کا حوالہ دے کر اس نے کہا۔ ”ہمیں یہ مووی درکار ہے، بغیر کسی ایڈٹ کے اور مکمل شٹل کے ساتھ۔“

”مل جائے گی۔“ روم انچارج نے جواب دیا۔ ”بشرطیکہ پولیس کی طرف سے باضابطہ درخواست کی جائے۔“

”درخواست بھی مل جائے گی۔“ سام نے جواب دیا پھر اس نے جان سے ہال دیکھنے کی فرمائش کی۔

تھیں کا یہ ہال پولیس کی طرف سے بند تھا۔ اسٹینجیر سامان اسی طرح موجود تھا اور فرش پر ہنرک کی لاش کا خاکہ بنا ہوا تھا۔ داخلی راستوں پر پولیس کی پتلی پٹی لگی ہوئی تھی۔ جان نے کہا۔ ”تب سے اب تک کوئی یہاں نہیں آیا ہے۔“

سازندوں والا حصہ بھی اسی طرح قائم تھا۔ یعنی سب کی ششیں اور آلات موسیقی اپنی جگہ موجود تھے۔ سام نے ہنرک کے ڈائریکٹر پر کھڑے ہو کر سامنے گیلری کی طرف دیکھا۔ اس کا سینہ میں گیلری کے رخ پر تھا اور اگر وہاں سے کوئی اس کا نشانہ لیتا چاہتا تو بہت آسانی سے لے سکتا تھا۔ لیکن یہ نشانہ بلو پاپ سے نہیں لیا جاسکتا تھا، اسے صرف کسی پیسٹل یا رائفل کی گولی سے نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔ ڈائریکٹر گیلری کے درمیان فاصلہ اس کے اندازے سے زیادہ تھا۔ سام نے جان کی طرف دیکھا۔

”اس جگہ سے گیلری کا فاصلہ کتنا ہوگا؟“

”کم سے کم ایک سو تیس فٹ۔“ جان نے جواب دیا۔

”اگر تم سوچ رہے ہو کہ قاتل نے وہاں سے ہنرک پر حملہ کیا تو یہ ممکن نہیں ہے۔ اول تو فاصلہ بہت زیادہ ہے اور دوسری بات یہ کہ گیلری تقریباً پورے ہال کی نگاہوں کے سامنے ہے اور اس میں کی جانے والی کوئی حرکت لوگوں سے چھپا کر نہیں کی جاسکتی۔ اگر کوئی شخص یہاں سے ہنرک کو نشانہ بنانا چاہتا تو وہ فوراً دوسروں کی نظروں میں آ جاتا۔“

”تجربے کا ٹکڑا ہے۔“ مل نے کسی قدر رکھائی سے کہا۔

”یہ ہمارا کام ہے، ہم دیکھ لیں گے۔“

بے چارہ جان کھیا کر رہ گیا۔ سام غور سے سازندوں کی نشستوں اور ان کے سازوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے مل کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”اس بے چارے نے غلط نہیں کہا ہے، اتنی دور سے نشانہ لینا ممکن نہیں ہے اور کسی کی نظروں میں آئے بغیر لینا تو قطعی ناممکن ہے۔ تم دیکھ سکتے ہو اگر اس گیلری میں کوئی شخص ذرا بھی حرکت کرے تو وہ صاف نظر آئے گی۔“

مل نے کوئی جواب نہیں دیا، شاید اسے اچھا نہیں لگا تھا کہ اس کا رائٹر اس کے مقابلے میں ایک غیر پیشہ ور شخص کی بات کو ترجیح دے۔ وہ باہر نکلے تک خاموش ہی رہا۔ جب سام اس کے برابر میں آ کر بیٹھا تو اس نے منہ بنا کر پوچھا۔

”اب کہاں جانا ہے؟“

سام مسکرایا۔ ”شاید تمہیں برا لگا کہ میں نے جان کی بات کی تانیدی۔ لیکن تم خود سوچو کہ ایک سو تیس فٹ کی دوری سے بلو پاپ استعمال کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ تیس فٹ تک کارآمد ہوتا ہے۔ بہت طاقت ور آدمی بھی

اس سے زیادہ دور سوئی نہیں چھینک سکتا۔ اس سے زیادہ فاصلے تک سوئی پہنچانے کے لیے لازمی کسی میگزین کی مدد حاصل کرنی پڑتی ہے۔ لیکن کسی قسم کی بھی ڈیوائس لوگوں کی نظروں میں آئے بغیر استعمال کرنا ممکن نہیں ہے۔ جان بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا، وہ گیلری ہزاروں نگاہوں کے بالکل سامنے تھی اور ناممکن تھا کہ ہمہ وقت کچھ نگاہیں اس طرف نہ لگی ہوں۔“

سوال وہی تھا کہ قاتل نے یہ کام کیسے کیا؟ اور مل کے نزدیک اس سے بھی بڑا سوال یہ تھا کہ اس نے یہ کام کیوں کیا؟ اس کی ہنرک سے کیا دشمنی تھی؟ سام نے مل سے کہا۔

”ہمیں ٹی وی چینل کے دفتر جانا ہوگا کیونکہ وہ باضابطہ پولیس درخواست کے بغیر شوکی مووی دینے کو تیار نہیں ہیں۔“

چینل کے ریکارڈنگ انچارج اسٹیو کو فر نے تانسی گرم جوشی کے ان کا استقبال کیا۔ سام نے ہنرک کے قتل کا حوالہ دیا تب بھی اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سام نے مووی کا مطالبہ کیا۔ اسٹیو نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ مووی باقاعدہ درخواست کے بغیر فراہم نہیں کی جاسکتی۔“

”تو باقاعدہ درخواست اور کیا ہوتی ہے؟“ سام نے حیرت سے کہا۔ ”ہم اس کیس کے تقاضائی افسران ہیں اور وہ مووی دیکھنا ہماری ذمہ داری ہے۔ وہ اس ادارت کی اشیاء میں شامل ہے اور پولیس اسے اپنی تحویل میں لینے کی مجاز ہے۔“

”بلکہ چینل کو اسے نشر کرنے کے لیے پولیس کی اجازت کی ضرورت ہوگی۔“

”اور اگر اسے بنا اجازت کے نشر کیا گیا تو عدالت میں جواب دی تمہیں کرنا ہوگی مسٹر کو فر۔“

”اس کا چینل مالکان پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔“ مل نے مزید اضافہ کیا۔

”ہمیں وہ مووی ابھی دیکھنی ہے۔“ سام نے کہا تو اسٹیو نرم پڑ گیا۔ غالباً اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ پولیس کے اختیارات کیا ہوتے ہیں، اگر اس نے ان کی بات نظر انداز کی تو جج جج مشکل میں پڑ جائے گا۔

”ٹھیک ہے، میں تمہیں مووی دے دیتا ہوں۔ مگر تم

ایک چھوٹی سی تحریری درخواست تو دے سکتے ہو تا؟“ اس کے لہجے میں انتہائی۔

سام نے اس کی فرمائش پوری کر دی اور اسٹیو نے اپنے شوٹ سیکشن کے انچارج کو بلا دیا۔ ”انہیں ہنرک کی آخری شو مووی دکھانی ہے جیسے یہ کہیں ویسے۔“

”آج میرے ساتھ۔“ انچارج نے سام اور مل سے کہا۔ وہ انہیں ایک پلے روم میں لے آیا۔ یہاں بے شمار ٹی وی لگے ہوئے تھے اور ان پر مختلف چیزیں چل رہی تھیں۔ انچارج نے ہنرک کے شو کی مووی کیسٹ نکالی اور انہیں بتایا۔ ”یہ چار کیمروں سے شوٹ کی گئی ہے۔ کل دورانیہ ایک گھنٹا ہے۔“

”یعنی یہ کل چار گھنٹے کی مووی ہے؟“

انچارج نے سر ہلایا اور سامنے رکھی ایک کیسٹ کی

بچہ ہمارے عہد کے

استانی نے کلاس میں چوتھی جماعت کے ایک طالب علم سے پوچھا۔ ”تم بڑے ہو کر کیا کرو گے؟“

”کالج! لڑکے نے جانا تھا جواب دیا۔“

”میرا مطلب ہے کہ کیا ہو گے؟ استانی نے شہکار کی بات دہرائی۔

”لہذا! لڑکے کے پاس جواب تیار تھا۔

”اس میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ بڑے ہو کر تم کیا حاصل کرو گے؟“

”لڑکے کی سوئی ایک ہی جگہ لگی ہوئی تھی۔

”میں یہ جانا چاہتی ہوں کہ تم اپنے ماں باپ کے لیے کیا کرو گے؟“ استانی نے پوچھا کہ

سوال کیا۔

”ہو لاؤں گا۔“

”تمہارے والد تم سے کیا چاہتے ہیں؟“ استانی اپنے سوال کا جواب سننے پر مصر

تھی۔

”پتا۔“

”لڑکے! یہ بتاؤ کہ تمہاری زندگی اور اس تعلیم کا مقصد کیا ہے؟“ استانی کے صبر کا بیانیہ

لہر بڑھ گیا۔

”شادی!“

اسلام آباد سے راشدہ اسلم کی برچسٹ

طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ایک نمبر کیمرا ہے۔ یہ مستقل ہنرک اور اس کے آرکسٹرا پر فوکس رہتا ہے۔ دوسرا کیمرا رول کرتا رہتا ہے لیکن یہ بھی ہنرک اور اس کے آرکسٹرا کو نظر میں رکھتا ہے، ساتھ ہی قماشائیوں کو بھی دکھاتا ہے۔ یہ تیسرا کیمرا قماشائیوں کے لیے مخصوص ہے اور ان پر رول کرتا رہتا ہے۔ یہ کمرین کیمرا ہے اور خصوصی زاویوں سے مناظر کو شوٹ کرتا ہے۔ تم پہلے کیا دیکھنا پسند کرو گے؟“

”یہ کیسٹ جو مستقل ہنرک اور اس کے آرکسٹرا پر مرکوز رہی۔“ سام نے پہلی کیسٹ کی طرف اشارہ کیا تو انچارج اسے پہلے کرنے لگا۔ اس نے بی بورڈ سامنے کر لیا تھا۔ کچھ دیر بعد ستائیس انچ کی وائڈ اسکرین پر ہال کا منظر نمودار ہوا۔ ہنرک اور اس کے آرکسٹرا پر سے پردہ اٹھ رہا تھا۔ لوگوں نے پُر جوش تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔ ہنرک نے ڈانکس سفیلا اور موسیقی کے لیے اشارے دینے لگے۔ کچھ دیر میں اس کا آرکسٹرا پوری طرح حرکت میں آچکا تھا۔ سام نے انچارج سے کہا۔

”مووی کو وہاں تک لے جاؤ جہاں ہنرک گرتا ہے۔“ انچارج نے مووی کی رفتار تیزی اور چند منٹ بعد وہ سین آگیا۔ اس پر وقت اتنا لیس منٹ کا آ رہا تھا۔ گویا شو شروع ہوئے تقریباً پون گھنٹا ہوا تھا، تب یہ واقعہ پیش آیا۔ اس وقت آرکسٹرا اونچے سروں پر تھا اور ہال موسیقی کی تیز آواز سے گونج رہا تھا۔ ہنرک گراتو سام نے مووی روکنے کا اشارہ کیا اور پھر بولا۔ ”اسے ریو اینڈ کرو۔۔۔ تقریباً پانچ منٹ تک۔“

انچارج نے مووی ریو اینڈ کی اور اسے چوتیس منٹ پر لے آیا۔ اب ہنرک دوبارہ اسکرین پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سام غور سے اس کی حرکات دیکھتا رہا۔ موسیقی دینے کے دوران میں وہ ساکت نہیں رہتا تھا۔ نہ صرف اس کے ساتھ مستقل حرکت میں تھے بلکہ وہ جسم کو بھی دائیں اور بائیں گھما رہا تھا۔ یہ گھمانے والی حرکت وہ ایک خاص ردھم میں کر رہا تھا۔ ایک بار وہ دائیں طرف گھومتا تھا جس طرف قماشائی تھے اور ایک بار وہ بائیں طرف اپنے آرکسٹرا کی طرف۔ جب اس کے گرنے کا منظر آیا تو سام نے سین کو ایک منٹ ریو اینڈ کرنے کو کہا۔ انچارج نے اس سین کو ریو اینڈ کیا۔ جب ہنرک گراتو سام نے پھر سے سین دکھانے کو کہا اور اس نے کوئی دس بار سین کو ریو اینڈ کر کے دیکھا۔ بل بیواری سے بیٹھا بس اسکرین کو گھور سے جا رہا تھا۔ ٹک آکر اس نے

سام سے کہا۔

”میرے خدا... سام! کیا تم اس منظر کو یاد کرنا چاہتے ہو؟“

سام نے اس کی بات نظر انداز کر کے انچارج سے کہا۔ ”اب یہی سین مجھے آرکسٹرا کو زدم کر کے دکھاؤ۔“ انچارج نے ایسا ہی کیا۔ اب اسکرین پر آرکسٹرا نظر آ رہا تھا۔ یہ سین بھی سام نے بار بار ریو اینڈ کر کے دیکھا حتیٰ کہ انچارج بھی بیزار نظر آنے لگا۔ اس نے کہا۔ ”اگر تم کوئی خاص چیز دیکھنا چاہتے تو مجھے بتا دو، میں اسے واضح کر کے دکھا سکتا ہوں۔“

”یہ سازندوں کی دوسری قطار ہے، اوپر سے دوسری میں... اس کے درمیان والے حصے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“ انچارج نے یہ کام بھی کر دیا لیکن سام نے اسے بھی بار بار دیکھنا شروع کر دیا۔ بل کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے سام سے کہا۔ ”آخر تم کیا چیز دیکھنا چاہتے ہو؟“ سام مسکرایا۔ ”میں قائل کو دیکھنا چاہتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ میں نے قائل کو دیکھ لیا ہے۔“

بل اچھل پڑا۔ ”کہاں ہے... کون ہے؟“ ”ایک منٹ... ذرا صبر سے کام لو۔“ سام نے کہا اور انچارج سے کہا۔ ”یہ سب کیسٹس میں ساتھ لے جا رہا ہوں۔“ ”ٹھیک ہے، تم مجھے ان کی رسید دے دو۔“ انچارج نے اعتراض نہیں کیے۔ اس نے اپنے باس کا رویہ دیکھ لیا تھا۔ ویسے بھی یہ ماسٹر پرنٹ نہیں تھا بلکہ اس کی نقل تھی۔ باہر آکر سام نے جان کو کال کی۔

”تم کہاں ہو؟“ ”میں اپنے دفتر میں ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہیں رو، ہم آ رہے ہیں۔ ہمیں شوکی مووی دیکھنی ہے، اس کا اختتام کر کے رکھنا۔“

”تم بے فکر رہو، یہاں سب تیار ہوتا ہے۔“ وہ میرین تھیز پہنچے تو جان ان کا منتظر تھا۔ وہ انیس براہ راست تھیز کے مووی روم میں لے گیا۔ یہ زیادہ بڑا نہیں تھا، یہاں مشکل سے سو افراد کی گنجائش تھی۔ سامنے ایک بڑی اسکرین والائی وی تھا۔ یہاں خصوصی شو کو دیکھا جاتا تھا۔ سام نے پہلی کیسٹ جان کے حوالے کی۔ ”اسے تیس منٹ تک لے جا کر پلے کرو۔“ جان نے ایسا ہی کیا۔ کچھ دیر بعد اسکرین پر ہنرک

اور اس کا آرکسٹرا ابھرا۔ اسکرین بڑی ہونے کی وجہ سے سب بہت واضح نظر آ رہا تھا۔ جان نے مووی کو تیسویں منٹ تک فارورڈ کیا۔ اس کے بعد پلے کر دیا۔ ہنرک موسیقی دے رہا تھا۔ اس کی حرکات ایک ردھم میں جاری تھیں۔ سام نشست پر بیٹھنے کے بجائے ٹی وی کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔ اس کی اسکرین کو ٹی فونٹ بلند اور سولفٹ چوڑی تھی۔ مووی پائی ڈیفینیٹ تھی اس لیے اتنے بڑے سائز میں بھی واضح تھی۔ بل بھی اس کے پاس آگیا۔ جان مووی چلانے والے سسٹم کے پاس تھا۔ جیسے ہی مووی کو اڑتیس منٹ پورے ہوئے، سام نے جان سے کہا۔

”مووی کو سلوموشن کر دو۔“ جان نے اسے سلوموشن کر دیا، اب سین بہت آہستگی سے گزر رہا تھا۔ اسی معاملے سے ہنرک اور اس کے ساتھیوں کی حرکت میں بھی آہستگی آگئی تھی۔ پھر موسیقی دیتے ہوئے ہنرک مخصوص ردھم میں آرکسٹرا کی طرف گھوما اور پھر جیسے ہی سیدھا ہونے لگا، اس کا جسم رول اور پھر وہ ایک دم ٹھکڑا کر ڈانکس سے نیچے گرا اور ساکت ہو گیا۔ سام نے کہا۔ ”سین کو ایک منٹ پیچھے کر کے مزید سلوموشن کر دو۔“

جان نے مووی ایک منٹ پیچھے کی اور اسے مزید ست کر دیا۔ سام نے بل سے کہا۔ ”اس نوجوان کو دیکھو جو بانسری بجا رہا ہے۔“

سام نے جس نوجوان کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ اوپر سے دوسری قطار میں تقریباً درمیان میں بیٹھا ہوا تھا۔ گول چشمے اور کھیرے بالوں کے ساتھ وہ نرم مزاج اور بچہ کوئی بانسری نواز لگ رہا تھا۔ بل نے محسوس کیا کہ اس کی بانسری کا رخ ہنرک کی طرف تھا۔ پھر جیسے ہی وہ مویج آیا جب ہنرک آرکسٹرا کی طرف گھومتا ہے تو نوجوان نے اپنی انگلیاں بانسری کے سوراخوں سے ہٹائے ہوئے اس کا رخ ہنرک کی طرف کر دیا اور پوری قوت سے پھونک ماری۔ اس سے موسیقی کے ردھم پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا کیونکہ اس وقت جو ردھم چل رہا تھا، اس کے مطابق بانسری نواز کو زور و شور سے بانسری بجاتا تھا اور وہ ردھم کی ضرورت کے عین مطابق تھا۔ اس نے پھونک مارنے سے پہلے کال پوری طرح پھلا لیے اور زور سے اس کے جسم نے جھٹکا لیا تھا لیکن یہ سب شاید سینکڑوں کے تیسرے حصے میں ہوا تھا اس لیے کوئی بھی اس کا نوٹس نہیں لے سکا۔ اگر وہ مووی کو نازل رفتار سے چلا کر دیکھ رہے ہوتے تو شاید ان کو بھی نوجوان کی اس حرکت کا پتا نہ چلتا۔ اس کے پھونک مارنے کے دو سینکڑوں کے اندر ہنرک نیچے گر چکا تھا

حسن ظن

ایک بد شکل آدمی اپنی حسین و جمیل بیوی کے ساتھ سڑک سے گزر رہا تھا کہ ایک لڑکے نے فقرہ چست کیا۔ ”حور کے پہلو میں لنگور۔“ اس آدمی نے لڑکے کو پکڑ لیا اور اس کی پٹائی شروع کر دی۔ چندرا گکیر بچہ چاؤ کرنے آگئے اور جھگڑے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا۔ ”یہ لڑکا میری بیوی کو لنگور کہہ رہا تھا۔“ برنس روڈ سے احمد حسن کی شوقی

اور جب تک دوسرے اس تک آتے، وہ ختم ہو چکا تھا۔ جان یہ منظر دیکھ کر اچھل پڑا۔ اس بار اس نے سام کے کپے بغیر سین کو ریو اینڈ کیا اور اسے مزید ست کر دیا۔ پھر اس نے اسے بانسری والے نوجوان پر زدم کیا اگرچہ اس سے بچھڑکی کو اپنی پرفرقی پڑا تھا مگر انہوں نے بانسری سے کوئی چیز نکلتی ہوئی دیکھ لی تھی۔ اگرچہ سوئی واضح نہیں تھی تاہم زدم کرنے سے اتنا منظر واضح ہو گیا تھا۔

”تو یہ قائل ہے؟“ بل نے کہا اور جان کی طرف دیکھا۔ ”تم اسے جانتے ہو؟“

”میں تو نہیں لیکن جیڈ جانتی ہوگی۔ سازندے اس کی فٹے داری ہیں۔“ جان نے کہا اور جیڈ کو کال کی۔ وہ بڑی پیاری لیکن سنجیدہ اور اپنے کام سے مخلص لڑکی تھی۔ جب جان نے اس سے آرکسٹرا کے بارے میں پوچھا تو وہ ان کا اہم لے آئی۔ سام نے خشمیہ والے نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔

”کیون ہے؟“ ”یہ بین مائیکل ہے۔“ جیڈ نے کہا۔ ”ابھی ایک سال پہلے ہنرک کے آرکسٹرا میں شامل ہوا ہے۔ اچھا نوجوان ہے، بھی بھی ویسے بھی بانسری بجا کر دکھاتا ہے۔ اسے موسیقی سے بھی دیکھی ہے۔“

”موسیقی سے دلچسپی؟“ سام نے سوالیہ نظر سے دیکھا۔

”میرا مطلب ہے، موسیقی ترتیب دینے سے دلچسپی ہے۔ ابھی یہ صرف سازندہ ہے لیکن بعض اوقات بڑے اچھے ہیں خود سے بنا کر ہمیں سنا تا ہے۔“

سام نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے، یہ بے تکلف قسم کا شخص ہے؟“

”بہت... اکثر خوشم ہونے کے بعد یہ ہمارے ساتھ

آجاتا ہے۔“ جیڑ نے بتایا۔ ”ویسے یہ طالب علم ہے اور موسیقی سکھانے والے ایک ادارے میں پڑھ رہا ہے۔ ساتھ ہی ہنرک کے ساتھ کام بھی کرتا ہے۔ یوں اسے اتنا معاوضہ مل جاتا ہے جس سے یہ اپنی فیس ادا کرنے کے ساتھ اپنے دوسرے اخراجات بھی پورے کر لیتا ہے۔“

”اس کا پتا ہے؟“

”ہاں، ایک منٹ میں لے کر آتی ہوں۔“ جیڑ نے کہا اور چند منٹ بعد اس نے ایک کاغذ پر مائیکل کا پتہ لکھ کر دے دیا۔ وہ میا می کے ایک متوسط علاقے میں رہتا تھا۔ ”یہ معاملہ کیا ہے؟“

”ہنرک کا قاتل مائیکل ہے۔“ ان سے پہلے جاننے جیڑ کو بتا دیا۔

”کیا؟ مائیکل قاتل ہے؟“ وہ چیخ اٹھی۔

”لیکن ابھی یہ بات تم دونوں تک محدود رہنی چاہیے۔“ سام نے انہیں خبردار کیا۔ ”دوسری صورت میں تم لوگ مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“

وہ سسٹنس لے کر باہر آئے اور جیڑ کے دیے ہوئے پتے پر روانہ ہو گئے۔ جن مائیکل اپنے ایک کمرے کے اپارٹمنٹ میں تھا اور شاید کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ پوئیس چیچ دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

”ہمیں تم سے بات کرنی ہے۔“ سام نے کہا اور اسے دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ بل اس کے پیچھے تھا۔

مائیکل نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”آفسیر! تم کیا چاہتے ہو؟“

”ہم صرف ایک بات جانا چاہتے ہیں کہ تم نے ہنرک کو کیوں قتل کیا ہے؟“ سام نے کہا اور اپنا پستول نکال لیا۔ بل نے مائیکل کی تلاشی لی اور اس کی جیب سے تمام چیزیں نکال لیں پھر اسے اس کے حقوق بتاتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ مائیکل کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ سام نے بات جاری رکھی۔ ”ہمارے پاس مکمل ثبوت ہے کہ قتل تم نے کیا ہے اور بہت ہوشیاری سے کیا ہے... لیکن تمہاری بد قسمتی کہ مووی کیرے نے وہ منظر ریکارڈ کر لیا جب تم نے ہنرک پر اپنی ہائرسری کی مدد سے زہر کی سوئی چھینکی تھی۔ وہ ہائرسری بھی یہیں کہیں ہوگی اور نہ بھی ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

☆☆☆

سام اور بل، جولیا کے عالی شان ساحلی مکان کے باہر اپنی کار میں بیٹھے تھے۔ بل نے فخر سے کہا۔ ”دیکھا، میرا

اندازہ درست ثابت ہوا نا... یہ سارا دولت کا پیکر تھا۔“

”ہاں، ہنرک اگر زندہ رہتا تو چند ہی منٹ بعد وہ اپنا میسرے شادی کرنے والا تھا۔“ سام نے ایک معروف سپر ماڈل کا نام لیا۔ ”اس سے اس کا انیسر خاصے عرصے سے جاری تھا اور انہوں نے اسے کامیابی سے چھپایا بھی تھا لیکن یہ راز بھی ٹشٹ از باہم ہو گیا۔ اس سے شادی کرنے کی صورت میں یقیناً وہ اس کی دولت کے وراثتوں میں شامل ہو جاتی۔“

”اور یہی بات ہنرک کی موت کی وجہ بن گئی۔“ بل نے کہا اور مکان کے گیٹ کی طرف دیکھا جہاں جولیا کو پولیس کار میں بٹھایا جا رہا تھا۔ مکان کی اوپری منزل سے ہنرک اور جولیا کی گیارہ سالہ بیٹی ناشا حسرت سے اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ سام نے یہ منظر دیکھ کر گہری سانس لی۔

”مجھے اس بچی کا افسوس ہے۔ باپ سے محروم ہوئی تھی، اب ماں سے بھی محروم ہو گئی۔ جولیا کو یقیناً لمبی سزا ہو گی۔ اس نے ایک موسیقار کو قتل کر لیا اور دوسرے موسیقار کو مجرم بنا دیا اور اس کا کیریئر بھی تباہ کر دیا۔“

”مائیکل اس میں برابر کا شریک ہے۔ اس نے دولت کے لالچ میں قاتل بنا گوارا کیا۔“

”دولت کے لالچ سے زیادہ بڑی وجہ اس کی ہنرک سے نفرت تھی۔ اس نے موسیقی کے کچھ ٹکڑے بنا کر ہنرک کو رائے کے لیے دیے اور اس نے چالاکی سے انہیں اپنی موسیقی میں شامل کر لیا۔ اسے جس میوزک پر آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا ہے، اس میں بھی کچھ ٹکڑے مائیکل کے بنائے ہوئے شامل تھے۔ اس لیے جب جولیا نے اسے ہنرک کے قتل پر آمادہ کرنا چاہا تو وہ اسی وجہ سے آسانی سے مان گیا۔ ایسی ہائرسری اس نے خود بنائی جو بلو پاپ کا کام بھی کرتی اور زہریلی سوئی اسے جولیا نے فراہم کی۔ اس نے مائیکل سے کہا کہ وہ ہنرک کو قتل کرنے کی صورت میں نہ صرف بڑی رقم دے گی بلکہ اسے ایک موسیقار کے طور پر پروموشن بھی کرے گی۔“

بل نے سر ہلایا۔ ”وہ لالچ میں آ گیا۔ اب وہ ساری عمر جیل میں رہے گا۔“

”جولیا کی طرح!“ بل نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

مکان کی اوپری منزل سے جھانکتی ناشا ماں اور باپ دونوں سے محروم ہو گئی تھی۔



لڑکی ایک تھی اور اُمیدوار دو۔ لڑکی کا نام میا تھا اور اس کے دو امیدواروں میں ایک مختار تو دوسرا فیروز تھا۔

ان دونوں دوستوں نے میا کو ایک ساتھ ہی پسند کیا تھا۔ دونوں اپنے کسی مشترکہ دوست کی شادی میں شریک تھے جب وہ لڑکی اچانک ان کے سامنے آ گئی۔

اس وقت کھانا لگ چکا تھا۔ لڑکی کے ایک ہاتھ میں

پلیٹ تھی اور وہ کولڈ ڈرنک کی تلاش میں گردن گھما رہی تھی۔ جس کے کریت اس سے کچھ فاصلے پر تھے جبکہ یہ دونوں اس کے قریب کھڑے تھے۔

”پلیز.....“ اس نے ایک وقت میں شاید دونوں کو مخاطب کیا تھا۔ ”میرے لیے کولڈ ڈرنک لے آئیں گے؟“

لڑکی وہیں کھڑی رہی اور دونوں ہی اس کے لیے کولڈ ڈرنک

ایک ہی لڑکی کی چاہت میں مبتلا ہونا ہے اس کے دو دوستوں کی کیفیت

زندگی کی گاڑی عمل کے پہیے سے چلتی ہے... کچھ کند ذہن رکھنے والوں کا خیال ہوتا ہے کہ ان کا خاندانی جاہ و جلال اور حسب نسب ان کی شخصیت کو معتبر بنانے کے لئے کافی ہے... ایک ایسے ہی بے عمل شخص کی کتھا...

نسب نما

منظر راما



لینے دوڑ گئے۔

”یہ لیں۔“ فیروز نے بوتل اس کی طرف بڑھائی۔

”اوہ بوتل تو یہ لے آئے ہیں۔“ لڑکی نے مختار کی

طرف اشارہ کیا۔

”یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں بھی تو لایا ہوں۔“

فیروز نے کہا۔

”اب دیکھیں۔۔۔ میں دو کوئلہ ڈرنگ تو نہیں لی سکتی

تا۔“

”فیروز تم ایسا کرو یہ بوتل مجھے دے دو۔“ مختار نے

کہا۔

”نہیں یہ میں ان کے لیے لایا ہوں۔ تمہیں کیوں

دے دوں؟“

”لیکن میرے پاس تو ڈرنگ ہے نا۔“ لڑکی کچھ

جھلانے لگی تھی۔

فیروز نے اس وقت بات بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔

لڑکی ایک طرف چلی گئی۔ مختار کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ فیروز

اس سے کچھ ناراض ہو گیا ہے۔ اس نے فیروز کے پاس جا کر

کہا۔ ”کیا ہوا یا تم کیوں اتنے جذباتی ہو رہے ہو؟“

”جب تمہیں یہ پتا تھا کہ میں اس کے لیے کوئلہ ڈرنگ

لینے گیا ہوں تو پھر تمہیں ہمدردی کی کیا ضرورت تھی۔“ فیروز

خسے سے بولا۔

”ارے یا رکھا ہو گیا تمہیں۔“ مختار حیران رہ گیا۔ ”یہ

کون سا ایسا ایٹھ ہے جس پر ناراض ہوا جائے؟“

”ایٹھ یہ ہے میرے دوست کہ وہ لڑکی مجھے اچھی لگی

ہے۔“ فیروز مسکراتے ہوئے بولا۔

”اوہ!“ مختار نے گہری سانس لی۔ ”مگر یہی بات

میں کہوں تو۔۔۔؟“

”ہونہ۔“ فیروز نے ہونٹ سکڑیے۔ ”دیکھا جائے

گا۔“

صبا سے ملاقات پہلے ہی دن وہ لڑکی دونوں دوستوں

کے درمیان اختلاف کا سبب بن گئی تھی حالانکہ دونوں اس

کے نام سے بھی ناواقف تھے۔ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ

کون ہے اور کہاں رہتی ہے اور اس کے والدین کون ہیں۔

کچھ دنوں بعد فیروز اپنے دوست اختر کے پاس پہنچ

گیا۔ وہ دوست جس کی شادی میں انہوں نے اس لڑکی کو

دیکھا تھا۔

”یار میں نہیں جانتا کہ وہ لڑکی تمہاری رشتے دار ہے یا

جان پہچان والی ہے؟“ فیروز نے کہا۔ ”لیکن بات صرف

اتنی ہے کہ وہ مجھے اچھی لگی ہے۔“

”کس لڑکی کی بات کر رہے ہو؟“

”جس نے سفید چوڑی دار پاجامہ اور سفید کرتہ پہن

رکھا تھا۔“ فیروز نے بتایا۔

”اوہ۔“ اختر ہنس دیا۔ ”آخر چکر کیا ہے مختار بھی اسی

کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔“

”کیا مطلب؟ کیا وہ معلوم کر گیا ہے۔“

”ہاں بھائی وہ اس کا نام اور پتا بھی پوچھ رہا تھا۔ میں

نے اسے بتا دیا ہے۔ چھپانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔“

”کیا نام ہے اس کا؟“

”صبا۔“ اختر نے بتایا۔ ”باپ کا نام قیصر ہے۔ کسی

انگلش فرم میں اچھے عہدے پر ہیں اور اپنے مزاج کے اعتبار

سے آدھے انگریز ہو چکے ہیں۔ انہیں اس بات کی پروا بھی

نہیں ہے کہ صبا کتنے لڑکوں سے دوستی کرتی ہے، یہ اور بات

ہے کہ صبا بہت سو پرکی لڑکی ہے۔ میں نے آج تک اس کے

حوالے سے کوئی ایسی سیدھی بات نہیں سنی۔“

”چلو اب تم مجھے اس کا پتا بھی بتا دو۔“ فیروز نے کہا۔

”دیکھو مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اس لڑکی کی وجہ سے

تمہارے اور مختار کے درمیان اختلافات پیدا ہو رہے ہیں

اس لیے بہتر ہے کہ تم دونوں ہی اس کا خیال ترک کر دو۔“

”مختار سے کہو کہ وہ پیچھے ہٹ جائے۔“ فیروز نے

کہا۔ ”اب تم خود سوچو۔“ کیا مختار اس لڑکی کے قابل

ہے۔۔۔ اس کا فیملی بیک گراؤ نہ کیا ہے کچھ بھی تو نہیں۔“

”لیکن وہ تو اچھا ہے نا۔“ اختر، فیروز کی طرف دیکھتے

ہوئے بولا۔ ”وہ اپنا مستقبل بنانے کے لیے جدوجہد کر رہا

ہے۔ خود بھی ذہین ہے۔“

”بے وقوف ہو تم۔“ فیروز ہنس دیا۔ ”اس معاشرے

میں اصل اہمیت اسٹیشن کی ہوتی ہے۔ اگر اسٹیشن ہے تو سب

کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں ہے۔“

”اچھا چلو۔ کم از کم اتنا تو وعدہ کر لو کہ تم مختار سے جھگڑا

نہیں کرو گے۔“

”جھگڑا۔“ فیروز ہنس دیا۔ ”میری جان جھگڑا تو برابر

والوں کے درمیان ہوتا ہے۔ تم بتاؤ تم چاہو دے رہے ہو یا

نہیں؟“ اختر نے گہری سانس لے کر فیروز کو بھی پتا بتا دیا۔

فیروز نے براہ راست صبا کے والد سے ملاقات کر لی

تھی۔ وہ واقعی ایک اصول پرست انسان تھا۔ فیروز نے ان

سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بتایا۔ ”جناب عالی میرا تعلق

ایک مستحق گھرانے سے ہے۔ آپ نے شاید میرے ڈیڈ کا

نام سنا ہو گا حمید الزماں صاحب۔“

”اوہ۔۔۔ تو تم حمید الزماں کے بیٹے ہو۔“ قیصر نے

خوشی کا اظہار کیا۔

”جی جناب، پھر تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ ہمارا

فیملی بیک گراؤ نہ کیا ہے؟“

”بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ قیصر نے کہا۔ ”خیر تم

یہ بتاؤ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔۔۔ کیوں آئے ہو میرے

پاس؟“

”جناب میں صاف بات کرنے کا عادی ہوں اسی

لیے اپنا کیس لے کر خود ہی آ گیا ہوں اور اگر بات آگے بڑھی

تو ڈیڈ بھی آ جا سکتے۔“

”جس طرح تم صاف بات کرنے کے عادی ہو اسی

طرح میں بھی ہوں۔“ قیصر نے کہا۔ ”کھل کر کہو، کیا کہنا

چاہتے ہو۔۔۔؟“

”انگل میں، میں آپ کی صاحبزادی سے شادی کرنا

چاہتا ہوں۔“ فیروز نے اپنی بات کہہ دی تھی۔

”کیا تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟“

”جانتا نہیں جانتے۔“ بس ایک بار ملاقات ہوئی۔“

فیروز نے بتایا۔

”اور ایک بار کی ملاقات میں تم نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا

اور یہ بھی کیا ضروری ہے کہ جو فیصلہ تمہارا ہے وہی صبا کا بھی ہو

۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس رشتے سے انکار کر دے تو پھر۔“

”انگل میرا خیال ہے کہ اگر آپ کی صاحبزادی کے

پاس عقل ہوگی تو وہ انکار نہیں کریں گی۔“ فیروز نے کسی قدر

اٹڑتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ میرا ایک گراؤ نہی ایسا ہے۔“

”یہ تو میں نہیں جانتا کہ وہ کس حد تک تمہارا ساتھ

دے گی لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس قسم کے

سارے فیصلے اسی پر چھوڑ دیے ہیں۔ میری طرف سے کوئی

جبر، کوئی باؤ نہیں ہے۔“

”تو آپ بتائیں میں کیا کروں؟“

”تم چاہو تو اس سے ملاقات کر سکتے ہو۔ میری طرف

سے کوئی پابندی نہیں ہے۔“ قیصر نے کہا۔ ”بلکہ ایسا کہ تم دس

منٹ رک جاؤ وہ ابھی آ رہی ہوگی۔ میں اپنی اسٹری میں جا

رہا ہوں۔ تم جب تک چائے پیو۔“ قیصر کے جانے کے بعد

ملازم نے چائے لا کر رکھ دی۔

ابھی اس نے چائے ختم ہی کی تھی کہ صبا کے ہنسنے کی

آوازیں آئیں، وہ مختار کے ساتھ کمرے میں داخل ہو رہی

تھی۔

صبا اور مختار کو ایک ساتھ دیکھ کر فیروز کے ماتھے پر

فکٹیں پڑ گئیں۔ مختار، فیروز کو دیکھ کر جلدی سے اس کے پاس

آ گیا تھا۔ ”یار تم یہاں۔۔۔؟“

”کیوں جب تم یہاں آ سکتے ہو تو میں کیوں نہیں

آ سکتا۔“ فیروز نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر

دیا۔

”میں آپ کو پہچان گئی۔“ صبا نے کہا۔ ”آپ سے

بھی شاید اسی دن ملاقات ہوئی تھی۔“

”جی میں وہی ہوں۔۔۔ فیروز نام ہے میرا۔“ فیروز

نے بتایا۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے آپ کے ڈیڈ سے بھی ملاقات

ہو چکی ہے۔“

”اچھا ابھی مجھے اجازت دو۔“ مختار نے صبا کی طرف

دیکھا۔

”اجازت کیسی جناب۔۔۔ ابھی تو مجھے آپ کے

ساتھ باہر جانا ہے۔“ صبا نے کہا پھر فیروز سے مخاطب ہوئی۔

”اچھا فیروز صاحب آپ ڈیڈ سے کب شپ لگائیں میں

ذرا باہر جا رہی ہوں۔“ فیروز کے لیے یہ بڑی توہین کی بات

تھی۔

صبا نے اسے مختار کے سامنے نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ

اس کے لیے بالکل نیا اور تکلیف دہ تجربہ تھا۔ اس نے ہمیشہ

اپنی بات منوائی تھی اور وہ سب کچھ حاصل کیا تھا جو اس کی

خواہش تھی لیکن مختار جیسے شخص کے سامنے اس کی حیثیت صفر ہو

کر رہ گئی تھی۔

اس نے اپنے باپ حمید الزماں سے بات کی۔ ”ڈیڈ

آپ کو میرا ایک کام کرنا ہے۔“

”کہو، کیا کام ہے؟“

”ڈیڈ، میں نے ایک لڑکی شادی کے لیے پسند کر لی

ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”پلیز۔۔۔ آپ جا کر بات چلا سکیں۔

لڑکی کے والد آپ کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”کیا نام ہے اس کے باپ کا؟“

”قیصر۔۔۔ مارن روڈ پر رہتے ہیں یہ لوگ۔“

”سمجھ گیا۔“ حمید الزماں نے گردن ہلائی۔ ”کسی

زمانے میں وہ مجھ میرا ماتحت ہوتا تھا۔“

”بس ڈیڈ پھر تو کام بن گیا۔“ فیروز اچھل پڑا۔ ”وہ

برائے فروخت

آصف ملک

خرید فروخت کے سونے بڑی چابک دستی اور باریک بینی سے تکمیل پاتے ہیں... اور اس فن میں بہت کم لوگ کمال پزیر رکھتے ہیں... ایک ایسے ہی لڑکے کے عزائم جوتے سرے سے اپنی کاروباری زندگی کا آغاز چاہتا تھا...

ایک سووے کی آڑ میں رونما ہونے والے غوثی کھیل کا دلچسپ انجام



میں نے گریج آرٹ اور ڈیزائننگ انسٹی ٹیوٹ سے کلاسیک فرنیچر ڈیزائن کرنے کا ڈپلوما حاصل کیا اور اس کے بعد تین سال تک میک فرنیچر آرٹ میں کام کرتا رہا۔ یہاں میں نے کئی شاہ کار فن پارے بنائے۔ یہ خصوصی طور پر آرڈر دے کر بنوایا گیا فرنیچر تھا اور یہی مالکان نے یقیناً اس کی بہت بھاری قیمت وصول کی ہوگی لیکن مجھے سوائے خواہ اور داد کے کچھ نہیں ملا۔ انگلینڈ میٹرفریڈ کا کہنا تھا کہ مجھے اپنا کام کرنا چاہیے۔

”تم اس کی فکر مت کرو۔ ایسے لوگوں کے پاس چار پیسے کیا آجاتے ہیں ان کے دماغ آسمان پر پہنچ جاتے ہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”تم دیکھ لینا، میں جس وقت قیصر کے پاس پہنچوں جاؤں گا اسی وقت اس کا پتا صاف ہو جائے گا۔“ لیکن یہ بات اتنی آسان ثابت نہیں ہوئی۔ قیصر نے اگرچہ حمید الزماں کا بہت احترام کیا تھا اور بہت عزت سے گھر میں بلایا تھا لیکن رشتے کی بات پر اس نے کہا۔ ”حمید صاحب، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ کون ہیں اور آپ کا خاندانی پس منظر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں مختار کے والدین سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ میں اور ان لوگوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“

”ہے نا۔“ حمید الزماں مسکرا دیا۔ ”جی جناب، اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مختار اور فیروز کے درمیان بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔“ ”وہ کیا...؟“ ”سامنے کی بات ہے۔“ قیصر نے کہا۔ ”مختار کا تعلق ایک اوسط بلکہ غریب خاندان سے ہے اسی لیے اس لڑکے میں آگے بڑھنے کا جوش اور ولولہ ہے۔ وہ اپنی ذہانت سے تعلیم کے سارے مراحل طے کرتا جا رہا ہے جب کہ فیروز کو اپنے حسبِ نسب پر فخر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ اس کی تعلیمی رپورٹ بھی بہت کمزور ہے۔ اس نے اپنی موجودہ حیثیت کو اپنی منزل سمجھ لیا ہے اور سیکل سے اس میں وہ خرابیاں پیدا ہونا شروع ہو گئیں۔۔۔ جو آج دکھائی دیتی ہیں۔ اسی لیے میں اس اپنی سلسلے میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ میرے لیے مختار، فیروز سے لاکھ گنا بہتر ہے۔“ حمید الزماں نے اپنی گردن جھکا لی۔ انہیں اندازہ تھا کہ قیصر جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ اس نے غم زدہ نگاہوں سے فیروز کی طرف دیکھا۔ وہ بھی قیصر کی بات سن کر خاموش ہو گیا تھا۔

”حمید الزماں صاحب معاف کیجیے گا میری باتوں سے آپ کو تکلیف پہنچی۔“ قیصر نے کہا۔ ”میں آپ کو ایک مستند ایک قول سنانا چاہتا ہوں۔ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ خرابی کہاں ہے۔“ ”ہاں سناؤ۔“ حمید الزماں نے دھیرے سے کہا۔ ”وہ قول یہ ہے کہ جس کی رفتار کو اس کی بے مکی نے ست کر دیا ہو۔ تب اس کی رفتار تیز نہیں کر سکتا۔“

آپ کو انکار نہیں کر سکیں گے۔ آپ چلے جائیں ان کے پاس۔“ ”زندگی بھر وہ آدمی میرے پاس آتا رہا ہے اور اب تم مجھے اس کے پاس بھیج رہے ہو؟“ ”یہ رشتے کا معاملہ ہے ڈیڈ اسی لیے کہہ رہا ہوں۔“ ”ٹھیک ہے میں چلا جاؤں گا لیکن تم اس کو پہلے اطلاع کر دینا۔“ ”ظاہر ہے میں ابھی کہہ دیتا ہوں ان سے۔ میں ان کا نمبر بھی لے آیا ہوں۔“ فیروز نے اسی وقت اپنے موبائل سے قیصر کے گھر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے قیصر ہی نے فون اٹھایا۔ ”ہیلو انگل، میں فیروز بول رہا ہوں۔ حمید الزماں کا بیٹا۔“ ”ہاں بیٹا پہچان گیا، ہو کیا بات ہے؟“ ”انگل، ڈیڈ آپ کے گھر آنا چاہتے ہیں۔“ ”میرے گھر۔۔۔۔۔ دوسری طرف خاموشی چھا گئی پھر قیصر کی آواز آئی۔ ”ان سے کہو کہ انہیں تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔“ ”نہیں انگل ان کی خوشی اسی میں ہے کہ وہ خود آئیں۔“ ”ٹھیک ہے تو کل شام کی چائے پر ان کا انتظار رہے گا۔“ فیروز نے سلسلہ ختم کر کے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ ”ڈیڈ وہ بے چارے تو آپ سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔“ ”کیوں نہ ہوں۔“ حمید الزماں نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ شخص ہمارے پورے خاندان سے واقف ہے۔ یہ اس کے لیے اعزاز کی بات ہوگی کہ میں اس کے گھر جا رہا ہوں اور رشتے کا سن کر تو اس کے ہوش اڑ جائیں گے۔“ ”میں جانتا ہوں ڈیڈ۔ وہ بے چارہ میرا کیا مقابلہ کرے گا۔“ ”کس بے چارے کی بات کر رہے ہو؟“ ”ڈیڈ وہ جو میرا دوست ہے نا مختار، وہ بھی اس لڑکی کا امیدوار ہے۔“ ”کون۔۔۔۔۔ تمہارا دوست، اس بچے کی اولاد؟“ حمید الزماں نے پوچھا۔ ”جی ڈیڈ، میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔“

”جون! تمہیں اپنا کام جانے میں کچھ وقت تو لگے گا لیکن اس طرح تمہیں اپنی محنت کا درست معاوضہ مل سکے گا۔“

انگل میٹر ٹھیک کہہ رہے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اپنا کام شروع کرنے کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی اور وہ میرے پاس نہیں تھا۔ میں صرف بارہ سال کا تھا جب انگل میٹر کی تحویل میں آگیا۔ میرے ماما اور پاپا ایک انٹرکیش میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ انگل میٹر میرے ابو کے انگل کے بیٹے تھے، اس طرح ان کا رشتہ سینئر کزن والا بننا تھا۔ ماما کی طرف سے کئی فرسٹ کزن موجود تھے لیکن کسی نے میرا سرپرست بننا قبول نہیں کیا۔ انگل میٹر نے عدالت میں درخواست دی اور میرے سرپرست بن گئے۔ وہ اکیلے رہتے تھے اور بعد میں بھی انہوں نے شادی کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے شادی کیوں نہیں کی، اس بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم تھا لیکن ایک بار ان کے رشتے کا ایک بھائی ملے آیا تو اس نے چپکے سے مجھے بتایا کہ جوانی میں انگل میٹر کسی سے محبت کر چکے تھے۔ لڑکی نے ان سے بے وفائی کی، بس اسی کا روگ دل سے لگے بیٹھے تھے اور اس کے بعد انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ میڈیسن پولیس میں آفیسر تھے آخری دس سال انہوں نے جاسوس کے طور پر کام کیا۔ انگل میٹر لیے چوڑے لیکن بہت نرم طبیعت کے آدمی تھے۔ دفتر کا تو مجھے نہیں معلوم لیکن گھر میں وہ بہت خوش مزاج اور پیارے پٹن آنے والے انسان تھے۔ مجھے نہیں یاد کہ انہوں نے بھی مجھ سے سخت لہجے میں بات کی ہو۔ جب میں ان کے پاس آیا تو وہ پچاس برس کے تھے اور جس سال میں نے ڈپلوما مکمل کیا، اس سال وہ ریٹائر ہو گئے تھے۔ اگرچہ انہوں نے ملازمت کا سارا وقت امریکا کی ریاست میڈیسن میں گزارا تھا لیکن ان کا آبائی تعلق ایک چھوٹے سے گاؤں میری ٹاؤن سے تھا۔ یہ مای گیروں کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ ہے جو جھیل میں پھیلیاں پکڑے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انگل میری ٹاؤن منتقل ہو گئے۔ میں ان دنوں ایک نزدیکی شہر میں ڈپلوما کر رہا تھا۔ ڈپلوما مکمل کرنے کے بعد مجھے میڈیسن میں ہی ملازمت مل گئی اور میں نے وہیں رہائش اختیار کر لی۔ میری ٹاؤن یہاں سے کوئی ڈیڑھ سو کلومیٹر کی مسافت پر تھا۔ میں مبینے میں ایک دو بار میری ٹاؤن کا چکر لگایا اور یوں انگل سے ملاقات ہو جاتی۔ انگل میڈیسن نہیں آتے تھے حالانکہ انہوں نے یہاں اپنی عمر کے پینتیس برس گزارے تھے اور یہاں ان کے بے شمار دوست اور جاننے والے تھے۔ وہ ان سب سے خط اور فون کے ذریعے رابطہ رکھتے

تھے مگر خود نہیں آتے تھے۔

تین سال بعد میں نے میک فرنیچر چھوڑ دیا۔ مجھے ایک اور فرنیچر بنانے والی فرم میں جاب کی پیش کش تھی لیکن فی الحال میں نے اسے قبول نہیں کیا۔ انگل میٹر کو معلوم ہوا کہ میں نے جاب چھوڑ دی ہے تو انہوں نے مجھے کال کی۔ ”جون! میرے پاس آ جاؤ۔“

”انگل! میں دوسری جاب کے لیے سوچ رہا ہوں۔“

انگل میٹر نے ایک گوج دار تہید لگایا۔ ”میرے بیٹے! میری ٹاؤن میں سوچنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔“

یوں میں میری ٹاؤن کی طرف روانہ ہو گیا۔ ڈیڑھ سو کلومیٹر کا یہ سفر عام حالات میں دس سے ڈھائی گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے لیکن اس روز بہت شدید بارش ہو رہی تھی۔ اس وجہ سے ہائی وے پر رفتار سستی تھی اور جب پہاڑی علاقہ شروع ہوا تو میں رفتار مزید کم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہاں پہاڑ زیادہ اونچے نہیں ہیں لیکن حادثے کے لیے دو ڈھانچے فٹ کی کھائی کافی ہوتی ہے۔ دو گھنٹے میں، میں نے یہ مشکل سا ڈھانچہ کلو میٹر کا فاصلہ طے کیا تھا۔ اس سے پہلے میں نے شہر سے باہر اس قسم کے موسم میں سفر نہیں کیا تھا اس لیے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایسے موسم میں ہائی وے پر سفر کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ تین گھنٹے بعد مجھے ہائی وے کے ساتھ ایک سروس اسٹیشن اور کینے دکھائی دیا۔ میں نے فوراً گاڑی اس طرف موڑ دی۔ اگرچہ اگست کا مہینہ تھا لیکن مسلسل بارش سے موسم سرد ہو چلا تھا۔ میں کینے میں آیا جہاں مجھ جیسے چند افراد موجود تھے جو بارش سے تنگ آ کر یہاں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ کافی ہنگوانے کے بعد میں نے وقت گزاری کے لیے اخبار اٹھا لیا اور اس میں اشتہارات والا صفحہ دیکھنے لگا۔ ایک اشتہار نے میری توجہ مبذول کرائی۔

”ایک کارپینٹر ورکشاپ کی فروخت کا اشتہار تھا۔ ورکشاپ پچیسل مشین گرا، کے ساتھ تھی اور جو پتا دیا ہوا تھا، میرے حساب سے وہ میری ٹاؤن سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ورکشاپ میں تمام مشینیں اور اوزار بہترین حالت میں تھے اور مالک اس کے صرف بیچیں ہزار ڈالرز مانگ رہا تھا۔ ورکشاپ کے ساتھ ایک کمرے کا چھوٹا سا مکان بھی اس قیمت میں شامل تھا۔ فون نمبر نہیں دیا تھا، صرف پتا تھا۔ ایک جملہ ہائی لائٹ کیا گیا تھا۔۔۔۔۔ قیمت نقد لی جائے گی۔“

دو گھنٹے بعد بارش ہلکی ہوئے گی اور مغرب کی طرف سے بادل چھٹنے لگے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور روانہ ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد میں انگل میٹر کے چھوٹے سے لیکن خوب

صورت اور بچے سجائے گھر میں موجود تھا۔ یہاں سردی کی شدت زیادہ تھی اور انکل نے آتش دان جلا لیا تھا۔ آتش دان کے سامنے انہوں نے میز پر براعزلی کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ اس میں سے آدھی بوتل ہم دونوں پی چکے تھے۔ انکل معمول سے زیادہ موڈ میں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے وقت گزاری اور کچھ اضافی کمائی کے لیے ایک مقامی دوست کے ساتھ شراکت کر لی ہے۔ وہ اپنے ٹرالر کے ذریعے تعمیراتی اور فرنیچر سازی میں کام آنے والی لکڑی کینیڈا سے امریکا لاتا ہے۔ اس کام میں اچھا نفع ہے کیونکہ کینیڈا سے لکڑی سستی مل جاتی ہے اور امریکا میں اس کی مانگ زیادہ ہے اس لیے یہاں قیمت اچھی ملتی ہے۔

”یوں سمجھ لو کہ اسے ایک ٹرپ میں کوئی تین ہزار ڈالر بیع جاتے ہیں اور۔۔۔ وہ سال میں ایسے سات آٹھ ٹرپ لگاتا ہے۔“

”یہ تو اچھا بزنس ہے۔“ میں نے دلچسپی سے کہا۔

”آپ نے کتنے فیصدی شراکت لی ہے؟“

”میں نے ایک تہائی بزنس لیا ہے۔ اس لحاظ سے نفع کا تناسب بھی ایک تہائی ہے۔ جب سے میں شامل ہوا ہوں، دو ٹرپ ہو چکے ہیں اور مجھے کوئی گیارہ ہزار ڈالرز کا نفع ہوا ہے۔ یہ بُرا نہیں ہے۔“

انگل کی بات پر مجھے خیال آیا اور میں نے انکل کو فروخت ہونے والی ورکشاپ کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے کہا۔ ”میں تو تمہیں اب سے کہہ رہا ہوں کہ اپنا کام شروع کرنے کے بارے میں سوچو۔ ملازمت میں تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔“

”انگل! اس مشورے کو قبول کرنے میں دو رکاوٹیں تھیں۔ ایک تو مجھے بزنس کا علم نہیں تھا، دوسرے میرے پاس رقم نہیں تھی۔ اب مجھے بتایا ہے کہ بزنس کس طرح کیا جاتا ہے اور اب میرے پاس کچھ رقم بھی ہے۔ پھر مجھے بینک سے قرض بھی لی سکتا ہے۔“

”رقم کا مسئلہ نہیں تھا، میں بھی تمہیں سرمایہ فراہم کر سکتا ہوں لیکن یہ اچھی بات ہے کہ تمہیں بزنس کرنا آ گیا ہے۔ اگر تم ورکشاپ لے لو تو اپنا کام شروع کر سکتے ہو۔ یہاں تمہیں لکڑی شہر کے مقابلے میں آدھی قیمت مل جائے گی بلکہ میں تمہیں اس سے بھی سستی اور بہتر لکڑی مہیا کر دوں گا۔ جہاں تک فروخت کا تعلق ہے، میرا مشورہ ہے کہ تم براہ راست انٹرنیٹ کے ذریعے کاروبار کرو۔ آج کل اس کا رجحان بہت زیادہ ہے۔“

”فکرو۔۔۔ یہ جیسے ہی یہ باتیں دیکھی ہیں۔ میں ہمارے ورکشاپ کے لیے لکڑی۔۔۔“

میں نے بالکل سنا لیا تھا، اگلے روز صبح میں اپنی داڑھی کھائی اور لہلہے۔ ”نہیں! یہاں کے ٹاؤن کے شمال میں کہیں ہے۔“

”میرے پاس ہر موسم میں پتلے والی فور وٹیل ڈرائیو ہے۔“

”نہیں، اتنی جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم اس طرح امیر بنیں گے تو وہ سمجھ جائے گا کہ ہم زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں مجبورہ قیمت میں کی نہیں کرے گا۔“

انگل میٹر نے۔۔۔ ”برخوردار۔۔۔ لگتا ہے تمہیں واقعی بزنس کرنا آ گیا ہے۔“

اس کے بعد انکل نے موضوع بدل دیا۔ ”تم نے شادی کے بارے میں سوچا؟ جہاں تک مجھے علم ہے فریڈ خاندان میں کسی بھی نوجوان کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہے۔ فریڈ خاندان کو اگلی نسل کی ضرورت ہے۔“

میں مسکرایا۔ ”انکل! آپ نے بھی تو فریڈ خاندان کو اگلی نسل نہیں دی؟“

انہوں نے تسلیم کیا۔ ”ہاں، اس معاملے میں مجھ سے کوتاہی ہوئی۔ اصل میں مجھ میں حوصلہ نہیں تھا کہ کسی عورت کو ہر وقت سولی پر لٹا کر رکھوں۔ پولیس والے کی بیوی ہونا ہر عورت کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے میں نے شادی نہیں کی۔“

”لیکن میں آپ کے جتنے دوستوں اور ساتھیوں کو جانتا ہوں، وہ سب شادی شدہ ہیں۔“

”ہاں لیکن ان کی بیویاں کتنی خوف زدہ رہتی تھیں، یہ بھی میں جانتا ہوں۔ ان میں سے کئی نفسیاتی مریض ہو گئی تھیں اور کئی نے تو اپنے شوہروں سے طلاق لے لی تھی۔“

انگل میٹر نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”خیر چھوڑو، یہاں میری ٹاؤن میں بہت سی خوب صورت لڑکیاں ہیں۔ تم ان سے ملو، ممکن ہے کسی سے تمہارا معاملہ ہیٹ ہو جائے۔“

”فی الحال تو میں اپنا بزنس ہیٹ کرنا چاہوں گا۔ اگر یہ ورکشاپ مل جاتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ میرے پاس ایک بہتر جاب کی آفر موجود ہے۔“

”ورکشاپ مل جائے گی۔“ انگل میٹر نے یقین سے کہا۔ ”اور نہ بھی ملے تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بیچیں ہزار میں تم خود بہتر بن ورکشاپ بنا سکتے ہو۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بچیں ہزار میں صرف مشینیں اور اوزار آئیں گے۔ مجھے جگہ بھی ملنی پڑے گی اور اسے بنانا بھی پڑے گا۔ یوں سمجھ لیں کہ رزم ڈھل ہو جائے گی جبکہ یہاں بنی بنائی ورکشاپ ہے اور اس کے ساتھ رہائشی کمرہ بھی ہے۔“

”چلو پہلے دیکھ لیتے ہیں۔“ انگل میز نے کہا۔ ”ورنہ جگہ یہاں ہے اور رہائشی کے لیے میرا مکان موجود ہے۔“ انگل کا مکان بھیل کے ساتھ ہی تھا اور ایک تختہ بھیل کے پانیوں کے اندر تنک گیا ہوا تھاں پر کوئی کشتی لنگر انداز ہو سکتی تھی اور اسے خشک یا ڈائیونگ کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اگلے روز بھی موسم سرد تھا اور بھیل کا پانی تو شدید گرمی میں بھی سرد رہتا ہے لیکن اس میں تیراکی کا پناہ گاہ ہے۔ میں جب یہاں آتا تھا تو تیراکی ضرور کرتا تھا۔ ابھی انگل سو رہے تھے۔ میں تنک پہن کر باہر آیا اور اوتار تختے سے بھیل میں چلا گیا۔ لگاؤ۔ پانی سرد تھا اور جسم پر ایک لمبے کوکرنٹ کی طرح لگا تھا لیکن جب کچھ دیر گزری تو مزہ آنے لگا۔ میں بھیل میں آگے کی طرف جانے لگا۔ اس پورے ساحل پر چھوٹے چھوٹے مکانات بنے ہوئے تھے جن کے ساتھ ڈاک بھی تھے اور تختے بھی۔ کئی مکانات کے سامنے کشتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کوئی سوکر آگے نکل کر میں واپس آ رہا تھا کہ انگل میز کے برابر والے مکان سے ایک نوجوان لڑکی نکلی۔ اس نے تیراکی کا لباس پہن رکھا تھا جس میں اس کا سڈول جسم نمایاں تھا۔ اس نے ذرا دوڑ کر چلا نکلتی لڑکی اور پانی میں گری۔ ایک طویل غوطہ کڑھ پانی سے برآمد ہوئی تو مجھ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔

”ہیلو۔“ میں نے جواب دیا۔
”میں انگل میز کے گھر کی طرف جا رہا تھا، وہ سمجھ گئی۔“
”تم شاید انگل میز کے بھتیجے ہو؟“
”درست۔۔۔۔۔ میرا نام جون فریڈ ہے۔“ میں نے کہا۔
”شون کارلینڈ۔“ اس نے پانی میں میری طرف ہاتھ بڑھایا جو میں نے گرم جوش سے تمام لیا۔
”تم سب ل کر خوش ہوئی۔ تم یہاں رہتی ہو؟“
اس نے سر ہلایا۔ ”میں اسٹیٹ یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہوں، ان دنوں چھٹیاں گزارنے ماما کے پاس آئی ہوں۔“
”میں فرنیچر ڈیزائنر ہوں اور ان دنوں فارغ ہوں لیے۔“

اس لیے انگل کے پاس چلا آیا۔
”انگل میز نے تمہارے بارے میں بتایا ہے۔“
کچھ دیر میں ہم پرانے دوستوں کی طرح بے تکلف ہو گئے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں یہاں ایک ورکشاپ دیکھنے جاؤں گا جو میری ٹاؤن کے پاس ہے۔ جگہ پوچھنے پر میں نے بتا دیا تو وہ چونک گئی۔ ”میرا خیال ہے کہ میں نے یہ جگہ دیکھی ہے۔ یہ بھیل کے ایک چنگ پوائنٹ کی طرف جانے والے راستے پر واقع ہے۔“
”یہ تو ابھی بات ہے کیونکہ انگل میز کو بھی اس جگہ کے بارے میں درست پتا نہیں ہے۔ اگر تم ہماری راہنمائی کر سکو تو۔۔۔۔۔“

”میں چلوں گی۔“ اس نے کہا اور اسی لمحے بارش کا آغاز ہو گیا۔ بارش کا پانی اتنا تیز تھا کہ بھیل کا پانی اس کے مقابلے میں گرم محسوس ہونے لگا تھا۔ شون نے مجھے خدا حافظ کہہ کر اپنے مکان کا رخ کیا تو مجبوراً میں بھی واپس ہو گیا۔ جب اندر پہنچا تو انگل میز ناشتا تیار کر رہے تھے۔ انہوں نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ ”کیسی لگی لڑکی؟“
”جھپٹ گیا۔“ آپ دیکھ رہے تھے؟“
”ہاں تو اس میں کوئی خاص بات ہے؟ تم دونوں کی ملاقات اتفاقاً ہوئی؟“
”شون اچھی لڑکی ہے اور اس سے بھی اچھی بات یہ ہے کہ اس نے ورکشاپ دیکھی ہے۔“
”وہ یہاں گھومتی پھرتی رہتی ہے۔“ انگل میز نے فرانگ بین میں انڈا ڈالا اور بولے۔ ”جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ، ناشتا بس تیار ہے۔“
میں کپڑے پہن کر آیا اور ناشتا کیا۔ انگل شروع سے کھانا بنانے کے ماہر ہیں اور وہ ہر دھن اچھی بناتے ہیں کہ چاہیں تو کسی ریستوران میں شیف بھی بن سکتے تھے۔ اس سارا دن بھی بارش ہوئی رہی لیکن شام کو بادل چھٹ گئے۔ رات کے کھانے کے بعد انگل میز نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کل چلتے ہیں ورکشاپ دیکھنے۔“
میں بھی اب ورکشاپ دیکھ لیتا جا رہا تھا۔ ”اگر پرنڈ آگئی تو میں بھانڈے کے ربات بک کر لوں گا۔“
”اتنی جلدی کی ضرورت نہیں ہے برخواستہ۔“ وہ بولے۔ ”اس قسم کے معاملات میں آدمی کو سوچ کچھ کر لینا کرنا چاہیے۔“
”آپ شون سے بات کر لیجیے گا ساتھ چلے کے لیے۔“

”میرا خیال ہے تم بات کر لو کیونکہ وہ تمہیں پہلے ہی رضامندی دے چکی ہے۔“ انگل کا لہجہ مستی خیز ہو گیا۔ میں جھپٹ گیا۔ اگلے دن بحریہ اور تیز دھوپ لگی ہوئی تھی۔ میں تیراکی کے لیے بھیل کی طرف آیا تو شون بھی موجود تھی۔ اس ملاقات میں ہمارے درمیان بے تکلف مزید بڑھ گئی۔ میں نے اسے بتایا کہ میری کوئی کرل فرینڈ نہیں ہے۔ یہی زمانے میں ایک دولڑکیوں سے دوستی رہی تھی لیکن یہ ایک حد سے آگے نہیں گئی تھی۔ شون نے صاف کوئی سے بتایا کہ چند مہینے پہلے تک اس کی ایک لڑکے سے دوستی تھی لیکن لڑکا غیبت استعمال کرنے لگا تھا اس لیے شون نے اس سے دوستی ختم کر دی۔ وہ سرخی مائل براؤن بالوں کی اور بہت نازک سے نقوش والی دل کش لڑکی تھی۔ مجھے تعجب ہوا کہ کسی اور نے اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ اس سے ملے ہو گیا کہ دوپہر کے وقت ہم ورکشاپ دیکھنے جا سکیں گے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ دو بجے تیار ملے گی۔
دو بجے ہم انگل کی سنگل کیمین فور جیل ڈرائیو میں روانہ ہوئے۔ ڈرائیونگ انگل کر رہے تھے اور میں فرنٹ سیٹ پر تھا۔ درمیان میں شون بیٹھی تھی۔ اس نے جینز اور اس کے ساتھ بنیان نمائی شرٹ پہن رکھی تھی اور اس لباس میں بھی اچھی لگ رہی تھی۔ اتفاق سے میں نے دونوں پارے تیراکی کے لباس میں دیکھا تھا۔ پہلی بار اسے مکمل لباس میں دیکھ رہا تھا۔ انگل دوران سفر ہمیں قصے سناتے رہے اور لطیفوں سے ہنساتے رہے۔ ان کے ساتھ رہ کر آدمی پور نہیں ہوسکتا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد شون نے ایک ذیلی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ ورکشاپ اس راستے پر آتی ہے۔ ایک بار میں اور میری یونیورسٹی فرینڈز یہاں چنگ منانے آئے تھے، تب میں نے ورکشاپ دیکھی تھی۔ مجھے یاد ہے، اس پر گولڈی کا چپٹر شاپ کا بورڈ لگا تھا۔“
اشتبہار میں ورکشاپ کا نام ہی تھا اور اس کا مالک کوئی سین گولڈی تھا۔ انگل نے پک آپ اس راستے پر موڑ دی۔ ”ابھی دیکھ لیتے ہیں۔“
راستہ کچا لیکن اچھی حالت میں تھا۔ چونکہ یہ آس پاس کے جنگل سے اونچا تھا اس لیے اس پر بارش کا پانی جمع نہیں ہوا تھا اور سوائے ٹائروں کے نشانات کے اس پر گھاس اکی ہوئی تھی۔ یعنی یہاں گاڑیوں کی آمد و رفت بہت زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ ہم کوئی ایک کلومیٹر اندر گئے ہوں گے کہ بائیں جانب خاردار تاروں میں گھرا ایک احاطہ نظر آیا۔ احاطے کے داخلی دروازے پر گولڈی کا چپٹر شاپ کا بورڈ لگا تھا۔ شون کی

حق تلفی

انگلستان میں ایک نئی بیویہ نے بھیر مینی میں جا کر اپنے شوہر کے بیٹے کی رقم طلب کی۔ فیئر نے اخلافا کہا کہ ”تم مرنے والے ہو“ آپ کے شوہر کی موت کا دلی صدمہ ہے۔“ ابھی وہ یہ کہتے ہی پایا تھا کہ وہ خاتون چھٹ ہوئی۔
”ہاں، بیوی تو تم مردوں کا قاعدہ ہے، جہاں عورتوں کو کوئی فائدہ ہونے لگا۔۔۔ انہیں اس کا صدمہ ہونے لگتا ہے۔“

راجیلا انعام۔۔۔ منڈی بہاؤ الدین

سلاسل

مجھے یہاں ایک شادی میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ بڑی پر تکلف عورت کا اہتمام کیا گیا تھا تاہم میں نے دیکھا کہ کھانے سے قبل لوگ ایک ایک کر کے دولہا کے پاس جاتے تھے اور اسے کچھ روئے پیش کرتے تھے۔ دولہا کے ساتھ ایک شخص بیٹھا تھا جو رقم گنتا اور ایک کاپی میں درج کرتا چلا جاتا۔ مجھے یہ رسم بہت اچھی لگی کہ ہر کوئی اپنے کھانے کا بل خود ادا کرتا ہے۔ ہمارے ہاں اسے ”ڈچ سسٹم“ کہا جاتا ہے جبکہ یہاں کے لوگ اسے ”مسائی“ کہتے ہیں۔
انتخاب، کلپل غلطی، اسلام آباد

بات درست ثابت ہوئی تھی۔ انگل نے پک آپ احاطے کی طرف گھمادی۔ گیٹ کے دونوں پت کھلے تھے اور کوئی انتہائی یورڈ نہیں تھا اس لیے ہم بلا تکلف اندر چلے آئے۔ انگل نے احتیاطاً ہارن دے دیا اور ہم نیچے اتر آئے۔ احاطے میں ایک طرف شیف تلے لکڑی کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور یہ سب اعلیٰ درجے کی لکڑی تھی جس سے بہترین فرنیچر بنایا جا سکتا تھا۔ ورکشاپ کی عمارت لمبی اور مستطیل شکل کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کیمین تھا۔ ہارن کی آواز پر ایک نوجوان شخص ورکشاپ سے نمودار ہوا اور اس نے سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ اس کی عمر پچیس چھیس سال تھی، جسم چھریر اور نقوش سے بھرتے ہوئے تھے۔ اس نے کام کا لباس پہن رکھا تھا۔ انگل میز آگے آئے۔
”ہم اخبار میں تمہارے اشتہار کے جواب میں آئے ہیں۔ کیا تم ہی سین گولڈی ہو؟“
اس نے سر ہلایا۔ ”اشتہار میں غلطی سے سین گولڈی

”مجبور کیا تھا، میرا اصل نام مارک گولڈی ہے۔“
 ”مارک اور مین۔“ اگل میٹر نے ہر خیال انداز میں کہا۔ ”دونوں میں خاص فرق ہے۔ پھر یہ غلطی کیسے ہوئی؟“
 مارک گولڈی نے شانے اچکائے۔ ”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”یہ ایک غمنی بات ہے۔“ میں نے مداخلت کی کیونکہ اگل میٹر اس سے مزید بحث کے موڈ میں نظر آرہے تھے۔
 ”اصل بات یہ ہے کہ ہم ورکشاپ دیکھنے آئے ہیں۔“
 ”تم لوگ شوق سے دیکھ سکتے ہو۔“ اس نے ورکشاپ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس میں کارپینٹر کے کام سے متعلق تقریباً ہر شے اور اوزار موجود ہیں۔“

مارک گولڈی ہمیں ورکشاپ میں لایا۔ یہ کوئی چالیس فٹ لمبا اور پچیس فٹ چوڑا کمرہ تھا جس میں لکڑی کو تراشنے، اسے ساخت دینے، کانٹے اور پائل کرنے والی مشینیں موجود تھیں۔ ایک طرف بہت بڑے ریک پر اوزار بیلٹے سے رکھا ہوا تھا۔ باہر سے ورکشاپ کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی لیکن اندر سے یہ بہت صاف تھی۔ نی الحال وہاں کوئی کام نہیں ہو رہا تھا اس لیے فرش بھی صاف سترا ہو رہا تھا لیکن وہاں آرا مشین نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو مارک نے کہا۔ ”وہ پیچھے لگی ہے کیونکہ وہ بلاوجہ بہت جگہ گھرتی ہے اور اس سے اتنا کام بھی نہیں ہوتا۔“
 میں مشینوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ ہر مشین کے ساتھ اس کا پاور کنکشن الگ تھا اور اس کے لیے مین سوچ سے الگ تار آ رہی تھی۔ تمام مشینیں بہترین اور چلنے والی حالت میں تھیں۔ میں نے مارک گولڈی سے اجازت لے کر ان مشینوں کو باری باری چیک کیا۔ شون میرے ساتھ تھی لیکن میں نے غور نہیں کیا کہ اگل میٹر ورکشاپ میں نہیں آئے تھے۔
 مشینوں سے فارغ ہو کر میں نے ٹول ریک کا معائنہ کیا۔ یہ تمام اعلیٰ درجے کے ٹولز تھے اور ہر ٹول کا ایک اضافی ٹول بھی تھا۔ مجھے ٹولز میں بھی کسی قسم کی کوئی کمی نظر نہیں آئی۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے ورکشاپ اور اس کا سامان بہت پسند آیا۔ یہ بہت اچھی پروڈیکشن ورکشاپ تھی۔ اندر کام کرنے کے لیے جگہ بھی مناسب تھی۔ اگرچہ ورکشاپ کا باہر والا حصہ کسی قدر خراب تھا لیکن میں اسے خود ٹھیک کر کے رنگ و روغن کر سکتا تھا۔ یہاں میں فریجر کے حصے تیار کر سکتا تھا اور انہیں جوڑنے اور مکمل کرنے کے لیے میں یہاں ایک ہال اور بنا سکتا تھا۔ اس احاطے میں خاصی جگہ تھی۔ میں نے مارک سے کہا۔
 ”ٹھیک ہے، میں نے ورکشاپ دیکھ لی ہے۔ کیا تم

مجھے آرا مشین دکھاؤ گے؟“

مارک گولڈی نے اشارہ کیا۔ ہم ورکشاپ کے عقبی حصے میں آئے جہاں کچھ آسان سائے ایک بڑی آرا مشین لگی ہوئی تھی۔ اس سے ہر سائز اور ہر قسم کی لکڑی کو ہر انداز میں کاٹا جا سکتا تھا۔ اس سے تختے اور لکڑی کی بلیاں بنائی جا سکتی تھیں۔ آرا مشین کی میز اور موٹر بہترین حالت میں تھی۔ کھلی جگہ ہونے کے باوجود اسے بہت اچھی طرح حفاظت سے رکھا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس پر کہیں رنگ کا معمولی سا دھبہ بھی نہیں تھا۔ جہاں ٹرنکس تھا، وہاں سے دھات چمک رہی تھی۔ کھلی جگہ کی زمین بھی لکڑی کی تھی۔ اس طرح رکھا گیا تھا کہ اس پر بارش کا پانی رکتا نہیں تھا۔ کل تک مسلسل بارش ہوتی رہی تھی لیکن زمین پر کہیں پانی نہیں کھڑا تھا۔ البتہ مٹی نمی تھی جس سے پتا چل رہا تھا کہ بارش ہوئی ہے۔ ایک طرف چھوٹا کنبین تھا۔ شون نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ تمہاری رہائش ہے؟“

”ہاں، یہ بھی ورکشاپ میں شامل ہے۔“ مارک نے کہا۔ ”میں نے غصے کیسے کیا کہ وہ بتا کہ جوش یا تاثر کے بالکل سپاٹ لے لیا۔ اس سے انداز میں بات کر رہا تھا۔ مین بہت اچھے انداز میں بنایا گیا تھا۔ اس میں ایک طرف کچن اور با تھ روم بھی تھا۔ رفع حاجت کے لیے ایک با تھ روم آرا مشین والے صحن میں بھی بنا ہوا تھا۔ مجھے اگل میٹر یہاں بھی نظر نہیں آئے۔ ہم واپس آئے تو اگل میٹر لکڑی والے شیڈ کی طرف سے آتے دکھائی دیے۔ انہیں دیکھ کر مارک کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ اس نے کسی قدر جلت میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم لوگوں نے ورکشاپ دیکھ لی ہے؟“

”ہاں، ہم نے دیکھ لی ہے۔“
 ”اگر تمہاری نسلی ہو گئی ہے تو میں تمہارا جواب جاننا چاہوں گا۔“ مارک نے مجھ سے کہا۔ میں نے جس انداز سے مشینیں اور ٹولز دیکھے تھے، وہ مجھ کی تھکا کہ میں ورکشاپ میں لینا چاہ رہا ہوں۔

”میں اتنی جلدی تو جواب نہیں دے سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”وہی قیمت زیادہ ہے، میں میں ہزار سے اوپر نہیں دے سکتا۔“
 ”قیمت بالکل مناسب ہے۔“ اس نے اصرار کیا۔
 ”یہ تو صرف ٹولز اور مشینوں کی قیمت ہے۔ اس کے ساتھ تمہیں پوری ورکشاپ اور ایک عدد مکان بھی مل رہا ہے۔ شیڈ میں تقریباً ستر کیوبک میٹر لکڑی ہے۔ اس کی قیمت بھی اچھی خاصی بنتی ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا لیکن اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، میں غور کروں گا۔ اگر مجھے مناسب لگا تو پھر میں یہ ورکشاپ تم سے خرید لوں گا۔“
 ”جیسی تمہاری مرضی۔“ اس نے شانے اچکائے۔
 ”لیکن قیمت اس سے کم نہیں ہوگی۔“

اگل میٹر ہمارے پاس آگئے۔ انہوں نے مارک گولڈی سے کہا۔ ”برخوردار یہ احاطہ کہاں تک ورکشاپ کی ملکیت ہے؟“
 ”جہاں تک خاردار تاریکی ہے۔“ اس نے ناگواری سے کہا۔ ”میرا نام مارک ہے۔“

”ٹھیک ہے مارک۔“ اگل میٹر نے اس کی بات پر کوئی تاثر دینے پر تیار نہیں کیا۔ ”اس ورکشاپ کو تم چلاتے رہے ہو؟“
 مارک کا چہرہ گڑبگڑا۔ ”ظاہر ہے اگر میں نہیں چلا رہا تو پھر کون چلاتا رہا ہے؟“

اگل میٹر نے اس بار بھی متاثر ہوئے بغیر کہا۔ ”تم غصے میں آ رہے ہو۔ میں کاروباری نقطہ نظر سے پوچھ رہا ہوں۔ جب تمہارے پاس ہر چیز موجود ہے تو یقیناً برتن بھی ہوگا؟“
 اگل میٹر کی بات پر اس کے تاثرات درست ہو گئے اور اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہاں، اس ورکشاپ سے بہت سارے لوگ اور کنبیاں چیزیں بنواتے ہیں۔“
 ”ان لوگوں کا ٹیکس بھی ہمیں چاہیے۔“

مارک نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرے پاس کوئی کاشیک نمبر نہیں ہے۔ جسے کام کرتا ہوتا ہے وہ خود رابطہ کرتا ہے۔“

اگل میٹر نے جرح جاری رکھی۔ ”ورکشاپ کی حالت سے لگ رہا ہے یہاں کئی دنوں یا ہفتے سے کوئی کام نہیں ہوا ہے؟“

مارک کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ اسے یہ پوچھ گچھ بالکل پسند نہیں آ رہی ہے۔ وہ مجبوراً جواب دے رہا تھا۔ ”ہاں کیونکہ میں نے اسے فروخت کرنا ہے۔ اس لیے میں نے کوئی کام لینے سے منع کر دیا ہے۔“

”وہی ہے جگہ کچھ زیادہ ہی دور نہیں ہے؟“ اگل میٹر نے کہا وہ یہ غور مارک کا جائزہ لے رہے تھے۔ ”یہاں سے نزدیک ترین آبادی بھی چند ہفتے کی دورانیہ پر ہے۔“
 ”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ مارک بولا۔
 ”جنہوں نے کام لینا ہوتا ہے، وہ یہاں آتے ہیں اور میں سکون سے بغیر کسی مداخلت کے کام کرتا ہوں۔ آبادی میں

لوگ آرا مشین کے شور پر اعتراض کرتے ہیں۔“
 اس کا جواب درست تھا۔ کارپینٹر شاپ کی اکثر مشینیں بہت شور مچاتی ہیں اور اگر ان کے آس پاس کوئی گھر ہو تو اس میں رہنے والے اعتراض کر سکتے ہیں۔ یہاں نہ تو آبادی تھی اور نہ ہی مستقبل میں آبادی کا کوئی امکان تھا اس لیے یہ کام کے لیے آئیڈیل جگہ تھی۔ خاردار تاریکیوں میں گھری جگہ کوئی چوتھائی میٹر یا ڈھائی ہزار گز پر تھی اور کسی آبادی میں اتنی بڑی جگہ خاصی تنگی پڑ جاتی۔ میں نے مارک سے پوچھا۔
 ”تمہارے پاس زمین اور ورکشاپ کے کاغذات ہیں؟“

”زمین میرے اگل نے لی تھی۔ ان کے مرنے کے بعد یہ جگہ مجھے مل گئی لیکن میں نے زمین اپنے نام پر نہیں کرائی ہے۔ ورکشاپ کے کاغذات نہیں ہیں۔ میں تمہارے ساتھ سیل انگریجمنٹ سائن کروں گا اور ملکیت تمہیں منتقل کر دوں گا۔“ اس نے اس بار بھی دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں تمہیں مطلع کر دوں گا۔ تمہارا کوئی نمبر ہے؟“
 ”نہیں، یہاں فون لائن نہیں ہے اور میں موبائل نہیں رکھتا۔“

مجھے تعجب ہوا۔ ”تب تمہارے گاہک تم سے کس طرح رابطہ کرتے تھے؟“
 ”خود یہاں آ کر۔“

آج کے دور میں کوئی شخص بغیر رابطے کے نہیں رہ سکتا، وہ اس دیرانے میں رہ رہا تھا اور کام بھی کر رہا تھا۔ بہر حال، یہ اس کا ذاتی مسئلہ تھا۔ ہم اگل میٹر کی ایک آپ میں سوار ہوئے اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ مارک گولڈی ورکشاپ کے سامنے کھڑا ہمیں جاتے دیکھ رہا تھا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے اگل میٹر کچھ سوچ رہے تھے۔ جیسے ہی ہم احاطے سے باہر آئے، اگل میٹر نے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”جون! یہ شخص گڑبڑ ہے۔“

مجھے ان سے اتفاق نہیں تھا۔ ”مجھے تو اس میں کوئی گڑبڑ نظر نہیں آئی اور ورکشاپ بھی بالکل ٹھیک ہے بلکہ اسے ون کنڈیشن میں ہے۔“

”میں ورکشاپ کی نہیں، اس شخص کی بات کر رہا ہوں جو اپنا نام مارک گولڈی بتاتا ہے۔“
 اس بار شون نے سوال کیا۔ ”اگل! کیا یہ مارک گولڈی نہیں ہے؟“
 ”آپ کو اس کے بارے میں شہ ہے؟“ میں نے

”ہاں، مجھے شہر ہے۔“ انگل صاف گوئی سے بولے۔
 ”یہ خود کو جوتابہر کر رہا ہے، وہ نہیں ہے۔“
 ”آپ کا مطلب ہے یہ مارک گولڈی نہیں ہے؟“
 ”نہیں، ممکن ہے یہ مارک گولڈی ہو لیکن یہ کارپینٹر
 نہیں ہے اور میرا اندازہ ہے کہ یہ ورکشاپ بھی اس کا نہیں
 ہے۔“

”آپ کے اس اندازے کی وجہ؟“ میں نے کسی قدر
 جارحانہ انداز میں پوچھا۔

”ایک تو اس کے ہاتھ۔“ انگل میسر نے کہا۔ ”میں
 نے کسی کارپینٹر کے ہاتھ اتنے صاف ستھرے اور نازک نہیں
 دیکھے۔ اس کے شانے بھی کمزور سے ہیں جبکہ بھاری لکڑی کو
 اٹھانے رکھنے والے کے شانے لازمی مضبوط ہونے
 چاہئیں۔“

”میں نے غور نہیں کیا۔“ میں نے اعتراف کیا۔
 ”کیونکہ تم نے غور کرنے کی تربیت حاصل نہیں کی
 ہے۔“ انگل میسر بولے۔ ”دوسرے وہ ورکشاپ کے بارے
 میں بہت لاطعلقی سے بات کر رہا تھا جیسے یہ اس کی ملکیت نہ
 ہو۔ آدمی بھی اپنی ملکیت کے بارے میں اتنی لاطعلقی سے
 بات نہیں کرتا۔“

”انگل میسر ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ شون نے انگل کی
 تائید کی۔ ”یہ بات میں نے بھی محسوس کی ہے۔“
 یہ بات میں نے بھی محسوس کی تھی لیکن میں اتنی آسانی
 سے مارک گولڈی پر شک کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جب
 وہ فروخت کی کارروائی کرتا تو لازمی بات ہے اپنی شناخت
 کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور دکھاتا۔ اس کا مطلب ہے وہ فراڈ
 نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی باتوں میں بس ایک چیز مجھے مشکلی تھی
 کہ اس کے پاس کوئی رابطے کا ذریعہ نہیں تھا۔ میں نے کہا۔
 ”انگل! امیر اخیال ہے وہ کچھ عجیب ہے لیکن اس کا مطلب یہ
 نہیں ہے کہ اس پر شک کیا جائے۔“

”نہیں، شک کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ کچھ وجوہات
 میں تمہیں بتا چکا ہوں۔“

”اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 انگل نے سر ہلایا۔ ”میں لکڑی والے شیڈ کی طرف گیا
 تھا، اس طرف سے خاردار تاروں کا ایک حصہ کٹا ہوا اور اس
 میں باقاعدہ راستہ ہے۔ میں اس سے باہر نکلا تھا۔ تاروں
 سے کوئی دن قدم دور جھاڑیوں کے درمیان زمین کی تازہ
 کھدائی کی گئی ہے۔“

میں اور شون چوٹے۔ ”آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ زمین
 میں کھدائی کی گئی ہے؟“
 ”کھدی ہوئی زمین خود بتاتی ہے۔“ انگل نے کہا اور
 اس دوران میں ہم سڑک تک پہنچ گئے۔ انگل نے پک آپ
 مزید آگے بڑھانے کے بجائے ایک طرف روک لی۔
 ”خاص بات یہ تھی کہ اس کھدی زمین سے کچھ ہی دور مجھے
 ایک جوتا نظر آیا۔“

”ممکن ہے مارک نے وہاں زمین میں کچھ کچرا دیا ہو
 اور جوتا بھی اس کا ہو۔“ میں نے کہا۔

”جوتا مارک کا نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس کے جوتے کا
 ساڑد دیکھا ہے۔“ انگل میسر نے نفی میں سر ہلایا۔
 انگل میسر کا ہمیشہ سے یہ کہنا رہا ہے کہ وہ شرلاک ہومز
 ٹائپ نہیں ہیں اور جاسوسی کے لیے مردِ چتر طریقہ کار کی پیروی
 کرتے ہیں لیکن اس وقت وہ بالکل شرلاک ہومز کے انداز
 میں گفتیش کر رہے تھے، یعنی زبانی کلائی۔ اور اب بس جا
 کر مجرم کو پکڑنے کی کسب پاتی رہ گئی تھی۔ لیکن یہ تو شرلاک
 ہومز کا زمانہ ہے اور نہ ہی اس معاملے میں کہیں جرم نظر آ رہا
 تھا۔ میں نے کہا۔ ”انگل! ممکن ہے وہ جوتے کسی اور کا ہو لیکن
 اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟“

انگل میسر ہنسیاے۔ ”برخوردار! مجھے پولیس سے ریٹائر
 ہوئے خاصا عرصہ ہو گیا ہے اس لیے میں ہچکچا رہا ہوں۔ ورنہ
 یہ معاملہ بہت مشکوک لگ رہا ہے۔ آخر اس نے وہاں زمین
 کیوں کھودی ہے؟“

”یہ بات ہم اس سے پوچھ لیتے ہیں وہاں چل کر۔“
 انگل نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر وہ سچ مجرم ہوا تو پھر
 ہمیں بھی مارنے کی کوشش کرے گا اور میں یہ رسک نہیں لے
 سکتا۔ خاص طور سے جب شون ہمارے ساتھ ہے۔“
 شون کا رنگ بدلا ہوا تھا لیکن اس نے بہادری سے
 کہا۔ ”انگل! ہمیں چیک کرنا چاہیے۔“

”چیک کیسے کریں؟“ میں نے پوچھا۔
 ”زمین جہاں سے کھودی گئی ہے، ہم وہاں کھدائی
 کر کے دیکھ سکتے ہیں۔۔۔ خاموشی سے رات کے وقت جا
 کر۔“

پہلے انگل گفتیش کی پڑ گئی تھی اور اب شون بھی ان کے
 نقش قدم پر چلنا چاہ رہی تھی۔ میں نے گہری سانس لی۔
 ”انگل! آپ کو شبہ ہے کہ وہ مارک گولڈی نہیں ہے یا یہ
 ورکشاپ اس کا نہیں ہے تو اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔“
 ”کس سے؟“

”اس کے گاہکوں سے۔“

”اس کے گاہکوں کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے
 اور میں شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں کہ میری ٹاؤن میں بھی کوئی اس
 کے بارے میں نہیں جانتا ہوگا۔“

”اور اگر کوئی جان پہچان والا نکل آیا؟“
 ”تو میں ہار مان لوں گا۔“ انگل میسر نے فراخ دلی
 سے کہا۔

ہم میری ٹاؤن کی طرف روانہ ہو گئے۔ شون کو اس
 کے گھر پر اتار کر میں اور انگل میسر پہلی مارک گولڈی کے
 بارے میں کسی جاننے والے کی جستجو میں روانہ ہوئے۔ انگل
 نہایت مہارت سے اس کے بارے میں اپنے واقف کاروں
 سے معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن جیسے جیسے ہم
 لوگوں سے پوچھتے جا رہے تھے، انگل میسر کا خیال درست
 ثابت ہو رہا تھا۔ میری ٹاؤن میں کوئی مارک گولڈی کے
 بارے میں نہیں جانتا تھا۔ صرف ایک بوڑھے نے بتایا تھا کہ
 اس نے کوئی بیس سال پہلے گولڈی ورکشاپ سے کچھ کام کرایا
 تھا اور اس وقت وہاں اس کا ہم عمر کوئی آدمی کام کرتا تھا۔ وہ
 یقیناً مارک گولڈی کا نکل تھا۔ سب سے آخر میں انگل میسر نے
 شریف آفس کا رخ کیا۔ سابق پولیس افسر ہونے کی وجہ سے
 وہاں گرم جوشی سے ان کا استقبال ہوا۔ انگل نے آفس کے
 سب سے پرانے اور معلومات رکھنے والے افسر سے گولڈی
 ورکشاپ کے بارے میں معلوم کیا لیکن اسے یا شریف آفس
 میں کسی کو بھی اس بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں تھیں۔
 خاص طور سے مارک گولڈی سے سب ہی واقف تھے۔
 جب ہم شریف آفس سے نکلے تو انگل میسر کا انداز فاتحانہ
 تھا۔

”بولو برخوردار۔۔۔ اب تم کیا کہو گے؟“
 ”ٹھیک ہے مارک گولڈی کو یہاں کوئی نہیں جانتا لیکن
 یہ اس کے مجرم ہونے کی دلیل نہیں ہے۔“

”ایک اور جگہ سے تصدیق ہو سکتی ہے۔“ انگل نے کہا
 اور مجھے لے کر پیدا آفس و اسوات کاریکارڈ رکھنے والے مقامی
 دفتر پہنچے۔ یہاں کا اخبارچ انگل میسر کا بہت اچھا دوست تھا
 اس لیے اس نے انگل کے لیے مستعدی سے اپنا کمپیوٹر
 استعمال کیا اور تصدیق کر دی کہ پچھلے بیس سال میں کسی گولڈی
 کی وفات واقع نہیں ہوئی ہے۔ ہم دفتر سے باہر آئے تو انگل
 میسر نے کہا۔ ”یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔ اس
 نے کہا کہ اس کے انگل کے مرنے کے بعد یہ جگہ اس کے
 پاس آئی ہے لیکن اس کے انگل کی وفات کہیں سے ثابت نہیں

ہوتی ہے۔“
 ”یعنی اب ہمیں آدھی رات کو پوری سچی ورکشاپ
 تک جا کر زمین کھودی ہوئی؟“ میں نے سرخروہ لگتے میں کہا۔

”لازمی بات ہے برخوردار۔۔۔ یہ معاملہ اب صرف
 ورکشاپ کے سودے سے تک محدود نہیں رہا ہے، یہ جاننا ضروری
 ہو گیا ہے کہ مارک گولڈی نامی یہ شخص کیوں جھوٹ بول رہا
 ہے۔“

انگل میسر کی پولیس والی رگ پوری طرح پکڑ چکی تھی
 اور وہ اس معاملے کو پاہیہ تک پہنچانے بغیر سکون سے نہیں
 بیٹھتے۔۔۔۔۔ طے پایا کہ میں اور انگل رات کو ورکشاپ کی
 طرف جائیں گے اور زمین کھود کر دیکھیں گے کہ مارک گولڈی
 نے وہاں کیا دیا یا تھا۔ کوئی کچرا تھا یا اس نے اپنے انگل کو دبا
 دیا تھا۔ انگل میسر کو اصل شبہ یہی تھا۔ میرے خیال میں شون کو
 اس معاملے میں ملوث کرنا ٹھیک نہیں تھا اس لیے ہم نے اسے
 مطلع نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ جب ہم ایک مقامی
 ریسٹوران میں ڈنکر کے واپس انگل میسر کے گھر پہنچے تو وہ خود
 آگئی۔

”رات کا کیا پروگرام ہے۔۔۔۔ تم دونوں جاؤ گے
 ورکشاپ کی طرف؟“
 میں نے سر ہنجایا۔ ”نہیں، آج ارادہ نہیں ہے۔ ویسے
 یہ اتنی اہم بات نہیں ہے، بخود انگل کا شبہ کم ہو رہا ہے۔“
 شون نے مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھا۔ ”سچ کہہ
 رہے ہو؟“

”ہاں، تم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟“
 میں نے پورے غلوں سے کہا۔ شون کے جاننے کے بعد انگل
 میسر نے میری طرف دیکھا۔

”برخوردار! یہ لڑکی تم میں دلچسپی لینے لگی ہے کیونکہ میں
 نے اس کے انداز میں وہ شک دیکھا ہے جو لڑکی صرف اسی
 آدمی پر کرتی ہے جسے وہ پسند کرتی ہو۔“
 میں ہنسا۔ ”ممکن ہے یہ بھی صرف آپ کا شک ہو
 انگل۔“

”اب ہمیں بہت احتیاط سے جانا ہوگا، مجھے یقین ہے
 شون ہماری روانگی پر نظر رکھے گی۔“

انگل کی پک آپ کا بڑا بڑا انجی خاصا شور کرتا تھا اس
 لیے بارہ بجے کے قریب روانگی اس طرح ہوئی کہ پہلے میں
 نے انگل کے ساتھ مل کر پک آپ کو دھکا دے کر باہر سڑک
 تک پہنچایا۔ گھر سے دور نکل کر انگل نے اس کی ڈرائیونگ
 سیٹ سنبھالی اور ہم روانہ ہوئے۔ ہم نے زمین کھودنے

کا سامان ساتھ رکھ لیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”فرض کریں انکل کچھ نکل آتا ہے تو؟“

”مثلاً کیا نکل آتا ہے؟“

”میری کوئی لاش وغیرہ تو کیا ہوگا؟“

”کیا ہوتا ہے، میں پولیس کو اطلاع کروں گا۔“

”میں مارک کی نہیں، ورکشاپ والے معاملے کی بات کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ اس کا پھر کیا ہوگا؟“

انکل میز کے شانے اچکا۔ ”پھر دیکھنا پڑے گا کہ ورکشاپ کی ملکیت کس کے پاس آتی ہے اور وہ اسے پچناندہ کرتا ہے یا نہیں۔“

یعنی اگر مارک گولڈی مجرم نکل آتا تو امکان تھا کہ ورکشاپ کی ملکیت بھی اس کے پاس نہیں رہے گی اور یہ کسی اور کو مل جائے گی جو ممکن ہے اسے فروخت کرنا پسند نہ کرے۔

میں نے دل سے دعا کی کہ مارک گولڈی ہی مالک ہو اور وہ کسی چکر میں ملوث نہ ہو۔ کچھ دیر میں ہم ورکشاپ کی طرف جانے والے کچے راستے پر تھے۔ انکل نے پیک آپ کی روشنیاں بجھا دیں اور اسے ورکشاپ کے احاطے سے کوئی دو سو گز پہلے روک دیا تاکہ مارک انجن کی آواز سن کر ہوشیار نہ ہو جائے۔ ہم اترے، پیچھے منیاء اور احاطے کی طرف روانہ ہو گئے لیکن ہم نے احاطے میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے لکڑیوں والے شیڈ کی طرف آئے۔ یہاں سے خاردار تاریں کاٹ کر راستہ بنایا گیا تھا لیکن جب انکل میز نے چھوٹی سی تارچ کی روشنی میں دیکھا تو خاردار تاریں دوبارہ جوڑ دی گئی تھیں۔ اب یہاں راستہ نہیں تھا۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

”تم نے دیکھا۔۔۔۔۔ دوپہر میں راستہ تھا لیکن اب یہاں کوئی راستہ نہیں ہے۔“

”زمین کہاں کھودی گئی ہے؟“

”آؤ میرے ساتھ۔“ انکل نے کہا اور مجھے جھاڑیوں میں لے آئے۔ انہوں نے تارچ کی روشنی زمین پر ڈالی۔

”یہ دیکھو، کھدائی کے بعد مٹی ڈالی گئی ہے۔ میرا اندازہ ہے مٹی ڈالے اڑتا لیس گھنٹے سے زیادہ نہیں گزرے ہیں۔“

میں نے ان سے کہا۔ ”میں کھدائی کرتا ہوں، آپ ذرا ارد گرد نظر رکھیں تاکہ کوئی آئے تو ہم خبردار ہو جائیں۔“

”میں دیکھ رہا ہوں۔“ انکل نے کہا اور میں نے پیچھے اٹھا کر احاطے سے کھدائی شروع کر دی۔ میری کوشش تھی کہ آواز نہ ہو۔ مٹی واقعی نرم تھی جیسے کچھ وقت پہلے ڈالی گئی ہو، ورنہ بارش کے بعد مٹی اور جم جاتی ہے۔ ممکن ہے اسے بارش

کے بعد کھودا گیا ہو اور اسی وجہ سے زمین پر اسے نمایاں نشانات باقی رہ گئے۔ میں مٹی کھود کر باہر پھینک رہا تھا اور انکل میز مجھے تارچ سے روشنی دکھا رہے تھے۔ ساتھ ہی وہ آس پاس نظر بھی رکھ رہے تھے۔ کوئی تین فٹ کی کھدائی کے بعد مٹی بہت آسانی سے نکلنے لگی۔ میں پیچھے مارتا تو وہ اندر صاف جاتا۔ انکل میز نے کہا۔ ”ذرا آہستہ بیٹے۔۔۔۔۔ اگر اندر کچھ ہوا تو پیچھے اسے لگ سکتا ہے۔“ انہوں نے لاش کا واضح ذکر نہیں کیا تھا لیکن میں سمجھ گیا اور اس کے بعد بہت احتیاط سے پیچھے مارنے لگا۔ میں کھودنے کے بجائے مٹی سمیٹ رہا تھا۔ اچانک پیچھے کی چیز سے ٹکرایا۔ میں رک گیا۔

”انکل! کچھ ہے۔“ میں نے کہا اور جھک کر ہاتھوں سے مٹی ہٹانے لگا۔ پھر میرے ہاتھ میں جو چیز آئی، اسے محسوس کر کے میرا دل ڈوبنے لگا۔ یہ جو تھا اور صرف جو تھا نہیں تھا بلکہ اس میں ایک انسانی پاؤں بھی تھا۔ انکل روشنی ڈال رہے تھے۔ ”انکل! یہاں سچ لاش ہے۔“

”ہاں، یہ لاش ہے۔“ کسی نے کہا لیکن آواز انکل کی نہیں تھی بلکہ مارک گولڈی کی تھی۔ میں غلبت میں گڑھے سے نکلا تو انکل میز ہاتھ اوپر کیے کھڑے تھے۔ مارک پاس ہی ایک تیز روشنی والی لائٹ اور پتول لیے کھڑا تھا۔ اس نے انکل میز سے کہا۔ ”جب میں نے یہاں سے جو غائب پایا تو میں سمجھ گیا کہ تم نے گڑھا دیکھا ہے۔“

”تم مارا انتظار کر رہے تھے؟“ انکل نے سکون سے کہا۔ ”وہ مجرموں اور اسلحے کا سامنا کرتے رہے تھے اس لیے مجرم سکون تھے لیکن میں گھبرا رہا تھا۔“

”ہاں، مجھے تو بے فیصد یقین تھا کہ تم یہاں آؤ گے۔“

”لیکن دس فیصد امکان یہ بھی تو تھا کہ ہم پولیس کو بتا دیتے اور اس وقت یہاں جگہ ہماری پولیس ہوتی۔“

”ہاں، اس کا امکان تھا لیکن میں نے خطرہ مول لیا۔ اگر پولیس آجاتی تو میں نے فرار کا راستہ تیار رکھا تھا۔ پولیس مجھے نہیں پکڑ سکتی تھی۔“

”گڑھے میں کون ہے۔۔۔۔۔ اصل مارک گولڈی؟“

میں نے پوچھا۔

”نہیں، مارک گولڈی میں ہوں۔ یہ میرا انکل ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ تو تم نے اسے مار کر اس کی جگہ لے لی۔“

اس کی ورکشاپ پر قبضہ کر لیا اور اب اسے سچ رہے ہو۔

”میں اسے بھی نہ بچتا اگر مجھے کارپینٹر کا کام آتا۔“

اس نے تلخی سے کہا اور گڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ ”لیکن اس شخص نے مجھے کئی سال گدھے کی طرح استعمال کیا اور بے

وقوف بناتا رہا کہ مجھے جلد کام سکھانا شروع کرے گا۔“ مارک گولڈی مشتعل نظر آنے لگا۔

”اس لیے تم نے اسے مار دیا؟“ انکل میز نے کہا۔

”نہیں، میں نے اس لیے اسے نہیں مارا تھا بلکہ جب اس نے چپکے سے ورکشاپ کی فروخت کی کوشش کی، تب میں نے اسے مار دیا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں پانچ سال اس کے ساتھ کام کروں تو وہ ورکشاپ میرے حوالے کر دے گا۔“

”لیکن اس نے نہ تو تمہیں کارپینٹر کا کام سکھایا اور نہ ورکشاپ تمہارے حوالے کی؟“ انکل میز کی بات پر اس نے سر ہلایا۔

”ہاں، اس کے بجائے وہ اسے چپکے سے فروخت کر کے یہاں سے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔“ مارک مزید مشتعل ہو گیا۔ ”میں نے اس سے پوچھا تو اس نے مجھے گالیاں دیں اور دھکے دے کر یہاں سے نکالے۔ میں نے اس کا پتول لیا اور اس کے سر میں سوراخ کر دیا۔“

”اس کا مطلب ہے؟“

”تمہارے انکل کا نام سین گولڈی ہے؟“

”تم نے درست سمجھا۔“ اس نے سر ہلایا۔

”تم نے اس کی لاش یہاں اتنی قریب دفن کر حقائق کی ہے؟“ انکل میز نے کہا۔ ”پھر زمین پر سے کھدائی کے آثار کبھی نہیں مٹائے، اسی وجہ سے یہ جگہ میری نظر میں آئی۔“

”میں کوئی پیشہ ور مجرم نہیں ہوں۔“ مارک غرایا۔

”اب مجھے تم دونوں کا بندوبست بھی کرنا پڑے گا۔“

”کیا مطلب؟“ میں چونکا۔

”تم۔“ اس نے پتول کا رخ میری طرف کر دیا۔

”اس گڑھے کو بڑا کرو۔“

اس کی بات کا مطلب سمجھ کر میرے جسم میں سردی لہر دوڑ گئی۔ وہ اسی گڑھے میں، ہم دونوں کو مار کر ڈالنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ انکل میز نے کہا۔ ”برخوردار تم پھر وہی حفات کرنے جا رہے ہو۔ احاطے کے اتنے قریب موجود لاشیں تمہیں کسی وقت بھی پکڑوا سکتی ہیں۔“

اس نے دانت نکالے۔ ”اب مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ تمہارے جانے کے بعد ایک آدمی آیا تھا اور اس سے ورکشاپ کا سودا ہو گیا ہے۔ وہ آج رزم لے کر آئے گا اور میں ورکشاپ اس کے حوالے کر کے ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اس کے بعد اگر تم لوگوں کی لاشیں یہاں سے ملتی

زندگی اے زندگی

☆ زندگی ایک ایسا نغمہ ہے جس کی فرمائش کی جائے تو وہ بارہ نہیں چلتا۔

☆ زندگی کا ہم پر کتنا احسان ہے کہ وہ ہم سے صرف ایک بار روکتی ہے۔

☆ زندگی کی مشکلات گھاس کے مانند ہوتی ہیں اگر ان پر توجہ نہ دی جائے تو پڑے سے لگتی ہیں۔

☆ زندگی اتنی تلخ تو نہیں کہ اس سے بھاگا جائے اور اتنی شیریں بھی نہیں کہ اس کے پیچھے بھاگا جائے۔

☆ زندگی کے اخبار میں سب سے اچھا صفحہ بچوں کا ہوتا ہے۔

☆ زندگی میں سوال زیادہ ہیں اور جواب کم۔

☆ زندگی ایک چنک کے مانند ہے جو کچھ اس میں جمع کر جاؤ گے وہی نکلوا سکو گے۔

نمک پارے

اکثر خاندان کو یہ یاد یاد رہتا ہے کہ ان کی شادی ہوئی تھی لیکن یہ یاد نہیں رہتا کہ کیوں ہوئی؟

جو شخص اتنا ستا ہوتا ہے کہ وہ سوچ بھی نہ سکے تو اس شخص کو راز شادی کر لینی چاہیے۔

زیادہ بہتر یہ ہے کہ اپنا منہ بند رکھو اور لوگوں کو سمجھنے دو کہ تم بے وقوف ہو۔ یہ نسبت اس کے کہ اپنا منہ کھولو اور لوگوں کے تمام شبہات ختم کر دو۔

رضامندی

میں جلد ہی تم سے شادی کر لوں گا بس ذرا اپنے گھر والوں کو راضی کر لوں۔“ نوجوان نے اپنی چاہت کا یقین دلانے ہوئے کہا۔

”آپ کے گھر میں کون کون ہے؟“ لڑکی نے شرما تے ہوئے پوچھا۔

”اور کوئی نہیں بس میری بیوی، ساس اور چچے ہیں۔“ نوجوان نے سادگی سے جواب دیا۔

وزیر محمد حنان، بٹل مانہ سرہ

آپلا رنگ

گمان بے گمان

سرور اکرام

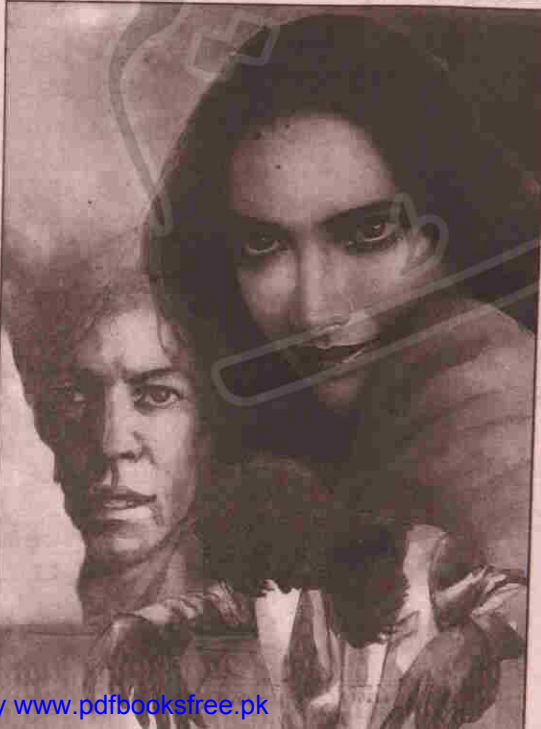
تمہارے اور میرے درمیان اک بات ہوتا تھی
بلا کا دن نکلتا تھا بلا کی رات ہوتا تھی
بلا کا دن بھی نکلا اور بلا کی رات بھی گزری
عذاب ذات بھی گزرا فناء ذات بھی گزری

خواہشات اور خوابوں کا سفر کبھی رکنا نہیں... یہ انسان
کو ہمیشہ دوڑانے رکھتا ہے... تاوقتیکہ اپنے ہدف کو نہ پالے
... تلاش و تجسس کا ایک ایسا ہی سفر در سفر... اپنے
مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ دیوانہ وار بھٹک رہے تھے...
اور ان کی دیوانگی... ایک لڑکی کے لیے عذاب بن گئی تھی...

اس لڑکی کے گرد گھومتی کہانی... جس کی زندگی مسلسل حادثات کا شکار ہو رہی تھی

شاہد سے میری ملاقات.... ایک چھوٹے سے
حادثے کی وجہ سے ہوئی تھی۔
میں نہ جانے کس کام سے اپنے فلیٹ سے باہر گئی ہوئی
تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اچانک بارش شروع ہو جائے گی
اور وہ بھی اتنی تیز کہ ذرا سی دیر میں ہر طرف پانی ہی پانی ہو

جائے گا۔
میرا خیال تھا کہ بارش اگر ہوئی بھی تو دوسرے دن
تک ہوگی۔ آسمان پر بادل تو تھے لیکن محکمہ موسمیات والوں
کی پیش گوئی دوسرے دن کی تھی۔
بہر حال، میں گھر سے نکلی اور بارش میں پھنس گئی اور



ہوئی تو انکل نے مناسب سمجھا کہ وہ مارک کو دیکھ لیں۔ جب
میرے جذبات ذرا اعتدال میں آئے تو میں نے شون سے
پوچھا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہم یہاں آئے ہیں؟“
”میں نے گھڑی سے تم لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھ لیا
تھا۔“ شون بولی۔
”میں نے تمہیں گھڑی میں کھڑے دیکھ لیا تھا۔“ انکل
میزر بولے۔

”آپ نے مجھے بتایا نہیں؟“ میں نے شکوہ کیا۔
”برخوردار اضروری نہیں تھا کہ شون ہمارے پیچھے آتی
اس لیے تمہیں بتانے کا فائدہ نہیں تھا۔ بس ایک امید تھی کہ
شون ہمارا تعاقب کرے گی۔“

”اور اگر میں نہ آتی تو؟“ شون ہنسی۔ اپنے کارنامے
پر وہ بھی بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس سوال کا ہمارے پاس
کوئی جواب نہیں تھا۔ انکل کو مارک کی نگرانی پر چھوڑ کر ہم
ورکشاپ میں آئے لیکن وہاں سچ کچ کوئی فون یا سو پائل نہیں
تھا اس لیے مجبوراً ہمیں سڑک تک جانا پڑا اور ایک فون بوتھ
سے پولیس کو کال کرنا پڑی۔ آدھے گھنٹے بعد وہاں پولیس اور
پھر ایسی پولیس بھی آگئی تھی۔ سین گولڈی کی لاش سرد موسم کی
وجہ سے زیادہ خراب نہیں ہوئی تھی اور تقریباً اصل حالت میں
تھی۔ اس کے ایک پاؤں کا جوتا فٹانے کے دوران میں نکل
گیا تھا اور اسی جوتے نے مارک کو پکڑا دیا تھا۔ پولیس کو
بیانات دیتے اور دوسرے معاملات نمٹاتے ہوئے صبح ہو گئی،
تب ہمیں گھر جانے کا موقع ملا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ورکشاپ مارک کے
بجائے سین گولڈی کے ایک اور رشتے دار کو مل گئی تھی اور اس
نے اسے فروخت کرنے کے بجائے خود چلانا شروع کر دیا۔
مجبوراً مجھے انکل کی پیش کش قبول کرنا پڑی۔ جمیل کے ساتھ
ان کی کچھ زمین میری ماؤں میں تھی۔ میں نے اس پر اپنی
ورکشاپ قائم کر لی اور فرنیچر بنانا شروع کر دیا۔ گولڈی انکل
میزر نے سرمائے کی صورت میں فراہم کی اور جب میرا کام
چل نکلا تو میں نے انہیں رقم قسطوں میں لوٹا دی۔ دو سال بعد
جب شون یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کر کے واپس آئی تو ہم نے
وقت ضائع کیے بغیر شادی کر لی۔ آج میری ماؤں میں میرا
فرنیچر سازی کا کارخانہ ہے جس میں مجھ سمیت دس افراد کام
کرتے ہیں۔ شون بزنس دیکھتی ہے اور میں فرنیچر ڈیزائن
کرتا ہوں جبکہ انکل میزر ہمارے بچوں کی دیکھ بھال کرتے
ہیں اور سب سے زیادہ خوش وہی ہیں۔

بھی ہیں تو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہوگی۔“
وہ پتھول لیے ہمارے سر پر موجود تھا اور ہم میں سے
کوئی ایسا ہیرو نہیں تھا جو پتھول کی پروا کیے بغیر اس سے بھڑ
جاتا اور... اسے قابو کر لیتا۔ انکل اپنی عمر گزار چکے تھے اور
مجھے لڑائی بھڑائی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ خاص طور سے جب
فریق ثانی سب سے پہلے ہی ایک قتل کر چکا ہو۔ اس لیے
مجبوراً میں نے نیچلے سنبالا اور گڑھے میں اتر گیا۔ انکل میز
ایک طرف کھڑے تھے اور مارک گولڈی پوری طرح چوکتا
تھا۔ میں ست روی سے گڑھا بڑا کر رہا تھا اور اس کے لیے
مجھے مجبوراً لاش پر کھڑے ہونا پڑا تھا۔ مارک میری رفتار پر
غرایا۔

”تیزی سے ہاتھ چلاؤ، ایسا نہ ہو میں تمہیں مار دوں
اور پھر گڑھا بھرنے بڑا کرنا پڑے۔“
”تم ہمیں بعد میں بھی مار دو گے۔“ میں نے رک کر
کہا۔ ”اس لیے میں محنت کیوں کروں؟“
”تا کہ کچھ دیر زندہ رہ سکوں۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن اگر
تم جلدی مرنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“
”ایک منٹ۔۔۔ میں کھدائی کر رہا ہوں۔“ میں نے
جلدی سے کہا اور نیچلے چلانا شروع کر دیا۔ مارک گولڈی آہستہ
سے ہنسا۔ انکل میز پائل ساکت اور سکون سے کھڑے تھے
جیسے کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔ میں جل گیا۔ اس مصیبت میں انہوں
نے ہی پھنسا یا تھا اور اب ان کو کوئی پروا نہیں تھی۔ گڑھا بڑا
ہوتے ہی مارک ہم دونوں کے سر میں بھی سوراخ کر دیتا اور
اس کے بعد اسے صرف گڑھے میں مٹی بھرنا پڑتی۔ جیسے جیسے
گڑھا بڑا ہوتا جا رہا تھا، موت سانسے نظر آنے لگی تھی۔ اب
گڑھا اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ میرا سر بھی اس کے اندر تھا اس لیے
اوپر اچانک کھٹ کی آواز آئی اور اچانک مارک لیٹ کر
گڑھے میں جھانکنے لگا تو میری ہجھ میں بالکل نہیں آیا کہ کیا ہوا
ہے۔ البتہ انکل میز کا قبضہ سناؤ دیا اور پھر انہوں نے کہا۔
”گڈ گرل!“

میں جو مارک کے سر پر نیچلے رسید کرنے جا رہا تھا، رک
گیا کیونکہ مارک پہلے ہی بے ہوش تھا۔ وہ اس طرح گرا تھا
جیسے لیٹ کر گڑھے میں جھانک رہا ہو۔ میں جلدی سے باہر نکلا
تو انکل میز شون کا شانہ چھتیار ہے تھے جس کے ہاتھ میں
ایک موٹی سی لکڑی تھی اور یقیناً یہی لکڑی مارک گولڈی کے سر
پر لگی تھی اور وہ بے ہوش ہوا تھا۔ میں نے مارے خوشی کے
اسے سینے سے لگالیا۔ شون نے ہماری جان بچائی تھی اور میں
اس کا شکر گزار تھا۔ جب یہ شکر گزاری مکمل حدود میں داخل

میرے لیے وہابی جی دشوار ہو گئی۔ میں جسی سڑک پر تھی، اس سڑک پر رکشایا ٹیکسی وغیرہ بہت کم چلا کرتی تھی۔ میں اندھیری رات اور بارش میں فٹ پاتھ پر کھڑی ہوئی تھی کہ اچانک ایک گاڑی آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس گاڑی کی روشنی براہ راست مجھ پر پڑ رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ گاڑی یا تو تیزی سے آگے گزر جائے گی یا میرے پاس آ کر رک جائے گی۔

لیکن وہ تو سیدھی میری طرف چلی آ رہی تھی۔ جیسے مجھے کچل دینا چاہتی ہو۔ قریب... قریب اور قریب... میں بوکھلا کر فٹ پاتھ کے کنارے سے اور پیچھے کی طرف چلی گئی اور وہ گاڑی مجھ سے کتراتی ہوئی گزرتی چلی گئی۔ میرا دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔

کیا تھا یہ سب۔ کیا یہ گاڑی والوں کا مذاق تھا یا انہوں نے مجھے مارنے کی کوشش کی تھی... لیکن کیوں۔ اگر مذاق تھا تو پھر ایسا مذاق کون کر سکتا ہے۔ اور اگر مارنے کی کوشش کی تھی تو کس لیے؟ میں نے کسی کا کیا کاڑا تھا؟ اتنی دیر میں اس اندھیرے میں کسی اور گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکیں۔ شاید یہ وہی گاڑی تھی یا کوئی اور بھی۔ بہر حال، وہ بھی سیدھی میری طرف آ رہی تھی۔

میں خوف سے کانپ رہی تھی۔ گاڑی والا کیوں پیچھے پڑ گیا تھا۔ اچانک وہ گاڑی اسٹاپ پر آ کر رک گئی۔ ایک نوجوان گاڑی سے اتر کر میری طرف آ گیا۔ اس نے اپنی گاڑی کی روشنیاں چلا رکھی تھیں۔ اسی لیے میں اس کا چہرہ دیکھنے کے قابل ہو سکی تھی۔

”آپ ٹھیک تو ہیں؟“ اس نے بہت نرم آواز میں پوچھا۔ ”جی، جی ہاں... ٹھیک ہوں۔“

”میں نے دور سے ایک گاڑی کو آتے دیکھا تھا۔ میں یہ سمجھا شاید وہ آپ کو ہٹ کر گئی ہے۔ یہ سوچ کر آپ کی طرف آ گیا تھا۔“

”نہیں، مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔“

”چلیں، میں آپ کو پہنچا دوں۔ اس طرح رات کے وقت آپ کا بارش میں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں۔“

”نہیں، میں چلی جاؤں گی۔ کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔“

”وہ تو فی نہ کریں۔ چلیں بیٹھ جائیں۔“

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں زیادہ دیر تک تردد نہیں کر سکی اور اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہی نوجوان شاہد تھا۔

اس نے راستے میں مجھ سے صرف ہیرا پھڑکیس معلوم کیا تھا۔ اس کے سوا اس نے اور کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے اتار کر جاتے ہوئے اس نے اتنا کہا۔ ”پلیز اس طرح بے دھڑک رات کے وقت نہ نکل جایا کریں، آپ کو اپنا خیال رکھنا ہے۔“ وہ گاڑی آگے بڑھا لے گیا اور میں اس کے بارے میں سوچتی رہ گئی۔

کون تھا یہ شخص... اگر یہ وہاں نہ آ جاتا تو پھر میں نہ جانے کب تک وہیں کھڑی رہتی اور ایسا آدی تھا جس نے تنہائی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس نے بات تک نہیں کی تھی۔ بہر حال، میں نے دل ہی دل میں اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے فلیٹ واپس آ گئی۔ شاہد سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد ہم ملتے رہے۔ شاہد ایک مہربان اور خیال رکھنے والا نوجوان ثابت ہو رہا تھا۔ البتہ وہ کبھی بھی اس بات پر پریشان ہو جاتا کہ بارش کی اس رات کس گاڑی نے مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیا چاہتے تھے وہ لوگ؟

لیکن اس کے بعد چونکہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس لیے رفتہ رفتہ وہ واقعہ ہمارے دھیان سے نکل گیا۔

کچھ دنوں کے بعد پھر ایک واقعہ ہوا۔ یہ بھی پہلے والے سے کم نہیں تھا۔ کسی نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ اس رات بھی میں اپنے گھر کی طرف واپس آ رہی تھی۔ میں نے ٹیکسی کچھ فاصلے پر رکوائی تھی۔ یہ میں عام طور پر کرتی تھی۔

نہ جانے کیوں ہمارا معاشرہ کچھ ایسا ہو گیا ہے۔ اگر کوئی ایسی لڑکی ٹیکسی میں آتی جاتی دکھائی دے تو اس کے بارے میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ کہاں جاتی ہے۔ کس کے پاس جاتی ہے؟ چاہے وہ بے چاری کسی کام سے جا رہی ہو۔

تو اس رات بھی میں نے ٹیکسی کچھ فاصلے پر رکوائی اور اپنے فلیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ ایک ایک گھنٹی کی بلڈنگز کے درمیان میں تھی۔

اس گلی سے گزرتے ہوئے مجھ پر حملہ ہوا۔ کوئی شخص میرے پیچھے چل رہا تھا۔ میری چھٹی حس نے مجھے کسی خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ میں نے مزید دیکھا ہی تھا کہ اس نے فائر کر دیا۔ گولی چلنے کی آواز تو نہیں آتی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ اس نے فائر کیا تھا۔ گولی ایک دیوار پر لگی تھی۔ یا تو اس کا نشانہ

چوک گیا تھا یا اس نے جان بوجھ کر صرف مجھے خوف زدہ کیا تھا۔ بہر حال، میں نے گلی میں دوڑ لگا دی۔ اب وہ میرے پیچھے نہیں آ رہا تھا۔ میں جب اپنی بلڈنگ کے گیٹ پر پہنچی تو میری سانسیں بڑی طرح پھول رہی تھیں اور شاہد یہاں موجود تھا۔

وہ میرا یہ حال دیکھ کر جلدی سے میرے پاس آ گیا۔ ”کیا ہوا روٹی؟ خیریت تو ہے نا؟“

”نہیں... خیریت نہیں ہے۔“ میں پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی۔ ”آؤ میرے فلیٹ میں آ جاؤ۔“ فلیٹ پہنچ کر میں نے اسے پوری بات بتا دی۔ وہ حیران اور پریشان ہو گیا۔ ”آخر کیوں، تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟“

”میں کیا بتاؤں، خود میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“

”روٹی، ایک بات بتاؤ۔ کیا تمہاری ذات سے کوئی راز پوشیدہ ہے... یا کوئی ایسی بات ہے جو تمہیں معلوم ہے۔ کوئی بھی بات؟“

”نہیں تو... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“

”یاد کرو روٹی... یہ تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ ہر پوائنٹ آف ویو سے سوچو۔ چوٹی سے چوٹی بات کو بھی نظر انداز مت کرو۔ ہو سکتا ہے کہ جس کی تمہاری نگاہوں میں کوئی اہمیت نہ ہو کسی اور کے لیے وہ زندگی اور موت کا سوال بن گئی ہو۔“

”نہیں، مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت تو اور بھی یاد نہیں آ رہا۔“

”خیر، پریشان مت ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ شاہد نے تسلی دی۔

خدا جانے کیا ٹھیک ہونا تھا یا کیا نہیں ہونا تھا۔ لیکن حیرت یہ تھی کہ آخر کون مجھے مارنا چاہتا ہے۔ میری کسی سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ اگر شاہد نہیں ہوتا تو... حالانکہ شاہد نے مجھے بچانے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود اس کی وجہ سے میری ڈھارس بندھی ہوئی تھی۔

اسے دیکھ کر ایک خاص تقویت کا احساس ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ شخص میرے لیے ڈھال بن جا رہا ہو۔ کون تھا وہ؟ بہر حال وہ جو کچھ بھی تھا۔ ایک محبت کرنے والی اور خیال رکھنے والا ثابت ہو رہا تھا۔

اس کے بعد بھی وہ کئی بار مجھ سے ملا۔ مجھے تسلی دی۔ میرا حوصلہ بڑھا تا رہا۔ ایک شام میں اپنے فلیٹ میں تھی کہ

شاہد کا فون آ گیا۔ وہ بہت خوش گوار سوز میں تھا۔ ”کیا کر رہی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ آج دفتر نہیں گئی تھی۔ سوچا کچھ کام ہی کر لوں۔“

”چھوڑو کام کو۔ ذرا باہر نکل کر دیکھو۔ موسم کتنا خوب صورت ہو رہا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”آ جاؤ باہر۔“

”باہر کہاں آؤں؟“

”میں تمہاری بلڈنگ کے سامنے ہی گاڑی لیے کھڑا ہوں۔“ اس نے بتایا۔

مجھے بہت اچھا لگا۔ کوئی تو ہے جس نے اتنی اپنائیت سے مجھے آواز دی تھی۔ جو میرے لیے گاڑی لیے کھڑا تھا۔ میں جلدی جلدی تیار ہو کر نیچے آ گئی۔

شاہد معمول کے مطابق اپنے لالابی پین کے ساتھ اپنی نئی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ گاڑی اس نے حال ہی میں خریدی تھی۔ اور مجھے اس کے بارے میں بتا دیا تھا۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ”ہاں بیٹی، کہاں چلنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”افق کے اس پار۔“ اس نے رومینک ہو کر کہا۔

”لیکن میرے پاس اتنی فرصت کہاں ہے کہ تمہارے ساتھ افق کے اس پار جاؤں۔“ میں مسکرا کر بولی۔

”میرے لیے تو فرصت لگائی ہی پڑے گی۔“

اس نے ایک ہنسلے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ہم بہت دیر تک یوں ہی گھومتے رہے۔ پھر ساحل پر آ کر ایک دوسرے کو پکڑنے کے لیے دوڑتے رہے۔ ایک پکڑنا ہی خوشی حاصل ہو رہی تھی۔ نہ جانے کتنے برسوں بعد زندگی میں ایسی خوشی آئی تھی۔ ورنہ اب تک تو بس سوائے پریشانیوں کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔

ہم نے رات کا کھانا بھی باہر ہی کھایا تھا۔ اس رات میں بہت خوش تھی۔ شاہد شاید میری زندگی کا ایک لازمی حصہ بن چکا تھا لیکن اسی رات پھر ایک حادثہ ہو گیا۔ میں بہت گہری نیند میں تھی جب اچانک کمرے کی کھڑکی کے شیشے ٹوٹ گئے۔ شاید کسی نے بے آواز گولی چلائی تھی۔ میں خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

اگر میں اس وقت جاگ رہی ہوتی اور کھڑکی کے پاس ہی ہوتی تو پھر میرا کیا حشر ہوتا؟

میں نے اسی وقت شاہد کے موبائل کا نمبر ملا دیا۔ وہ نیند سے جاگتا تھا۔ اسی لیے اس کی آواز بوجھل بوجھل سی تھی۔

”کیا بات ہے روٹی، خیریت تو ہے؟“

”شاہد خدا کے لیے میرے پاس آ جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”کسی نے مجھ پر گولی چلائی ہے۔“

”اوہ۔“ یہ سن کر اس کی نیند اڑ گئی۔ ”پریشان مت ہو۔ میں دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“

دس منٹ کے بعد دروازے کی کھنٹی سنائی دی۔ میں آہستہ آہستہ دروازے تک پہنچ گئی۔ ”کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”روٹی، دروازہ کھولو۔ میں آ گیا ہوں۔“

میں نے دروازہ کھول دیا۔ شاہد اندر آ گیا۔ اس وقت مجھے نہ جانے کیا ہوا کہ میں۔۔۔ اس سے لپٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ وہ آہستہ آہستہ مجھے تھپکایا دیتا جا رہا تھا۔

”شاہد! وہ کم بخت مجھے مار دیں گے۔“ میں نے روتے ہوئے کہا۔

”کوئی نہیں مارے گا تمہیں۔“ شاہد نے مجھے سہارا دے کر ایک طرف بٹھایا۔ ”اور اتنا یاد رکھو کہ کوئی تمہیں مارنا بھی نہیں چاہتا۔“

”مارنا نہیں چاہتا تو پھر یہ سب کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟“

”صرف تمہیں خوف زدہ کرنا۔“ اس نے کہا۔ ”خود سوچو۔۔۔ تم پر اب تک کتنے حملے ہو چکے ہیں۔ تمہیں خراش تک بھی نہیں آئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ صرف تمہیں ڈرا رہا ہے۔“

”شاہد کچھ بھی ہو، معاملہ اب میری برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں تمہارے لیے کیا کروں۔“ اس نے کہا۔ ”کیونکہ میں خود یہاں سے جا رہا ہوں۔“

”تم جا رہے ہو۔ کہاں کس لیے؟“ میں ایک دم سے پریشان ہو گئی۔ ”میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ تمہاری وجہ سے برا حوصلہ ہے مجھے۔“

”بے وقوف! میں ایک ہفتے کے لیے مری جا رہا ہوں۔ ایک کام کے سلسلے میں۔ ایک ہفتے کے بعد واپس آ جاؤں گا۔“

”تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔“

”تم کہاں میرے ساتھ جاؤ گی؟“

”نہیں، میں بھی جاؤں گی۔ میں ان حالات میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“

”اگر میں خود ہی تمہارا دشمن نکلا تو۔۔۔“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ میں ہنس پڑی۔

”تمہاری دشمنی بھی قبول ہے۔“

”اوکے“ تو پھر اپنا سامان پیک کر لو۔ ہم کل صبح ہی یہاں سے جا رہے ہیں۔“

اور میں شاہد کے ساتھ اسلام آباد آ گئی۔

ہم نے اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ بہت خوب صورت ہوٹل تھا۔ اور یہاں سے اسلام آباد کی خوب صورت عمارتیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

شاہد کے ساتھ اس طرح آنا اچھا لگ رہا تھا۔

نہ جانے کیوں کچھ لوگ بہت جلدی قریب آ جاتے ہیں۔ ان کی رفتار طوفانی ہوتی ہے۔ شاہد بھی ایسا ہی تھا۔ اس نے بہت تیزی سے میرے دل میں اپنی جگہ بنائی تھی۔

وہ مجھے ہوٹل میں چھوڑ کر کسی کام سے چلا گیا تھا۔

”دیکھو، کمرے کا دروازہ صرف اس وقت کھولنا جب میری آواز پہچان لو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خطرہ یہاں بھی تمہارے ساتھ ساتھ چلا آ ہو۔“ اس نے کہا۔

”شاہد تم مجھے اور بھی ڈرا رہے ہو۔“

”ایک بات کہہ رہا ہوں یا۔۔۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”ویسے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہے۔“

”چلو، اگر تم کہہ رہے ہو تو پھر ٹھیک ہی ہوگا۔“ میں بھی مسکرا دی۔

☆☆☆

میں شاہد کا انتظار کر رہی تھی کہ موبائل کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

یہ ایک نامائوس نمبر تھا۔ نہ جانے کون تھا۔ ”ہیلو!“ میں نے کہا۔

”سنو، تم مجھے نہیں جانتیں لیکن میں تمہارا ہمدرد ہوں۔“ دوسری طرف سے کسی کی آواز آئی۔

”جی ہمدرد صاحب فرمائیں۔ مجھے کیوں کال کی ہے؟“

”روٹی! میں تمہیں شاہد کی طرف سے خبردار کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”تم اس سے محبت کرنے لگی ہو لیکن وہ تمہیں مارنا چاہتا ہے۔“

اتنا کہہ کر دوسری طرف سے موبائل آف کر دیا گیا۔

میں ہیلو ہیلو کہتی رہ گئی۔ کون ہو سکتا تھا۔ اس کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ مجھے شاہد کی طرف سے خبردار کرتا۔

شاہد۔۔۔ وہ میرا دوست تھا۔ یہ دوستی زیادہ پرانی بھی نہیں تھی۔ لیکن ہم ایک ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ کم از کم شام کا وقت تو ہمارا ساتھ ہی گزرتا تھا۔

وہ ایک مہذب اور بظاہر سلجھا ہوا انسان دکھائی دیتا تھا پھر اس کے لیے کسی نے ایسی بات کیوں کی تھی؟

میں ان ہی سوچوں میں تھی کہ شاہد آ گیا۔ وہ میرے سامنے اپنا ہاتھ نکالتے ہوئے بولا۔ ”ہیلو بے بی۔ جاگ جاؤ۔ کس سوچ میں پڑی ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے اس کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھا۔ ”میں تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی کہ تم کتنے خطرناک انسان ہو۔“

”اوہ، تو اب میں خطرناک بھی ہو گیا۔“ وہ کرسی پر بیٹھنے ہوئے بولا۔

”ہاں، مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ تم ایک خطرناک انسان ہو اور مجھے مارنا چاہتے ہو۔“

”ویری گڈ۔“

”کسی نے ابھی موبائل پر بتایا ہے۔“

”کیا؟“ اس کے چہرے پر غصے کا رنگ نمایاں ہو گیا۔ ”کون کہتا ہے۔ کیا نمبر ہے اس کا؟“

”میں اسے نہیں جانتی اور نمبر سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ کیونکہ یہ نمبر کسی بی سی ادکا ہے۔“

”خدا کی پتا۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”اس دنیا میں کیسے کیسے لوگ ہوتے ہیں۔ اب اس کا فون آئے تو مجھ سے بات کر دینا۔“

”تم نے اس کی بات کو دل پر کیوں لے لیا۔ اس قسم کی کالز تو آتی رہتی ہیں۔“

”لعنت سیجھو۔ چلو کہیں لانگ ڈرائیو پر چلتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”نہیں مجھی۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔“ میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ”اب مجھے تم سے ڈر لگنے لگا ہے۔ نہ جانے کس وقت تمہارا دماغ پھر جائے اور تم مجھے جان سے مار دو۔“

”مائی بے بی۔ تمہیں جان سے مارنے کے لیے پلاننگ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں تو ویسے ہی مار سکتا ہوں۔“

”وہ کیسے؟“

”اپنے پیارے۔ اپنی محبت سے۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے گردن ہلا دی۔ ”اس طرح تو تم مجھے مارتی چکے ہو۔“

”چلو، اب اٹھو یہاں سے۔“

ہم پارکنگ کی طرف چل پڑے۔ جہاں شاہد نے

اپنی گاڑی کھڑی کی تھی اور گاڑی کے پاس بیٹھنے ہی موبائل پھر بول اٹھا۔ ”ہیلو!“ میں نے موبائل کان سے لگایا۔

”روٹی! تم شاہد کے ساتھ نہیں مت جانا۔ وہ تمہارا دشمن ہے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا اور اس بار آواز لڑکی کی تھی۔

”تم کون ہو؟ اور مجھ سے ہمدردی کیوں کر رہی ہو؟“

میں نے غصے سے پوچھا۔

”اس تفصیل میں مت جاؤ اور اپنی جان بچاؤ۔“ دوسری طرف سے اتنا کہہ کر موبائل آف کر دیا گیا۔

”کیا بات ہے؟“ شاہد نے پوچھا۔ ”کیا اسی کا فون تھا؟“

”اس کا نہیں۔ اس بار کسی لڑکی کا فون تھا۔“ میں نے بتایا۔ ”لیکن وہ بھی یہی کہہ رہی تھی کہ شاہد سے اپنی جان بچاؤ۔“

”یہ کون لوگ ہیں کم بخت۔“ شاہد غصے سے دانت چرس کر بولا۔ ”کیوں تمہیں ڈرا رہے ہیں۔ لاؤ تم اپنا موبائل دکھاؤ۔ میں نمبر دیکھوں گا۔“

میں نے موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے نمبر دیکھنے کے بعد موبائل واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”لعنت ہو۔ کسی بی سی ادکا نمبر معلوم ہوتا ہے۔“

”شاہد! اب تو مجھے واقعی ڈر لگنے لگا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ارے، اس قسم کے کہنے لوگ ہر معاشرے میں ہوتے ہیں۔ جن کا کام۔۔۔ دوسروں کو پریشان کرنا ہوتا ہے۔ تم پریشان ہو گئیں۔ یہی تقریر اس کے لیے بہت ہے۔“

”نہیں شاہد! میں تنبیہ کی سے سوچنا پڑے گا۔“

میں نے کہا۔ ”یہ کوئی گہری پلاننگ معلوم ہوتی ہے۔ خود سوچو۔ پہلے ایک مرد نے فون کیا۔ اب کوئی لڑکی فون کر رہی ہے۔ تو یہ کوئی تقریر نہیں ہو سکتی۔“

”خیر، تم پریشان مت ہو۔ میں ان فون کرنے والوں سے نمٹ لوں گا۔“

میں اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

اس وقت ہم اسلام آباد میں تھے اور شاہد نے میرے بیٹھ جانے کے بعد یہ بتایا کہ اس کا ارادہ مری کی طرف جانے کا تھا اور ٹھوڑی سی سیر کر کے واپس آ جاتے۔

”شاہد مجھے ڈر لگتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”مجھے؟“

”تم سے نہیں، مری کی ادنیٰ نیچی سڑکوں سے۔“ میں

نے کہا۔ ”ان سڑکوں کے لیے بہت مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”پاگل ہو تم۔ تم نے کیا مجھے اتاڑی ڈرائیور سمجھ رکھا ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”درجنوں بار ان سڑکوں پر سفر کر چکا ہوں۔“

پھر اس نے اپنی گاڑی مری روڈ کی طرف دوڑا دی۔ اس وقت اتفاق سے موسم بھی بہت خوب صورت ہو گیا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہوں اور جب سخت گرمی میں بھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہوں اور جب ایک خوش گواری غنودگی کا احساس ہونے لگے۔۔۔ اور جب گاڑی میں ہلکی ہلکی موسیقی گونج رہی ہو تو اس وقت سب کچھ اچانک بہت خوب صورت ہو جاتا ہے۔

سارے اندیشے ایک طرف رہ جاتے ہیں۔ بس ایک سبک رفتار اور خوب صورت سی زندگی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ شاید گاڑی بہت تیز چلانے لگا تھا۔

”شاید یہ کیا کر رہے ہو؟“ میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ ”اسپید کم کرو۔ دیکھ رہے ہو کتنے خطرناک موڑ ہیں۔“ ”ڈرنے لگیں نا۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”مائی بے بی! تم تو جانتی ہو کہ تیز ڈرائیونگ میرا جیون ہے۔“ ”جیون تو ہے لیکن یہ جیون ایسی سڑکوں پر مت دکھاؤ، پلیز۔“

”اچھا بس۔“ اس نے رفتار کم کر دی۔ ہم ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد مری پہنچ گئے تھے۔ وہی چھوٹا سا خوب صورت شہر۔۔۔ وہی مال روڈ کی روٹیں اور دونوں اطراف پہنے ہوئے ہوٹلز۔ جہاں سے کھانوں کی خوشبوئیں باہر آرہی تھیں۔

ہم نے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کافی پی۔ یہاں کی کافی بہت اچھی ہوا کرتی تھی۔ اور کافی پینے کے دوران میں ہی موسم کے تہوار اچانک خطرناک ہو گئے۔

بادلوں نے دن کی روشنی غائب کر دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی بادلوں کی گرج نے مری کی پہاڑیوں میں گونج پیدا کرنی شروع کر دی۔

یہاں بارش اسی انداز سے شروع ہو جاتی تھی۔ یہ بارش خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوف زدہ کرنے والی بھی ہوا کرتی ہے۔

میں اب واقعی پریشان ہو گئی۔ ”شاید اب کیا ہوگا؟“ ”انجوائے کریں گے اور کیا ہوگا؟“ ”میرا مطلب ہے واپس کیسے جائیں گے؟“

”کیسی بات کر رہی ہو۔ ایسے موسم میں واپس کیسے جا سکتے ہیں؟“ شاید نے کہا۔

”تو پھر کیا کریں؟“ ”بہیں رہ جاتے ہیں۔“ ”کسی ہوٹل میں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، ہوٹل میں نہیں۔ یہاں میرے ایک دوست کا ایک خوب صورت اپارٹمنٹ ہے۔“ شاید نے بتایا۔ ”وہ آج کل کراچی گیا ہوا ہے اور اس کی چابی میرے پاس ہے۔“ ”میرے ذہن میں گھٹنیاں سی بجنے لگیں۔ اس اپارٹمنٹ کی چابی شاید کے پاس کیوں تھی۔ کیا وہ یہ سوچ کر چلا تھا کہ ہمیں مری میں رکنا ہوگا۔ کیا باقاعدہ پلاننگ کے تحت وہ مجھے مری لے کر آیا تھا اور موسم نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔“

”کیا سوچنے لگیں؟ کیا گھر والوں کی طرف سے پریشانی ہے؟“ ”گھر والے؟“ میرے ہونٹوں پر ایک دکھ بھری مسکراہٹ آ گئی۔ ”کون سے گھر والے؟ شاید کیوں میرے زخموں کو کبیر رہے ہو۔ تم تو یہ جانتے ہو کہ اس دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں ہے۔“

”ہاں۔“ وہ دھیرے سے بولا۔ ”معاف کرنا۔ نہ جانے کس روز مری میں، میں نے یہ بات کہہ دی۔“ اس وقت میری آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے۔

☆ ☆ ☆ دو سال پہلے تک سب کچھ ٹھیک تھا۔ زندگی بہت آرام دہ اور خوشیوں سے بھری ہوئی تھی۔

میرے باپ کے پاس بہت دولت تھی۔ بہت بڑا کاروبار تھا ان کا۔ اور میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ میں نے خوشیوں کے ان خوب صورت دنوں کے درمیان یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ اچانک سب کچھ بدل جائے گا۔

یہ بدلاؤ پاپا کے ایک دوست جلال کی وجہ سے آیا تھا۔ کسی زمانے میں پاپا نے اس آدمی سے بہت بڑی رقم قرض کے طور پر لی تھی۔ پاپا نے کئی بار اس کی رقم واپس کرنی چاہی۔۔۔ لیکن اس نے ہر بار رقم لینے سے انکار کر دیا۔ وہ یہی کہتا رہا۔ ”ارے نہیں بھائی، اس وقت ہمیں ضرورت نہیں ہے۔“

”پھر بھی تمہارا قرض تو ہے۔“ ”قرض تو ہے لیکن تمہارے سر پر جبر کی کوئی تلوار نہیں ہے۔“ وہ کہا کرتا۔ ”جب مناسب سمجھوں گا، تم سے واپس

لے لوں گا۔“

پاپا کو اس کی طرف سے اطمینان تھا۔

لیکن جب پاپا بینک کے ایک معاملے اور کاروباری طرف سے پریشان ہو گئے تو جلال نے پیسوں کا تقاضا شروع کر دیا۔

اس نے پاپا کو پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ پاپا اتنی بڑی رقم ایک ساتھ ادا نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے فوری طور پر دینے سے معذرت کر لی اور اس نے پاپا کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا۔

نہ جانے وہ پاپا سے کب کی دشمنی نکال رہا تھا۔ اس نے ایک عجیب شرط عائد کر دی۔ اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کا رشتہ میرے لیے مانگ لیا۔ اس کا بیٹا کہنا تھا کہ اگر وہ میری شادی اس کے لڑکے سے کر دیں تو وہ قرض کی واپسی کا تقاضا نہیں کرے گا۔

یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی۔

میں نے اس کے بیٹے کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس کی شہرت بے حد خراب تھی۔ وہ لوہو اور بد معاش قسم کا لڑکا تھا۔ میں نے اسے آج تک دیکھا نہیں تھا لیکن اس کی بے شمار کتیں میرے علم میں تھیں۔

ہمارے لیے اس انکار کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے ایک لڑکی کے ساتھ زبردستی شادی رچائی تھی اور بعد میں اسے چھوڑ دیا تھا۔

یہ ایک مشہور کہیں تھا۔ اس لڑکی نے خودکشی کر لی تھی لیکن مرنے سے پہلے اس نے جلال کے بیٹے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ جلال چونکہ ایک دولت مند اور اثر رسوخ والا آدمی تھا اس لیے یہ کیس بادی گیا۔

اس کے علاوہ اس سے انکار کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جلال اس طرح مجھے اور پاپا کو بلیک میل کرنا چاہتا تھا اور ہم کسی بھی صورت زبردستی کی اس شادی کے لیے تیار نہیں تھے۔

جلال کو جب اس انکار کا پتا چلا تو وہ بہت بری طرح تھملا گیا تھا۔ پاپا سے انکار سننے کے باوجود وہ شخص میرے پاس پہنچ گیا۔ ”بیٹا! میں یہ کیسا رہا ہوں۔ تم نے میرے بیٹے کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا ہے؟“

”جی انکل! آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔“

”لیکن کیوں، منصور میں کیا خرابی ہے؟“

”انکل! اس کی خرابیاں آپ خود جانتے ہیں۔ اب میں آپ کی معلوم میں کیا اضافہ کر سکتی ہوں۔“

جلال کے چہرے پر غصے کا رنگ آ کر گزر گیا۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پا کر دے دی تھی۔ ”دیکھو بیٹا! جوانی میں تو ایسی شرارتیں سب ہی کرتے ہیں۔“

”جی ہاں سب ہی کرتے ہیں لیکن شرارت اور بد معاشی میں بہت فرق ہوتا ہے انکل۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے آپ کے بیٹے کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ایک بد معاش اور عیاش قسم کا انسان ہے اس لیے پلیز مجھے اس رشتے کے لیے مجبور نہ کریں۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ وہ چملا کر کھڑا ہو گیا۔ ”وہیے میں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے انکار کر کے اچھا نہیں کیا۔“

”اور میں بھی اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ جب پاپا نے میری طرف سے انکار کر دیا تھا تو پھر آپ کو آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔“

میرے اس دونوک جواب نے شاید اس کے اندر کی خیاثت کو بیدار کر دیا تھا۔ اس نے پاپا کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا۔

پاپا کو اس نے عدالت سے نوٹس بھجوا دیا تھا۔ بہر حال، یہ ایک لمبی چوڑی کہانی ہے، اس شخص نے اپنی کئی حرکتوں کی وجہ سے ہمیں کس طرح برباد کیا۔ پاپا نے اپنی ساکھ اور عزت بچانے کے لیے اپنی فیکٹری فروخت کر کر دی۔ اس کے قرض واپس کیے۔ بینک والوں کو رقم لوٹائی۔ اس چکر میں وہ بیمار پڑتے چلے گئے۔ انہیں دل کا عارضہ ہو گیا۔

ہمارا خوب صورت مکان ان کے علاج کے لیے فروخت ہو گیا۔ پھر یہ ہوا کہ پاپا چل بسے۔ اور ان کے چند مہینوں کے بعد ہی کا بھی انتقال ہو گیا۔

رشتے داروں کی طرف سے تو ویسے بھی کسی سپورٹ کی امید نہیں تھی۔ اس لیے میں نے جاب کر لی اور کرائے کے ایک فلیٹ میں چلی آئی۔

یہ تھی میری زندگی کی پوری داستان۔ اس دوران شاید سلاطنت ہو گئی۔ اس کی باتیں بہت خوب صورت تھیں۔ بہت جلد بے تکلف ہو جانے والا شخص تھا۔ لہذا میری اس سے دوستی ہو گئی۔

اور اب میں اس کے ساتھ طوفانی بارش میں مری کے ایک فلیٹ میں موجود تھی۔

☆☆☆

اس کمرے میں اچھی خاصی سردی تھی۔

شاہد نے مجھے ایک سوئی سی شال لاکر دے دی تھی۔ اس شال کو لپیٹ لینے کے بعد ٹخنک کا احساس کچھ کم ہو گیا تھا۔

”کیا بات ہے، کھڑکی سے باہر کیا دیکھ رہی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”کچھ نہیں، اتنے اندھیرے میں کیا دکھائی دے گا؟“ میں نے کہا۔ ”وہیے یہ اپارٹمنٹ بہت اچھا ہے۔“

”ہاں اور یہ عام طور پر میرے ہی استعمال میں رہتا ہے۔“

”اور تم یہاں آ کر کیا کرتے ہو؟“

”کوئی خاص نہیں۔ جب دنیا اور دنیا والوں سے کوفت ہونے لگتی ہے تو یہاں آ کر چھپ جاتا ہوں۔ چائے پیو گی؟“

”ہاں لیکن میں بناؤں گی۔“

”کیوں، تم کیوں بناؤ گی؟“

”اس لیے کہ مجھے چائے پانا اچھا لگتا ہے۔“

”اوکے، جاؤ سامنے کچن ہے۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں کچن کی طرف جانے لگی اور وہ میرے سامنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت اس کے چہرے کی عجیب کیفیت تھی۔

”اس طرح تو نہیں جانے دوں گا۔“ وہ شرارت آمیز انداز میں بولا۔

”شاہد! ہٹ جاؤ ایک طرف۔“ میں نے اس کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ ”ورنہ میں اسی موسم میں باہر چلی جاؤں گی۔“

”اچھا بھئی ہٹ گیا۔“ وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولا۔ ”لیکن کچن میں تو تمہارے ساتھ رہا ہوں گا۔“

”وہ کس خوشی میں؟“

”تمہیں کچن میں کام کرتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”اچھا بابا آ جاؤ۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔ وہ کچن میں میرے پاس ہی کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں لاؤنج میں اپنی اپنی پیالی لیے بیٹھے تھے۔ شاہد کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ ”اس طرح کیا دیکھے جا رہے ہو؟“

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ کون لوگ تھے جو تمہیں فون کر رہے تھے؟“ اس نے کہا۔

”ہاں۔“ میں چونک پڑی۔ ”میرے ذہن سے تو ان کا خیال نکل ہی گیا تھا۔“

”کیا چاہتے تھے وہ؟“

”اب میں یہ کیا بتا سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”وہیے پہلے کبھی ایسی بات نہیں ہوئی۔“

”اچھا، تم یہ بتاؤ، کیا میں تمہارا دشمن ہو سکتا ہوں؟ اور وہ بھی اس حد تک کہ تمہارے گل کی پلانٹ کرنے لگوں۔“

”کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ میں دھیرے سے بولی۔ ”انسان کی فطرت کا آسانی سے اندازہ نہیں ہوتا کیونکہ میں لوگوں کو بدلتے اور بے رحم ہوتے دیکھ چکی ہوں۔ اس کی مثال وہ جلال تھا۔ میں جس کے بارے میں تمہیں بتا چکی ہوں۔“

”ہاں ہاں، بتا چکی ہو مجھے۔“ وہ کچھ چملا کر بولا۔

”لیکن بار بار اس تذکرے سے کیا فائدہ؟“

”فائدہ کچھ نہیں ہے شاید... فائدہ تو ہم نے کبھی حاصل ہی نہیں کیا۔ میں تو یہ سوچتی رہتی ہوں کہ لوگوں کے کتنے چہرے ہوتے ہیں۔ ایک طرف انتہائی مہربان اور دوسری طرف انتہائی بے رحم۔“

”میرے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

”تم بھی ایک عام انسان ہو اس لیے تمہیں دوسروں سے الگ نہیں سمجھتی۔“ میں نے کہا۔ ”تمہاری آنکھیں یہ بتا رہی ہیں کہ تم میرے لیے خطرناک بھی ہو سکتے ہو۔“

”ہو نہیں سکتا بلکہ ہوں۔“ اس نے اچانک میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”اب بتاؤ، کیا تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو۔ اگر میں نہ چاہوں تو کیا تم یہاں سے نکل سکتی ہو؟“

”ہاں۔“ میں نے اس کے ہاتھ سے گرفت چھڑالی۔

”میں چاہوں تو یہاں سے جا بھی سکتی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”والدین کی موت کے بعد جب مجھے تنہائی کا احساس ہوا... اور یہ خیال آیا کہ میں انسان تھا بھیڑیوں کے درمیان اکیلی رہ گئی ہوں تو میں نے اپنے آپ کو مضبوط بنانا شروع کر دیا۔“

سلیف ڈیفنس کے ہر حربے سے واقف ہوں۔ اب کوئی بھی اتنی آسانی سے مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ دومنٹ میں اس کی ہڈیاں تو زرد کر رکھ دوں گی۔“

”واہ، تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔“ وہ ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی مجھے اس وقت بہت کھوکھلی محسوس ہوئی تھی۔

”خیر، اب تو معلوم ہو گیا نا۔“ میں مسکرا دی۔ ”اچھا اب نوٹس سونے جا رہی ہوں۔“

2011

سے خوف زدہ ہو کر توفرا ہوئی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس وقت اس کا فون مجھے بہت بڑے سہارے کی طرح محسوس ہوا۔ ”روٹی کہاں ہو؟“ ”کیسی ہو؟“ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ ”میں نہیں جانتی، میں کہاں ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”میں کسی جگہ نہیں گئی ہوں۔ ایک بوزے آدی کے ساتھ آئی تھی۔“

”کون سی جگہ ہے۔ خدا کے لیے کچھ بتاؤ۔“

”میں نے کہا تھا کچھ نہیں معلوم۔ بس ایک کمرہ ہے اور باہر کچھ لوگ بیٹھے ہیں۔ ان میں ایک عورت بھی ہے۔ اور ہاں اتنا معلوم ہے کہ یہ کمرہ کسی پھاڑی کے دامن میں ہے۔ کچا مکان ہے۔“

دروازے پر دستک ہونے لگی۔ میں نے موبائل آف کر دیا۔ اس عورت کی ہدایت پر میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ ”کون ہے؟“ میں نے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔

”میں ہوں۔“ اس عورت کی آواز آئی۔ ”کھول دو دروازہ۔“

میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ عورت ٹرے میں چائے لیے کھڑی تھی۔ کچھ ہلکتے بھی اپنے ساتھ لائی تھی۔ ”یہ لو۔“ اس نے ٹرے میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔ ”چائے پی لو۔“

اس نے یہ جملہ بلند آواز میں کہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے آنکھ سے ایسا اشارہ کیا۔ جیسے وہ چائے پینے سے منع کر رہی ہو۔ اس نے شاید کسی کو سنانے کے لیے اونچی آواز میں چائے پینے کو کہا تھا۔ میں نے اس کا اشارہ سمجھ کر اس کا شکریہ ادا کر کے ٹرے لے لی۔

دروازہ بند ہو گیا۔ اب میں پھر کشش میں مبتلا ہو گئی۔ اس عورت نے واضح طور پر چائے پینے سے منع کیا تھا۔ یعنی اس چائے میں کوئی چیز ملا دی تھی۔

لیکن وہ عورت تو انہی کی ساتھی تھی پھر میرے ساتھ اتنی ہمدردی کس لیے۔ وہ بھی خدا کی طرف سے میری مدد تھی۔ نہ جانے چائے پینے کے بعد میرا کیا حشر ہوتا۔

میں نے چائے ایک کوٹے میں پیچنک دی اور خود چار پانی پر لپٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ان لوگوں نے اسی لیے ایسی چائے دی ہوگی کہ میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاؤں۔

پندرہ میں منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ میں

آہیں بند کیے لیٹی رہی۔ دوبارہ دستک ہوئی۔ اس بار بھی میں خاموش رہی اور اچانک موبائل پھر بج اٹھا۔ میں نے اس بار موبائل ہی آف کر دیا۔ وہ یقیناً شاہد ہی ہوگا۔ اس کا شکار اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا ایسے ہی اس کی بے قراری سمجھ میں آ رہی تھی۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی مرد کی آواز آئی۔ ”گم بخت نے دروازہ اندر سے بند کر رکھا ہے۔“

”ہاں، ویسے بے ہوش تو ہو گئی ہوگی۔“ یہ دوسری آواز تھی۔

”اب اندر کیے جائیں؟“

”کھڑکی سے۔“ دوسرے نے کہا۔ ”کھڑکی کا پت بہت آسانی سے نکل جاتا ہے۔“

یہ سنتے ہی میں جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ کھڑکی کا پت میرے لیے بھی ایک راستہ ہو سکتا تھا۔ میں نے کھڑکی کے پاس جا کر کھڑکی کو ایک جھکاؤ یا اور اس کا پت باہر آ گیا۔

اب میں بڑی آسانی سے باہر جا سکتی تھی۔ میں نے ایک لمبے کی تاخیر کے بغیر باہر اندر میرے میں چھلانگ لگا دی اور ایک طرف دوڑتی چلی گئی۔

نہ جانے میری قسمت میں کیا لکھا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک تو صرف شاہد میرا دشمن تھا لیکن اب نہ جانے کتنے ہو گئے تھے۔ کھڑکی سے باہر جھانپاں تھیں۔

اندھیرا تھا اور سرد ہوا میں تھیں۔ میں وہاں رک کر یہ نہیں دیکھ سکتی تھی کہ میرے فرار ہونے پر ان کا کیا رد عمل ہوا ہوگا۔ بس میں ایک طرف دوڑتی چلی گئی۔

ایک بار پھر وہی سی دوڑ تھی۔ خوف پھری۔ بلا کی تعاقب کرتی ہوئی۔ موبائل کی کھنٹی پھر بجنے لگی تھی۔ میں دم لینے کے لیے ایک جگہ رک گئی۔ وہ شاہد ہی تھا جو مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں کہاں ہوں اور میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟

”شاہد! میں اس مکان سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”تھینک گاڈ اور اس وقت کہاں ہو؟“

”یہ میں نہیں جانتی۔ بس دوڑ رہی ہوں۔ سامنے گاڑیوں کی روشنائی نظر آ رہی ہیں۔ شاید وہ مین روڈ ہے۔ میں وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہوں۔“

”ہاں ہاں، تم وہاں پہنچو، میں بھی آ رہا ہوں۔“

میں گاڑیوں کی روشنیوں کی طرف چل دی۔ اس بار بہت دیکھ بھال کر راستے طے کر رہی تھی۔ حالانکہ اندھیرا ویسا

ہی تھا۔ اس کے باوجود میں بچتی بچاتی ہوئی روڈ تک آئی گئی۔ یہاں تو اونچی خاموشی رونقیتی۔

کچھ کہیں بنے ہوئے تھے۔ جن میں کھانے پینے کی چیزیں رک رہی تھیں۔ دو تین گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ جن میں عورتیں اور بچے تھے۔ یہ سب کچھ کھانے پر ہے تھے۔ کوئلہ رنگ بنی رہے تھے۔

یہاں آ کر اطمینان سا محسوس ہوا۔ وہ لوگ کم از کم یہاں مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے تھے۔

ایک دکان پر بورڈ لگا ہوا تھا۔ ”ماریا باربی کیو“ ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی مشہور جگہ ہو۔ اس بھاگ دوڑ کے درمیان میرا بیگ میرے ساتھ رہا تھا۔

میرا موبائل سیٹ بھی اسی میں تھا۔ مجھے یاد آیا کہ مری کے مکان سے فرار ہوتے وقت میں نے میز پر رکھا ہوا اپنا بیگ اٹھا لیا تھا۔ وہی اس وقت میرے کام آ رہا تھا۔

میں نے روشنی میں دیکھا۔ بیگ میں پانچ چھ سو روپے تھے۔ میں نے اپنے اعصاب کو سکون دینے کے لیے ایک کوئلہ رنگ منگوا لی اور اس کی ہلکی ہلکی چسکیاں لے لی رہی تھی کہ اچانک کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں تقریباً اچھل ہی پڑی۔

یہ وہی عورت تھی اس مکان والی جو مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

میں اس وقت ایک چھوٹے سے کمرے میں تھی۔ یہ کمرہ اس عورت کا تھا۔ اس نے اپنا نام جیلہ بتایا۔

جیلہ مجھے اس کمرے میں لے آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ ان کم بختوں کو اس کمرے کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔

”بی بی جی، میں سمجھتی تھی کہ آپ کمرے سے نکل کر اس طرف آ رہی ہوں گی۔ کیونکہ سڑک کی روشنائی دور سے نظر آ جاتی ہیں۔ اسی لیے میں بھاگ کر یہاں آ گئی۔ اور آپ کو دیکھ لیا۔“

”یہ سب کیا ہے جیلہ؟“ میں نے پوچھا۔ ”کون لوگ ہیں یہ؟“

”بڑے ظالم لوگ ہیں جی۔“ جیلہ نے کہا۔ ”وہ بوڑھا ایک نمبر کا بدعاش ہے۔ وہ لڑکیاں گھیر کر لاتا ہے اور یہ لوگ انہیں بیچ دیتے ہیں۔“

”او خدا یا! میں کانپ کر رہ گئی۔“ یہ بتاؤ، تم مجھ پر کیوں مہربان ہو گئی ہو؟“

”آپ کو دیکھ کر دل نے کہا کہ ان بی بی کو بچانا ہے۔“

جیلہ نے کہا۔ ”میں نے کہا۔“

ایک بچہ جاتے والے طلبہ کے لیڈر نے مگر ڈراموں سے پوچھا۔ تمہاری کسی مہم ناولوں دوست آرام سے بیٹھ سکیں گے یا تم پیدل چلنا پسند کر گے؟“

”میرے لیے نچے اتارنے کی کوشش مت کرنا۔ میں نے فریضہ پشانی ہے۔“

”اب تباہی ہو چکی ہے آدھا لٹا سدا تر چکا ہوں؟“

”جی (دلزم سے) تمہارا کوئی بیکل نہیں ہے؟“

”مذہم! میں جناب والا۔ میں نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”تمہارا بھائی مجھے تم آدھا لٹا رہا ہے اور آج تک اس نے ایک پیسہ بھی ادا نہیں کیا۔“

”ممن! وہ بچپن ہی سے بچت کا عادی ہے۔“

بس خدا نے دل میں نیکی ڈال دی۔ میں تو بے یی اسنے گناہ کر چکی ہوں جی۔ ہو سکتا ہے میری یہ نیکی خدا کو پسند آ جائے۔“

”ضرور پسند آئے گی جیلہ۔“ میں نے کہا۔ ”تم اتنی اچھی ہو کر ان لوگوں کے پنگل میں کیسے پھنس گئیں؟“

”بس جی، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“ جیلہ نے ایک گہری سانس لی۔ ”آپ تو جی اپنے بارے میں بتائیں۔“

آپ کے ساتھ کیا ہوا۔ آپ کہاں بھاگتی پھر رہی ہیں؟“

”کیا بتاؤں جیلہ۔۔۔ میں ایک بد قسمت لڑکی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”میرے ساتھ ایسے ایسے قاتلے ہو رہے ہیں کہ میں پاگل ہو کر رہ گئی ہوں۔“

”بتائیں جی، شاید میں آپ کے کسی کام آ سکوں۔“

”جیلہ! یہ بتاؤ، کیا تم مجھے مری سے نکال سکتی ہو؟“

”یہ کون سا مشکل ہے جی۔ سچ سو رہے اتنی وکٹیں اسلام آباد کے لیے چلتی ہیں۔ آپ کسی میں بیٹھ جائیں۔“

سیدھا اسلام آباد پہنچ جائیں گی۔“

”نہیں جیلہ! یہ اتنا آسان نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ لوگ میرے دشمن ہیں۔ وہ ہر جگہ گرائی کر رہے ہوں گے۔ ان سے بچ کر نکلتا بہت مشکل ہوگا۔“

”تو پھر ایک کام کریں۔ کل دن بھر بیٹیں رہیں۔ مغرب کے بعد مری کا ایک آدمی اپنی گاڑی لے کر روزانہ اسلام آباد جاتا ہے۔ وہ مرغیوں کی چلائی کا کام کرتا ہے۔ گی۔ میں اس سے کہہ دوں گی۔ وہ آپ کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔“

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔“

”لیکن اس کے لیے آپ کو دن بھر اس کوٹھری میں رہنا ہوگا۔“ اس نے کہا۔ ”جبکہ میں ان کینوں کے پاس جاؤں گی۔ ورنہ وہ مجھ پر رشک کرنے لگیں گے کہ میں نے تمہیں آپ کو چھپا کر رکھا ہے۔“

”ہاں، تمہیں ان کو مطمئن کرنا بھی ضروری ہوگا۔“

”اب آپ بے فکر ہو کر جائیں گی۔“ جیلہ نے کہا۔ ”یہاں کوئی نہیں آنے والا ہے۔“

پھر شاید کا فون آگیا۔ اس بار وہ پہلے سے زیادہ پریشان محسوس ہو رہا تھا۔ ”روشی اتم کہاں ہو۔ میں پاگلوں کی طرح تمہیں تلاش کرتا پھر رہا ہوں؟“

”شاید! میں وہاں سے نکل کر ایک محفوظ مقام پر آگئی ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”کون سا محفوظ مقام؟“

”یہ میں نہیں بتا سکتی۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے تم میری طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔“

”خدا یا آخر تمہیں ہوا کیا ہے، تم کیا کرتی پھر رہی ہو؟“ وہ غصے سے بولا۔ ”بے وقوف لڑکی! کیا تمہیں یہ اندازہ نہیں کہ تمہاری جان خطرے میں ہے۔“

”اندازہ ہے اسی لیے تو جان بچاتی پھر رہی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اور خود تم سے بھی۔“

”روشی! پاگل مت بنو۔ بتاؤ کہاں ہو تم؟“

میں نے رابطہ ختم کر دیا۔ ”بی بی! یہ کیا سلسلہ ہے۔ آپ کس سے جان بچانی پھر رہی ہیں؟“

”اس شخص سے جس سے میں نے محبت کی تھی۔“ میں تلخ ہو کر بولی۔ ”لیکن اچھے دن اور اچھی زندگی ہم جیسوں کو راس نہیں آتی۔“

”بتاؤ بی بی، کیا دکھ ہیں آپ کے ساتھ؟“

”پیری داستان سننے والا کوئی ملا تھا۔ کسی نے اتنی ہمدردی کی کسی اسی لیے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جیلہ نے بہت پیار سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”ارے کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ آپ تو بہت حوصلے والی ہیں بی۔ پھر آپ کی آنکھوں میں یہ آنسو کیسے؟“

”جیلہ! میرا حوصلہ اب جواب دیتا جا رہا ہے۔ میں بہت تھک چکی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں بی۔ ایسا نہ نہیں، انسان کو اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔“

اس نے میرے لیے جانے بنا دی۔

میری زندگی کی یہ رات بھی بہت عجیب تھی۔

صرف بھاگ دوڑ ہوئی رہی۔ موت میرے تعاقب میں تھی۔ میں اس سے کتر اکثر لکڑی جاری تھی لیکن کب تک۔ لیکن کب تک۔۔۔

جیلہ چائے بنا کر لے آئی۔ چائے پینے کے دوران میں نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ حیران ہو کر رہ گئی۔ ”اس کا یہ مطلب ہوا جی کہ آپ کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔“

”ہاں جیلہ، جلال نام کے ایک آدمی نے میرے باپ کو تیار کر دیا۔ ہم محتاج ہو کر رہ گئے۔ اور آج سب سے بڑا قسوس یہ ہے کہ میں نے جس سے محبت کی اسی سے میری زندگی کو خطرہ ہو گیا۔“

”بی بی جی! میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ جو کچھ سوچ رہی ہوں۔ وہ سب غلط ہو۔“

”کیا مطلب؟“

”میرے بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ نے جس سے محبت کی ہے۔ وہ واقعی آپ کا دوست اور ہمدرد ہو۔“ جیلہ نے کہا۔

”آپ نے اسے غلط سمجھا ہوا سی لیے وہ آپ کے لیے اتنا پریشان ہو رہا ہے۔“

”لیکن میرے لیے جو فون اتار رہا ہے، وہ کیا ہے؟“

”ہو سکتا ہے کہ فون کرنے والے آپ کو بھکا رہے ہوں۔“ جیلہ نے کہا۔ ”آپ نے شاید کے ہاتھ میں پتوئل دیکھ کر یہ کہہ سمجھ لیا کہ وہ آپ کو مارنے کے لیے آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی اور وجہ ہو۔“

جیلہ بہت منتقل مندی کی باتیں کر رہی تھی۔ اس کی باتیں میرے ذہن کے درمیانے کھول رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ میری آنکھوں سے پٹی فٹی جاری تھی۔ اگر شاید ایسا ہی تھا تو پھر میں نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی۔

”جیلہ! کیا خیال ہے میں شاید کوفن کروں؟“

”خود کر سکتی ہیں۔ آپ کی یہ بھاگ دوڑ تو ختم ہو جائے گی نا۔“

میں نے موبائل پر شاید کا نمبر ملا لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ ”کیا ہوا بی بی؟“ جیلہ نے

پوچھا۔

”پتا نہیں۔ اس کا نمبر نہیں مل رہا ہے۔“ میں نے تھکے ہوئے انداز میں بتایا۔

اور اسی وقت دروازے پر دستک ہونے لگی۔ ہم دونوں ہی بری طرح چونک اٹھے۔ ”خدا خیر کرے۔“ جیلہ نے کہا۔ ”پھر میرا ہاتھ تمام کراہی کوٹنے میں لے آئی۔ یہاں پانی کا ایک بڑا سا ڈرم رکھا ہوا تھا۔“ اس میں پانی نہیں ہے۔

آپ جلدی سے اس میں چلی جائیں۔“ اس نے کہا۔

دروازے پر دستک ہوئی پھر کسی نے زور سے آواز دی۔ ”جیلہ!“

”جلدی کریں۔“

میں نے اپنے آپ کو سمینا اور اس ڈرم میں داخل ہو گئی۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ میں بے آسانی اس میں داخل ہو گئی تھی۔ جیلہ نے آنکھیں ملے اور جمائی لیتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

”تو کہاں سے آگیا؟“ جیلہ نے کسی سے پوچھا۔

”اتنے سویرے سویرے۔“

”وہ میں سویرے سویرے سیر کو جاتا ہوں نا۔“

آنے والے نے بتایا۔ ”میں نے سوچا تجھ کو بھی ساتھ لے لوں۔“

”پاگل ہو گیا ہے۔ ساری نیند خراب کر دی۔ جادو ہو جا۔“

”نہیں، میں تو تجھ کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

”نہیں میں اس وقت نہیں جاؤں گی تو جا۔“

پھر دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور جیلہ نے مجھے پکارا۔ ”آجائیں بی۔ چلا گیا۔“

میں بڑی مشکل سے ڈرم سے باہر آئی۔ ”بڑوس میں رہتا ہے بی بی۔ کچھ پاگل سا ہے۔“ جیلہ نے بتایا۔ ”میرا دماغ خراب کرنے چلا آتا ہے۔“

”جیلہ! میں تو یہ دیکھ رہی ہوں کہ صرف ایک رات گزری ہے۔ لیکن ایسا لگ رہا ہے جیسے دوڑتے دوڑتے صدیاں گزر چکی ہوں۔“

”ہاں بی۔ مصیبت کی ایک گھڑی آرام کی ہزار گھنٹیوں کے برابر ہوتی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”بی بی! آپ ایسا کریں۔ سو جائیں۔ یہاں کوئی نہیں آتا۔ میں باہر سے تالا بھی لگا دوں گی۔ آپ مجھے اس گھر کا پتا سمجھا دیں۔ میں اس آدمی کو لے کر آ جاؤں گی۔“

”پتا تو مجھے بھی ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔“ میں نے

کہا۔ ”اگر موبائل پر اس کا نمبر مل جاتا پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا لیکن اس کا نمبر ہی نہیں مل رہا۔“

”آپ مجھے سمجھائیں تو۔ یہ پورا علاقہ میرا چھانا ہوا ہے۔ میں نہیں کی ہوں۔“

میں اپنی یادداشت سے کام لیتے ہوئے جو کچھ بتا سکتی تھی، وہ اسے بتا دیا۔ ”مجھے لگتی۔“ اس نے گردن ہلائی۔

”میں اس بندے کو لے کر آتی ہوں۔ وہ گھر میرا دیکھا ہوا ہے۔ آپ گھبرانا نہیں۔ گھر میں کھانے پینے کی چیزیں رکھی ہیں۔ بس آپ کھڑکی سے بھی باہر نہیں دیکھیں گی۔“

”ٹھیک ہے جیلہ تم جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس کے نمبر پر فرائی بھی کرتی رہوں گی۔“

جیلہ چلی گئی۔ اس نے باہر سے دروازہ بند کر دیا بلکہ تالا بھی لگا دیا تھا۔ میں اب پوری طرح حالات کے رحم و کرم پر تھی۔ نہ جانے میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

یہ جیلہ بھی ایک اجنبی عورت تھی۔ میں نے نہ جانے کیوں اس پر بھروسہ کر لیا تھا۔ اب میں اس کے رحم و کرم پر تھی۔ اس نے باہر سے دروازہ بند کر دیا تھا اور یہ میں نے جیلہ ہی دیکھ لیا تھا کہ کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ پچھلے کمرے میں ایسا نہیں تھا۔ اسی لیے میں آسانی سے فرار ہو گئی لیکن اس کمرے سے لکھنا مشکل تھا۔

اچانک موبائل کی گھنٹی بج گئی۔

یہ شاید کا نمبر نہیں تھا، یہ کوئی اور تھا۔ وہی جو مجھے شاید کے خلاف بھڑکایا کرتا تھا۔ ”تم اس وقت کہاں ہو؟“ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

”کیوں، کیا تمہیں یہ بتانا ضروری ہے؟“

”بے وقوف لڑکی! تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ شاید تمہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہے۔ کیونکہ تم اس کے چنگل سے نکل بھاگی ہو۔“

”اوہ، بہت فکر ہے تمہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں شاید کے چنگل سے نکل کر تمہارے چنگل میں پھنس جاؤں؟“

”دیکھو روشی! میں ہمدرد ہوں تمہارا۔ حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم بہت بڑے عذاب میں ہو۔ بتاؤ اس وقت کہاں ہو؟“

”میں خود نہیں جانتی کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔“

میں نے بتایا۔ ”کسی نے مجھے پناہ دی ہے۔ میں اسی کے پاس ہوں۔“

”کس نے پناہ دی ہے؟“

”ایک عورت ہے۔ جیلہ نام کی۔“ میں نے کہا۔ ”وہ

مجھے کمرے میں بند کر کے گئی ہے۔ باہر تالا لگا ہے۔
 ”اودھا، آخر تم کسی پکڑ میں پکڑ نہ گئیں۔ خیر، تم مجھے
 لوکیشن تو بتا سکتی ہو نا؟“
 ”میں کچھ بھی نہیں بتا سکتی۔ کیونکہ یہاں بالکل اجنبی
 ہوں۔“
 ”شہر۔ تمہارے لیے کچھ کرنے کی کوشش کرتا
 ہوں۔“

بیرونی دنیا سے رابطہ قائم ہو گیا۔ نہیں معلوم کہ وہ دوست
 تھا یا دشمن۔ دوستی اور دشمنی کی لکیریں بھی بھی ایک دوسرے
 کے ساتھ ساتھ چلتے لگتی ہیں۔ اور دوست دشمن کا اندازہ کرنا
 دشوار ہو جاتا ہے۔

اس وقت میں نے سچے دل سے دعا کی کہ خدا مجھے
 راستہ دکھا دے۔ میرے ساتھ زندگی جو ٹھیک کر رہی ہے، وہ
 ختم ہو۔ میں نے سنا تھا کہ اس قسم کی دشمنی کی صرف ایک وجہ
 ہوتی ہے اور وہ ہے دولت۔

لیکن میرے پاس تو دولت نام کی کوئی چیز ہی نہیں
 تھی۔ میں تو بالکل مفلس ہو چکی تھی۔ پھر میرے خلاف ایسی
 سازشیں کیوں ہو رہی تھیں۔

میں نے دروازے پر جا کر دروازہ کھولنے کی کوشش
 کی لیکن وہ باہر سے بند تھا۔ نہ جانے وہ عورت شاید تک پہنچ
 بھی سکے گی یا نہیں۔ شاید کافون تو مسلسل بندل رہا تھا۔

میں نے وقت گزارنے کے لیے کمرے کا جائزہ لیا۔
 نوٹے پھوٹے فرنیچر کے سوا وہاں اور کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک
 جگہ چائے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ اس کے پاس ہی بسکون
 کے ڈبے تھے۔

کھانے پینے کی چیزوں میں بس یہی سامان تھا۔
 عورت واپس آ کر ہی نہیں دے رہی تھی۔ اس کو گئے
 ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں نے اس دوران اپنے لیے
 چائے بھی بنالی۔ بسکٹ بھی کھائے۔ وقت کسی طرح گزرنے
 کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

پھر کچھ سوئے جاگئے، انتظار کرتے شام ہو گئی۔ اس
 عورت کی واپسی نہیں ہوئی۔ نہ جانے کہاں جا کر رہ گئی تھی یا
 اس کے ساتھ کیا حادثہ ہوا تھا۔

پھر اندھیرا اتر آیا۔ اور میں اس قید میں بیٹھی رہ گئی۔
 اچانک دروازے پر دستک ہونے لگی۔ یہ یقیناً جیل
 نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر جیل ہو تو اسے دستک دینے کی
 ضرورت نہیں تھی۔ یہ کوئی اور تھا۔

پھر کسی کی آواز آئی۔ ”دروازہ کھولو جیل۔ اب تو سیر کو
 چلو۔“
 یہ وہی پاگل تھا جس کے لیے جیلہ نے بتایا تھا کہ
 پڑوس میں رہتا ہے۔ ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں
 جلدی سے دروازے کے پاس آئی۔ ”سنو۔ دروازہ باہر
 سے بند ہے کھول دو۔“
 ”ارے، تم کون ہو؟“

”میں جیل کی مہمان ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”پھر میں
 تمہارے ساتھ سیر کو چلوں گی۔ اتنی دیر میں جیلہ بھی آ جائے
 گی۔“

”اچھا، تو تم میرے ساتھ سیر کو چلو گی۔“
 ”ہاں ہاں، بتا رہی ہوں نا۔“ میں نے کہا۔ ”تم
 دروازہ تو کھولو۔“

”اس میں تالا نہیں لگا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ تو ابھی
 کھل جائے گا۔“
 ”تو کھولو، سنا نہیں۔“

اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے ایک
 مجہول سا آدمی کھڑا تھا۔ ”ارے واہ۔ تم جیل کی مہمان
 ہونا؟“

”ہاں، میں اس کی مہمان ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”چلو
 تم مجھے روڈ تک لے چلو۔“
 ”چلو۔ روڈ اس طرف ہے۔“

اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔
 اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکا، میں نے اسی سمت
 دوڑ لگا دی۔ ایک بار پھر اندھیری رات اور میرا فرار۔ وہ بے
 چارہ آواز ہی دیتا رہا لیکن میں دوڑتی چلی گئی۔

روڈ سامنے تھی اور میں کی ٹھوٹا جگہ کی تلاش میں تھی۔
 میں گرتی پڑتی ہوئی کسی نہ کسی طرح روڈ تک پہنچ ہی گئی۔
 یہاں گاڑیاں چل رہی تھیں۔ دکانیں کھلی تھیں۔ انسان دکھائی
 دے رہے تھے۔

میں نے ابھی اپنی سانسیں درست ہی کی تھیں کہ دو
 آدمی میرے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک
 وہی باپا تھا۔ جو مجھے اس مکان میں لے گیا تھا اور دوسرا وہ شخص
 تھا جس کو میں نے کمرے میں دیکھا تھا اور ان دونوں
 آدمیوں کے پیچھے جیلہ کھڑی تھی۔

”اوہ تو یہ کھیل ختم ہو گیا۔“ میں نے باپوی سے سوچا۔
 ”ہم سے کہاں بھاگے گی۔“ وہ آدمی غرایا۔ ”تم اس
 باؤلے کو دھوکا دے کر بھاگی ہو نا۔ اسی نے بتایا کہ تم اس

طرف آئی ہو۔“ پھر اس نے جیل کی طرف دیکھا۔ ”اور تو۔
 تجھ سے تو ہم بعد میں نمیش گے۔ ہمارا کھانا کبھی سے غداری
 کرتی ہے۔“
 جیل کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ اس کی گردن پر نیل کے
 نشانات تھے۔ جو یہ ظاہر کر رہے تھے کہ اس پر تشدد بھی کیا گیا
 ہے۔ شاید وہ جبر تشدد ہوتا رہا ہو۔ بالآخر اس کی ہمت اور
 برداشت جواب دے گئی ہو اور اس نے یہ بتا دیا ہو کہ وہ مجھے
 کہاں چھپا کر آئی ہے۔

”اب چل ہمارے ساتھ۔“ اس آدمی نے میرا ہاتھ
 تھام لیا۔
 ”نہیں، کیا سمجھ رکھا ہے مجھے؟“
 ”چلتی ہے یا نہیں۔“

اسی وقت میں نے ایک زوردار ٹھوکر اس کی ناف کے
 نیچے رسید کر دی۔ اس نے بھی سوچا بھی نہیں ہو گا۔ وہ ایک
 بھیا تک پیچ کے ساتھ سڑک پر ہی لوٹنے لگا۔ میں نے کرائے
 کا ایک بھرپور ہاتھ اس بوڑھے کو بھی رسید کر دیا۔ وہ بھی ڈھیر
 ہو گیا۔

”چلو جیلہ جلدی۔“ میں نے کہا۔
 ”نہیں بی بی۔ تم جاؤ۔ جان بچاؤ اپنی۔ میں نہیں جا
 سکتی۔ میرا تو مرنا جیتانا کم سختوں کے ساتھ ہے۔ تم جاؤ۔“

اور میں ایک بار پھر وہاں سے چل دی۔
 اس بار بھی راستے کا کوئی تعین نہیں تھا۔ بس چلتے جانا
 تھا۔ خدا جانے کس طرف۔ کہاں؟ پھر کسی گاڑی کی روشنی میں
 نہانگی۔ گاڑی مجھ سے کچھ فاصلے پر آ کر رکتی گئی۔

اور کوئی گاڑی سے اتر کر میری طرف آنے لگا۔ میں
 خوف زدہ رہتی کی طرح بھڑک اٹھی پھر اس نے آواز دی۔
 ”روٹی روٹی!“

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ یہ شاید تھا۔ اس

نے میرے قریب آ کر بہت بے تابی سے مجھے پکڑ لیا تھا۔
 ”خدا کی پناہ! تم نے تو پاگل بنا کر رکھ دیا ہے۔ کہاں کہاں
 تلاش کرتا رہا ہوں۔ دیکھ رہی ہو میری حالت۔ دونوں سے
 ایک لمحے کا سکون نہیں ہے۔“
 ”مکار۔“ میں نے اپنے دل میں سوچا۔
 شاہد مجھے اپنے اپارٹمنٹ میں لے آیا تھا۔

☆☆☆
 دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے بیدار کر
 دیا۔

دن نکل آیا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ میں خاصی دیر
 تک سوئی رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور دروازے پر
 لڑکی کود کچھ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

وہ لڑکی دراصل ایک عورت تھی۔ چوتیس پچیس برس
 کی۔ بہت خوب صورت، اسماٹ۔ اس کے ہاتھ میں چائے
 کی ٹرے تھی۔

”صبح بخیر۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ لیں
 آپ کے لیے چائے حاضر ہے۔“
 ”لیکن... آج تم کون ہو؟“

”ارجمند نام ہے میرا۔“ اس نے بتایا۔ ”فی الحال تم
 شاوہ لے کر چائے وغیرہ پی کر لاؤ گے میں آ جاؤ۔ ہم وہاں
 تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

میں نے چائے کی ٹرے اس کے ہاتھ سے لی۔
 ارجمند مجھے اچھی لگی تھی۔ انسان کا چہرہ اس کے دل کا
 آئینہ ہوتا ہے۔ اس کا چہرہ بہت صاف تھا۔ تو اس کا دل بھی
 صاف ہو گا لیکن وہ بھی کون؟

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ شاید نے رات کے وقت اس کو
 بھی بلا لیا ہو۔ اس کے انداز... بتا رہے تھے کہ وہ اس
 اپارٹمنٹ کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ اس کا یہاں آنا جانا لگا

اہم انتخاب

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ مشترکین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضابطہ کردی جاتی ہے، قارئین رابطہ یا معلومات کے لیے براہ راست مشترکین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

رہتا ہوگا۔

بہر حال، جب میں لاؤنج میں پہنچی تو وہاں اس ارجنڈ کے علاوہ شاید اور ایک شخص بھی تھا۔ گوارنگ اور بلیک لیکن مٹھی مونچھوں نے اسے خاصا دلکش بنا دیا تھا۔
”روٹی“ شاید مجھے مخاطب کیا۔ ”ان سے ملو۔ یہ ہیں میرے دوست ارسلان۔ اور یہ ان کی سزا رجمند۔ یہ اپارٹمنٹ ان ہی کا ہے۔ تم تو سوری نہیں۔ یہ دونوں رات کو آئے تھے۔“

ادوب معاملہ واضح ہو گیا۔

کچھ دیر بعد ہم ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ دونوں میاں بیوی بہت خوش اخلاق اور زندہ دل ثابت ہو رہے تھے۔

”ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے شاید سے کہا۔
”شاید امیر انجیل ہے کہ اب ہمیں واپس جانا چاہیے۔“
”اتنی جی کیا جلدی ہے، دو چار دن رک جاؤ۔“
ارجنڈ نے کہا۔

”نہیں، رکنا مشکل ہوگا۔“ شاید بھی بول پڑا۔ ”میں نے سوچا ہے کہ میں روٹی کا امتحان لیتا ہوا چلوں گا۔“
”کیا امتحان؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”تمہاری ڈرائیونگ کا۔ تم کہتی ہونا کہ تمہاری ڈرائیونگ بہت اچھی ہے۔ تو میں وہی دیکھنا چاہتا ہوں۔“
”ڈرائیونگ تو اچھی ہے لیکن مری کی خطرناک سڑکوں پر میں گاڑی نہیں چلا سکتی۔“ میں نے کہا۔
”تم تو بہت حوصلے اور بہادری کی باتیں کر رہی تھیں پھر کیوں ڈر رہی ہو؟“

”شاید! کیا بے وقوفوں جیسی بات کر رہے ہو۔“
ارسلان نے بھی کہا۔ ”اچھے اچھے مردوں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور تم بے چاری روٹی سے کہہ رہے ہو۔“
”تو یہ کہہ دیں کہ عورت ایک کمزور مخلوق ہے۔“

”نہیں، میں یہ نہیں کہوں گی۔“ میں جلدی سے بول پڑی۔ ”شاید مجھے تمہارا بیٹہ منظور ہے۔“
”یہ بات ہوئی نا۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”اب تم یہاں سے اکیلی گاڑی چلائی ہوئی گھوڑا تک جاؤ گی۔ وہاں ہم سب تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”شاید یہ طاقت مت کرو۔“ ارجنڈ نے کہا۔
”نہیں ارجنڈ۔“ میں نے ارجنڈ کی طرف دیکھا۔
”میں اتنی کمزور دل کی نہیں ہوں۔ میں وہی کروں گی جو شاید

چاہتا ہے۔“

”تو پھر یہ طے پایا کہ ہم تم سے پہلے گھوڑا گلی کی طرف نکل جائیں گے۔“ شاید نے کہا۔
لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔

شاہد کی گاڑی کا انجن ہی سیز ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے طور پر بہت کوشش کر کے دیکھ لی لیکن انجن اشارت ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔
”کیا ہو گیا ہے اس کم بخت کو؟“ وہ گاڑی کو ٹھوکر مارتے ہوئے بولا۔

”اب تم اپنی گاڑی بیٹیں رہنے دو۔“ ارسلان نے کہا۔ ”یہ مقابلہ اب ختم ہو گیا ہے۔ میں تم دونوں کو اسلام آباد پہنچا دیتا ہوں۔ ہم بھی اسی طرف جا رہے ہیں۔ واپس آ کر تمہاری گاڑی کسی اچھے مکانیک کے حوالے کر دیں گے۔“

شاہد کے تاثرات بہت عجیب ہو رہے تھے۔ شاید اسے اس بات پر مایوسی ہو رہی تھی کہ وہ میری مہارت نہیں دیکھ پایا تھا۔

روانہ ہونے سے پہلے مجھے اپنے بیگ کا خیال آ گیا۔ جسے میں لاؤنج میں یا اپنے کمرے میں بھول آئی تھی۔ میں معذرت کر کے اپارٹمنٹ میں واپس آ گئی۔

میرا بیگ لاؤنج میں نہیں تھا۔ وہ اس کمرے میں ہو سکتا تھا جہاں میں نے رات گزاری تھی لیکن وہ بیگ کمرے میں ہی تھا۔ میں نے عادت کے مطابق اسے چیک کرنے کے لیے جب اس کی زپ کھولی تو ایک انجینی سا کارڈ اس میں رکھا دکھائی دے گیا۔ حیرت انگیز بات تھی۔
وہ گتے کا ایک چوکور ٹکڑا تھا جس پر کسی نے لکھ دیا تھا۔
”خطرہ۔ تم اپنی جان بچا سکتی ہو تو بچو۔ اور شاید سے دور رہو۔ وہ تمہارا قاتل ہونے جا رہا ہے۔“

میں کانپ کر رہ گئی۔
کئی طرح کے سوالات سانپ کی طرح کلبلانے لگے۔ ایسا کون ہو سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اسلام آباد سے آتے ہوئے اس قسم کی کوئی چیز میرے بیگ میں نہیں تھی اور اب کہاں سے آ گئی تھی۔

اس اپارٹمنٹ میں تو صرف شاہد تھا۔ یادہ دونوں تھے جو بعد میں آئے تھے۔
پھر یہ کارڈ کس نے رکھا ہوگا۔ مجھے وہ آدمی بھی یاد آ گیا۔ جس کے شور سے میری آنکھ کھل گئی تھی اور جس نے چوکور خانوں والا کوٹ پہن رکھا تھا۔

میں نے وہ کارڈ دوبارہ بیگ میں رکھ لیا۔ نہ جانے

کیوں میں کسی کو بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اس وقت خاموشی میں مصلحت تھی۔ اگر ان تینوں میں سے کوئی ہوگا تو وہ میرے ہاتھ میں بیگ دیکھ کر اس کے تاثرات کچھ بدل جائیں گے۔ وہ یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ میں نے اس کا لکھا ہوا کارڈ پڑھ لیا تھا۔

لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔
کسی کے تاثرات نہیں بدلے۔ کسی نے تجسس بھری نگاہوں سے میری طرف نہیں دیکھا۔ سب کچھ نازل تھا۔

اسلام آباد آنے تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ ان لوگوں نے میرے فلیٹ کی بلڈنگ کے گیٹ پر مجھے اتارا اور خود واپس چلے گئے۔

میرے سوچنے کے لیے بہت مواد تھا۔
آخر یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا تھا۔ وہ بار بار آنے والی کالز۔ وہ کسی چیز کا گرتا۔ شاہد کی طرف سے خبردار کرنا۔ اور پھر میرے بیگ میں رکھا ہوا کارڈ۔ یہ سب کس کی طرف اشارہ کر رہے تھے؟

☆☆☆

ہم اپنے شہر واپس آ گئے۔
ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے صدیوں کا سفر طے کیا ہو۔
کیسے کیسے واقعات ہوئے تھے۔ کسی کسی پریشانیوں کوئی تھیں۔

موت کس کس انداز سے میرے قریب آتی رہی تھی۔
ایک انسان کے کتنے چہرے میرے سامنے آئے تھے۔ اس میں سفر کو بھلا نہیں سکتی۔ نہ جانے میری ذات سے وابستہ خطرے ختم بھی ہوئے تھے یا نہیں۔

شاہد مجھے چوکور کارڈ واپس چلا گیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کے دوست ارسلان اور ارجنڈ واپس آ گئے ہیں۔
دو دن کے بعد شاہد کا فون آیا۔ اب مجھے اس کی کمی محسوس ہوا کرتی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ وہ میرے قریب رہے۔ مجھے حوصلہ دیتا رہے۔

شاہد مجھے بتا رہا تھا۔ ”روٹی! کیا تمہیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ میری گاڑی کس طرح خراب ہوئی ہوگی؟“
”نہیں، مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔“

”اس کے انجن کو کچھنی ڈال کر سیز کر دیا گیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ بہت عام تکنیک ہے۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ میری گاڑی کے ساتھ ایسا کیوں ہوا اور کس نے کیا ہو گا؟“

اور ایک بار پھر میرے دھیان میں وہ رات آ گئی۔

کیا آپ

لیوب مقوی اعصاب

کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری غبر

زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لیوب مقوی

اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر

لیوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف

دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی

قوت والی لیوب مقوی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی

VP منگوائیں فون نمبر 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (دعوت)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
آپ صرف فون کریں۔ آپ تک
لیوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

جب میں نے کھڑکی سے باہر آواز سنی تھی۔ اور ایک چوکور خانوں والا کوٹ پہنے ایک آدمی یاد آئے لگا۔
تو کیا وہ شخص صرف اس لیے آیا تھا کہ شاہد کے انجن میں چینی ڈال کر اسے سیز کر دے لیکن کیوں؟ کیا وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اس دوڑ میں حصہ لوں۔
کیا اسے معلوم تھا کہ شاہد مجھ سے کہے گا کہ میں مری کی سڑکوں پر گاڑی دوڑائی ہوئی کھوڑا گلی تک پہنچ جاؤں اور یہ بات کس کو معلوم ہو سکتی تھی۔
”روٹی! آج شام کیا کر رہی ہو؟“ شاہد کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔
”کوئی خاص نہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”خیریت؟“
”ایک پارٹی میں چلنا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”یہ بہت خاص قسم کی پارٹی ہے۔ یہاں اس قسم کی تقریبات بالکل بھی نہیں ہوتی ہیں۔“
”کیا خاص بات ہے اس پارٹی میں؟“
”یہ ایک فنی ڈریس شو ٹاپ کی پارٹی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”ہر شخص ماسک پہن کر اس میں شریک ہوگا۔ میں نے اپنے لیے ایک ماسک لے لیا ہے۔ تم بھی اپنے لیے اپنی مرضی کا ماسک لے لو۔“
”یہ ہے تو بہت ہرنگ۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ایسی پارٹی کا مقصد کیا ہے؟“
”انجوائے منٹ... اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اب میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ میرے پاس کیا ماسک ہے۔ اسی طرح تم بھی اپنا ماسک مجھ سے چھپائے رکھنا۔ ہم دونوں وہاں پہنچ کر ماسک پہن لیں گے۔ اس کا خاص طور پر انتظام کیا گیا ہے کہ مہمان ایک دوسرے کے ماسک سے واقف نہ ہو سکیں۔ پھر سب بڑے ہال میں جمع ہو جائے ہیں اور اصل مزہ وہیں آتا ہے۔“
”اور ایسا ماسک کہاں ملتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”پورے شہر میں صرف ایک ہی اسٹور ہے۔“
Rainy Day وہاں سے مل جائے گا۔“
مجھے بھی یہ یاد دہرا کر سننے میں اچھا محسوس ہوا تھا اسی لیے میں نے ہائی بھری۔ ”اوکے، میں چلوں گی۔ لیکن ماسک لینے کے بعد کیا ہوگا؟“
”پھر تم میرے ساتھ اس مکان میں چلو گی جہاں یہ پارٹی ہو رہی ہے۔“
”لیکن وہ مکان ہے کس کا؟“
”اس شہر کے ایک نوجوان بزنس مین منصور کا۔“ شاہد

نے بتایا۔ ”اس کا باپ بھی ایک بڑا بزنس مین تھا۔ جلال نام تھا اس کا۔“
میرے ذہن میں جیسے طوفان سے اٹھنے لگے۔ یہ وہی جلال تھا میرے خاندان کی تباہی کا ذمے دار۔ منصور اسی کے بیٹے کا نام تھا۔ جس نے میرے لیے اپنا رشتہ بیجا تھا۔ میں نے تو ان کم بختوں کو اپنے ذہن سے جھٹک ہی دیا تھا لیکن آج پھر ان کا ذکر کرنے کو مل رہا تھا۔
وہ بد معاش قسم کا نوجوان اب ایسی پارٹیز کرنے لگا تھا۔ یہ بھی اس کی عیاشی کا ایک پہلو ہو سکتا تھا۔
آج اس کے جھٹکے میں داخل ہونے کا موقع مل رہا تھا لیکن کس انداز میں۔
پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ میں نے شاہد سے کہا۔
”ٹھیک ہے شاہد، میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔ میں جا کر ماسک لے آتی ہوں۔ ایسا موقع تو زندگی میں بھی ملتا ہے۔“
”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ میں ٹھیک سات بجے تمہیں لینے آ جاؤں گا۔“
میں نے اپنے لیے ایک بوڑھی عورت کا ماسک منتخب کیا تھا۔ مجھے اس دکان کے بارے میں اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہاں اس قسم کے ماسک ملتے ہوں گے۔
بوڑھی عورت کا ماسک انتہائی خونی ہے بنایا گیا تھا۔ زبردست کارنگری تھی۔ ہونٹوں کا سٹرواؤ۔ چہرے کی جھریاں۔ سفید بال۔ سب کچھ بالکل اور بچل دکھائی دے رہے تھے۔
شام سات بجے میں شاہد کے ساتھ اس زبردست اور شاندار جھٹکے میں داخل ہو رہی تھی جو ہمارے خاندان کے دشمن کا تھا۔ میں نے شاہد کو اپنے ماسک کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور خود اس نے بھی خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔
اس نے جیسا کہا تھا، ویسا ہی ہوا۔
اس پارٹی میں ایسا اہتمام کیا گیا تھا کہ کسی کو ایک دوسرے کے ماسک کا پتا نہ چل سکے۔
تقریب کے ہال میں بہت گہما گہما تھی۔
طرح طرح کے لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ سب نے ماسک پہن رکھے تھے۔ کوئی چیل بنی ہوئی تھی۔ کوئی بھوت نظر آ رہا تھا۔ کوئی شہزادہ تھا۔ کوئی انارکلی تھی۔
یہ پتا چلانا مشکل تھا کہ کون کس روپ میں ہے۔ میں نے منصور کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن آج اسے دیکھنا چاہتی تھی۔
میرے دل میں اس کے لیے آگ بھڑک رہی تھی۔

ویسے تو میں نے اس آگ کو بہت عرصہ پہلے بجھا دیا تھا لیکن یہاں آنے کے بعد وہ پھر بھڑک اٹھی تھی۔ ہال میں ایک طرف ڈانس ہوا تھا۔ جس پر ایک مینڈ تازہ دھن بجا رہا تھا۔ صرف وہی لوگ ماسک میں نہیں تھے۔ ان کے علاوہ سب نے ماسک پہن رکھے تھے۔
میں اور شاہد یہاں آ کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے۔ اب میں نہیں جانتی تھی کہ وہ کس روپ میں ہال میں موجود ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس ہال میں شاہد کے علاوہ اور کچھ لوگ ہوں جنہیں میں پہچانتی ہوں گی۔ لیکن فی الحال تو کوئی انداز نہیں ہو رہا تھا۔
اچانک موبائل کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔
دوسری طرف سے کہا جا رہا تھا۔ ”مبارک ہو روٹی! تم اپنی موت کے قریب پہنچ چکی ہو۔“
”کون ہو تم؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔
”تمہارا وہی بھروسہ۔ جو تمہیں شاہد سے دور رہنے کے لیے کہتا آیا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”کیا تم یہ بتا سکتی ہو کہ تمہارا دوست شاہد اس ہال میں کہاں ہے؟“
”نہیں، میں یہ نہیں جانتی۔“
”کوئی بھی نہیں جانتا۔“ اس نے کہا۔ ”اگر کوئی کسی کا خون کر دے تو کوئی بھی نہیں بتا سکے گا کہ مارنے والا کون تھا۔“
اتنا کہہ کر دوسری طرف سے موبائل آف کر دیا گیا۔
میں ہلہولہ ہوتی رہ گئی۔ اس وقت ایک انجانا سا خوف میری رگوں میں سرایت کرنا جا رہا تھا۔ یہ واقعی ایک خطرناک پچویشن تھی۔
اگر کوئی بھی کسی کا خون کر دیتا تو ماسک کی وجہ سے کیا پتا چلتا۔ وہ بعد میں اپنا ماسک اتار کر ایک طرف پھینک کر مہمانوں میں آ کر شامل ہو جاتا اور لوگ اس مارنے والے کو تلاش ہی کرتے رہ جاتے۔
لیکن کیوں؟
شاہد مجھے کیوں مارنا چاہے گا۔ اس کی مجھ سے کیا دشمنی تھی۔ وہ تو میرا دوست تھا۔
میں ابھی یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اور اسی وقت اندھیرا چھا گیا تھا۔ ہال میں کئی چیزیں گونج گئیں۔
ہاتھ پکڑنے والے نے ایک جھٹکے سے مجھے ایک طرف کھینچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی گولی چلنے کی آواز آئی۔ ایک بھیا نک سی آواز اور بے پناہ افراتفری۔

ہاتھ تھامنے والا اس اندھیرے میں مجھے ایک طرف دوڑائے لیے جا رہا تھا اور میں اس کے ساتھ تھی۔ بالکل بدحواسی کے عالم میں۔
کئی گھمٹاؤ بھڑاؤ کے بعد اس نے جھٹکے سے مجھے ایک طرف دھکیل دیا اور اسی کے ساتھ روشنی ہوئی۔ میں ایک چھوٹے سے کمرے میں تھی۔
یہاں بہت خوب صورت فرنیچر تھا۔ پورے کمرے میں سفید رنگ نمایاں تھا۔ اور میرے سامنے ایک شہزادہ کھڑا تھا۔ میرا مطلب ہے شہزادے کے ماسک اور گیٹ اپ میں ایک آدمی۔ وہی مجھے یہاں تک لایا تھا۔
”کیا بات ہے، کون ہو تم؟ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟“
”لوکی! اپنی جان بچنے پر شکر ادا کرو۔“ اس نے کہا۔ ”... تمہارے لیے چلائی ہوئی گولی نے شاید کسی اور کی جان لے لی ہے۔“
”کیا؟“ میں سکتے میں رہ گئی۔ ”میری طرف... گولی؟“
”ہاں، تم نے گولی کی آواز تو سن ہی لی ہوگی۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تم پر چلائی گئی تھی لیکن میں نے سین وقت پر تمہیں وہاں سے ہٹا لیا۔“
”میرے خدا! میں پاگل ہو جاؤں گی۔ آخر کون ہے میرا دشمن اور تم کون ہو؟“
”تمہارا دشمن شاہد ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں کئی بار تمہیں فون پر بتا چکا ہوں۔“
”لیکن کیوں؟ وہ میرا دشمن کیوں ہونے لگا۔ میں نے اس کا کیا گناہ کیا؟“
”تم نے اس کی توہین کی۔ اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی توہین کرنے والے کو بھی معاف نہیں کرتے۔“
”لیکن میں نے تو اس کی بھی توہین نہیں کی۔“
”تم نے اس سے شادی سے انکار کر دیا تھا۔“
”میں نے... میں نے کب انکار کیا۔ ہمارے درمیان ایسی بات تو بھی نہیں ہوئی۔“
”روٹی! تم نے مسٹر جلال کے لڑکے منصور سے شادی کرنے سے انکار کیا تھا؟“
”ہاں تو پھر؟“
”شاہد وہی منصور ہے۔ منصور شاہد پورا نام ہے اس کا۔“ اس نے بتایا۔
”نہیں، یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ایسا ہی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اس نے ایک پلاننگ کے تحت تم سے دوستی کی ہے۔ تمہارے قریب آیا ہے۔“

”اور تم...؟ تم کو تو؟“

اس نے اپنا ماسک اتار دیا اور وہ ارسلان تھا۔ شاہد کا وہ دوست جس کا اپارٹمنٹ سری میں تھا۔

میں شاید بے ہوش... ہوتی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ایک بار پھر ہم کبھی اور ملے جا رہے تھے۔ یہ گاڑی ارسلان کی تھی۔ اس نے دوبارہ اپنا ماسک پہن لیا تھا اور مجھے اس پینکے کی بھول بھلیوں سے نکال کر باہر لے آیا تھا۔ پتا چلا تھا کہ میرے دھوکے میں ایک اور لڑکی کو گولی لگ گئی ہے لیکن اس کی حالت تشویشناک نہیں تھی۔

پارکنگ میں ارسلان کی بیوی ارچند گاڑی کے پاس کھڑی تھی۔

پینکے میں ایک افراتفری مچی ہوئی تھی اور ہم کسی طرح وہاں سے نکل آئے تھے۔

گاڑی میں بیٹھ جانے کے لیے ہم تینوں نے ماسک اتار دیے۔ اس وقت میرے ذہن پر دھند طاری تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

ارسلان اور اس کی بیوی مجھے کہاں لے جا رہے ہیں لیکن اتنا احساس ہو گیا تھا کہ یہ دونوں میرے ہمرو ہیں۔ اور مجھے موت کے منہ سے نکال کر لائے ہیں۔

گاڑی پندرہ میں منٹ تک تیز رفتاری سے چلتی رہی۔ رات کی وجہ سے سمت کا اندازہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ بہر حال، گاڑی ایک بڑے سے مکان کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔

”اب تم یہاں محفوظ ہو۔“ ارسلان کی بیوی ارچند نے کہا۔ ”شاہد کے تصور میں بھی نہیں ہو گا کہ ہم تمہیں یہاں لے آئے ہیں۔“

اس وقت ہم اس مکان کے ڈرائنگ روم میں تھے۔

”تم دونوں کا بہت بہت شکریہ۔“ میں نے کہا۔

”لیکن یہ سب آخر ہے کیا۔ وہ مجھے کیوں مارنا چاہتا ہے؟ تم لوگ مجھے کیوں بچا رہے ہو؟ جبکہ تم دونوں شاہد کے دوست ہو۔ اگر یہ وہی منصوبہ ہے تو...“

”ہاں، یہ وہی منصوبہ ہے۔“ ارسلان نے بتایا۔

”جلال کا بیٹا۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ تمہارے پاپا اور جلال دوست ہوا کرتے تھے۔ لیکن تمہارے پاپا کو یہ نہیں معلوم تھا کہ جلال ایک دھوکے باز انسان ہے۔ اس نے تمہاری ساری دولت دھوکے سے اپنے قبضے میں کر لی۔ اور تمہارے پاپا کے

سامنے شرط رکھی کہ منصور ہے اگر تمہاری شادی ہو جائے تو پھر وہ کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔“

”ہاں، یہ سب میں جانتی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اور میں نے بہت سختی سے اس رشتے کے لیے انکار کر دیا تھا۔“

”بس تو شاہد کو یہ گوارا نہیں ہوا۔ وہ اپنی توہین پر بلبلا اٹھا۔“ اس کے باپ نے جو کچھ کیا، وہ تو ایک الگ کہانی ہے لیکن اس نے تم کو مارنے کا منصوبہ بنایا اور ایک پلاننگ کے تحت تمہارے نزدیک آنے لگا۔ اس نے تم سے دوستی کر لی۔ اس کے خطرناک ارادے ہمارے علم میں آ گئے اور ہم تمہیں بار بار آگاہ کرتے رہے۔“

”تو وہ فون تم دونوں کرتے تھے؟“

”ہاں، تمہیں اس کی طرف سے ہوشیار کرنے کے لیے۔“ ارچند نے کہا۔ ”وہ ایک منصوبہ ہی کے تحت تمہیں اپنے ساتھ مری لے گیا تھا۔ اس رات میں اور ارسلان تمہیں خبردار کرنے کے لیے فوری طور پر اسلام آباد سے مری چلے گئے تھے۔ ہمیں اس کی باتوں سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنی گاڑی تمہارے حوالے کر دے گا۔“

”تاکہ تم اسے چلاتی ہوئی خطرناک حادثے کا شکار ہو جاؤ۔“ ارسلان نے بات آگے بڑھائی۔ ”کیونکہ اس نے تمہارے کمرے میں چلے جانے کے بعد گاڑی کے بریک فیل کر دیے تھے۔“

”اوہ گاڑی۔“ میں کانپ کر رہ گئی۔

”اور اسی لیے ارسلان نے اس گاڑی کے انجن میں شکر ڈال کر اسے سیز کر دیا تھا۔“ ارچند نے بتایا۔

”اوہ، تو وہ تم تھے۔“ میں نے ارسلان کی طرف دیکھا۔

”ہاں، وہ میں تھا۔ میں اندھیرے میں کسی چیز سے ٹکرا گیا تھا۔ جس سے تمہاری آنکھ مل گئی اور تم نے کھڑکی کھول کر مجھے دیکھ لیا تھا۔“

”پھر آج کیا ہوا؟“

”وہ ہر سال فینسی ڈریس شو اپنے مکان میں کیا کرتا ہے۔“ ارسلان نے بتایا۔ ”اس بار یہ پارٹی پندرہ دنوں پہلے کی گئی۔ صرف تمہاری وجہ سے۔ تاکہ تمہیں نشانہ بنایا جاسکے اور ہم نے اس کی یہ پلاننگ بھی ناکام بنادی۔“

”لیکن کیوں؟ سوال وہی ہے کہ تم دونوں کو آخر مجھ سے کیوں دلچسپی ہو گئی؟“

”اس لیے کہ تمہارے پاپا جلال صاحب ہمارے پاس ہوتے تھے۔“ ارسلان نے بتایا۔ ”ہم دونوں ہی

تمہارے پاپا کی فرم میں جاب کرتے تھے۔ یہ سمجھ لو کہ ہماری شادی بھی انہوں نے کرانی ہے۔ وہ ہمارے محسن تھے اور ہم ان کے احسانات کا بدلہ اتارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”اوہ تو یہ بات سچی۔“

”ہاں، اب تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم کچھ دنوں تک بیٹھیں رہو۔“ ارچند نے کہا۔ ”وہ اس وقت جھلا کر تمہیں پورے شہر میں تلاش کر رہا ہوگا۔ یوں سمجھ لو کہ وہ اس وقت زخمی سانپ کی طرح تھملا یا ہوا ہے۔ ہم اس کے قریب رہ کر تمہیں اس کی پلاننگ سے آگاہ کرتے رہیں گے۔“

”اور ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ اس کی گولی نے کس بدنصیب کو نشانہ بنایا ہے۔“ ارسلان میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم بے فکر ہو کر یہاں رہ سکتی ہو۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”ایک بات تو بتاؤ۔“ میں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ ”کیا صرف اتنی سی بات کے لیے کوئی شخص ایسی خطرناک پلاننگ بھی کر سکتا ہے؟“

”میں کسی اور کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتی۔ لیکن منصور اسی حراج کا ہے۔“ ارچند نے کہا۔ ”خیر، تم یہاں رہو۔ اس گھر میں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ باہر گیٹ پر چوکیدار موجود ہے۔ کوئی ضرورت ہو تو اسے بتا دینا۔“

”ٹھیک ہے، تم جاؤ۔“

☆ ☆ ☆

سوچتے سوچتے میرے دماغ کی چولیس مل گئیں۔ کچھ عجیبی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ شاہد کی ایسی بے رحمی میرے خیال میں بھی نہیں آ رہی تھی۔ اس نے مجھے قابو میں کرنے اور مارنے کے لیے ایسی منصوبہ بندی تھی۔

خدا نے ان دونوں میاں بیوی کو میرا اہمرو بنا کر بھیج دیا تھا۔ ورنہ میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

رات بچک چلی گئی۔

اس وقت شاید گیارہ یا ساڑھے گیارہ بجے ہوں گے جب موبائل کی گھنٹی بج گئی۔ اتنی دیر کے بعد یہ پہلا فون آیا تھا۔ میں نے دیکھا۔ وہ نمبر شاہد کا تھا۔ اس نے مجھے فون کیا تھا لیکن کیوں؟

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس بار میں نے اس کی کال وصول کر لی تھی۔ ”روٹی! کہاں ہو تم؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ ”تم اچانک کہاں غائب ہو گئی تھیں؟“

”تم کیا سمجھتے ہو کہ میں پھر تمہارے چنگل میں آ جاؤں

گی؟“

”کیا حماقت ہے۔ تم یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

”مجھے سب پتا چل گیا ہے شاہد۔“ میں نے کہا۔ ”تم میرے سب سے پرانے دشمن ہو۔ تمہارا باپ بھی ہمارے خاندان کا دشمن تھا۔ اسی نے ہمیں تباہ کیا ہے اور اب تم مجھے مارنا چاہتے ہو۔“

”کیا بکواس ہے۔ یہ سب کیا کہہ رہی ہو؟“

”تم یہ بتاؤ کہ کیا تم جلال کے بیٹے منصور شاہد نہیں ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔“

”جواب دو۔ کیا تم وہی نہیں ہو جس نے میرے لیے اپنا رشتہ بھیجا تھا؟“

”ہاں، ہاں... میں وہی ہوں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”فرق یہ پڑتا ہے کہ تم نے مجھے بھی مارنے کی کوشش کی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اب تم اطمینان رکھو۔ میں تمہارے ہاتھ نہیں آنے والی۔ میں تم سے جان بچا کر ایک محفوظ جگہ پر آ چکی ہوں۔“

”کون لایا ہے تمہیں۔ کہاں پر ہو؟“

”سوری، میں یہ سب نہیں بتاؤں گی۔ تم نے مجھے مارنے کے لیے پارٹی میں کسی بے گناہ پر گولی بھی چلوادی تھی۔ میری قسمت اچھی تھی جو مین وقت پر اس ہمدرد نے مجھے بچالیا۔“

”روٹی! یہ سب غلط ہے۔ میں نے کسی پر گولی نہیں چلوائی۔ اور تم کس ہمدرد کی بات کر رہی ہو۔ کون ہے وہ؟“

میں نے موبائل آف کر دیا۔

گھنٹی بجتی رہی۔ جتنی دیر لیکن اب اس کی کال ریسپو نہیں کر رہی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کی یہ بات درست ہو گئی تھی کہ شاہد ہی جلال کا بیٹا ہے اور اس کا نام منصور شاہد ہے اور اس نے خاص پلاننگ کے تحت مجھ سے دوستی کی ہے۔

میرے قریب آیا ہے۔

دو بجے رات کے وقت دونوں میاں بیوی کی واپسی ہوئی تھی۔ ہم لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے۔ ارچند چائے بنا کر لے آئی تھی۔ میں ان دونوں سے صورت حال جاننے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ بالآخر ارسلان نے کہا۔ ”روٹی! تمہارے سر پر منڈلانے والا خطرہ وقتی طور پر تو گل گیا ہے لیکن صرف وقتی طور پر۔ وہ کمینہ کسی بھی وقت تمہاری جان لے سکتا ہے۔“

”میرے پاس اس کی کال بھی آئی تھی۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ پوچھ رہا تھا کہ میں کس کے ساتھ ہوں؟“

”تم نے کچھ بتایا تو نہیں؟“

”نہیں۔ میں اتنی پاگل نہیں ہوں کہ تم دونوں کے بارے میں بتا دوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم یہ بتاؤ پارٹی میں کیا ہوا۔ گولی کس کو لگی تھی؟“

”ایک عورت کو۔“ ارجمند نے بتایا۔ ”لیکن وہ صرف زخمی ہوئی ہے۔“

”اب پتا چلا کہ کہانی کچھ اور ہے۔“ ارسلان نے کہا۔

”میں بھی الجھا ہوا تھا کہ صرف شادی سے انکار کی وجہ سے کوئی آدمی اس طرح کسی کے پیچھے نہیں پڑتا۔ اب پتا چلا کہ بات کچھ اور ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“

”لاکرمبر اٹھارہ۔“ اس نے بتایا۔

”لاکرمبر اٹھارہ، یہ کیا ہے؟“

”کسی بینک کا۔۔۔ لاکر ہے۔“ ارسلان نے کہا۔

”اس میں تمہارے پاپا کے ایسے کاغذات ہیں جو جلال اور اس کے پورے کاروبار کو بر باد کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ تمہارے پاپا نے اپنی زندگی میں ایسے کاغذات تیار کروا کے لاکر میں رکھوا دیے تھے۔ ان پر جلال کے دستخط بھی موجود ہیں۔“

”لیکن پاپا نے تو ایسا کوئی ذکر نہیں کیا۔“

”ہو سکتا ہے آدمی جب الجھا ہوا ہو تو بہت سی باتیں اس کے ذہن سے نکل جاتی ہیں۔“ ارجمند نے کہا۔ ”شاید کہ ان کاغذات کاظم سے اسی لیے وہ تم سے دوستی کر رہا تھا کہ تم سے لاکر کی چابی حاصل کر کے کاغذات کو خارج کر سکے۔“

”یہ تو بے وقوفی کی بات ہوگی۔ جب میں اس کی پلاننگ سے مر جاتی تو پھر چابی کیسے حاصل کر سکتا تھا؟“

”ہاں، میں بھی اسی نقطے پر سوچتا رہا ہوں۔ پھر چیمرہ صاحب سے ملنے کے بعد ساری پوزیشن کلیئر ہو گئی ہے۔“

”کون چیمرہ صاحب؟“

”بینک منیجر۔“ ارسلان نے بتایا۔ ”جن کے بینک میں وہ لاکر ہے۔ وہ کاغذات ان کے سامنے لاکر میں رکھے گئے تھے۔ اس وقت جلال بھی موجود تھا۔ اس زمانے میں تمہارے پاپا اور جلال ایک دوسرے کے دوست ہوا کرتے تھے۔“

”ہم لوگ اس وقت چیمرہ صاحب کے گھر سے ہی آ رہے ہیں۔“ ارجمند نے بتایا۔

”معاہدے کے مطابق اس لاکر پر پہلا حق تمہارے پاپا کا اور اس کے بعد تمہارا ہے۔ یعنی یا تو تمہارے پاپا وہ لاکر کھول سکتے تھے یا پھر تم۔۔۔ اگر دونوں میں سے کوئی نہ رہے تو پھر یہ حق خود بخود جلال یا اس کی اولاد کو ٹرانسفر ہو جاتا ہے۔“

”اوہ، اب سمجھی۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔

”یعنی میری موت کے بعد شاید اس لاکر کو کھولا سکتا ہے۔“

”ہاں، یہی بات ہے۔ کیونکہ اسے یہ خوف لاحق ہے کہ اگر تمہیں اس لاکر کا خیال آیا اور تم نے وہ کاغذات دیکھ لیے اور اپنا حق مانگنے کے لیے کھڑی ہوئیں تو پھر وہ فٹ پاتھ پر آ جائے گا۔“

”تو پھر بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”اس لاکر کی چابی لے کر ہمارے ساتھ کل صبح بینک چلو اور لاکر کھول کر وہ فائل نکال لو۔“

”لیکن پاپا نے تو مجھے ایسی کوئی چابی نہیں دی۔“ میں نے بتایا۔

”کیا؟“ دونوں حیران رہ گئے۔ ”اسنے اہم لاکر کی چابی تمہیں نہیں دی۔“

”ہو سکتا ہے کہ افراتفری اور پریشانی کے عالم میں پاپا چابی دینا بھول گئے ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ٹھیک ہے کچھ یاد آ رہا ہے۔“

”خدا کے لیے یاد کرو۔ کیونکہ اسی چابی پر تمہاری زندگی اور تمہارے مستقبل کا انحصار ہے۔“

اس وقت پاپا کے حوالے سے بہت سی یادیں میرے دھیان میں گردش کر رہی تھیں۔ لاکرمبر اٹھارہ۔ چابی۔۔۔ چابی۔۔۔ چابی۔ اور اچانک مجھے وہ چابی یاد آئی۔

پاپا نے ایک بار مجھے ایک چابی دیتے ہوئے کہا تھا۔

”بیٹا! یہ رکھ لو۔ یہ ایک لاکر کی چابی ہے۔ اس میں جو کچھ ہے۔ وہ تمہارے کام آ جائے گا۔“

اور میں نے اس وقت زیادہ دھیان دینے کے بجائے وہ چابی اپنے پاس رکھ لی تھی۔ شاید اپنی الماری میں یا اپنی میز پر دراز میں یا اپنے کس میں۔ یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ میں نے جب ان دونوں کو بتایا تو وہ اچھل پڑے۔ ”یہ بات ہوگی نا۔ خدا کے لیے یاد کرو۔ اپنے ذہن پر زور دو اور سوچو کہاں رکھی ہوگی؟“

”شاید میرے کسی سوٹ کس میں ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”بس، تو تمہارے گھر چلتے ہیں۔ اسے تلاش کر لو۔

کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی۔ اور میں بینک سے وہ فائل نکال کر لے آؤں گا۔

”ارجند“ میں نے ارجند کی طرف دیکھا۔ ”پاپا کی موت کے بعد میں نے وہ مکان چھوڑ دیا تھا اور ایک فلیٹ میں چل گئی تھی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ چابی میرے سوٹ کیس میں ہوگی۔“

”تو پھر چلو۔“ ارجند جلدی سے بولی۔ ”میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

پھر ہم اس مکان سے چل پڑے۔ آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم اس بلڈنگ میں پہنچ چکے تھے جس کی دوسری منزل پر میں نے ایک چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے رکھا تھا۔ اس وقت رات کے تین بج چکے تھے۔ لیکن اس بھاگ دوڑ میں نیند مکمل طور پر غائب ہو چکی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ہم سب اندر آ گئے۔ میں نے دیوار پر لگا ہوا مین آن کر دیا۔ روشنی ہوئی اور اس روشنی میں شاید دکھائی دے گیا جو سونے پر بیٹھا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پستول بیٹھی تھا۔

☆☆☆

”تو تم اسے یہاں لے ہی آئے۔“ شاید نے ارسلان کی طرف دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”روشی! آؤ میرے قریب آ جاؤ۔ گھبراؤ نہیں۔ یہ دونوں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

”روشی! یہی ہے تمہارا دشمن۔“ ارسلان نے کہا۔ ”تم اس کے پاس مت جانا۔۔۔ ورنہ۔“

”اوہ تو اب تم یہ چال پیل رہے ہو۔“ شاید غصے سے بولا۔ ”روشی!“ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”دوست، دشمن میں تمیز کرنا سیکھو۔ یہ دونوں تمہیں مار دینا چاہتے ہیں۔“

”مکار انسان۔“ روشنی کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ ”ارجند نے کہا۔“ اب یہ تمہاری چال میں نہیں آئے گی۔“

اور اسی وقت مجھ سے ایک حرکت سرزد ہوئی۔ یہ بہت جرأت مندانہ حرکت تھی۔ شاید کچھ بھی کر سکتا تھا۔ لیکن مجھ پر تو جنوں سوار ہو گیا تھا۔ میں نے پہلے بتا چکی ہوں کہ میں نے سیلف ڈیفنس کی تربیت حاصل کی تھی۔ اسی سے اس وقت کام لیا تھا۔

میں نے اپنی جگہ سے جست لگائی اور شاید پر جا پڑی اور کچھ اس انداز سے کہ اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر گر پڑا۔

ارسلان اور ارجند کے لیے اتنا موقع بہت تھا۔

ارسلان نے جھپٹ کر پستول اٹھالیا جبکہ شاید حیران... سکنے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ”روشی! تم نے بہت بڑی حماقت کی ہے۔“

”ہاں، اب روشنی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ارسلان نے کہا۔ ”چپ چاپ سامنے والی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔“

شاید خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ وہ بار بار میری طرف غصیلی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

ارسلان نے میری اور ارجند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو! اگر کہیں رسی مل جائے تو۔۔۔“

”ہاں، میں جس رسی سے اپنے بستر وغیرہ باندھ کر لائی تھی وہ گھر میں ہی ہے۔“ میں نے بتایا۔

”جاؤ، وہ لے کر آؤ۔ جلدی۔“

میں جانے لگی تو شاید نے آواز دی۔ ”روشی! تم بہت بڑی غلطی کر رہی ہو۔ یہ دونوں بہت مکار اور خطرناک ہیں۔“

”روشی کو معلوم ہے کہ کون مکار اور خطرناک ہے۔“ ارجند نے غصے سے کہا۔

دس منٹ کی تلاشی کے بعد مجھے وہ رسی مل گئی۔ میں اسے لے کر لاؤنج میں واپس آ گئی۔ ارسلان نے ابھی تک شاید کوکور کر رکھا تھا۔

ان دونوں نے شاید کو باندھنے سے پہلے پستول میرے حوالے کر دیا۔ ”روشی! تم اسے کور کئے رکھو۔“

ارسلان نے کہا۔ ”اور جیسے ہی اس کی طرف سے کوئی شرارت دیکھو۔ گولی مار دینا۔“

”اوکے۔“ میں نے پستول اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

اس وقت شاید کی بے تابی دیکھنے کے قابل تھی۔ اس نے پھر مجھ سے کہا۔ ”روشی! ہوش میں آؤ۔ تم جو کر رہی ہو وہ بہت غلط ہے۔“

لیکن میں اس کی مٹھی باتوں پر اب دھیان نہیں دینا چاہتی تھی۔ میں نے اس کی طرف سے اپنے کان بند کر رکھے تھے۔ میں بے حس ہو گئی۔ اگر قانون کا خوف نہیں ہوتا تو شاید اس وقت اسے گولی بھی مار دیتی۔

ان دونوں نے شاید کو رسیوں سے جکڑ دیا تھا، وہ اب بے بسی کی تصویر بنا کر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

”چلو، اب اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔“ ارسلان نے پستول واپس لینے کے لیے میری طرف ہاتھ

بڑھایا۔ ”لاؤ یہ پستول مجھے دو۔ اور جا کر وہ چابی تلاش کرو۔“

میں نے پستول اسے واپس کیا اور ارجند کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب مجھے وہ چابی تلاش کرنی تھی۔ جس پر میری زندگی اور مستقبل کا انحصار تھا۔

مجھے یاد آ رہا تھا کہ وہ چابی میں نے اپنے سوٹ کیس میں رکھی تھی لیکن چابی سوٹ کیس میں نہیں تھی۔ ”کیا ہوا؟“

ارجند نے بے تابی سے پوچھا۔ ”کہاں تھی چابی؟“

”پتا نہیں۔ یاد تو ہے کہ وہ سوٹ کیس میں ہی تھی۔ لیکن اب نہیں مل رہی۔“

”بے وقوف لڑکی۔ جلدی تلاش کرو۔“ ارجند نے کہا۔

اور اس وقت اچانک میرے ذہن میں کوئی چیز کھلانے لگی۔ ایک سوالیہ نشان میرے سامنے آ کر کھڑا ہوا تھا۔

آخر کیوں؟

یہ لوگ اس چابی کو حاصل کرنے کے لیے اتنے بے تاب کیوں ہو رہے تھے۔

انہیں مجھ سے ایسی کوئی سی ہمدردی ہوئی تھی کہ میرے لیے انہوں نے اتنی جدوجہد کی اور شاید سے دشمنی مول لے لی۔ کیوں؟ پھر ارجند کا رویہ، اس کی بے تابی، اس کی بولکلاہٹ۔ یہ سب کیا ظاہر کر رہا تھا۔

”بتاؤ تا چابی کہاں ہے؟“ ارجند نے پھر کہا۔ ”اس بار اس کا لہجہ پہلے سے زیادہ سخت تھا۔“ اگر چابی نہیں ملتی تو پھر تم مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔“

”ارجند! ایک بات بتاؤ۔ اگر چابی مل گئی تو پھر تم دونوں کیا کر دے گے؟“

”کرنا کیا ہے۔ ہم صبح سویرے بینک پہنچ جائیں گے۔“ ارجند نے کہا۔ ”لیکن تم باہر ہوگی۔ بینک میں نہیں جاؤ گی۔“

”وہ کیوں۔ لاکر تو میرا ہے۔ وہ تو میں کھولوں گی۔“

”اچھا سمجھتی تھی مجھے ساتھ چلنا۔ اس وقت تو تلاش کرو۔“

میں نے چابی پھر تلاش کرنی شروع کر دی۔ بالآخر چابی تیسرے سوٹ کیس میں مل گئی۔ میں نے وہ چابی اپنی جیب میں ڈال لی تھی۔ ”چابی مل گئی ہے ارجند۔“ میں نے کہا۔

”اب صبح ہم تینوں بینک جائیں گے۔“

ارجند نے غصے سے میری طرف دیکھا۔ کچھ کہنے کی کوشش کی پھر خاموش رہی۔ ہم واپس لاؤنج میں آ گئے۔ یہاں کی وہی چوہن تھی۔

ارسلان نے شاید کوکور کر رکھا تھا۔ اور شاید بے بسی کے عالم میں کرسی سے بندھا ہوا تھا۔

”ارسلان! چابی مل گئی ہے۔“ ارجند نے بتایا۔

”کہاں ہے چابی؟“

”وہ میرے پاس ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”میں کل صبح تم لوگوں کے ساتھ بینک جاؤں گی۔“

”نہیں، تم ساتھ نہیں جاؤ گی۔“ ارسلان نے غصے سے کہا۔ ”بلکہ تم ایک اتھارٹی لیٹر لکھ کر دو گی جس میں مجھے اس لاکر کو کھولنے کا اختیار دو گی۔“

”آخر کیوں، میں یہ سب کیوں کروں؟“ میں نے جھلا کر پوچھا۔

”جو اس نہیں کرو۔“ ارسلان غرایا پھر اس نے ارجند کی طرف دیکھا۔ ”چابی چین لو اس سے۔“

ارجند میرے پاس آئی اور یہی اس کی غلطی تھی۔

اس وقت میرا ٹیکھا ہوا ہنر میرے کام آ گیا۔ میں نے ایک کلک اس طرح ارجند کو رسی کی کہ وہ اچھل کر ارسلان پر جا کر لیکن ارسلان نے گرتے گرتے بھی ایک فائر جھونک مارا تھا۔

کوئی آگ کا گولہ سامیرے شانے میں اترتا چلا گیا۔ میں چیخ کر ایک طرف الٹ گئی۔ میرا شانہ بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔

بہتے ہوئے خون نے میرے کپڑوں کو رنگین کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر مجھے اتنا ہی ہوش رہا کہ شاید غصے سے دھاڑ رہا تھا اور میری آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔

☆☆☆

میں غنودگی کے عالم میں تھی۔

یا شاید خواب دیکھ رہی تھی۔ اس وقت کچھ مجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کچھ لوگوں کی مختلف آوازیں... پاپا شاید آوازیں دے رہے تھے۔ یا شاید بکا رہا تھا۔ کچھ اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں پھر مجھے ہڈا گیا۔

میرے ذہن کے شانے کی ڈریسنگ کر دی گئی تھی۔ دن ہو چکا تھا۔ لیکن چوہن وہی تھی۔ میں اسی لاؤنج میں تھی۔ شاید اسی طرح کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ اور وہ دونوں یعنی ارسلان اور ارجند میرے سامنے کھڑے تھے۔

”بے وقوف لڑکی۔ تو اپنی حماقت کی وجہ سے اس حال کو پہنچی ہے۔“

”میری ڈریسنگ کس نے کی ہے؟“ میں نے نقاہت بھری آواز میں پوچھا۔

”میں نے۔“ ارجمند نے بتایا۔ ”میں ارسلان سے ملنے سے پہلے نرس رہ چکی ہوں۔“

”لیکن کیوں۔ جب تم نے مجھ پر گولی چلائی دی تھی تو پھر میری ڈریسنگ کیوں کروائی۔“

”تا کہ تم اتھارٹی لیٹر پر سائن کر سکو۔“

”میرے خدا۔ اس لاکر میں رکھی ہوئی فائل سے تم دونوں کا ایسا کیا تعلق ہے کہ اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟“

”روٹی!“ شاید بول پڑا۔ ”یہ دونوں بکواس کر رہے ہیں۔ تمہارے لاکر میں کوئی فائل وائل نہیں ہوگی۔ کچھ اور ہو سکتا ہے جس کا علم صرف ان دونوں کو ہے۔“

”خاموش رہو۔ تم کہہ رہے ہو جس نے روشی کو مارنے کی کوشش کی تھی۔“

”نہیں، میں نے اسے کبھی مارنے کی کوشش نہیں کی۔“

”شاید نے کہا۔“ روشی کو خود اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کون اس کا دوست ہے اور کون دشمن۔“

ارسلان نے اس کا جواب دینے کے بجائے ارجمند کی طرف دیکھا۔ ”ارجمند! جو ہم نے اتھارٹی لیٹر تیار کیا ہے۔ اس پر روشی سے سائن کروالو۔“

”نہیں روشی، ایسا کبھی مت نہ کرنا۔“ شاید چیخا۔ ”تمہارے سائن کرنے کے بعد یہ شخص تمہیں شوٹ کر دے گا۔“

”لگتا ہے اس سے پہلے تمہاری زبان بند کرنی ہو گی۔“ ارسلان نے کہا۔

ارجمند نے میرے سامنے ایک کاغذ اور قلم لاکر رکھ دیا۔ ”چلو اس پر سائن کرو جلدی۔ یہ سب ہم تمہاری بھلائی کے لیے کر رہے ہیں۔“

”اور اگر سائن نہ کروں تو پھر۔“

”پھر یہ کہ میں تمہارے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“ ارسلان نے کہا۔

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس لاکر میں کوئی فائل نہیں بلکہ کچھ اور رکھا ہوا ہے۔“

”ہاں، کچھ اور ہے اس میں۔“ ارسلان کسی جنونی کی طرح چیخنے لگا۔ ”اس کو حاصل کرنے کے لیے میں نے بہت پاؤں پیلے ہیں۔ بہت محنت کی ہے۔ تمہارے پاپا کے دفتر میں جگہ مارتا رہا ہوں۔ لیکن اب معاملہ برداشت سے باہر ہو چکا ہے۔ اس میں جو کچھ ہے۔ وہ صرف میرا ہے۔“

”میرا نہیں... بلکہ ہمارا۔“ ارجمند بول پڑی۔ ”میں نے بھی اس کے خواب دیکھے ہیں۔ پلاننگ کی ہے میں نے۔ تم اکیلے اس کے حق دار نہیں ہو سکتے۔“

”کیا تم مجھے روک لو گی؟“

”ہاں، روک سکتی ہوں تمہیں۔“ ارجمند اس کے سامنے تن کر کھڑی ہوئی۔ ”ارسلان! یہ مت بھولو کہ شاید تمہاری دوستی میں نے کرائی تھی۔ تا کہ تم اس کے قریب رہ کر اس کا اعتماد حاصل کر سکو۔“

”بکواس مت کرو۔ یہ ساری باتیں یہاں دہرانے کی کیا ضرورت ہے۔“

”بولتی رہو ارجمند۔“ میں نے کہا۔ ”تم ایک اچھی لڑکی ہو۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم کسی مجبوری کی وجہ سے ارسلان کا ساتھ دے رہی ہو۔“

”خاموش۔“ ارسلان گرجا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر میرے چہرے پر چھڑر سید کر دیا۔

اور اسی وقت ارجمند اس سے لپٹ پڑی۔

وہ کسی خونخوار بیٹی کی طرح اس سے چٹ گئی تھی۔ اس وقت ایک گولی اور چلی لیکن یہ گولی ارسلان نے نہیں چلائی تھی بلکہ دروازے پر کھڑے پولیس آفیسر نے ان دونوں کو خبردار کرنے کے لیے چلائی تھی۔

☆☆☆

یہ بہت گہری سازش تھی۔

یچ دیر بیچ۔ پولیس اس طرح آگئی تھی کہ گولی چلنے کی آواز نے آس پاس کے کینوں کو چونکا کر دیا تھا۔ انہوں نے پولیس کو اطلاع کر دی تھی۔

کہانی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب ارسلان اور ارجمند نے پاپا کے دفتر میں ملازمت حاصل کی۔ یہ دونوں اپنی کارکردگی اور محنت کی وجہ سے پاپا کی نگاہوں میں ایک خاص مقام حاصل کرتے چلے گئے۔

پاپا نے اس زمانے میں کچھ قیمتی ہیرے منگوا کر لاکر نمبر اٹھارہ میں رکھوا دیے تھے۔ جن کا کسی طرح ان دونوں کو علم ہو گیا تھا۔ اسی دوران جلال اور پاپا کے درمیان اختلافات شروع ہو گئے۔

اس کے بعد کی کہانی شاید نے بتائی۔ ”جب روشی نے مجھ سے شادی سے انکار کیا تو اس وقت میں واقعی بہت غصے میں تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس لڑکی سے انتقام لوں۔ جس نے میری توہین کی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ میرے ڈیڈی نے روشی کے پاپا کے خلاف سازشیں شروع کر دیں اور انہیں برباد کر دیا۔ پھر جب میں نے ان کی بربادی اور تباہی کے بارے میں سنا تو مجھے آنسو ہونے لگا۔ اسی زمانے میں ارسلان سے میری جان بچان ہوئی۔ جو بعد میں ارسلان اور

ارجمند کی طرف سے بے تکلفی میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ان دونوں نے روشی کے پاپا کے یہاں جاب بھی کی تھی۔ ان دونوں کو یہ معلوم تھا کہ روشی کے پاپا نے لاکر میں ہیرے رکھوائے ہیں اور انہیں یہ یقین تھا کہ شاید کسی وجہ سے روشی کو ان ہیروں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔

ورنہ وہ اتنے بڑے حالات میں زندگی نہیں گزارتی۔“

ہم سب اس علاقے کے ایس پی کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ یعنی اس کہانی کے سارے کردار۔ اور آہستہ آہستہ کہانی کے بھید کھلتے جا رہے تھے۔

بہت کچھ معلوم ہو رہا تھا۔

پھر ارسلان نے بیان دیا۔ ”اس دوران میں ہمیں پتا چلا کہ شاید نے روشی سے دوستی کر لی ہے اور آہستہ آہستہ اس کے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس نے روشی کو اپنا آدھا نام بتایا ہے۔ یعنی شاید۔ ہم دونوں نے پھر ایک پلاننگ کے تحت شاید سے مزید دوستی بڑھائی۔ ہماری پلاننگ یہ تھی کہ ہم شاید کو روشی کی نگاہوں میں ایک خوفناک انسان ثابت کر دیں گے اور اس کا اعتماد حاصل کر کے لاکر کی چابی حاصل کر لیں گے۔ ہم نے چابی کے لیے جیک فیجر پر بھی دباؤ ڈالا تھا لیکن اس نے ہماری بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔“

پھر شاید یعنی منصور شاید نے کہا۔ ”یہ درست ہے کہ میں ایک آوارہ اور عیاش قسم کا نوجوان تھا۔ لیکن پاپا کی موت کے بعد اور یہ جان لینے کے بعد کہ پاپا کی وجہ سے روشی برباد ہو گئی ہے۔ مجھے اس سے ہمدردی ہوئی۔ میں اس کا ساتھ دینا چاہتا تھا لیکن کس طرح۔ اس کے لیے میرے ذہن میں یہی بات آئی تھی کہ میں اس سے دوستی کروں اور اسے اعتماد ہو جائے تو یہ بتا دوں کہ میں کون ہوں۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس سے پہلے ہی اس کہانی کا ڈراپ سین سامنے آ گیا۔“

”اگر یہ سچ ہے تو پھر وہ گاڑی چلانے کی آخر۔ تم کیوں چاہتے تھے کہ میں مری کی خطرناک سڑکوں پر گاڑی چلاؤں؟“ میں نے شاید سے پوچھا۔

”وہ ایک مذاق کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔“ شاید نے کہا۔ ”اور جب تم واقعی گاڑی چلانے لگتے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کے انجن کو جان بوجھ کر خود میں نے ہی خراب کر دیا تھا۔“

”کیا؟ وہ خرابی خود تم نے پیدا کی تھی۔“

”ہاں بھی۔“ وہ سکرا دیا۔ ”اس کا مقصد یہ تھا کہ تم بھی کسی قسم کے احساس میں نہ رہو۔ تم یہ کہہ سکو کہ تم تو ڈرائیونگ کے لیے تیار تھے لیکن گاڑی ہی خراب ہو گئی تھی۔

یہ دراصل تم میں مزید خود اعتمادی پیدا کرنے کی ایک ترکیب تھی۔ جس کا فائدہ ان دونوں نے اٹھا کر میری طرف سے تمہیں اور بھی بلگان کر دیا۔“

”اور وہ؟“ ڈریس شوٹس فائرنگ، وہ کیا تھا؟“

”وہ کوئی فائرنگ نہیں تھی۔ اس نے کہا۔“ اندھیرا ہو گیا تھا۔ اور وہ بھی بجلی کی خرابی کی وجہ سے۔ اور وہ بجلی کی خرابی بھی ارسلان اور ارجمند نے ایک سازش کے ذریعے کی تھی۔“

”میں نہیں سمجھتی۔“

”میں پوری پچویشن بناتا ہوں۔ پستول ارسلان کے پاس تھا۔ وہ تمہارے پاس پہنچا۔ ارجمند سوچ بورڈ کے پاس تھی۔ اس نے مقررہ وقت پر سوچ آف کر دیا۔ ارسلان نے جیب سے پستول نکال کر ہوائی فائر کیا اور تمہارا ہاتھ تھام کر تمہیں باہر نکال لایا۔ یہ پورا ڈراما ان دونوں نے اتنی ہوشیاری سے کیا تھا کہ تمہیں شبہ بھی نہیں ہو سکا اور تم یہ سمجھتی رہیں کہ میں نے تمہیں مارنے کے لیے یہ حرکت کی ہے۔“

”او خدا! تو یہ ساری سازش ان دونوں کی تھی۔“

”ہاں، ان دونوں کی۔“ شاید نے کہا۔ ”اور ایک سازش میری بھی تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ تمہیں اعتماد میں لے کر تمہارا اعتماد بحال کیا جائے۔ تمہیں زندگی کی طرف واپس لایا جائے۔ کیونکہ تم بہت ٹوٹ گئی تھیں اور اب تمہارے پاس کروڑوں کے ہیرے ہیں۔ ایک نئی زندگی ہے۔ اگر تم جاہو تو اس شخص کو معاف کر سکتی ہو۔ جو پہلے واقعی بہت بھونکا ہوا تھا۔ لیکن اب زندگی کے اتنے بے رحم پہلوؤں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔“

”اور اب میں بھی ایک بات بتا دوں۔“ ایس بی نے کہا۔ ”یہ دونوں میاں بھوی بھی نہیں ہیں۔ یہ لڑکی ارجمند اس سے پہلے بھی ایک بار جیل کاٹ چکی ہے۔ پھر ارسلان سے اس کی ملاقات ہوئی۔ دونوں نے ایک جگہ ملازمت کر لی۔ یعنی تمہارے پاپا کے یہاں۔ شروع میں تو ان کا یہی ارادہ تھا کہ شرافت کی زندگی گزاریں گے لیکن جب کروڑوں کے ہیرے کی بات سامنے آئی تو ان کے اندر کا جرم پھر جاگ اٹھا اور اب جو بھی ہے۔ وہ سب کے سامنے ہے۔“

ارسلان اور ارجمند کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ شاید یعنی منصور شاید امید بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور اب ایک بار پھر ایک نئی زندگی میرے انتظار میں تھی۔ شاید صبح کا بھولا ہوا تھا۔ جوشام کو گھر واپس آ گیا تھا۔

ریگِ رواں

سلیم فاروقی

صدیوں کا سفر طے کرنے کے باوجود واقعات و حالات... چاہے کسی بھی نوعیت کے ہوں... تاریخ کے صفحہ قرطاس پر ہمیشہ کے لیے نہ مٹنے والی سیاہی کا لبادہ اوڑھ کر امر ہو جاتے ہیں... ہم ان تلخ و شیریں حادثات سے صبرِ قہر نظر تو کر سکتے ہیں... مگر انہیں بھلا نہیں... سکتے... پاک و ہند کی تاریخ سے تعلق رکھنے والے ایک ایسے ہی سانحے سے وابستہ دل گداز تحریر...

تحریکِ پاکستان کے درمیان وقتی، مابین قریبی تحریکِ کھانی جس میں کئی راز پوشیدہ تھے

ہر طرف آتش و آہن کی بارش ہو رہی تھی، موت کا دیوانہ وار رقص جاری تھا۔ انسانی خون پانی سے بھی زیادہ ارزاں ہو گیا تھا۔ میرے بیشتر ساتھی جامِ شہادت نوش کر چکے تھے۔ موت کا بے رحم ہاتھ کسی بھی وقت مجھے دبوچ سکتا تھا لیکن مجھ پر اس وقت ایک جنون کی سی کیفیت طاری تھی کہ مارو یا مرجاؤ۔

بات کو کہ اب سے چالیس سال پرانی ہے لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ کل ہی کی بات ہو۔

میں نے ایک مہینے پہلے ہی پاکستان آری میں کمیشن حاصل کیا تھا۔ میری پہلی پوسٹنگ پنجاب رجنٹ کے ایک یونٹ میں ہوئی۔ ان دنوں وطن کے حالات بہت دگرگوں تھے۔ مشرقی پاکستان (جو اب بنگلہ دیش بن چکا ہے) میں ہماری فوج گزشتہ سات ماہ سے کئی باہنی سے نہر دماڑھی۔

اچانک جی ایچ کیو سے حکم موصول ہوا کہ ہماری بٹالین کو مشرقی پاکستان جانا ہے۔

ہماری بٹالین کے ہر جوان اور افسر کا چہرہ خوشی سے روشن ہو گیا۔ ہم بھی اپنے ان ساتھیوں کے شانہ بشانہ دفاعِ وطن میں شریک ہونا چاہتے تھے جو گزشتہ سات ماہ سے مسلسل دشمن سے برسرِ پیکار تھے۔

روانگی سے قتل ہماری بٹالین کے سی او (کمانڈنگ آفیسر) لیفٹیننٹ کرنل احسان نے ایک ولولہ انگیز تقریر کی تو ہمارے حوصلے کئی گنا بڑھ گئے۔

ہماری بٹالین کو مشرقی پاکستان کے شہر کومیلہ بھیجا جا رہا

ان کے اس ولولہ انگیز بیان نے ہم میں گویا بجلیاں سی بھر دیں۔

یہ چودہ اور پندرہ دسمبر کی درمیانی شب کا واقعہ ہے۔ اب بھارت مکمل کر ہمارے خلاف صف آرا ہو چکا تھا۔ اس کے پورے دو ڈویژن بمبلی پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ یہ علاقہ جتنی لفظ نظر سے انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ وہ تین دن سے بھر پور حملے کر رہے تھے لیکن ہماری صرف دو کمپنیوں نے انہیں روک رکھا تھا۔

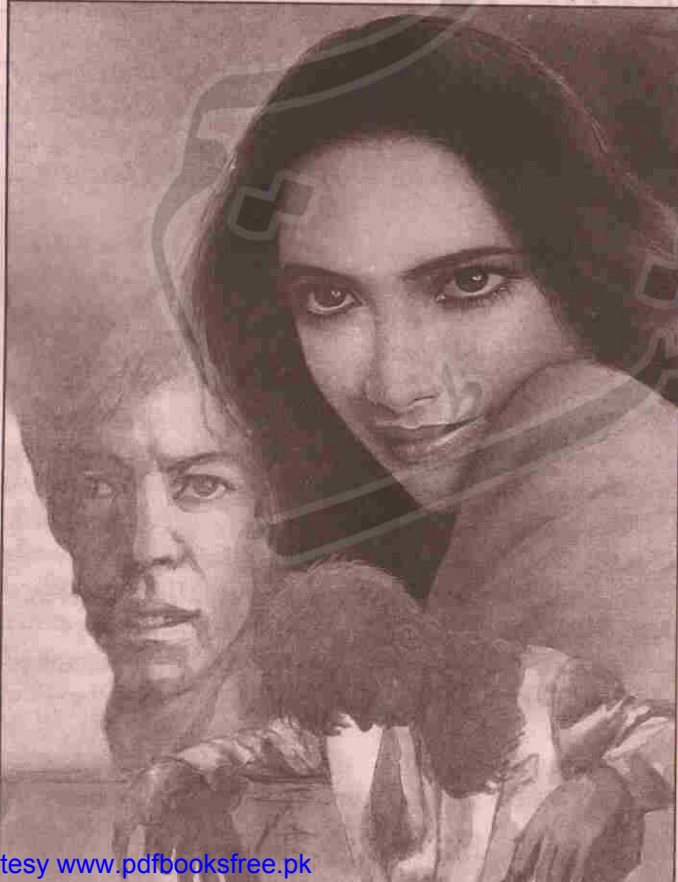
ہمارے کمپنی کمانڈر کمپٹن ضیا اور کمپٹن وقار وائزلیس پر مسلسل ہیڈ کوارٹر سے کمک اور رسد کی درخواست کر رہے تھے لیکن وہاں کمک کا کیا سوال! ہمارے پاس افرادی قوت محدود تھی۔

جس رات کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس رات دشمن نے بہت بڑے پیمانے پر حملہ کیا اور نہ جانے اپنی کتنی فوج کو اس معرکے میں جھونک دیا۔ اس رات بہت ہی گھمسان کا رن

انہی دنوں راج شاہی سے بلوچ رجنٹ کی ایک بٹالین کو میلا بچتی تو ہم نے سکون کا سانس لیا کہ اب ہم زیادہ سے زیادہ علاقے کو دشمن سے پاک کر سکیں گے لیکن دو دن بعد یہ سن کر مجھے بہت حیرانی ہوئی کہ ہماری بٹالین کو وہاں سے کسی دوسرے محاذ پر منتقل کیا جا رہا ہے۔

یہ مقام ”بمبلی“ تھا۔ یہاں دشمن نے کچھ زیادہ ہی سرائٹا رکھا تھا۔ ہمارے سی او نے صرف دو کمپنیوں کو وہاں تعینات کیا اور بقیہ دو کمپنیوں کو دوسری طرف تعینات کر دیا۔

بمبلی تنگ پٹیچے کے لیے ہمیں دریا عبور کرنا پڑا۔ یہ ایک الگ داستان ہے کہ ہم نے کتنے مشکلوں سے دریا عبور کیا۔ اس کوشش میں حوالدار فتح محمد اور لانس ٹائیک احمد خان نے جامِ شہادت نوش کیا لیکن ہم نے دشمن کو نزدیک بھی نہیں پھٹنے



پڑا اور ہمارے بیشتر ساتھیوں نے جام شہادت نوش کیا لیکن ہم نے دشمن کو ایک اچھی آگے نہیں بڑھنے دیا۔

رات کی تاریکی میں دشمن کی طرف سے اتنا بدست حملہ ہوا تھا کہ ایک دفعہ تو ہمارے پاؤں بھی اکھڑ گئے لیکن ہم نے اپنے جوش جنوں کے سہارے دوبارہ سنبھالا لیا۔

پندرہ دسمبر کا سورج طلوع ہوا تو ہمارے آدھے سے زیادہ ساتھی جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ ان شہداء میں ہمارے کئی کمانڈر کپٹن ضیاء الحسن بھی شامل تھے۔

کپٹن وقار نے بچے بچے جوانوں اور افسروں کو طلب کیا اور کہا۔ ”ساتھیو! ہمارے زیادہ تر ساتھی جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔ جو لوگ باقی ہیں وہ بھی زخمی اور بری طرح تھکے ہوئے ہیں لیکن ہم یہ علاقہ اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک ہم میں سے ایک آدمی بھی زندہ ہے۔ ہمیں ہیڈ کوارٹر سے کمک ملنے کی امید نہیں ہے۔ ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں، پسپائی اختیار کریں یا لڑتے ہوئے یہیں شہید ہو جائیں۔“

”ہم سب آخری دم تک اس مورچے کی حفاظت کریں گے۔“ میں نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

حوالدار دین محمد نے زوردار انداز میں ”غیرہمگیر۔“ سب نے اسی انداز میں ”اللہ اکبر“ کہہ کر اس کا جواب دیا۔

”کپٹن وقار کا چہرہ خوشی سے دھکنے لگا۔ اس وقت دشمن شدید جانی نقصان اٹھا کر کچھ پیچھے ہٹ گیا تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ وہ جلد ہی پہلے سے بھی زیادہ شدت سے حملہ آور ہوگا۔

”آئیے، پہلے اپنے شہیدوں کو اللہ کے حوالے کر دیں۔“ کپٹن وقار کا لہجہ عجیب تھا۔

وہاں جا یہ جا ہمارے شہیدوں کے جسدِ خاکی بکھرے ہوئے تھے لیکن ان میں سے کسی کے چہرے پر بھی موت کا خوف یا اذیت کے آثار نہیں تھے۔

اسی وقت ہمارے وائزلیس نے دشمن کا ایک پیغام پکڑ لیا۔ ”سر! ابھی پر پاکستان کا پورا ایک ڈویژن موجود ہے۔ کل رات ہمارے آدھے سے زیادہ ڈویژن کا صفایا ہو چکا ہے۔ ہمیں مزید کمک چاہیے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔“

”اس فرنٹ پر دو ڈویژن اور روانہ کیے جا رہے ہیں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔“

ہمارے چہرے مسرت سے کھل اٹھے اور ہمارے حوصلے گویا آسمان کو چھونے لگے۔

ہم نے جس بے سروسامانی کے عالم میں دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور کیا تھا، وہ ہمارا جوش جنوں ہی تھا۔ دشمن ہماری دو کمپنیوں کو ایک ڈویژن سمیٹ رہا تھا۔

دشمن کی طرف سے حملہ اب اسی وقت ہوتا جب اسے کمک پہنچ جاتی۔

وہ سولہ دسمبر کی صبح تھی۔ ہم سب ایک نئے جوش اور ولولے سے صف بندی کر رہے تھے اور دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کے امکانات پر غور کر رہے تھے۔

اچانک وائزلیس آپریٹر نے آکر ایک امدادہ ناک خبر سنائی۔ ”سر! ہیڈ کوارٹر سے سی او صاحب کا پیغام آیا ہے کہ جنرل نیازی نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور سیز فائر ہو چکا ہے۔“

”نامکن۔“ کپٹن وقار نے بے یقینی سے کہا۔ ”یہ دشمن کا پروپیگنڈا ہے جو ان! جنرل صاحب“ نامنکر نیازی کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ ہتھیار کیسے ڈال سکتے ہیں؟ سی او سے میری بات کراؤ۔“

”کوشش کرتا ہوں سر!“ وائزلیس آپریٹر نے جواب دیا۔ دس منٹ کی مسلسل کوششوں کے بعد کپٹن کا رابطہ سی او سے ہو گیا۔

”سیلوس! کمانڈر آف برادر کمپنی آئیڈیو۔۔۔۔۔ اور۔۔۔“

”میں کپٹن! اسی آواز اسپیکنگ۔۔۔۔۔ اور۔۔۔“

”سر! میں نے ابھی ابھی سنا ہے کہ۔۔۔۔۔“

”میں کپٹن!“ کرنل صاحب نے سپاٹ لہجے میں ان کی بات کاٹ دی۔ ”جنرل نیازی نے ڈھاکا کے پانچ میدان میں بھارتی جنرل اردو کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ ہم سب کو بھی یہی حکم ملا ہے۔۔۔۔۔ اور ایڈز آل۔“

کرنل کا لہجہ گلو گلو تھا۔

ہم سب دکھ اور صدمے سے ساکت رہ گئے۔ پھر ہم میں سے کچھ جوان بڑی طرح ہلک ہلک کر رونے لگے۔

حوالدار خدا بخش نے روتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہماری قربانیوں کا یہی صلہ ہے کہ ہم دشمن کے ہاتھوں ذلیل و خوار بھی ہوں؟“

خود میری یہی کیفیت تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اگر ہمارے مذہب میں خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں اس وقت یقیناً خود کو گولی مار لیتا۔ کپٹن وقار کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

انہوں نے ضروری نوعیت کے تمام کاغذات ایک جگہ جمع کر کے ان میں آگ لگا دی۔

اسی وقت بھارتی فوج کی طرف سے کوئی انتہائی کمریہ آواز میں میگا فون پر چلتا۔ ”پاکستان! تمہارے سینا پٹی نے ہتھیار چھین کر خود کو ہمارے حوالے کر دیا ہے۔ تم بھی اپنے ہتھیار چھین کر دو۔“

اگر میں نے سی او کا پیغام اپنے کانوں سے نہ سنا ہوتا تو میں اس بات پر کبھی بھی یقین نہ کرتا۔ میرے دوسرے ساتھیوں کی کیفیت بھی یہی تھی۔

کپٹن وقار کے حکم پر ہم نے اپنا ہتھیار یونیشن دریا پر کر دیا۔ صرف ہمارے ریو اور اور رائفلس ہمارے پاس تھیں اور دشمن بڑی بڑی کشتیوں میں ہماری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ تاریخ میں ایک ذلت آمیز سیاہ باب کا اضافہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆

میں جنگی قیدی کی حیثیت سے الہ آباد کے کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ ہمارے شانوں پر صرف عہدوں کے اشارز تھے بقیہ نشانات ہم نے جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی ہٹا دیے تھے تاکہ دشمن کو معلوم نہ ہو سکے کہ ہمارا تعلق پاکستان آرمی کی کس رجمنٹ سے ہے۔

جب ہمیں آرمی ٹروپس بسوں میں کیمپ کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو سڑک کے دونوں اطراف تماشا بینوں کے ٹھٹ گئے ہوئے تھے۔ بھارتی ڈرائیوروں نے جان بوجھ کر گاڑیوں کی رفتار سست کر دی تھی۔ ہمیں دیکھنے والوں کے چہروں پر حیرانی تھی۔ شاید اس لیے کہ ان کے دلوں میں پاکستان آرمی کی دہشت تھی۔ وہ غالباً سوچ رہے ہوں گے کہ جس فوج نے اب سے چھ سال قبل ہماری کئی کئی زیادہ فوج کو اس بڑی طرح شکست دی تھی کہ وہ ہر محاذ پر اپنے جوتے اور کپڑے تک چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، اب ان شیروں کو ہماری سینا نے کیسے قید کر لیا۔

وہ ہم پر آوازیں کس رہے تھے، گالیاں دے رہے تھے اور پاکستان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔

ایک بات کی وضاحت کر دوں۔ ہمارے میڈیا سمیت دنیا بھر کے میڈیا میں یہ خبر پھیلی ہوئی تھی کہ پاکستان کی تو بے ہزار فوج نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ تو بے ہزار جنگی قیدی ضرور تھے لیکن ان میں لڑاکا فوج کی تعداد صرف چالیس ہزار تھی، باقی سرکاری اور نیم سرکاری اہل کار اور دفتر میں کام کرنے والے دوسرے پاکستانی تھے۔

بہر حال یہ بھی ذلت آمیز بات ہے کہ چالیس ہزار

فوجی بھی کم نہیں ہوتے۔ ہم نہ جانے کس سازش کا شکار ہوئے تھے کیونکہ بے سروسامانی اور محدود وسائل کے باوجود ہمارے حوصلے جوان تھے۔ ہم دشمن کو مزید چھ مہینے ناکوں سے چڑا سکتے تھے۔ اسے ہماری جانی اور مالی نقصان پہنچا سکتے تھے اور باعث طور پر موت کو گلے لگا سکتے تھے۔ ہم تو آخری آدمی اور آخری گولی تک لڑنے کا عزم کر کے میدان میں اترے تھے۔

خدا خدا کر کے ہمارا ستر رفتار کا نوائے الہ آباد کی معروف سڑکوں سے گزر کر آبادی سے باہر نکلا تو میں نے کچھ سکون کا سانس لیا۔

الہ آباد کے نواح میں بھارتیوں نے خاصے بڑے قلعہ زمین پر خاردار تار لگا کر جنگی قیدیوں کا کیمپ بنایا تھا۔

بھارتیوں کو اس سے پہلے جنگی قیدیوں کو رکھنے کا تجربہ نہ تھا کیونکہ انہیں توقع نہیں تھی کہ یہ ایسا موقع بھی آئے گا اس لیے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ یہ سارا انتظام انتہائی غلط میں کیا گیا ہے۔

اس قسم کے کیمپ بھارت کے دوسرے شہروں میں بھی بنائے گئے تھے لیکن ان کا طم تو مجھے بعد میں ہوا۔

تھکن اور بھوک سے ہماری حالت تباہ تھی۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے سے ہم نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا، نہ ہمیں سونے کا موقع ملا تھا۔

بھارتی فوجی خود کو اس وقت جرمن نازی سمجھ رہے تھے۔ سب سے پہلے ان کا ایک کچھ صوبیدار بھجوا دیا اور اس نے ہم سب کو میدان میں قطار بنا کر کھڑا ہونے کو کہا۔

کھڑا ہونا تو دور کی بات ہے، ہم میں تو بیٹھے کی بھی سکت نہیں تھی لیکن ہم بھارتیوں پر اپنی کمزوری بھی ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ ہم سب پر پڑے کے انداز میں قطار بن کر کھڑے ہو گئے۔

صوبیدار رہبر سنگھ نے کراہت سے کہا۔ ”تم میں سے جو کیشٹڈ افسر ہیں، وہ اپنی اپنی قطاروں سے دو قدم آگے آ جائیں اور پھر وہ اپنی الگ قطار بنائیں۔ سردار صاحبان (جو نیز کیشٹڈ افسران کو فوجی اصطلاح میں سردار کہا جاتا ہے) اپنی الگ قطار بنائیں۔“

ہم نے اپنی تین قطاریں الگ بنائیں، جے سی اوز کی سات قطاریں الگ تھیں۔

رہبر سنگھ نے حکم دے کر ان پیرس کی طرف چلا گیا جو کیمپ کے دوسرے سرے پر واقع تھیں۔

ہمارے سروں پر بھارتی فوجی رائفلیں تانے لیں

کھڑے تھے جیسے ہم اڑ کر وہاں سے فرار ہو جائیں گے یا خالی ہاتھ ان پر چھپتے پڑیں گے۔
کھڑے کھڑے کافی دیر گزر گئی۔ میرے پاؤں شل ہو گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اب میں کچھ ہی دیر میں بے ہوش ہو کر زمین پر گر جاؤں گا۔

پھر اچانک دھڑام سے میرے ساتھ کھڑا ہوا کیپٹن سعید گر پڑا۔ وہ بے چارہ زخمی تھا اور بخار میں چمک رہا تھا۔ اس کے بعد کئی افسر اور جوان غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے گزشتہ دو مہینے سے اپنے جوتے تک نہیں اتارے تھے، جو زخمی اور بیمار تھے۔

ہمارے ایک جوان نے آگے بڑھ کر اپنے افسر کو سہارا دینا چاہا تو اس کی پشت پر بھارتی سپاہی کے بوٹ کی ٹھوکر پڑی اور وہ خود بھی وہیں گر گیا۔

بھارتی فوجیوں کے روئے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ نہ صرف 65 کی ہڑت کی بلکہ گزشتہ ہزار برس کی غلامی کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ انگریزوں سے پہلے ہزار برس تک مسلمانوں نے ان پر حکومت کی تھی۔

صوبیدار سبیر نے سیکھ ایک مرتبہ پھر اڑتا ہوا آیا۔ اس نے آکر بلند آواز اور غلط سلاطہ انگریزی میں کہا۔

”تم میں سب سے سنتر افسر آگے آجائے۔“
اس کیپٹن میں سب سے سینئر بریگیڈیئر میر تھے۔ وہ وہ قدم آگے بڑھ کر کھڑے ہو گئے۔

”بریگیڈیئر!“ رنیر سیکھ نے کہا۔ ”آپ ان سب میں سینئر ہیں سر! آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ پی او ڈیپوز (Prisoner of war) کو کس طرح رہنا چاہیے اور احکامات کی خلاف ورزی پر ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔“

”اس نے پھر بھائی لکھے میں اٹلی سیدی انگریزی بولی۔“
”سر! میں چاہتا ہوں کہ آپ خود ہی اپنے لوگوں کو کنٹرول میں رکھیں۔“ وہ ”سر“ بھی یوں کہہ رہا تھا گویا احسان کر رہا ہو۔

بریگیڈیئر نے باوقار لکھ میں کہا۔ ”میں اور میرا ہر جوان جانتا ہے کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے لیکن شاید آپ لوگ جنیوا کنونشن سے واقف نہیں ہیں۔“

”ہم جنیوا کنونشن سے اچھی طرح واقف ہیں سر!“ صوبیدار رنیر سیکھ نے حق میز ہا کر کے کہا۔

”اگر واقف ہوتے تو سب سے پہلے زخمی اور بیمار قیدیوں کی سہولت کے لیے کچھ کرتے۔ آپ شاید دیکھ نہیں رہے ہیں کہ میرے کتنے افسر اور جوان کمزوری اور تھابت سے بے ہوش ہو گئے ہیں۔“

”میں ابھی ان لوگوں کو فیلڈ اسپتال میں بھجوا دیتا ہوں۔“ صوبیدار سبیر نے کہا۔ ”آپ لوگوں کو عہدوں کے لحاظ سے ٹینٹ الاٹ کر دیے گئے ہیں۔ سنتر آپ کو وہاں پہنچا دیں گے۔ وہیں آپ کا سامان بھی پہنچ جائے گا۔“
”میں کیپٹن کا ٹینٹ سے ملتا چاہوں گا۔“ بریگیڈیئر صاحب نے کہا۔

”کیپٹن کا ٹینٹ کرنل پر تپا۔ ایک ضروری میٹنگ میں ہیں۔ وہ ابھی توڑی دیر میں آجائیں گے۔“

بریگیڈیئر کے قیدی ہونے کے باوجود صوبیدار سبیر ان کی پُر وقار شخصیت اور عہدے سے مرعوب تھا۔ شاید اسے زندگی میں پہلی دفعہ کسی اتنے بڑے فوجی افسر سے بات کرنے کا موقع ملتا تھا۔

ہمیں چھوٹے چھوٹے ٹینٹ الاٹ کر دیے گئے تھے۔

میرے ساتھ بلوچ رجمنٹ کے دو افسر کیپٹن خالد اور لیفٹیننٹ وقار اور پنجاب رجمنٹ کے مجھ سمیت چار افسر کیپٹن وقار، کیپٹن جہاں زیب، لیفٹیننٹ اکرام اور میں یعنی سیکنڈ لیفٹیننٹ خرم تھے۔ یہ ساٹھ پونڈ کا چھوٹا سا خیمہ تھا۔

فوجی اصطلاح میں خیموں کے سائز کو پونڈز کے حساب سے ناپا جاتا تھا۔

کیپٹن میں بھارتی فوجیوں کا بہیمانہ سلوک، جینوا کنونشن کی خلاف ورزیاں اور پاکستان آری کے جوانوں پر تشدد کی علامت سے ایک طویل داستان ہے۔ ابھی موقع ملا تو میں آپ کو کیپٹن کے شب و روز سے بھی آگاہ کر دوں گا۔ مختصر ایتنا کچھ کہیں کہ بھارتی فوجی نہ صرف خود کو نازی سمجھتے تھے بلکہ ان جیسی بلکہ ان سے بھی زیادہ اذیت ناک اور پرتشدد کارروائیاں کرتے تھے۔

میرے ساتھیوں میں کیپٹن وقار خاصا زندہ دل اور پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے ”کیپٹن“ کہہ کر پکارتا تھا۔ میرے دوسرے ساتھی اس پر ہنستے تھے کہ تم نے سیکنڈ لیفٹیننٹ کا اچھا سزاؤں دھونڈا ہے۔

اس کے ساتھ ہی کیپٹن وقار انتہائی ہی دار، خود سر اور سرکش افسر تھا۔ وہ بھارتی فوجیوں کو بھی جھڑکنے سے نہیں چوکتا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ کئی دفعہ ان کے عتاب کا شکار بھی ہو چکا تھا۔

اس میں اور مجھ میں بھی قدر مشترک تھی۔ میں بھی اکثر یہ بھول جاتا تھا کہ میں جنگی قیدی ہوں اور اس وقت بھارتیوں کے رحم و کرم پر ہوں۔

مجھے اکثر اپنے والدین یاد آتے تھے، بہن یاد آتی تھی

اور تمہیں یاد آتی تھی تو میری شرمندگی شدید ہو جاتی تھی۔ وہ لوگ بھی کیا سوچتے ہوں گے کہ خرم نے تو بڑے بڑے دعوے کیے تھے کہ بھارتیوں کو نیست و نابود کر دوں گا۔

میں گھر سے یہ کہہ کر چلا تھا۔ ”ابا جی! اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو میں غازی بن کر لوگوں کا یا پھر آپ کو میری شہادت کی خبر ملے گی۔“

ابا جی خود بھی ریٹائرڈ فوجی تھے۔ انہوں نے میری پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔ ”خرم بیٹا! مجھے تجھ سے یہی امید ہے۔“

میرا تعلق پنجاب کی تحصیل (رب ضلع) پنڈدادن خان سے ہے۔ وہاں کے بارے میں مشہور ہے۔ دادن خان کی مائیں فوجی افسروں کو بھجوتی ہیں۔

بھارتیوں نے مجھ سے کہا کہ ریڈیو روم میں چلو اور ریڈیو پر اپنے گھر والوں کو اپنی خبریت کا پیغام دے دو۔

مجھے ایک مرتبہ پھر ندامت اور شرمندگی نے گھیر لیا۔ میں اپنے گھر والوں سے کیا کہتا کہ میں نہ غازی ہوں نہ شہید بلکہ دشمنوں کے سامنے ہتھیار بیچنے والا ایک قیدی ہوں جو اس وقت دشمن کے ٹکڑوں پر زندہ ہے۔

”اٹھو لیفٹیننٹ صاحب!“ آنے والے صوبیدار نے تھنیک آمیز لہجے میں کہا۔

میں ریڈیو روم کی طرف بڑھا تو میرے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ مجھے یہ ندامت تھی کہ میرے گاؤں والے کیا سوچیں گے؟ گھر والے کیا سوچیں گے اور سب سے بڑھ کر تمہیں کیا سوچے گی؟ تمہیں میری تم زادمی۔ وہ بہت خوب صورت تھی اور مجھے بہت پسند تھی۔ اس کی بولتی آنکھوں نے اکثر مجھے بتایا تھا کہ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے۔ ہم دونوں نے آج تک انکھار محبت نہیں کیا تھا، بس بغیر کچھ کہے ایک دوسرے کو چاہے جا رہے تھے۔

میری روائی کے وقت تمہیں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”کیا میرا انتظار کرو گی؟“ یہ جملہ بے اختیار میری زبان سے ادا ہو گیا تھا۔

تمہیں نے مسکرا کر مجھے دیکھا پھر سر جھکا کر اثبات میں گردن ہلا دی۔

میرے چاچا بھی فوجی تھے اور ان کا بیٹا راشد بھی فوج میں مقرر تھا۔

وہ لوگ کیا سوچ رہے ہوں گے؟ کیا وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ ایک ایسے آدمی کے ہاتھ میں دے دیں گے جو دشمن کے سامنے ٹھٹھکے بیٹا چکا ہو؟

یہی سوچنا ہوا میں ریڈیو روم تک پہنچا۔
مجھ سے پہلے دو افسر اور تین جوان اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے تھے اور اس وقت کیپٹن کے عہدے کا ایک فوجی اپنا پیغام ریکارڈ کر رہا تھا۔ ”میں کیپٹن علی حسن، نمبر 5031331، سکنت چک ایک سو چوہتر، تحصیل گوجرانہ، ضلع راولپنڈی خبریت سے ہوں اور اس وقت بھارتی فوج کی قید میں ہوں۔ ابا جی، اماں، شاداں سب کو میرا سلام اور گڈ وکڈ بہت بہت پیار۔“ اس نے اپنا پیغام ختم کیا تو اس کی پیشانی سینے میں ترسٹی اور آنکھیں نم۔ وہاں موجود ہر جنگی قیدی کی یہی کیفیت تھی۔

اپنی باری آنے پر میں نے بھی اسی قسم کا پیغام ریکارڈ کر لیا اور کوشش کی کہ سننے والوں کو میرے کرب اور ذہنی اذیت کا اندازہ نہ ہو سکے۔ پیغام ریکارڈ کرنے کے بعد میری بھی وہی کیفیت تھی۔ میرا چہرہ سینے میں ترسٹا اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

میں یوں پوچھل قدموں سے لوٹا جیسے اپنے گھر والوں کو اپنی موت کی خبر دی ہو۔

میں آگے پیٹھا ہی تھا کہ کیپٹن وقار میرے پاس آگیا اور آہستہ سے بولا۔ ”کچے! میرے ذہن میں یہاں سے فرار کا ایک پلان ہے۔۔۔۔۔ چلے گا میرے ساتھ؟“

میں نے چونک کر اسے دیکھا، وہ اس وقت بالکل سنجیدہ تھا۔

”میری بات کو مذاق مت سمجھ۔“ وقار نے کہا۔ ”میں فرار کی تیاریاں کافی دنوں سے کر رہا ہوں۔“

”لیکن سر! اگر پکڑے گئے تو۔۔۔۔۔“
”تو کیا؟“ وقار نے کہا۔ ”زیادہ سے زیادہ یہ لوگ گولی مار دیں گے۔۔۔۔۔ تو مار دیں۔ ذلت کی اس زندگی سے تو بہتر ہے کہ ایک کوشش کر کے مر جائے۔“

”پلان کیا ہے سر؟“ میں نے بھی سرگوشی میں پوچھا۔
”پلان بھی تجھے بتا دوں گا۔“ وقار نے کہا۔ ”پہلے تو یہ تو بتا کہ تمہیں کتو میرے ساتھ چلے گا یا نہیں؟“

”ہمارے ساتھ اور کون کون جا رہا ہے؟“
”صرف سپاہی احمد یار نے میرے ساتھ چلنے کی ہامی بھری ہے۔“ وقار نے کہا۔ ”یوں بھی میں نے زیادہ لوگوں سے بات نہیں کی۔ زیادہ لوگوں میں پکڑے جانے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔“

”میں چلوں گا سر!“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
اس وقت مجھے اپنے جسم میں گویا ایک نئی توانائی کا احساس

”تمہارے پاس پیسے کتنے ہیں؟“ وقار نے پوچھا۔
 ”پیسے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔ ”میرے پاس تو کوئی پیسہ نہیں ہے۔“
 ”نو پر ابلیہ؟“ وقار نے کہا۔ ”میں نے پانچ پانچ، دس دس روپے کر کے کچھ پیسے بچائے ہیں۔ تم بھی آج سے بچانا شروع کر دو۔“

بھارتی فوجیوں اور ریڈ کراس کی طرف سے ہمیں ہر ہفتے چھوٹے موٹے اخراجات کے لیے کچھ رقم ملتی تھی جو ہم صابن، ٹوٹھ پیسٹ اور اس قسم کی دوسری چیزوں میں خرچ کرتے تھے۔ کیمپ میں ایک کینٹین بھی تھی۔ کینٹین کا بنیا ٹھیکہ دار ایک نمبر کا کینہ تھا۔ وہ ہر چیز ہمیں منگے داموں فروخت کرتا تھا۔

”آپ وہ پیسے رکھتے کہاں ہیں سر؟“ میں نے پوچھا۔
 ”بھارتی فوجی ہفتے میں ایک دفعہ یا بھی کسی اجانک بھی ہماری تلاشی لے لیتے ہیں۔ وہ اتنی رقم دیکھیں گے تو نہ صرف جبین لیں گے بلکہ ہماری طرف سے مشکوک بھی ہو جائیں گے۔“

”میں بعد میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ اس وقت وہ کینہ بوٹا سنگھ بہت غور سے ہمیں دیکھ رہا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ قدرے بلند آواز میں بولا۔ ”اب اس حقیقت کو تسلیم کر لو لیفٹیننٹ خرم! تم ایک جتنی قیدی ہو اور اس وقت فاتح فوج کی قید میں ہو۔“ وہ ہنسا ہوا چلا گیا۔

بوٹا سنگھ کے ساتھ ساتھ وہاں موجود دوسرے سستریوں نے بھی وقار کی بات سنی اور ان کی گردنیں فخر سے اکڑ گئیں۔ ان کے خیال میں وقار جیسے خود سر اور سرکش آدمی نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔

حوانے ضروریہ سے فراغت کے لیے بھارتی فوجیوں نے کیمپ کے ایک کونے میں تین کی چادریں لگا کر دو تین بیت الخلا بنادے تھے۔ بیت الخلا کیا، زمین میں خاصا گہرا ایک گڑھا کھود کر اسے بیت الخلا کا نام دے دیا تھا۔ وہاں پانی کا ایک ڈرم رکھ دیا گیا تھا۔ اس ڈرم میں پانی بھرنے کی ذمہ داری بھی قیدیوں کی تھی۔

البتہ افسران کو ان لوگوں نے کچھ سہولیات فراہم کی تھیں۔ ان کے بیت الخلا کچھ بہتر تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل اور بریگیڈ میجر کو البتہ خاصی مراعات دی گئی تھیں۔ انہیں پختہ اور بہتر منسل خانے اور بیت الخلا دیے گئے تھے۔ ان کی خدمت کے لیے جتنی قیدیوں ہی میں سے اردلی بھی دیے گئے تھے اور ان کے لیے لائڈری کا بھی

شروع شروع میں تو بیت الخلا جاتے وقت ایک سستری بھی ساتھ ہوتا تھا جو بیت الخلا سے کچھ فاصلے پر کھڑا رہتا تھا۔ پھر ان لوگوں نے یہ تکلف بھی چھوڑ دیا کہ قیدی خاردار تاروں کی دو دو باڑوں میں سے نکل کر کیسے بھاگ سکتا ہے۔ ایک باڑ کے بعد تقریباً چھ سات فٹ کے فاصلے پر دوسری باڑ تھی۔ دو دو باڑوں کے درمیانی حصے میں بھارتی فوجیوں کا گشت جاری رہتا تھا۔

انہی دنوں کینٹن وقار نے مجھے بتایا کہ ہم افسروں کے بیت الخلا سے ایک سرنگ کھودیں گے۔ اس نے اس کے لیے باقاعدہ نقشہ بھی بنا لیا تھا۔ بیت الخلا خاردار تاروں کی پہلی باڑ سے تین چار فٹ کے فاصلے پر تھا۔ گویا ہمیں تقریباً پچیس فٹ لمبی سرنگ کھودنا تھی۔ وہ سرنگ ایک میدان میں نکلتی۔ وہاں سے تقریباً دس بارہ فٹ کے فاصلے پر درختوں کے جھنڈ اور خود رو جھاڑیوں کا ایک جنگل سا بن گیا تھا۔

”پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ ہم ان خود رو جھاڑیوں تک سرنگ کھودیں گے۔“ وقار نے کہا۔ ”لیکن میں نے سوچا کہ فضول کی محنت سے کیا فائدہ۔“

رات بارہ بجے اور صبح چھ بجے تا دو پر موجود سستریوں کی ڈیوٹی تبدیل ہوتی تھی۔ پرانے سستریوں کے جانے اور نئے سستریوں کے آنے میں تقریباً چار منٹ کا وقفہ ہوتا تھا۔

”ہمیں اسی وقفے میں سرنگ سے نکل کر خود رو جھاڑیوں کے اس جھنڈ تک پہنچنا ہے۔ پھر اگر نقد پرنے ساتھ دیا تو انشاء اللہ ہم دشمن کی نظروں میں آئے بغیر وہاں سے نکل جائیں گے۔“

سیاہی احمد یار نے نہ جانے کہاں سے وہ مضبوط کیل حاصل کی تھی جسے زمین پر گاڑ کر اس میں خیمے کی رسیاں باغی جاتی تھیں۔

کینٹن وقار نے مجھ سے کہا کہ تو تھ پیسٹ کے ٹیوب کو نیچے سے کاٹ کر اس میں سے پیسٹ نکال دو اور اس میں ٹوٹ محفوظ کر لو۔

یہ طریقہ واقعی بہت بہترین تھا۔ بھارتی فوجی ہر ہفتے ہماری تلاشی لیتے تھے۔ ٹوٹھ پیسٹ کے ٹیوب کی طرف تو ان کا حیاں بھی نہیں جاسکتا تھا۔

میں نے اسی طریقے سے ٹوٹھ پیسٹ کے ٹیوب میں پیسے محفوظ کرنا شروع کر دیے۔

ہم لوگ باری باری سرنگ کھودتے تھے۔ جب ہم میں سے کوئی بیت الخلا میں ہوتا تو دوسرا کہیں آس پاس ہی

کسی بھی خطرے کی صورت میں باہر نگرانی کرنے والا کوئی آواز نکال کر اندر والے کو ہوشیار کر دیتا۔

ہمارے ان تمام ساتھیوں کو سرنگ کا علم تھا جو وہ بیت الخلا استعمال کرتے تھے۔ احمد یار بھی سستریوں کی آنکھ بچا کر اسی بیت الخلا چلا جاتا تھا۔

کھدائی کا کام ہم لوگ رات میں کیا کرتے تھے۔ ابتدا میں تو ہمیں ٹھوڑی سی دقت ہوتی لیکن ہمارے جنون نے اسے چیلنج سمجھ کر قبول کیا تھا۔ ہم تینوں رات رات بھر سرنگ کھودتے اور اس میں سے نکلنے والی مٹی کو اس گڑھے میں چھینک دیتے جو بیت الخلا کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

پھر ہم مٹی کو دو تین پھیلانے لگے۔ سرنگ آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ان دنوں اللہ آباد میں شدید سردی بھی اس کے باوجود سرنگ میں جا کر ہم پسینے میں شرابور ہو جاتے تھے۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے تاکہ یہ ایک دوسری سنسنی خیز داستان ہے۔ اگر بھی موضوع ملا تو میں آپ کو یہ داستان بھی سناؤں گا۔

تیس دن کی جدوجہد کے بعد سرنگ تیار ہو گئی۔ ہم نے باری باری اس سوراخ سے باہر جھانک جہاں سے ہمیں باہر نکلتا تھا۔ ہم کیمپ کی حدود سے تقریباً پندرہ فٹ باہر تھے۔ کینٹن وقار نے مٹی کے ڈھیلے لگا کر چھوٹے سے اس سوراخ کو دوبارہ بند کر دیا۔

یوں بھی خاص طور پر اس طرف کوئی آتا نہیں تھا لیکن بھارتی فوجی بھی کبھار پورے علاقے کا ایک چکر ضرور لگاتے تھے۔

ہماری تقریباً تمام تیار یاں مکمل تھیں، صرف کپڑوں کا بندوبست نہیں ہوا تھا۔ ہمارے کپڑوں پر خاصے لمبی حروف POW لکھا ہوا تھا۔

میرے پاس چھوٹا سا ایک ٹرانزسٹر تھا۔ آج کی طرح ان دنوں ٹرانزسٹر ریڈیو اور گھڑیاں اتنی ارزاں نہیں تھیں۔ بھارتی توپوں بھی ان چیزوں کے لیے ترے ہوئے تھے۔ وہاں تو غیر ملکی اشیاء کی اپورٹ پر پابندی تھی۔

ہمارے ٹینٹ میں صفائی کرنے کے لیے ایک خاکروب آیا کرتا تھا۔ ظاہر ہے، وہ شور تھا اور کیمپ کے سستریوں کا رویہ اس کے ساتھ انتہائی اہانت آمیز تھا۔ ہم لوگ اکثر اسے بھی چوٹی، بھی انٹنی دے دیا کرتے تھے۔ اکثر ہم اسے کھانے پینے کی چیزیں بھی دے دیتے تھے جو ریڈ کراس کی طرف سے ہمیں ملا کرتی تھیں۔

پچھلا دروازہ

یہاں رمضان کے مہینے میں کھانے پینے کی دکانیں شام تک بند رہتی ہیں۔ ایک روز شہر میں ٹھوٹے پھرتے مجھے جھوک محسوس ہوئی تو میں نے اپنے ایک مقامی دوست کو جو اس وقت میرے ہمراہ تھا، اس بنگالی صورت حال سے آگاہ کیا، چنانچہ وہ چلتے چلتے ایک جگہ رک گیا اور ایک بند دکان کے باہر آ بیڑاں گئے پر لکھی عبارت پڑھنے لگا۔ میں نے پوچھا کیا لکھا ہے؟ بولا لکھا ہے۔ ”رمضان المبارک کے احترام میں ہول بند ہے۔“ کھانا کھانے کے لیے پچھلے دروازے سے تشریف لائیں چنانچہ ہم کھانا کھانے کے لیے پچھلے دروازے سے داخل ہوئے اور کھانا کھا کر پچھلے دروازے ہی سے باہر آ گئے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہاں پچھلے دروازے کا استعمال بہت عام ہے۔ لوگ سیاست اور اقتدار میں بھی پچھلے دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور پھر ایک دروازہ کی داغ بیل بھی پچھلے دروازے سے ہی ہوتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریر، بلوچستان سے کشملا کا انتخاب

میں نے کینٹن وقار سے مشورہ کر کے اسے آزمانے کا فیصلہ کیا۔

ایک دن وہ صفائی کرنے آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”یار اتم اسنے عرصے سے آرہے ہو، میں آج تک تمہارا نام بھی معلوم نہیں ہوا؟“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پہلے تو وہ بہت سہا رہتا تھا لیکن پھر ہمارے بہتر رویے کی وجہ سے وہ ہم سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔

”نام کی بھی خوب کبھی صاب جی!“ اس نے ہنس کر کہا۔ ”مارا نام پچھ کے“ کے کرو گے؟ مارا نام تو بیولا رام ہے پر یہاں تو سب مارے کو بھٹکی کہتے ہیں، بھٹکی!“ اس کا لہجہ سن ہو گیا۔ ”جتنے بھی دلت (شودر) ہیں، وہ سارے ہی بھٹکی ہیں صاب جی۔“

”اچھا بھئی، میں تمہارے لیے کھانے کو کچھ لاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

وہ جھاڑو رکھ کے وہیں بھٹکڑا مار کے زمین پر بیٹھ گیا۔ شروع شروع میں تو وہ بھی محتاط تھا اور ہم سے بات کرنا تو دور کی بات ہے، ہماری طرف دیکھتا نہیں تھا لیکن جب بھارتی فوجیوں کی نگرانی میں ڈرائی واقع ہوئی تو بیولا رام بھی ہم سے بات چیت کرنے لگا۔

شام کو ریڈ کر اس کی طرف سے ہم لوگوں کو بکٹ اور لولڈ ڈرنک کے ٹن ملے تھے۔ دو سگریٹ کے پیکٹ بھی تھے۔

میں تو سگریٹ پیتا نہیں تھا۔ وہ سگریٹ میں اپنے ساتھیوں کو دے دیا کرتا تھا۔

میں نے لولڈ ڈرنک کا ایک ٹن، بکٹ کا ایک ڈبا اور سگریٹ کے دونوں پیکٹ بھولا رام کو دے دیے۔

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر بولا۔ "کے بات ہے صاب جی! مارے سے کوئی کام ہے؟"

وہ اتنا بھولا تھا نہیں جتنا شکل سے نظر آتا تھا۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ بھولا رام قابل اعتبار آدمی نہیں ہے۔ فی الحال اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ میرا ارادہ تھا کہ اسے اپنا ٹرانسزور دے کر معمولی کرتے پاجامے کے ٹمن جوڑے

منگو لوں گا۔ ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ کپڑوں کا تھا۔ ہمیں جویتی کپڑے ریڈ کر اس کے ذریعے پاکستان سے بھیجے جاتے تھے، ان میں سے آدھے سے زیادہ تو بھارتی فوجی خود

بھتھیا لیتے تھے۔ بقیہ پر بہت بے دردی سے POW (جنگی قیدی) کی مہر لگا دیتے تھے۔ ان کپڑوں میں تو ہم کیپ سے

نکلنے ہی دھر لے جاتے۔

میں نے بھولا رام سے سر دلچھے میں کہا۔ "مجھے تم سے بھلا کیا کام ہوگا؟ تم ہماری خدمت کرتے ہو اس لیے میں یہ چیزیں تمہیں خوش ہو کر دے رہا ہوں، آئندہ نہیں دوں گا۔"

"ارے صاب جی! ہم نے تے ایک بات پوچھی تھی، آپ تے نرا ضا ہی ہو گئے۔"

"میں ناراض نہیں ہوا۔" میں نے سر دلچھے میں کہا۔ "جاؤ اپنا کام کرو۔"

وہ شرمندہ سا ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

شام کو میں نے اس کا ذکر وقار سے کیا تو وہ درشت لہجے میں بولا۔ "تمہاری وجہ سے ہمارا پروگرام چوتھ ہو جاتا

خرم۔" وقار جب غصے میں یا بہت زیادہ سنجیدہ ہوتا تھا تو وہ مجھے کپٹین کہنے کے بجائے میرا نام لیتا تھا۔

"سوری سر۔" میں نے کہا۔ "میں نے اس سے کوئی بات تو نہیں کی۔"

"کپڑوں کی فکر مت کرو کیے! وقار مسکرا کر بولا۔ "اگلے مہینے جب ریڈ کر اس والے ہمیں کپڑے دیں گے تو میں لینے سے انکار کر دوں گا۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "تمہارے ساتھ پرائیم یہ ہے کپٹن کہ تم سوچتے

بالکل نہیں ہو۔ میں تمام وقت اسی سوچ بچار میں گزارتا ہوں۔"

میں بھی سوچتا تھا۔ میں نے فرار کے بارے میں کچھ منصوبے بھی بنائے تھے لیکن وہ ابھی تک میرے ذہن میں

تھے۔ شاید اس لیے کہ وقار جیسا سینئر آدمی ہمارا لیڈر تھا۔ وہ مجھ سے کافی سینئر تھا اور یہاں نہ ہوتا تو اب تک میجر بن چکا

ہوتا۔

"سر! آپ نے بتایا نہیں کہ....."

"اپنا ذہن استعمال کرو۔" وقار نے سنجیدگی سے کہا۔ "اور مجھے بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟ اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ریڈ کر اس والے دو دن بعد

آئیں گے۔"

"اوکے سر!" میں نے کہا۔ "میں کل ہی اپنا پلان آپ کو بتا دوں گا۔"

شام کی چائے پینے کے بعد بھی میں یہی سوچتا رہا کہ کپڑوں کا کیا بندوبست کیا جائے؟ وقار نے ریڈ کر اس

والوں کا ذکر کیا تھا۔ میں نے بھی اسی رخ پر سوچنا شروع کر دیا۔

میں نے سوچا، میں ریڈ کر اس والوں سے کیوں گا کہ اپنی نگرانی میں اور اپنے ہاتھوں سے سامان تقسیم کریں۔

بھارتی فوجی تو یوں بھی اپورنڈ کپڑوں، صابون، تھوٹھ پیسٹ وغیرہ کے دیوانے تھے، بھارتی فوجی ہی کیا پورے بھارت کا

یہی حال تھا۔ وہ جد امیز رشک سے کہتے تھے کہ تم لوگ خوش قسمت ہو کہ غیر ملکی اشیاء تمہارے ملک میں اتنی آسانی سے

دستیاب ہیں۔ مجھے اب خیال آتا ہے کہ یہ ہماری خوش نصیبی نہیں بلکہ بد نصیبی تھی۔ اگر ہمارے ملک میں بھی غیر ملکی اشیاء پر

پابندی ہوتی تو آج ہمارے ملک میں بھی صنعت بہت ترقی کر چکی ہوتی اور ہماری معیشت مضبوط ہوتی۔

ریڈ کر اس والے جب یہ اشیاء اپنے ہاتھوں سے کیپ میں تقسیم کرتے تو بھارتی فوجیوں کے ہاتھ کچھ بھی نہ آتا۔

میں نے سوچا جو صوبیداران خوب صورت کپڑوں پر پی او ڈبلیو کی بد نما مہر لگا کر برآمد کرتے تھے، اس سے کہوں گا

کہ وہ مجھ سے سارے کپڑے لے لے لیکن اتنے نفس اور قیمتی کپڑوں کو داغ دار نہ کرے۔ اگر وہ مان گیا تو مجھے ایک دو

جوڑے ایسے مل جائیں گے جن پر POW کا منوس نشان نہیں ہوگا۔ وہ کم بخت اس مہر کو چھاپتے بھی اتنی جلی حروف سے تھے کہ پہلی ہی نظر میں معلوم ہو جاتا کہ یہ آدمی جنگی قیدی ہے۔

شام کو وقار سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے اسے اپنے پلان سے آگاہ کیا۔

کپٹن وقار اچھل پڑا اور جوش میں آ کر میری پیٹھ پر اتنا زور دار دھپ مارا کہ چند لمحوں کے لیے تو میری سانس ہی

رک گئی۔ پھر وہ نفس کر بولا۔ "یار کیے! تو تو بالکل میرے انداز میں سوچتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیرا ذہن بھی

خوب کام کرتا ہے۔ میں نے بھی بالکل یہی سوچا تھا بلکہ میں نے نور یڈ کر اس والوں کو پیغام بھی بھجوا دیا ہے۔

"وہ کیسے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "دو دن پہلے احمد یار کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔"

"ہاں، یہ تو میں جانتا ہوں۔"

"اس کی طبیعت خراب ہوئی نہیں تھی بلکہ میرے کہنے پر اس نے خود ہی کی تھی۔ اس نے نہ صرف نیم کے پتے

چبائے بلکہ انہیں نگل بھی گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے زبردست التلیان شروع ہوئیں۔ بریکڈیٹر میر صاحب کے

کہنے پر اسے کیپ کے اسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ وہاں ریڈ کر اس کا ایک نمائندہ ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ اس

نے....."

"میں سمجھ گیا۔" میں نے کہا۔ "احمد یار نے ریڈ کر اس کے نمائندے تک آپ کا پیغام پہنچا دیا ہوگا۔"

"یہی بات ہے۔" کپٹن صاحب! وقار مسکرایا۔ "آج کے بعد میں آپ کو کپٹن نہیں کہوں گا۔"

"تھیک یوسر!"

"ریڈ کر اس والے اگلے یہاں آئیں گے۔ ہمارے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ سرنگ کہیں بیٹھ

ہی نہ جائے ورنہ ہماری ساری محنت غارت ہو جائے گی۔"

"انشاء اللہ! انہیں ہوگا سر۔" میں نے کہا۔

آپ کے ذہن میں یہ سوال ہوگا کہ میری وقار سے شام ہی کو ملاقات کیوں ہوئی تھی؟ دن بھر تو ہم بی بی پریڈ،

ایکسر ساز کرتے رہتے تھے۔ سہ پہر کے وقت ہم باسکٹ بال، ہاکی یا فٹ بال کھیلتے تھے۔ شام ہی کا وقت ایسا ہوتا تھا

جب ہم یکسو ہو کر بات چیت کر سکتے تھے۔ ☆☆☆

پینٹ اور قمیص تھیں، ہماری ماؤں اور بہنوں کے ہاتھوں کے بنے ہوئے خوب صورت سویٹر اور جرسیاں تھیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔

جب وہ سامان ہمیں مل رہا تھا تو بھارتی فوج کے افسروں اور جوانوں کے سینوں پر سانپ لوٹ رہے تھے۔

اچانک صوبیدار میجر رنیر سنگھ نے کہا۔ "اس تمام سامان پر پی او ڈبلیو کی مہر لگے گی اس لیے تم لوگ اسے ابھی

دوسرے سامان سے علیحدہ ہی رکھنا۔"

میں اور وقار سامان لے کر اپنے ٹینٹ میں آئے تو فوراً ہی وہ منحوس صورت صوبیدار بھی آ گیا جو ہمارے کپڑوں پر مہر

لگایا کرتا تھا۔

کپٹن وقار نے خوشامد اند لہجے میں کہا۔ "صوبیدار صاحب! آپ ان چیزوں میں سے جو چاہے لے لیں لیکن اسے لکھتی ٹھپا لگا کر خراب نہ کریں۔"

صوبیدار نے آہستہ سے کہا۔ "تم اس سامان میں سے صرف ایک کبل، ایک سویٹر اور نفیس، پینٹ کے دو جوڑے

رکھ سکتے ہو۔"

"آپ کی بہت مہربانی صوبیدار صاحب۔" وقار نے کہا۔ "اب آپ ہی بتائیے، اتنے قیمتی کپڑوں پر وہ لکھتی ٹھپا

اچھا لگتا ہے؟ اس سے تو کپڑوں کا سارا حسن غارت ہو جاتا ہے۔"

"اصل میں یہاں ہمارے جتنے بھی افسر اور جوان ہیں، اس سامان میں ان کی کچھ ہوتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں صوبیدار صاحب! یہ سب سامان آپ ہی کا ہے۔"

اس دن صوبیدار نے کسی بھی کپڑے پر وہ ٹھپا نہیں لگایا اور ساتھ ساتھ دھکی آئیز لہجے میں یہ بھی کہا کہ کسی سنٹری

کو یہ معلوم نہ ہو کہ میں نے اسٹیمپ نہیں لگائی۔

"آپ فکر مت کریں صوبیدار صاحب! کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔

وہ انتہائی لالچی اور آحق آدمی تھا۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو یہ ضرور سوچتا کہ یہ کپٹن کپڑوں پر ٹھپا کیوں نہیں

لگواتا جانتا؟

آحق صوبیدار نے کپٹن وقار کو ایک خوب صورت جرسی، موڑے اور کپڑوں کے دو جوڑے دے دیے۔ مجھے اس نے ایک خوب صورت اور قیمتی جیکٹ، کپڑوں کا ایک جوڑا اور چند چھوٹی موٹی چیزیں دے دیں۔

میری تو خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ ہمیں بغیر کوئی

اضافی رقم خرچ کیے کپڑے مل گئے تھے۔ ہمارے پاس جوتوں کا ایک ایک جوڑا پہلے ہی موجود تھا۔ میرے پاس تقریباً پانچ سو روپے جمع ہو گئے تھے۔ کپٹن وقار کے پاس ساڑھے بارہ سو روپے تھے کیونکہ وہ پہلے سے فرار کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ احمد یار کے پاس ساڑھے چار سو روپے تھے کیونکہ اس نے چارے کا الاؤنس ہم سے کم تھا۔ الاؤنس بھی عہدوں کے لحاظ سے دیا جاتا تھا۔ ہماری تیاری ہر طرح سے مکمل تھی۔

شام کی چائے پر وقار نے کہا: ”ہم لوگ کل رات کو رول کال کے بعد یہاں سے نکل جائیں گے۔ کل تم میں اچھی طرح آرام کر لینا کیونکہ ہمیں رات بھر جانا ہے۔ مجھے احمد یار نظر نہیں آیا ہے۔ اسے بھی بتا دینا کہ وہ کل رات تیار رہے۔“

”اوکے سر!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ رات بھر مجھے فرار کے خیال سے نیند نہیں آئی۔ میں خواب میں بھی خود کو فرار ہوتا دیکھ رہا تھا۔ بھی میں دیکھتا کہ بھارتی فوجیوں نے ہمیں پکڑ لیا ہے، بھی میں بھارتی فوجیوں پر حملہ کر دیتا۔

رات بھر اسی قسم کے بے سوچاؤ خواب دکھائی دیتے رہے اور میں چونک کر اٹھتا رہا۔

صبح میری طبیعت خاصی بھاری بھاری تھی۔ مجھے اپنے انسٹرکٹر میجر شاہد کا قول یاد آیا۔ ”کوئی بھی آئرش شروع کرنے سے پہلے اس پر ہر پہلو سے غور کرو اور مطمئن ہونے کے بعد جب اس پر عمل کرو تو ذہن میں کسی بھی قسم کی فیشن نہیں ہونا چاہیے۔“

میں نے صبح جائے کے ساتھ دو گولیاں اسپرین کی لیں اور پھر لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے مجھ پر فکر و تشویش سوار ہوئی تو میں اٹھ کر باہر نکل آیا۔

اس وقت مجھے احمد یار دکھائی دیا۔ وہ لمبا ترنگا اور گورا چٹا نو جوان تھا۔ بہت ہی ہنس مکھ اور بات بات پر قہقہے لگانے والا..... لیکن بھارتی فوجیوں سے اس کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ اگر اس کا بس چلتا یا کیمپ میں بریگیڈیئر منیر صاحب جیسے تخلص افسر نہ ہوتے تو وہ اب تک دو چار بھارتی فوجیوں کو قتل کر چکا ہوتا۔

وقار اکثر مجھے اور احمد یار کو سمجھاتا تھا کہ اس وقت ہم دشمن کی قید میں ہیں، ہمیں جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت ہے۔ تم دونوں اپنے جوش پر اپنی اجال قابو پاؤ، بعد میں جوش دکھانے کے لیے مواقع ملیں گے۔

میں نے احمد یار کو اشارے سے اپنی طرف بلا دیا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے فوجی انداز میں تن کر اپنے جسم کو دونوں بچوں پر اٹھایا اور بولا۔ ”میں سر!“

”احمد یار اب تیاری مکمل ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”میں سر! اپنا صاحب نے میرے ذمے جو کام لگائے تھے، وہ سب میں نے کر لیے ہیں۔“

”جاؤ اب کچھ دیر آرام کرلو۔“ میں نے کہا۔ احمد یار ہنستا ہوا چلا گیا۔ اصل میں کپٹن وقار نے ہم سب کی ذمے داریاں بانٹ دی تھیں۔ جنرل نارچ، زمین کھودنے کے لیے ٹینٹ کی بھاری اور ٹینٹ کیل، ایک مضبوط رسی اور فرسٹ ایڈ کا سامان اکٹھا کرنا احمد یار کی ذمے داری تھی۔

میرے ذمے پانی اور خوراک کا کچھ ذخیرہ، دردورفع کرنے والی گولیاں اور ایک چھری کا بندوبست کرنا تھا۔ باقی ذمے داریاں وقار کی تھیں۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں نے ہر چیز کا بندوبست کر لیا ہے، سوائے چھری کے۔

رات کو میں نے ان کپڑوں کی چھوٹی سی ایک ٹکڑی بنا کر اپنے پنگ کے نیچے چھپا دی جن پر جتنی قیدی کی مہر نہیں تھی۔ حسب معمول دس بجے رول کال شروع ہوئی۔ یہ ایک طرح سے تمام قیدیوں کی حاضری اور گنتی ہوتی تھی۔

گیارہ بجے ہمیں وہاں سے نکل کر سرنگ کے دہانے پر ملنا تھا۔ ہمارے پاس گھڑیاں تو نہیں تھیں لیکن کیمپ کے کوارٹر گارڈ کے گھنٹے سے وقت کا علم ہو جاتا تھا۔ وقار نے آہستہ سے کہا۔ ”گیارہ کا گھنٹا بجتے ہی تم لوگ سرنگ پر پہنچ جانا۔ اس کے لیے ہمارے پاس صرف دس منٹ ہوں گے۔“ سرنگ میں کرائگ کرنا بھی خاصا مشکل کام تھا۔ وقار نے اس کے لیے پینٹا لیس منٹ رکھے تھے۔

گویا گیارہ بج کر پچیس منٹ پر ہم سرنگ کے دوسرے دہانے پر ہوئے۔ بارہ بجے واپس ٹاور کے سنتریوں کی ڈیوٹی بدلتی تھی۔ دوسرے سنتری اوپر پہنچنے میں تقریباً پانچ سے سات منٹ لگاتے تھے۔ گویا ہمارے پاس وہی پانچ منٹ تھے جن میں ہم سرنگ سے نکل کر درختوں کے جھنڈ میں روپوش ہو سکتے تھے۔

خفیک گیارہ بجے میں نے اپنے سامان کا تھیلہ اٹھایا اور دیے پاؤں اس طرف بڑھ گیا جہاں ہم نے سرنگ کھودی تھی۔

اس وقت وقار بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلہ سا تھا۔ وہ اصل میں نیلے کاغذ تھا۔ ”تمہیں یہ بیگ کہاں سے مل گیا؟“ وقار نے پوچھا۔ ”یہ میں نے لیفٹیننٹ نعیم کے پنگ کے نیچے دیکھا تھا۔ اسے تو اس کی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں نے لے آیا۔“

”یہ احمد یار اب تک کیوں نہیں آیا؟“ وقار نے بے تابی سے کہا۔ ”بس آ رہا ہو گا سر!“ میں نے کہا۔ ”اس کے لیے دشواری زیادہ ہے کیونکہ یہ بیت الخلا افسران کے لیے ہے۔ رات کے وقت باہر نکلنے پر یوں بھی پابندی ہوتی ہے وہ.....“

میرا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ وقار نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کی ہدایت کی تھی۔ چند لمحوں بعد مجھے بھی قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ احمد یار نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ بھارتی لوگوں کی آواز تھی۔ میرا دل اچھل کر قلعے میں آ گیا۔ تو کیا ہمارا پلان ناکام ہو گیا تھا؟ میں نے دل گرفتگی سے سوچا۔

وہ آہستہ بیت الخلا کے دروازے کے پاس آ کر درک گئیں۔ پھر مجھے ایک اجنبی آواز سنائی دی۔ ”وہ اسی طرف آیا ہے۔“

”تو اب کہاں گیا؟“ دوسری آواز سنائی دی۔ ”کیا وہاں بن کر اڑ گیا یا زمین میں دھنس گیا؟“

”ہو سکتا ہے، وہ اندر چھپا بیٹھا ہو۔“ پہلے آدمی نے کہا۔

”کون ہے بھی؟“ وہ چیخا اور ساتھ میں طاقت ور نارچ بھی روشن ہوئی۔

کپٹن وقار ایک دم زمین پر لیٹ گیا اور میں سامنے آ گیا اور بولا۔ ”کیا بات ہے جوان..... کیوں چیخ رہے ہو؟“

اس کی نارچ سے میری آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ اس نے نارچ کا رخ دوسری طرف کرتے ہوئے پوچھا۔

”صاحب! ابھی آپ آئے ہیں ادھر؟“

”کیا کوئی اور بھی آیا ہے؟“ میں نے ناگواری سے کہا۔

”لیفٹیننٹ صاحب!“ ان میں سے ایک طنزیہ لہجہ میں بولا۔ ”آپ جانتے ہو کہ رات کے اس سے باہر نکلنا منع ہے۔“

”ہاں میں جانتا ہوں جوان!“ میں نے ہنس کر کہا۔

”لیکن میرے پیٹ میں شدید درد ہو رہا تھا اس لیے.....“

”اوئے سیتارام! وہ کوئی اور ہی تھا۔ تو یہاں کی اچھی طرح تلاشی لے لے۔“

میرا دل بڑی طرح دھڑکنے لگا۔ وہ ذرا سے آگے بڑھتے تو وقار کو دیکھ لیتے۔

میری طرف سے بے فکر ہو کر وہ مڑے ہی تھے کہ میں نے پشت سے ان دونوں کے کارپز کر ان کے سر آپس میں زور سے ٹکرایے۔

لمحے بھر کے لیے وہ ہٹکا ہٹکا سے رہ گئے۔ دوسرے ہی لمحے میں ہٹکا ہٹکا رہ گیا کیونکہ عقب سے ایک ہیولا سان پر چھپنا تھا اور ان میں سے ایک سنتری کو لے کر زمین پر ڈیرہ ہو گیا۔

میرے شکار کے ہاتھ میں ابھی تک روشن نارچ تھی۔ نارچ کی روشنی میں مجھے احمد یار نظر آیا۔ وہ ایک سنتری کی گردن دبا رہا تھا اور دوسرا ہاتھ مضبوطی سے اس کے منہ پر جما رکھا تھا۔

میں نے اپنے شکار کی کھوپڑی کی پشت پر ایک زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ وہ ”بے جھکوان“ کہتا ہوا زمین پر گر گیا۔

احمد یار اتنی دیر میں اپنے شکار کو ناک آؤٹ کر چکا تھا۔ یہ سب کچھ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہو گیا۔

”ان دونوں میں سے کسی کو زندہ مت چھوڑنا۔“ نزدیک ہی سے کپٹن وقار کی آواز سنائی دی۔ ”ورنہ یہ ہوش میں آتے ہی اتنی چیخ پکار کریں گے کہ بھارتی فوجی ہمیں اس سرنگ میں ہی زندہ دفن کر دیں گے۔“

احمد یار نے چھٹ کر میرے شکار کی گردن پکڑی، پھر گردن چھوڑ کر بائیں ہاتھ سے اس کا سر پکڑا اور دائیں ہاتھ سے ٹھوڑی پکڑی۔ اس نے سنتری کی ٹھوڑی پکڑ کر مخصوص انداز میں جھنکا دیا اور دوسرے لمحے ایسی آواز آئی جیسے سوکھی ہوئی شاخ کے ٹوٹنے سے آئی ہے۔

”جلدی کرو احمد یار!“ وقار نے کہا۔ ”دوسرے آدمی کو بھی ٹھکانے لگا دو۔“

”میں اسے ٹھکانے لگا چکا ہوں سر۔“ احمد یار نے کہا۔

”ان کی جیبوں سے نقدی نکال لو اور ان کی رائفلیں بھی اٹھا لو۔“

ان کی جیبوں میں نقدی تو زیادہ نہیں تھی۔ دونوں سنتریوں کی جیب میں مجموعی طور پر دو سو دس روپے تھے۔ ہمارے لیے تو وہ بھی اس وقت بہت تھے۔ البتہ ان سے ہمیں دو سو گھڑیاں مل گئیں۔ اس وقت گھڑی کی ہمیں شدید

دشمن کی قید میں ہیں، ہمیں جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت ہے۔ تم دونوں اپنے جوش پر اپنی اجال قابو پاؤ، بعد میں جوش دکھانے کے لیے مواقع ملیں گے۔

ضرورت تھی۔

احمد یار نے ایک گھڑی کیپٹن وقار کو دی اور دوسری میری طرف بڑھائی۔

”یہ گھڑی تم رکھو احمد یار!“ میں نے کہا۔

”نہیں سر! اس کی زیادہ ضرورت آپ کو ہے۔“ اس نے کہا۔ پھر کیپٹن وقار سے پوچھا۔ ”ان کی لاشوں کا کیا کرنا ہے؟“

”انہیں بھی ساتھ لے چلو۔“ کیپٹن وقار نے ہنس کر کہا۔ ”نہ جانے ہمیں کب کھانے کو ملے۔ کم سے کم انہیں روست کر کے کھا تو سکیں گے۔“

پھر وہ پیچیدہ ہو کر بولا۔ ”انہیں یہیں کہیں ڈال دو اور جلدی کرو۔ ہمارے سات منٹ پہلے ہی ضائع ہو چکے ہیں۔“

لاشوں کو ایک طرف ڈالنے کے بعد سب سے پہلے کیپٹن وقار نے احمد یار کو سرنگ میں اتارنے کا اشارہ کیا، پھر میں سرنگ میں اترا۔ سب سے آخر میں کیپٹن وقار سرنگ میں اترا۔ پہلے اس نے سرنگ کے منہ پر وہ تختہ رکھنا چاہا جو ہم احتیاط کے طور پر رکھتے تھے، پھر اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ تختہ رکھنے ہی سرنگ میں جمن بہت بڑھ گیا تھا۔

ہمارے پاس ساڑھے سات گھنٹے تھے۔ بھارتی فوجیوں کو ہمارے فرار کا علم صبح رول کال سے پہلے نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر خدا خواستہ انہیں اس سے پہلے علم ہو جاتا تو ہمارا فرار ناکام ہو جاتا۔

وہ سرنگ اتنی چوڑی تھی کہ ایک آدمی اس میں کراٹنگ کر کے آگے بڑھ سکتا تھا۔ اس کی اونچائی اتنی بھی نہیں تھی کہ ہم اس میں بیٹھ سکتے۔

احمد یار بہت تیزی سے کراٹنگ کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ وقار کے حکم پر اس نے بھارتی سنتر یوں سے چھٹی ہوئی طاقت ورنارچ روشن کر لی تھی۔

اس کے پیچھے میں تھا لیکن میری رفتار اتنی نہیں تھی۔ میں آپ کو شاید یہ بتانا بھول گیا کہ احمد یار تربیت یافتہ کمانڈر تھا۔ وہ اس قسم کے کاموں میں ماہر تھا۔ پریکٹس مجھے بھی تھی لیکن کافی عرصے سے کراٹنگ کرنے کی مشق نہیں کی تھی اس لیے رفتار درست تھی۔ یہی حال کیپٹن وقار کا بھی تھا۔

پنسل نارچ وقار کے پاس تھی اور وہ مسلسل گھڑی بھی دیکھ رہا تھا۔

مزید نہیں بائیس منٹ کی کراٹنگ کے بعد وقار نے کہا۔ ”احمد یار! نارچ بند کر دو۔ ہم اب سرنگ کے دوسرے

سرے تک پہنچنے والے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس طاقت ورنارچ کی روشنی باہر چلی جائے اور ورنارچ ٹاورز پر کھڑے ہوئے سنتری چونکنا ہو جائیں۔“

اچانک سرنگ میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ روشنی تھی تو اتنی گرمی اور گھٹن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میں جیتے جی کسی قبر میں دفن ہو گیا ہوں۔ شدید سردی کے باوجود میرے کپڑے پسینے میں تر ہو گئے تھے اور پسینا پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔

مزید دس منٹ گزرے تو میرا دم گھٹنے لگا، سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ وقار مسلسل پیچھے سے کھٹی کھٹی آواز میں کہہ رہا تھا کہ جلدی کرو، بس بارہ بجتے ہی والے ہیں۔

اچانک تازہ ہوا کا سرد جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا تو میری جان میں جان آئی۔

ہم سرنگ کے دوسرے سرے پر پہنچ چکے تھے اور احمد یار نے سرنگ کے منہ پر لگے ہوئے پتھر اور مٹی کے ڈھیلے ہٹا دیے تھے لیکن ابھی تک اس نے سرنگ سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ہم وہیں پڑے اپنی سانسیں بچال کرتے رہے۔ کیپٹن وقار کی نظریں گھڑی پر تھیں۔

بارہ بجتے ہی میرے کانوں میں گھنے کی خفیف سی آواز آئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم کیپ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔

کیپٹن وقار نے ایک منٹ انتظار کرنے کو کہا، پھر وہ اچانک فوجی انداز میں بولا۔ ”موو! (MOVE)۔“

احمد یار نے آہستگی سے سر باہر نکالا اور ارد گرد کا جائزہ لینے کے لیے رک گیا پھر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد ہم دونوں بھی باہر نکل آئے۔

ورنارچ ٹاورز ہم سے زیادہ دور نہیں تھے۔ یہ شدید خطرے کی بات تھی۔

کیپٹن وقار نے ہمیں کیپ کی مخالف سمت میں بڑھنے کا حکم دیا۔

احمد یار کسی چھپکلی کی طرح کراٹنگ کرتا ہوا ہم سے بہت آگے نکل گیا۔

میں بھی حتیٰ الامکان بہت تیزی سے کراٹنگ کر رہا تھا لیکن پیچھے پرلدا ہوا سامان کا تھیلہ اور سنتری سے چھٹی ہوئی رائفل رکاوٹ بن رہی تھی۔ میں یہ رائفل ابھی چھینک بھی نہیں سکتا تھا۔

بچنے کی صورت میں ہم کم از کم کچھ بھارتیوں کو تو جہنم

رسید کر سکتے تھے۔ کرائٹنگ کرنے میں میرے پیٹ، سینے پر خراشیں آئی تھیں، کنبھیاں تو بالکل ادھر کر رہی تھیں۔

کپٹن وقار کے بتائے ہوئے وقت کے مطابق ہم درختوں اور خودرو جھاڑیوں کے جھنڈ تک پہنچ چکے تھے۔

احمد یار وہاں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک اونٹ سے منہ پڑا ہوا تھا اور اپنی سانس بحال کر رہا تھا۔

”اب ہمیں جھک کر چلنا ہوگا۔“ کپٹن وقار نے کہا۔

”یہ درختوں کا جھنڈ اور خودرو جھاڑیاں بھی واضح طور پر سنتریوں کی ریح میں ہیں۔“

ہم جھکے جھکے بہت تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ اس وقت مجھے ملٹری اکیڈمی کے انسٹرکٹر صوبدار یوسف صاحب یاد آئے۔ وہ ٹیڈس کوسزا کے طور پر اس انداز میں دوڑا کرتے تھے۔ یہ سزا میں نے بھی بہت کھلتی تھی اس لیے مجھے زیادہ دقت نہیں ہو رہی تھی۔

”یار بھٹین!“ وقار نے ہنس کر سرگوشی کی۔ ”اس وقت تو مجھے ملٹری اکیڈمی یاد آگئی۔“

مجھے بھی آگئی کیونکہ میں بھی وہی کچھ سوچ رہا تھا۔

ہم نے اسی انداز میں دو فرلانگ کا فاصلہ طے کیا ہو گا۔ ایک ہی انداز میں چلتے چلتے میرے پاؤں شل ہو گئے تھے۔ کوئی عام آدمی اس طرح دوڑنا تو دور کی بات ہے، چلنے کا بھی تصور نہیں کر سکتا۔ میری پنڈلیوں اور رانوں کے منسل پہلے ہو گئے تھے۔

ایک جگہ کپٹن وقار نے رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم وہیں خود رو لگھاں پر پڑ کر ہانپنے لگے۔

کیمپ اب خاصا دور رہ گیا تھا لیکن ہم اب بھی خطرے میں تھے۔ فوجیوں کی کوئی بھی جیڑول پارٹی ہمیں پکڑ سکتی تھی۔

وہاں رک کر ہم لوگوں نے پانی پیا۔ پھر کچھ دم لے کر آگے بڑھ گئے۔ اس مرتبہ ہم تیزی سے دوڑ رہے تھے۔ ہمارے پیروں میں اگر مضبوط سول کے جوتے نہ ہوتے تو اس خاردار راستے پر ہمارے پاؤں لہو لہان ہو جاتے۔ ہمارے کپڑے خاردار جھاڑیوں میں الجھ کر پھٹ گئے تھے جسم پر کانٹوں کی بے شمار خراشیں تھیں۔ بس ہم دوڑ رہے تھے۔

آدھے گھنٹہ تک دوڑنے کے بعد کپٹن وقار نے ایک مرتبہ پھر گھڑی دیکھی اور بولا۔ ”ہمیں کیمپ سے فرار ہونے دو گھنٹے ہو چکے ہیں۔ اب تھوڑی دیر رک کر دم لے لو۔“

ہم وہیں زمین پر ڈھکے اور لمبے لمبے سانس لینے

لگے۔ کچھ دیر سنانے کے بعد ہم نے ایک مرتبہ پھر پانی پیا۔ جب ہماری توانائی ذرا بحال ہوئی تو وقار نے کہا۔

”یہاں سے ہمارے سفر کا دوسرا مرحلہ شروع ہوگا۔ ہم یہیں اپنے کپڑے بدلیں گے اور فالتو سامان سے چھٹکارا حاصل کریں گے۔“

ہم نے رائفل کی سنگینوں سے وہیں ایک گڑھا کھودا اور اس میں اپنے پکڑے، سنتریوں کی دونوں رائفلیں، پانی کی بوتلیں اور سارا فالتو سامان اس گڑھے میں ڈال دیا۔ ہم نے رائفلیں کی سنگینیں الیتا تار کی تھیں۔ یہ سنگینیں ہمارے کام کی تھیں لیکن انہیں چھپانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ اگر کسی کی نظر ان پر پڑ جاتی تو فوراً سمجھ جاتا کہ یہ فالتو سامان ہے یا پھر ہم کیمپ کے مفرو ہیں۔

کپٹن وقار نے چند لمحوں پر رائفلیں کی سنگینیں بھی اس گڑھے میں ڈال دیں۔ پھر ہم نے اس گڑھے میں مٹی بھر کے اس پر درختوں کے پتے اور خودرو جھاڑیاں پھینکا دیں۔

”اب تم لوگ اپنے اپنے پیسے نکالو۔“ کپٹن وقار نے کہا۔

میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سارے نوٹ نکالے اور وقار کے حوالے کر دیے۔ ہمارے پاس مجموعی طور پر چوبیس سو روپے تھے۔ اس نے اس رقم کے متن حصے کرنے کے بعد کچھ رقم میری طرف بڑھادی اور بولا۔ ”میں نے احمد یار کو کچھ پیسے زیادہ دیے ہیں۔ اب یہاں سے ہمارے راستے جدا ہو جائیں گے۔“

یہ سن کر مجھے ایک دھچکا سا لگا۔

”ہم تینوں ساتھ رہتے ہو پکڑے جانے کے امکانات زیادہ ہوں گے۔“ وقار نے کہا۔ پھر باری باری مجھ سے اور احمد یار سے نکل گیا اور بولا۔ ”اللہ حافظ و ستوا! اگر زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ مجھ سے اگر کوئی زیادتی ہوگئی ہو تو معاف کر دینا۔“ اس کی آواز گونج رہی تھی۔

”کیسی باتیں کرتے ہیں سر!“ میں نے کہا۔ ”ہمیں ہنسی خوشی رخصت ہونا چاہیے۔ آپ تو ہنسانے کے بجائے رلا رہے ہیں۔“

احمد یار کچھ نہیں بولا۔ اس نے فوجی انداز میں مجھے اور وقار کو تعظیم دی اور اپنے آنسو پکچھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میں نے بھی کپٹن وقار کو اس انداز میں تعظیم دی اور ہم مخالف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ میں نے سڑک پر ایک دفعہ اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ ہم میں

سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ اب کبھی ملاقات ہوگی بھی یا نہیں۔ ہم میں سے کون زندہ بچ کر پاکستان تک پہنچ پائے گا اور کون اس دوڑ میں اپنی زندگی کی بازی ہار دے گا۔

☆☆☆☆

اجنبی راستے، اجنبی منزلیں اور اجنبی دیس! میں تن بہ تقدیر ہو کر ایک سمت میں چلتا رہا۔ میرے دل سے یہی دعا نکل رہی تھی۔ ”اے رب کا کائنات! تو میرے گناہوں کو معاف فرما دے اور مجھے اور میرے ساتھیوں کو بہ عافیت پاکستان پہنچا دے۔ اے اللہ! ہم نے تیرے ہی آسمان پر یہ قدم اٹھایا ہے، تو ہی ہماری حفاظت فرمانے والا ہے۔ ہمیں مزید ذلیل و خوار ہونے سے بچالے میرے معبود!“

میں نے کیمپ کا تصور کیا۔ اس وقت چھ بج رہے تھے۔ ابھی بھارتیوں کو ہمارے فرار کا علم نہیں ہوا ہوگا۔ میں تیز قدم بڑھانے لگا۔

ابھی تک اندھیرا تھا۔ سردیوں میں تو یوں بھی سورج دیر سے نکلتا ہے۔

چلتے چلتے آخر اُفاق پر سپیدہ سحر نمودار ہو گیا۔ میں مزید تیز قدم بڑھانے لگا۔

اب اجالا چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ سوا سات بج رہے تھے۔ اب بھارتیوں کو ہمارے فرار کا علم ہو گیا ہوگا۔ یہ سوچ کر مجھے کچھ غمات سی ہوئی کہ ہمارے اس اقدام سے کیمپ کے قیدیوں کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ بھارتی فوجی ان پر اب شدید سختی کریں گے۔ ممکن ہے، اب تک وہ میرے دوسرے ساتھیوں سے پوچھ گچھ کر رہے ہوں اور ان پر تشدد کر رہے ہوں۔

میں نے دن کے اجالے میں اپنا جائزہ لیا۔ میرے منے کپڑے بھی مٹی میں اٹ گئے تھے، جوتے پر مٹی کی تھیں تھیں اور بالوں میں بھی بقیٹا مٹی ہو گئی۔

اجانک مجھے اپنی ہولناک غلطی کا احساس ہوا۔ میرے جسم کے کپڑے اگرچہ میلے ہو گئے تھے، اس کے باوجود وہ الگ سے پہچانے جاسکتے تھے۔ میں الہ آباد کے کسی گاؤں کے نزدیک تھا۔ گاؤں میں ایسے کپڑے کون پہنتا ہے اور کوئی شہر سے آنے والا پہنتا بھی ہوگا تو اتنے قیمتی اور اہمپور ٹھکانے اور ادنیٰ جری نہیں پہنتا ہوگا۔

میں مزید آگے بڑھتا تو کیمپوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک کھیت کی گچھنڈی پر چلتے ہوئے اچانک کسی کے گانے کی آواز سن کر میرے قدم رک گئے۔ میں نے ارد گرد دیکھا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ آواز کنوئیں کے پاس سے

آ رہی ہے۔ اس گاؤں میں اور ہمارے پنجاب کے گاؤں میں بالکل فرق نہیں تھا۔ وہی ریت، وہی کنواں، وہی وینڈ پمپ۔۔۔۔۔ فرق صرف زبان اور لباس کا تھا۔

کنوئیں کے ساتھ ہی چار دیواری اٹھا کر غالباً چھوٹا سا ایک غسل خانہ بنایا گیا تھا۔ گانے والا بہت ترنگ میں کوئی پورنی گیت گا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے وینڈ پمپ چلنے کی آواز آرہی تھی۔ اچانک میری نظر کنوئیں کی منڈیر کے پاس رکے ہوئے کپڑوں پر پڑی۔

میں نے جلدی سے وہ کپڑے اٹھالیے اور وہاں سے تیزی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

وہاں سے کافی دور جا کر میں نے چوری کیے ہوئے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ ان کپڑوں کا مالک ہی غالباً اندھیرا رہا تھا۔ یہ ایک دھوئی اور کڑتا تھا۔ کڑت بہت زیادہ میلا اور بوسیدہ نہیں تھا، دھوئی بھی ایسی حالت میں تھی۔ اس کے علاوہ ایک بنڈی بھی تھی جو گاؤں کے علاوہ شہروں کے لوگ بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس بنڈی میں پیسے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ چوکور سا ایک کپڑا اور تھا۔ اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا مالک اسے سر پر باندھتا ہوگا۔

میں نے ایک محفوظ جگہ پر کپڑے بدلے۔ میں نے پہلے جرسی پہنی، اس کے اوپر سے بنڈی پہننے کے کڑت پہن لیا اور دھوئی باندھ لی۔ میں نے اپنی جیبوں کی تمام چیزیں بنڈی میں منتقل کر دیں۔ ان میں سرور اور پیٹ کا درودفع کرنے والی گولیوں کے علاوہ نقد رقم بھی تھی۔

اپنے کپڑے میں نے اس چارخانے والے رومال میں باندھ لیے۔ اب میں کسی حد تک محفوظ تھا اور کوئی بھی مجھ پر شبہ نہیں کر سکتا تھا کہ میں اس علاقے میں اجنبی ہوں۔

کیمپوں کی اس گچھنڈی پر چلتے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ راستے میں کئی راہ گیاروں سے میرا سامنا بھی ہوا لیکن وہ لوگ توجہ دینے بغیر گزر گئے۔

آخر مجھے آبادی کے آثار نظر آ رہے گئے۔ وہ خاصا بڑا گاؤں تھا۔ گاؤں کی بلکہ قصبہ ہی ہوگا کیونکہ وہاں بہت سے کچے کچے مکانات تھے۔

میں مزید آگے بڑھا تو مجھے وہاں چھوٹا سا ایک بازار بھی نظر آیا۔ وہاں ایک دکان میں موٹا سا ایک آدمی بڑے سے کڑھاؤ میں پوریاں تیل رہا تھا۔ پوریوں کی اشتہا انگیز مہک سے میرے پیٹ میں بھوک کے مارے اٹھنے ہوئے تھے۔ رات کو کیمپ میں بھی مجھ سے زیادہ نہیں کھایا گیا تھا۔

میرے قدم بے اختیار مٹوانی کی دکان کی طرف اٹھ

گئے۔ اب مسئلہ تھا کہ میں اسے پوریوں اور ترکاری کے لیے کتنے پیسے دوں۔

میری یہ مشکل حل ہوئی کہ ایک دیہاتی آدمی نے چوٹی دے کر اس سے ڈھیر ساری پوریاں اور ترکاری لی گئی۔ میرے پاس ریزگاری تو کبھی نہیں۔ میں نے اپنی بٹری کی جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکالا اور حلوائی کی دکان پر پہنچ گیا۔

ملٹری اکیڈمی کا کول اور میری رجمنٹ میں کچھ راجپوت افسر اور جوان بھی تھے۔ وہ آپس میں اسی زبان میں بات کرتے تھے جو اس گاؤں میں بولی جا رہی تھی۔ ان کی باتیں سن کر میں بھی تھوڑی بہت پوری زبان سیکھ گیا تھا لیکن دو چار جملوں کے علاوہ کچھ بول نہیں سکتا تھا۔

میں نے ایک روپے کا نوٹ مولے حلوائی کو دیا تو اس نے مجھے گھور کے دیکھا اور بولا۔ ”اب اس سے میں چھٹا کہاں سے لاؤں۔ تیرے کتنے بچپن پیسے تھے؟“

”نہیں مجھے پوریاں اور جلیبیاں دے دے بھائی۔“ میں نے حتی الامکان اسی جیسے لہجہ بتانے کی کوشش کی۔ ”ہم مسافر ہیں بھیا! ادھر ہماری جنتیاں اور بچے بھی کھڑے ہیں تو آدھے پیسوں کی پوری اور باقی آدھے پیسوں کی جلیبی دے دے۔“

اس نے بڑے سے ایک کاغذ میں نہ جانے کتنی پوریاں باندھ دینا، ایک پتے کے اوپر آلوکی ترکاری بھی رکھ دی۔

اتنی زیادہ پوریاں تو میں کھا بھی نہیں سکتا تھا۔ حلوائی اب جلیبیاں تول رہا تھا۔ ”ایسا کر بھائی! جلیبیاں رہن دے۔۔۔۔۔ اب تیرے پاس اتنا چھٹا تو ہووے گا؟“

اس نے ایک مرتبہ مجھے گھورا پھر گلے میں ہاتھ ڈال کر ایک آنٹنی مجھے دے دی۔

میں نے وہ پوریاں مٹیں اور وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر پوریوں پر ٹوٹ پڑا۔ میں اتنا جھوکا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ساری پوریاں چٹ کر گیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں اس گاؤں کی آبادی کی طرف بڑھتا ہوں۔ اندازہ ہوا کہ یہ کوئی گاؤں نہیں بلکہ قصبہ ہو گا۔

اچانک میری نظر وہاں ایک بوسیدہ میسر پر پڑی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہاں مسلمان بھی موجود تھے۔ اب سے چالیس سال پہلے بھارتی مسلمان ذہنی اور جذباتی طور پر

پاکستان کے ساتھ تھے۔

میں نے مسجد میں جا کر ہاتھ منہ دھویا، سر بھی اچھی طرح صاف کر لیا۔

امام صاحب ابھی تک مسجد میں موجود تھے۔ ان کے ساتھ صاف ستھرے کرتے پا جاے میں ملیوں ایک صاحب اور بھی موجود تھے۔

امام صاحب ان سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے۔ میں نے نزدیک پہنچ کر بڑے ادب سے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دے کر کہا۔ ”بیٹھ جا بھائی! مارے سے کوئی کام ہے؟“

”میں مسافر ہوں مولوی صاحب۔“ میں نے کہا۔ ”راستے میں میری جیب میں سے کسی نے سارے پیسے نکال لیے۔“

”تم نے کچھ کھایا بھی ہے؟“

”ہاں، ایک روپہ میرے گرتے کی جیب میں پڑا تھا۔ میں نے ابھی پوریاں کھائی ہیں۔“

”جاننا کہہ رہے بھائی؟“ وہ صاحب پہلی دفعہ بولے۔

”الہ آباد۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”بھائی! تو ایسا کر مارے ساتھ چل۔ میں تیرے واسطے کچھ پیسوں کا بندوبست تو کر ہی سکتا ہوں۔“

امام صاحب نے بھی رضامندی ظاہر کر دی۔ میں نے انہیں پھر اسی طرح یاد اب ہو کر سلام کیا اور ان صاحب کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ جنہیں مولوی صاحب عبدالرحمن کے نام سے مخاطب کر رہے تھے۔

وہ صاحب سارے راستے بہت گہری نظر سے میرا جائزہ لیتے رہے۔ مجھے کچھ گھبراہٹ ہی ہونے لگی لیکن اب میں انکار کرتا تو مزید انہیں شک میں مبتلا کرتا اس لیے ان کے ساتھ چل رہا۔

وہ شاید اس قصبے کے خامسے خوش حال آدمی تھے۔ ان کا گھر بھی پختہ اور دروازہ تھا۔ انہوں نے مجھے دروازے پر ٹھہرنے کو کہا اور خود مکان میں چلے گئے۔ مکان کے مرکزی دروازے کے ساتھ ہی ایک اور دروازہ بھی تھا۔ رحمن صاحب نے اندر جا کر وہی دروازہ کھول دیا۔ اس میں ایک ٹواری پٹنگ اور چند موٹے رکھے ہوئے تھے۔ وہ شاید ان کی بیٹھک تھی۔

”لے بھائی! اب تو آرام سے بیٹھ جا۔ اگر تم نے کھانا نہیں کھایا ہے تو جواب نہ کر دو۔ تیرے واسطے کھانے کو

کچھ لاؤں؟“

”آپ کا بہت شکر ہے! کھانا تو میں کھا چکا ہوں۔“

”تو پھر میں تیرے واسطے چائے بنواتا ہوں۔ صورت سے بھی تو بہت تھکا ہوا دیکھ ہے۔ میری گھر والی ایسی چاہ بناتی ہے کہ تیری ساری ٹھن اتر جاوے گی۔“

وہ اندر گئے تو چند روزہ سال کا ایک لڑکا بستر کے کر آگیا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور پٹنگ پر بستر بچھا دیا۔ وہ ایک رضائی بھی لایا تھا اور کیچے بھی۔

وہ بستر لگا کر چلا گیا تو رحمن صاحب ایک تشری میں چائے کے دو گلاس لے کر آگئے۔

وہ گڑ کی چائے تھی جس میں رحمن صاحب کی گھر والی نے الائچی اور شاید کچھ اور بھی ڈالا تھا۔ چائے واقعی بہت لذیذ تھی۔

میں چائے پی کر فارغ ہوا تو رحمن صاحب چھوٹا سا ایک ٹرانزسٹر لے کر آگئے۔ انہوں نے ٹرانزسٹر درمیان میں رکھی ہوئی ایک میز پر رکھا اور کچھ سوچتے کچھ بھر بولے۔

”ایک بات پوچھوں، سچ بتائیو۔“

ان کا سچا اور سوال سن کر میرا دل آن جانے خدشات سے دھڑکنے لگا۔ ”جی پوچھیں؟“ میں نے کہا۔

”تو بھی ان تین قیدیوں میں سے ایک ہے جو جنگی کیمپ سے بھاگے ہیں؟“

مجھے ایسا لگا جیسے انہوں نے میرے سر پر لٹھر سید کر دیا ہو۔ میں پچھلی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”دیکھ، جھوٹ مت بولیو ورنہ نقصان میں رہے گا۔“

میں اسی وقت پہچان گیا تھا جب تو نے امام صاحب کو سلام کیا تھا۔

میں نے سوچا کہ اب جو ہو سو ہو، میں فرار ہو کر زیادہ دور بھاگ بھی تو نہیں سکتا تھا۔ نہ مجھے وہاں کے راستوں کا علم تھا، نہ یہی معلوم تھا کہ اس وقت میں جس قصبے میں ہوں اس کا نام کیا ہے اور الہ آباد سے کتنی دور ہے؟ میں نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

رحمن صاحب اچانک اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے وہاں سے انداز میں میری پیشانی چوم لی اور بولے۔ ”تو مسلمان ہے اور مسلمان بھائی کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ اب تو بالکل گمراہ کر۔ یہاں تیرے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اللہ کی قسم! میں بالکل سچ بول رہا ہوں۔“ ان کے لہجے میں خلوص تھا۔

”مجھے ایک بات بتائیے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ نے

مجھے پہچانا کیسے؟“

”تیرے جوتوں اور بالوں سے۔“ رحمن صاحب نے کہا۔ ”تیرا جو تاشی یا بودالا ہے اور بال بھی فوجی انداز میں کٹے ہوئے ہیں۔ پھر تو الہ آباد جانے کی بات کر رہا تھا۔ الہ آباد یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ مشکل سے تیس کلومیٹر ہو گا۔ تو نے بتایا تھا کہ تیرے پاس ایک روپہ تھا تو نے زیادہ سے زیادہ پچیس پیسے کی پوریاں کھائی ہوں گی۔ الہ آباد کے لیے لاری یہاں سے پچیس پیسے لیتی ہے۔“

مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میری باتوں ہی سے وہ شے میں پڑ گئے ورنہ کوئی مقامی آدمی ہوتا تو بس میں بیٹھ کر سیدھا الہ آباد چلا جاتا۔

”پھر مجھے یہاں سے جانا چاہیے۔“ میں نے گھبرا کر کہا۔

”کہاں جاوے گا؟“ رحمن صاحب نے پوچھا۔ ”الہ آباد میں کون ہے تیرا؟“ پھر وہ نرم لہجے میں بولے۔ ”ابھی تو آرام کر، رات بھر کا جاگا ہوا ہے۔ مجھ پر بھروسہ رکھ۔ میں تیرا دشمن نہیں ہوں۔“

میں اب بھی ان کی طرف سے مطمئن نہیں تھا لیکن ان کے اصرار پر لیٹ گیا۔ میں واقعی ٹھن سے چور چور تھا اور میرے جسم کا جوڑ جوڑ فریاد کر رہا تھا۔

رحمن صاحب نے ٹرانزسٹر کھول لیا اور بولے۔

”خبروں کا وقت ہونے والا ہے۔“

اس وقت ٹرانزسٹر پر لٹا حلقہ کار کوئی گانا بج رہا تھا۔

گانا ختم ہوتے ہی نیوز ٹیلن شروع ہو گیا۔ ”یہ آل انڈیا ریڈیو ہے۔ اب آپ سادھنا سے سنا رہے ہیں۔ کل رات الہ آباد کے جنگی کیمپ سے تین پاکستانی فوجی سرنگ کھود کر فرار ہو گئے ہیں۔ وہ جاتے جاتے کیمپ کے دستریوں کو بھی بار گئے ہیں۔ ان میں ایک سپاہی، ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ اور ایک کپتان کے عہدے کا قیدی ہے۔ لوگ ان لوگوں سے ہوشیار رہیں کیونکہ وہ اپنے ساتھ دستریوں کی رائفلیں بھی لے گئے ہیں۔“

پھر نیوز کا ستر دوسری خبریں سنائے گئی۔

ٹیلن ختم ہوا تو کوئی مردانا ڈنسر بولا۔ ”الہ آباد کے کیمپ سے جو قیدی فرار ہوئے ہیں، ان کے نام اور حلیے یہ ہیں۔ سپاہی احمد یار خان، لہا تو ڈانڈا و سفید آدمی ہے۔ اس کی گردن پر دواہیں جانب ایک مٹا ہے۔ اس کی عمر تقریباً بائیس سال ہے۔ دوسرا قیدی سیکنڈ لیفٹیننٹ خرم خان ہے۔ اس کی عمر تقریباً تیس چوبیس سال ہے۔ یہ قیدی بھی لہا تو ڈانڈا

جنگی تربیت

میں نے محسوس کیا ہے کہ لاہور کے عوام بچوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور ان کی تربیت پر بہت دھیان دیتے ہیں۔ میرے ایک دوست نے مجھے یہاں ایک بار اپنے گھر پر دعویٰ کیا تو مجھے اس کا بخوبی احساس ہوا۔ ڈرائنگ روم میں میزبان کا چار سالہ بیٹا بھی موجود تھا، بہت کیوٹ، میں نے اسے گود میں اٹھایا اور بیان کر لگا۔ میزبان نے مجھے بتایا کہ یہ بہت شیریں ہے اور اس کا ثبوت دینے کے لیے انہوں نے بچہ کو چکارا۔ ”سنے! اٹکل کو چپٹ مارو۔“ اور جیستہ اس کے میں اس شخص میں حفاظتی اقدامات کرتا، سنے ہاتھ کھما دیا۔ میری عینک ٹوٹ کر فیچے جا گری۔ اس پر میزبان ہنستے ہنستے دہرے ہو گئے اور سنے کو گود میں اٹھا کر چومنے لگے۔ یہاں کے لوگ اپنے بچوں کو بہادر دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے شردیغ سے ان کی تربیت جنگی بنیادوں پر کرتے ہیں۔

کراچی سے داہمہ یس کا تعاون

میں کروٹیں بدلتا رہا اور چوتراہا کہ میں یہاں کب تک پڑا رہ سکتا ہوں۔ صبح میں اگر یہاں سے الہ آباد کے لیے نکل جاتا تو وہاں سے شاہ جہاں پور پہنچنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ یہی سوچتے سوچتے نہ جانے کب مجھے نیند آئی۔ عادت کے مطابق علی الصباح میری آنکھ کھل گئی۔ گھر

بات بتا۔ یہ پاکستانی فوج کو کیا ہو گیا کہ اس نے ان گیدڑوں اور کتوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے؟“

”مجھے تو لگتا ہے کہ جہزِ نیازی نے اپنی جان کے خوف سے ہتھیار ڈال دیے ورنہ تم آؤ آخری آدمی اور آخری گولی تک لڑنے کا عزم کیے بیٹھے تھے۔“

”جس دن ہمیں یہ خبر ملی، قسم اللہ کی۔۔۔ اس دن ہمارے گھروں میں چوہا نہیں چلا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے گھر میں کسی کی میت ہو گئی ہو۔“ یہ کہتے ہوئے عبدالرحمن صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”آپ اداس مت ہوں۔“ میں نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس شکست کا بدلہ لیے بغیر ہم بھی چین سے نہیں بیٹھیں گے۔“

وہ چونک کر بولے۔ ”ہاتوں میں مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ تو بھوکا بھی ہو گا۔ چل کھانا کھا لے، کھانا تیار ہے۔ آ جا، اندر ہی آ جا تو میرے بیٹوں کی طرح ہے۔ میری گھر والی تجھ سے کیا پردہ کرے گی۔“

ان کے اصرار پر میں اندر چلا گیا۔ ان کی بیگم بھی بہت شفیق اور مہربان خاتون تھیں۔ میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کے مجھے ڈھیروں دعائیں دیں۔

”بس بھئی، یہی اپنا خاندان ہے۔“ رحمن صاحب مسکرائے۔ دو بیٹے اور ایک بیوی۔ ایک بیٹا احسان تو یہی ہے۔“

انہوں نے اس لڑکے کی طرف اشارہ کیا جو میرے لیے بستر لے کر آیا تھا۔

”دوسرا بیٹا فرمان دلی میں پڑھتا ہے۔ وہ چشمیوں پر گھرا آتا ہے۔“

کھانے کے بعد ان کی بیگم در تک مجھے سے پاکستان کی باتیں کرتی رہیں۔ پھر رحمن صاحب کی فرمائش پر انہوں نے وہی چائے بنائی جو میں دن میں پنی چکا تھا۔

میں اٹھ کر پھر بیٹھک میں جانے لگا تو رحمن صاحب بولے۔ ”میں نے تیرے لیے وہ کرا تیار کر دیا ہے۔“ انہوں نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ تو بیٹھک ہے۔ وہاں تو لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔“

میں خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں وہ ٹرانزسٹری می موجود تھا جو رحمن صاحب کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ میں نے یونہی ٹرانزسٹر آن کر دیا۔

خبریں شروع ہو چکی تھیں۔ اچانک نیوز کاسٹربولی۔

[illegible]

میں چہل پہل کے آثار تھے۔ رحمن صاحب فجر کی نماز کے لیے مسجد جا رہے تھے۔

میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو رحمن صاحب مسکرا کر بولے۔ ”لگتا ہے رات کو تجھے ٹھیک طرح نیند نہیں آئی؟“

”مجھے نیند تو خوب آئی۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”میں بھی آپ کے ساتھ نماز کے لیے مسجد جانا چاہتا ہوں۔“

”نہیں بیٹا!“ انہوں نے پہلی دفعہ مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب کیا۔ ”تیرا باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ یہاں کچھ مسلمان ایسے بھی ہیں جو پاکستان اور پاکستانیوں کے سخت خلاف ہیں۔ انہیں شک بھی ہو گیا تو وہ فوراً پولیس کو خبر کر دیں گے کہ عبدالرحمن کے گھر میں کوئی مشکوک آدمی ٹھہرا ہوا ہے۔ تو گھر ہی میں نماز پڑھ لے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ میں نے اپنے کمرے ہی میں نماز پڑھی۔ نماز کے بعد دعا مانگتے ہوئے میرے آنسو بہنے لگے۔

میں دیر تک رورور کہہ رہا تھا، اللہ سے دعا میں مانگتا رہا، اس سے حیرت انگیز طور پر میرا کھویا ہوا اعتماد لوٹ آیا اور مجھ میں ایک نئی توانائی آ گئی۔

نماز کے بعد میں نے کمرے ہی میں ہلکی پھلکی ایکمر ساز کی اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ ناشتے کے بعد میں نے رحمن صاحب سے پوچھا۔ ”یہاں اخبار نہیں آتا؟“

”یہاں تو بیٹا سارے اخبار ہندی میں ہوتے ہیں۔ انگریزی کا ایک اخبار بھی آتا ہے لیکن اخبار والا کتنی کے چند

اخبار لاتا ہے جو یہاں کے دو چار گھروں میں جاتے ہیں۔ اگر میں اس سے انگریزی کا اخبار مانگوں گا تو وہ مجھ پر شک کرے گا کہ میرے گھر میں انگریزی کا اخبار پڑھنے والا کون آگیا؟ میرا بڑا بیٹا فرقان یہاں ہوتا تو اور بات تھی۔“ پھر وہ

کچھ سوچ کر بولے۔ ”میں ہندی کا اخبار منگوا لیتا ہوں۔ احسان تمہیں پڑھ کر سنا دے گا۔ اسے ہندی بھی آتی ہے اور میں نے اسے اردو بھی پڑھائی ہے۔“

”تو پھر ہندی ہی کا اخبار منگواؤں۔“ میں نے کہا۔ ”احسان اس وقت تو اسکول گیا ہوا ہے۔ وہ واپس آئے گا تو منگوا دوں گا۔“ پھر وہ مسکرا کر بولے۔ ”ہاں، تمہاری خالہ جی نے تمہارے کپڑے دھو دیے ہیں۔“

”میرے کپڑے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”ہاں، تیرے وہ کپڑے جو تونے ایک پوٹی میں

باندھ رکھے تھے۔ الہ آباد جاؤ گے تو تمہیں ان کپڑوں کی

ضرورت بھی پڑے گی۔ میں نے تمہارے جو تے اور کپڑے ایک تھیلے میں رکھ دیے ہیں اور جو دھوئی اور کڑھن تم نے پہن رکھا تھا، میں نے وہ بھی دھوا کر اسی تھیلے میں رکھ دیا ہے۔“ رحمن صاحب واقعی بہت دور اندیش آدمی تھے۔ مجھے اگر گلت میں وہاں سے فرار ہونا پڑتا تو کسی قسم کی پریشانی نہ ہوتی۔

میں فرانسز لے کر اپنے کمرے میں لیٹ گیا۔ خروں سے صرف یہ معلوم ہوا کہ بھارت کی پولیس، خفیہ ایجنسیاں اور ملٹری انٹیلیجنس ہر طرف مفروضہ قیدیوں کو تلاش کر رہی ہیں۔ ان کے گرفتار ہونے والے ساتھی نے بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔

میں نے بیڑا ہور کر یڈیو بند کر دیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد احسان بازار سے ہندی کا ایک اخبار لے آیا اور مجھے دے دیا۔

”یار اچھے پڑھ کر بھی تم ہی سناؤ گے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”میں تو ہندی کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکتا۔“

اخبار ہی سے معلوم ہوا کہ پولیس نے یوپی سے باہر نکلنے والے تمام راستوں کی ناکابندی کر دی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ مفروضہ قیدی ابھی تک یوپی سے باہر نہیں نکلے ہیں۔

سرنگ کھود کر ان کے فرار کی خبر ملتے ہی انہوں نے ناکابندی کر دی تھی اور وہ ہر گاڑی، ہر بس کی تلاشی لے رہے تھے۔ لاری اڈوں اور ریلوے اسٹیشن پر بھی ان کی ناکابندی تھی۔

اس صورت حال میں کوئی فرار ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے کافی دیر تک احسان سے اخبار کی خبریں سنیں پھر مجھے احساس ہوا کہ احسان اب بور ہو گیا ہے۔ میں نے کہا۔ ”بس احسان میاں! تمہاری آج کی ڈیوٹی ختم۔ کل اسی وقت پھر اخبار لے آئے۔“

سردیوں کے دن بہت مختصر ہوتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سورج غروب ہو گیا۔ رحمن صاحب کئی گھنٹے سے باہر تھے۔ میں شبت سے ان کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا کیونکہ میں آج رات وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

بھارتی انٹیلیجنس اور پولیس اگر مسلسل ناکابندی رکھتی تو کیا میں اچھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہتا؟ رات کو رحمن صاحب واپس آئے تو ان کے چہرے پر فکر و تشویش کے آثار تھے۔ میں کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ چاچی نے پوچھا۔ ”آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟“

”مجھے خرم کی وجہ سے پریشانی ہے۔“ رحمن صاحب کی آواز آئی۔

”اس کی وجہ سے کیا پریشانی ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”سنا ہے کہ بھارتی فوجی آس پاس کے تمام دیہات کی تلاشی لے رہے ہیں۔ خاص طور پر مسلمانوں کے گھروں کی۔“

”تو کیا وہ یہاں تک بھی پہنچ گئے ہیں؟“ چاچی نے کہا۔

”وہ یہاں تک آج نہیں تو دو چار دن بعد پہنچ جائیں گے۔ میں اس سے پہلے خرم کو الہ آباد بھیج دوں گا۔ وہاں میرے ایک دوست کی پرچوں کی دکان ہے۔ وہ بھی پاکستانیوں کا حامی ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ خرم کا ساتھ ضرور دے گا۔“

میں اچانک کمرے سے باہر آ گیا اور بولا۔ ”چاچا جی!“ میں انہیں چاچا جی کہنے لگا تھا۔ ”اگر ایسی بات ہے تو میں ابھی اور اسی وقت نکل جاتا ہوں۔ میری وجہ سے کہیں آپ بھی مصیبت میں نہ پڑ جائیں۔“

”ابھی خطرے کی کوئی بات نہیں ہے بیٹا!“ چاچا جی نے کہا۔ ”پھر اس وقت تجھے کوئی لاری بھی نہیں ملے گی۔ تو جانے کا کیسے؟“

”پھر میں صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”لاریاں کس وقت چلنا شروع ہوتی ہیں؟“

”الہ آباد کی لاری تجھے صبح آٹھ بجے ملے گی۔“ چاچا نے کہا۔

میں واپس کمرے میں آ گیا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ ہر چیز تھیلے میں تھی۔ عام استعمال کے لیے چاچا جی نے وہاں کے مقامی موپئی سے میرے لیے ایک بدتر سا کھسا خرید لیا تھا۔ میں کرتہ پا جامہ اور وہی کھسا استعمال کر رہا تھا۔

اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور احسان اندر آ گیا۔ اس نے اخبار میں کوئی چیز لپیٹ رکھی تھی۔

”خیریت تو ہے احسان؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، خرم بھائی خیریت ہے۔ آپ بھول گئے آپ نے مجھ سے ایک کام کہا تھا؟“ اس نے اخبار میں لپیٹی ہوئی وہ چیز باہر نکالی تو وہ باریک پھل کا دو دھاری خنجر تھا۔ ”یہ رکھ لیں۔“

”یہ تم کہاں سے لے آئے؟“ میں نے پوچھا۔

شراب پر ابند اس

میں جن دنوں پاکستان میں تھا وہاں شراب پر ابندی تھی، البتہ میرے لیے یہ امر انتہائی حیرت انگیز تھا کہ اس ابندی سے بیڑے نہ صرف یہ کہ کتنی بھی بلکہ یہ کھلے بندوں فروخت ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کے بعض پادری بھی اسے پیتے تھے اور پھر سڑکوں پر لٹکھواتے پھرتے تھے۔ میں نے پہلی بار سخت گرمیوں کے موسم میں لاہور کے ایک مشہور علاقے بھائی گیٹ میں اس بیڑے کا ایک گلاس پیا۔ یہ بیڑہ سفید رنگ کی ہوتی ہے، وہی سے تیار ہوتی ہے اور اسے گلاس کے سامنے کشید کیا جاتا ہے۔ دنیا کی یہ واحد بیڑے جس میں پانی حل ہو جاتا ہے تاہم میں نے اسے نشے میں ہر بیڑے سے بہتر پایا۔ اس کا ایک گلاس پینے سے جسم ڈھیلا پڑنا شروع ہو جاتا ہے اور ایک عجیب طرح کی خودکلی سی طاری ہونے لگتی ہے۔ لاہور کے صبح شام یہ بیڑے پیتے ہیں، چنانچہ صبح سے شام تک اگلتے رہتے ہیں! اس بیڑے کو مقامی زبان میں سی کہا جاتا ہے۔

کڑی پولس کی شکایت کراچی سے

”اس کے لیے میں خاص طور پر رام نگر گیا تھا۔ وہاں ایک لوہار خنجر اور چھریاں بنانے میں ماہر ہے۔ لوگ دور دور سے اس کے پاس آتے ہیں۔“

میں نے خنجر کا جائزہ لیا۔ اس کا پھل پتلا لیکن مضبوط تھا۔ اس کے دونوں طرف دھار تھی اور اس کی نوک بہت خطرناک تھی۔ اس کا دست بھی مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا۔

”اس لوہار نے تم سے پوچھا نہیں کہ تمہیں یہ خنجر کیوں چاہیے؟“

”پوچھا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نے کہا کہ میں اکثر شکار پر جاتا ہوں۔ یہ خنجر میں اپنی حفاظت کے لیے بوار ہا ہوں۔“

”تمہارے کتنے پیسے خرچ ہوئے ہیں احسان؟“ میں نے پوچھا۔

”خرم بھائی! پیسوں کی بات مت کریں۔ یہ خنجر آپ کے لیے میری طرف سے تحفہ ہے۔“ اس نے کہا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ میں اس خنجر کو چھپاؤں کہاں؟ اگر میں اسے اپنی کمر میں ازنا تو وہ مجھے بھی زدعی کر سکتا تھا۔ پنڈلی پر باندھنے کے لیے بھی اس کے کور کی ضرورت تھی۔

میں نے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ مجھے دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی چڑے کی ایک بیلٹ نظر آئی۔ وہ بیلٹ شاید رحن صاحب کے بیٹے فرحان کی تھی۔ میں نے وہ بیلٹ اتار کے اپنی پنڈلی پر لپیٹی اور دو تین منٹ دینے کے بعد وہ خنجر پنڈلی کے ساتھ باندھ لیا۔ اب میری پنڈلی کی جلد اور خنجر کے درمیان مضبوط چڑے کی وہ بیلٹ تھی۔ اب خنجر کے کرنے کا کوئی بھی امکان نہیں تھا اور ضرورت پڑنے پر میں اسے فوراً ہی نکال بھی سکتا تھا۔ میں نے خنجر نکال کر اپنے عینکے کے نیچے رکھ لیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

اچانک کسی کے چنچھوڑنے سے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے چاچا جی کا دشت زدہ چہرہ نظر آیا تو میں بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ”کیا بات ہے چاچا جی؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

”خرم بیٹا! وہ لوگ ہمارے قسے سادوں پر تنک آپہنچے ہیں۔ وہ گھر گھر تلاشی لے رہے ہیں اور کسی اجنبی کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔“

میں چھپت کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنا خنجر عینکے کے نیچے سے نکال کر پنڈلی پر بندھی ہوئی بیلٹ میں اڑس لیا اور اپنا تھملا اٹھا کر روٹکی کے لیے تیار ہو گیا۔

”وہ لوگ اس وقت کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ ابھی گاؤں کے دوسرے سرے پر ہیں لیکن جلد ہی یہاں پہنچ جائیں گے۔ تمہیں مولوی صاحب کے علاوہ کسی نے بھی نہیں دیکھا ہے۔ مولوی صاحب سادہ آدمی ہیں۔ وہ فوجیوں کو بتا دیں گے کہ وہ دن پہلے ایک اجنبی یہاں آیا تو تھا۔ عبدالرحمن صاحب اسے اپنے گھر لے گئے تھے۔ پھر وہ سیدھے یہاں کا رخ کریں گے۔“

”میں اس سے پہلے ہی نکل جاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”مٹھرو! چاچا جی نے کہا۔“ میں تمہیں فی الحال ماسٹر رام پرشاد کے گھر لے جاتا ہوں۔ ان پر کوئی بھی شک نہیں کرے گا۔ اگر فوجیوں نے ان کے گھر کی تلاشی بھی لی تو زیادہ باریک بینی سے نہیں لیں گے۔ وہ اس علاقے کے معزز آدمی ہیں۔“ پھر چاچا جی نے پانچ پانچ سو روپے کے دو نوٹ نکالے اور میرے کرتے کی جیب میں ٹھوس دیے اور بولے۔ ”رکھو، تمہیں ان کی ضرورت پڑے گی۔ یہ پیسے بھی کم ہی ہیں۔ فی الحال میرے پاس اتنے پیسے ہی ہیں۔“

چپاچی روٹی ہوئی آگے بڑھیں اور انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے دعا دی۔ پھر انہوں نے بھی پانچ پانچ سو روپے کے کئی نوٹ مجھے پکڑا دیے اور

بولیں۔ ”خرم بیٹا! ان کا رمت کرنا۔ ایک ماں کی طرف سے خنجر سمجھ کر رکھ لو۔“

میں انکار نہ کر سکا۔ چاچا جی نے مجھے ساتھ لیا اور اندھیرے میں باہر نکل گئے۔ وہ گلیوں گلیوں ہوتے ہوئے ماسٹر رام پرشاد کے گھر پہنچ گئے۔

میں نے تو اب سب کچھ نقد پر چھوڑ دیا تھا اس لیے کسی روپوت کی طرح چاچا جی کے کہنے پر مل کر رہا تھا۔ چاچا جی نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ دوسری مرتبہ چاچا جی نے قدرے زور سے دستک دی تو اندر سے کسی کی ختم غودہ آواز سنائی دی۔

”کون؟“

”میں ہوں عبدالرحمن۔“ چاچا جی نے کہا۔ ”دروازہ کھولو رام پرشاد!“

قدموں کی آہٹ دروازے کے نزدیک آئی اور دروازہ کھل گیا۔ اندر رحن میں بلب جل رہا تھا۔ میں نے اس کی روشنی میں رام پرشاد کا جائزہ لیا۔ وہ چاچا جی ہی کے ہم عمر ہوں گے لیکن ان کی سمحت قابل رنگ تھی۔ ان کے سر پر کھٹے پال تھے جنہیں ہندی لگا کر انہوں نے سرخ کر لیا تھا۔ ہنس مکھ چہرہ تھا اور اس پر مونہ فریم کا پشہ۔

”خنجریت تو ہے رحن! رات کے اس سے۔۔۔۔۔“

”خنجریت نہیں ہے رام پرشاد!“ چاچا جی نے کہا پھر سرگوشی میں انہیں کچھ بتانے لگے۔

”کام تو خطرناک ہے۔“ رام پرشاد نے کہا۔ ”لیکن تم نے پہلی دفعہ مدد مانگی ہے اس لیے میں انکار بھی نہیں کر سکتا۔“ پھر وہ مجھ سے بولے۔ ”آؤ بیٹا! اندر جاؤ۔“

چاچا جی نے مجھے گلے لگا لیا اور بولے۔ ”قدرت کو منظور ہوا تو ہم جلد ہی دوبارہ ملیں گے۔ ہاں، میں احسان کے ہاتھ کل اپنے اس دوست کا پتا بھجوا دوں گا جو الہ آباد میں رہتا ہے۔“ وہ آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے لوٹ گئے۔

رام پرشاد جی مجھے لے کر اندر چلے گئے۔ ان کا مکان پختہ اور خاصا بڑا تھا۔

”بیٹا! یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ کس کی جرأت ہے کہ رام پرشاد کے گھر کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔“

”آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں؟“ میں نے پوچھا کیونکہ ابھی تک مجھے کوئی اور آدمی نظر نہیں آیا تھا۔

”ہاں، اب تو اکیلا ہی سمجھو۔“ ماسٹر جی نے کہا۔ ”کسی زمانے میں یہ گھر بھرا پرا تھا۔ میرے تین بیٹے، ان کے بیٹے، بہوئیں تھیں۔ سب یہیں رہتے تھے۔ لیکن اب سب

شہروں میں جا رہے ہیں۔ اس گاؤں میں انہیں گوبر کی بو آتی ہے۔ انہیں چمکراتے ہیں۔“ انہوں نے ایک کمر اٹھوتے ہوئے کہا۔ ”تین بیٹیاں بھی ہیں۔ دو بیٹیوں کی شادی کر چکا ہوں، تیسری ابھی ایف اے میں پڑھ رہی ہے۔ وہی میرے ساتھ رہتی ہے اور بیٹی کہتی ہے کہ بیٹی! میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ بھلا بیٹیاں بھی سبھی باپ کے گھر رہی ہیں؟“ رام پرشاد بہت بولتے تھے۔ ”پڑھائی مکمل کر لے تو میں اس کے ہاتھ بھی پیلے کر دوں۔ دیے تو یہ فرض ماؤں کا ہوتا ہے لیکن میری گھر والی مجھے اکیلا چھوڑ کر برسوں پہلے پرلوک سدھار گئی۔ پھر وہ چونک کر بولے۔ ”میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ خود ہی بولے جا رہا ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے بیٹا؟“

”میرا نام خرم ہے اور۔۔۔۔۔“

”بس اتنا ہی کافی ہے، مجھے اپنے بارے میں زیادہ مت بتاؤ۔ میری زبان پھسل جاتی ہے۔ کسی کے سامنے میرے منہ سے یہ باتیں نکل گئیں تو میں بھی مارا جاؤں گا۔ اب تم ہیمنان سے سو جاؤ۔ صبح ملاقات ہوگی۔ یعنی عبدالرحمن کا بیٹھیا ہے تو ہمارا بھی بیٹھیا ہوا۔ عبدالرحمن میرے بیچن کا دوست ہے۔ اس نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا ہے۔ اب اس نے زندگی میں پہلی دفعہ مجھ سے مدد مانگی ہے۔ وہ بھی اپنے بیٹھے کو، اپنے خون کو بچانے کے لیے۔۔۔۔۔ میں بھلا پیچھے کیسے ہٹ سکتا ہوں۔ اب تم سو جاؤ۔“ انہوں نے شاید یہ جملہ چوٹی بار ادا کیا تھا۔

پھر وہ واقعی چلے گئے اور میں پلنگ پر بیٹھ کر موجودہ حالات پر غور کرنے لگا۔

سردی شدید تھی اس لیے میں نے کپل اوڑھ لیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ میرا سونے کا ارادہ نہیں تھا۔ بھارتی فوجی نہ جانے کب وہاں آجاتے۔ یوں بھی وہ کمرادوں اور مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ بستر کی چادر پر بھی دھول مٹی جسے میں نے جھٹک کر صاف کر دیا تھا۔ مکمل کو بھی اچھی طرح بھاد کر دھول نکال دی تھی اس کے باوجود اس کمرے میں عجیب سی بو تھی۔

لیٹے لیٹے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

صبح میری آنکھ دروازے پر ہوئے ہوئے ہونے والی دستک سے کھلی۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو گویا دن میں چاند طلوع ہو گیا۔ وہ اتنی ہی خوب صورت تھی۔ اس کی بڑی بڑی بوتلی ہوئی آنکھیں اس کے خوب صورت چہرے پر نمایاں تھیں۔ متناسب اور پرکشش جسم اور لمبے سیاہ بال! میں چند لمحوں

مبہوت سا ہو کر اسے دیکھتا رہ گیا۔ ایسا مکمل حسن میں نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔

”ایسے آنکھیں بچھاڑ بچھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو جی؟“ اس کی مسرتم آواز گونجی۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ رام پرشاد جی نے اچانک لڑکی کا روپ کیسے دھار لیا۔“ میں نے کہا۔

وہ ٹھکھلا کر فہم دی۔ اس کی فہم کی آواز سے گویا جلیزنگ سے بچ اٹھے۔

”میں۔۔۔۔۔ رام پرشاد!“ وہ ایک مرتبہ پھر فہم کی فہم کی سفید رنگت سرخ ہوئی۔ ”میں ان کی بیٹی کا نانا ہوں بھولے نانا! اس نے یوں کہا جیسے کسی غبی بچے کو بھلا جاتا ہو۔“

”اچھا تم ہو کا نانا!“ میں نے کہا۔ ”رام پرشاد جی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔“

”کیا کہا تھا انہوں نے؟“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”اب چھوڑو اس بات کو۔۔۔۔۔“

”نہیں، پہلے مجھے بتاؤ کہ انہوں نے میرے بارے میں کیا کچھ کہا؟“ وہ بچوں کی طرح اڑ گئی۔

”انہوں نے کہا تھا کہ کا نانا ابھی بیٹی ہے۔ اس کی کسی بات کا برا مت ماننا!“ میں نے فہم کر کہا۔

”میں۔۔۔۔۔ میں بیٹی ہوں؟“ اس نے آنکھیں نکالیں۔ ”بیٹی تو پتا نہیں کب تک مجھے بیٹی ہی سمجھتے رہیں گے۔“

”میں نے کہا کہ ماسٹر جی۔۔۔۔۔ آپ فکر مت کریں۔ اگر وہ بڑی بھی ہوئی تو میں اس کی کسی بات کا برا نہیں مانوں گا۔“

”اچھا چلو، اب منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کرلو۔“ اس نے کہا۔ ”تم ہو کون اور اچانک کہاں سے آئے ہو؟“

”ارے ماسٹر جی نے تمہیں میرے بارے میں نہیں بتایا؟ میں ان کا شاگرد ہوں۔ یہاں اپنے ایک کام سے آیا تھا تو ماسٹر جی کو بھی سلام کرنے آ گیا۔ انہوں نے مجھے یہیں ٹھہرایا۔“

”وہ سامنے فوائٹ ہے۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”اور اس کے برابر میں ہاتھ روم ہے۔“

”واہ! تمہیں تو انگریزی بھی آتی ہے۔“ میں نے فہم کر کہا۔

”میں جاہل نہیں ہوں۔ ایف اے میں پڑھتی ہوں۔“ اس نے گردن اٹھا کر کہا۔

میں ہاتھ منہ دھو کر آیا تو اس نے ناشتا ایک چھوٹی سی

تپائی پر لگا دیا تھا۔

”ماسٹر جی کہاں چلے گئے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہ جانے پتا جی ہیج مج کہاں چلے گئے۔ مجھ سے کہہ گئے تھے کہ کنال بھیا کے کمرے میں ایک مہمان سورا ہے۔ وہ اٹھنے تو اسے ناشادہ دے دینا۔“

میں خاموشی سے ناشا کرنے لگا۔ ناشتے میں پراٹھے تھے، آلو کی بھیجیا تھی، حلوہ تھا اور مکھن تھا۔

میں ناشا کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ وہ میرے لیے چائے لے آئی اور بولی۔ ”مہمان جی! آپ کا نام کیا ہے؟“

”مہمان تو مہمان ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔“ میں نے سوچا، پتا نہیں ماسٹر جی نے اسے میرے بارے میں کیا بتایا ہے؟

”اچھا تو تمہارا کوئی نام ہی نہیں ہے؟“

”میرا نام لنگا رام ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”لنگا رام!“ وہ ہنس کر بولی پھر ہنسی چلی گئی۔

اسی وقت ماسٹر جی گھر میں داخل ہوئے اور کانتا سے بولے۔ ”تم پاگلوں کی طرح ہنس کیوں رہی ہو؟“

”پتا جی! اس مہمان کا نام لنگا رام ہے۔“ یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگی۔

اچانک دروازے پر زوردار دنگ ہوئی۔ میں بری طرح چونک اٹھا۔

”کون ہے بھئی؟“ ماسٹر جی نے پوچھا۔

”دروازہ کھولو۔“

”بھائی تم ہو کون اور دروازہ کیوں توڑے ڈال رہے ہو؟“

دروازے پر ایک ٹھوکر پڑی اور باہر سے کوئی چیخ کر بولا۔ ”ملٹری پولیس!“

میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ ماسٹر جی کا چہرہ بھی دھواں دھواں ہو رہا تھا، انہوں نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔ ”تم اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔ کانتا تم بھی جاؤ۔“

میں کانتا کو لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”آ رہا ہوں بھائی!“ ماسٹر جی نے بلند آواز میں کہا۔

”دروازہ تو مت توڑو۔“

عہدے کے لحاظ سے صوبیدار تھا اور دوسرا حوالدار۔ شکل سے دونوں ہی فوجی سے زیادہ فلتی بد معاش لگ رہے تھے، ایسے بد معاش جنہوں نے فوجی ورڈیاں پہن لی ہوں۔

”کیا بات ہے آفسر؟“ رام پرشاد نے پوچھا۔

”یہاں تم نے ایک مفروضہ جتنی قیدی کو پناہ دے رکھی ہے۔“ صوبیدار نے غصے سے جواب دیا۔

”میرے گھر میں جتنی قیدی؟“ رام پرشاد نے حیرت سے کہا۔ ”تم شاید مجھے جانتے نہیں ہو آفسر! میری بیٹی بہت ادریک ہے۔“

”ہمارا وقت خالص مت کرو بڑے۔“ صوبیدار نے درشت لہجے میں کہا۔ ”ہمیں اس مکان کی تلاشی لینا ہے۔“

کانتا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر میں نے جھک کر پنڈلی سے بندھا ہوا تیز دھار خنجر نکال لیا۔

”ہمارا راستہ چھوڑو بڑھے۔“ صوبیدار نے اس مرتبہ انتہائی درشت لہجے میں کہا۔ ”تمہاری بیٹی بہت ادریک ہے تو ہم ابھی تمہیں اور بچی پہنچا سکتے ہیں۔“

”میرے سرخ وارث کے میں تلاشی نہیں لینے دوں گا۔“ رام پرشاد کا بوجھ فیصلہ تھا۔

اچانک فائر کا دھماکا ہوا، اس کے ساتھ ہی رام پرشاد کی کرب ناک چیخ سنائی دی۔ کانتا نے بھی چیخ مارتا چاہی لیکن

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور دروازے کی کڑی آہٹ سے کھول دی۔ میں نے کانتا کو بیڈ پر لیٹنے کا اشارہ کیا اور خود دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔

ان لوگوں نے ٹھوکر مار کر کمرے کا دروازہ کھولا تو کانتا کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ پہلے صوبیدار اندر داخل ہوا، اس کے پیچھے حوالدار تھا۔ میں نے صوبیدار کی پشت پر پوری قوت سے خنجر کا وار کیا۔ اس کے منہ سے ایک کرب ناک چیخ نکلی۔ میری لات حوالدار کے پیٹ پر پڑی۔ وہ بھی پیٹ کچڑ کر دہرا ہو گیا۔ میں نے بہت پھرتی سے خنجر صوبیدار کی پشت سے نکالا اور وہی خنجر حوالدار کی پشت میں گھونپ دیا۔

وہ خنجر اتنا تیز دھار اور مہلک تھا کہ حوالدار کی گردن سے آ پار ہو گیا۔

صوبیدار ابھی تک پڑا اسک رہا تھا۔ میں جیسٹ کر باہر نکلا اور رام پرشاد جی کے پاس پہنچا۔ ریوالور کی گولی ان کے پیٹ میں لگی تھی اور خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔

”خرم... بیٹا... تم... کانتا کو... لے کر... نکل جاؤ۔“ میرے علاوہ... اس دنیا میں اس کا کوئی بھی نہیں ہے... میرے بیٹے برسوں پہلے امریکا جا بے ہیں... دونوں... بیٹیوں نے بھی شادی... کے بعد... لوٹ کر ہماری... خبر نہ لی... وہ لوگ پھر یہاں آئیں گے... اور اس مرتبہ... زیادہ... تعداد میں آئیں گے... تم... کانتا کو لے کر... نکل جاؤ۔ اور مجھ سے... وعدہ کر دو۔

”کے... اسے کبھی... کوئی... تکلیف نہیں... ہونے دو گے۔“

”ماسٹر جی! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”آپ کا ختم معمولی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ابھی آپ کو اسپتال لے جاؤں گا۔“

”ہاں پتا جی! ہم آپ کو اسپتال لے جائیں گے... آپ... مجھے... یوں... چھوڑ کر... نہیں جا سکتے۔“ کانتا بری طرح رونے لگی۔

”میرے پاس وقت... کم ہے... بیٹا!“ ماسٹر جی نے کہا۔ ”میری... الماری کی تجوری میں... کچھ رقم... اور گینے ہیں... وہ میں نے تیرے ہی لیے رکھے تھے۔ تو وہ نکال لے اور... خرم کے... ساتھ نکل جا۔“

کانتا دوڑ کر پانی لے آئی اور ماسٹر جی کا سر اپنے زانو پر رکھ کر انہیں پانی پلانے کی کوشش کی۔ انہوں نے ایک گھونٹ بہت مشکل سے پیا اور بولے۔ ”خرم بیٹا! دیر مت کرو۔ فوراً... یہاں سے نکل جاؤ۔ فائر... کے دھماکے... کی آواز دور تک گئی... ہوگی... ان کے دوسرے... ساتھی بھی ادھر آ رہے ہوں گے... کانتا بیٹا! تم لوگ... درمائی کے گھر کی طرف سے باہر نکلتا... ان لوگوں کی گاڑیاں... میں نے... سمجھ... کے پاس... دیکھی تھیں... شاید... ہمارے... پڑوسیوں... نے رات... خرم کو... یہاں آتے دیکھ لیا... ہے... انہی لوگوں... نے فوجیوں... کو بتایا ہے... تم۔“

بولتے بولتے ماسٹر جی کا سانس اکھڑنے لگا۔

”پتا جی!“ کانتا چیخ کر بولی۔ ”پانی... پی لیں۔“

اس نے پانی کا کنورا ماسٹر جی کے منہ سے لگا لیکن پانی ان کے حلق میں جانے کے بجائے ان کے چہرے سے ہوتا ہوا گردن کی طرف چلا گیا۔ پھر انہوں نے ٹپکی لی اور ان کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

”پتا جی!“ کانتا پاگلوں کی طرح چیخی۔ ”مجھے چھوڑ کر مت جاؤ پتا جی!“

”صبر کرو کانتا۔“ میں نے کہا۔

”تم کیوں آئے تھے یہاں؟“ کانتا نے ہڈیانی انداز میں مجھ سے پوچھا۔

”میں بہت شرمندہ ہوں کانتا۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”واقعہ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ تم چاچا عبدالرحمن کے گھر چلی جاؤ۔ میں ابھی یہاں سے نکل رہا ہوں۔“

میں نے کہا اور پھرتی سے کمرے میں گھس گیا۔ کرا گویا خون کا تالاب بن گیا تھا۔ بے کئے انسانوں کو میں نے بکرے کی طرح ذبح کر دیا تھا۔

میں فرش پر بیٹھنے والے خون سے بچتا ہوا کمرے میں گیا۔ سب سے پہلے میں نے صوبیدار کے ریوالور پر قبضہ کیا۔

ریوالور ہاتھ میں آتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میں اب تک ادھورا تھا۔ صوبیدار کے سینے پر بندھی ہوئی کٹ میں ریوالور کی بہت سی فاضل گولیاں تھیں۔ میں نے وہ اس کی جیب سے نکلنے والے رومال میں باندھ لیں۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں گھڑیاں بھی تھیں۔ میں نے وہ دونوں گھڑیاں بھی اتار لیں۔ دونوں کی جیبوں سے مجموعی طور پر

ذخائی سو روپے بھی نکلے۔

اس کے بعد میں نے اپنا جائزہ لیا۔ میرے کُرتے پر بھی خون کے داغ تھے۔ یہ داغ اس وقت پڑے تھے جب میں نے صوبیدار کی پشت سے خنجر نکالا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جسم سے خون بھی اٹل پڑا تھا۔ مزید چھیننے اس وقت پڑے جب میں نے حوالدار کی گردن میں خنجر پیوست کیا۔

میرا پاجامہ البتہ بے داغ تھا۔ کُرتہ دھونے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے کپڑوں کی الماری کھولی تو اس میں ماسٹر جی کے کئی جوڑے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے انہی میں سے ایک کُرتہ پاجامہ نکالا اور اسے بہت غلت میں تبدیل کر لیا۔ اپنے اتارے ہوئے کپڑے میں نے ایک بنڈل بننا کر پرانے اخبار میں لپیٹ لیے۔

پھر باہر آ کر میں نے اچھی طرح منہ ہاتھ دھویا اور کمرے میں جا کر اپنے کپڑوں کا تھملا اور اتارے ہوئے کپڑوں کا بنڈل اٹھا لیا اور کانتا سے بولا۔ ”میرے ساتھ چلو کانتا! یہ وحشی درندے تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کریں گے۔ میری ہی وجہ سے تمہارے گھر پر آفت آئی ہے۔ میں تمہیں اس خطرے میں نہیں چھوڑ سکتا۔“

کانتا نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس

ویران آنکھوں سے اپنے باپ کی لاش کو دیکھتی رہی۔
 ”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تم نہیں چلنا چاہتیں
 تو مت جاؤ۔“

میں نے باہر کی طرف قدم بڑھائے تو وہ وحشت زدہ
 انداز میں بولی۔ ”نٹھرو، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔“
 ”گھر میں موجود ساری نقدی اور زیورات لے لو۔“
 میں نے کہا۔

”تجوری خالی ہے۔“ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”چھ
 مہینے پہلے میری ایک بہن آئی تھی۔ اس کے سسرال والے
 بیویوں کا مطالبہ کر رہے تھے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ پتاجی کو
 صدمہ پہنچے۔ وہ تو یہی سمجھ رہے تھے کہ میری دونوں بیٹیاں
 اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ میں نے پتاجی کو بتائے
 بغیر سارے گہنے اور نقد رقم اپنی بہن کو دے دی۔“
 ”اچھا چھوڑو، اپنے کپڑوں کے چند جوڑے تو لے
 لو۔“

وہ خاموشی سے ابھی اور ایک بیگ میں اپنے کپڑے
 لے کر واپس آئی۔ پھر ہم دونوں وہاں سے نکل گئے۔
 ہم گلیوں گلیوں سے ہوتے ہوئے قصبے کے دوسرے
 سرے پر نکلے اور تیزی سے مین روڈ کی طرف بڑھ گئے۔
 میرا ارادہ تھا کہ کانتا کو اس کے کسی رشتے دار یا کسی
 بہن کے گھر چھوڑ کر نکل جاؤں گا۔ یہاں تو میری ہی جان کے
 لالے پڑے ہوئے تھے۔ میں بھلا کانتا کی حفاظت کب تک
 اور کہاں تک کر سکتا تھا؟

میں نے احتیاطاً سر پر ایک اوٹو ٹی بھی پہن لی تھی۔
 ”لاری اڈا یہاں سے کافی دور ہے۔“ کانتا نے کہا۔
 ”ہمیں کافی پیدل چلنا پڑے گا۔“
 ”لاری اڈا؟“ میں نے چونک کر کہا۔

”اس طرف تو جانا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔“
 ”پھر کیا کرو گے؟ اسی طرح پیدل، الہ آباد جاؤ گے؟
 اس میں خطرہ ہے۔ ہم راستے میں کہیں نہ کہیں پکڑے جائیں
 گے۔“

”یہاں کوئی ٹیکسی وغیرہ نہیں ملتی؟“ میں نے پوچھا۔
 اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولی۔ ”یہ الہ
 آباد کا ایک قصبہ ہے۔ یہاں تانگے چلتے ہیں۔ ٹیکسیاں تو الہ
 آباد، دلی اور بمبئی جیسے شہروں میں چلتی ہیں۔“ پھر وہ چونک کر
 بولی۔ ”ایک اینڈیا ہے۔ میں کوئی گاڑی روک کر لفٹ لیتی
 ہوں۔ میں کہوں گی کہ میرے بچے دلی کے مریض ہیں۔ میں
 انہیں علاج کے لیے الہ آباد لے جا رہی ہوں، تم ذرا بیماری کا

نا تک کرو۔“

”تم کیا کہو گی، تمہارے کون تیار ہیں؟“ میں نے
 پوچھا۔

اپنا جملہ یاد کر کے اس کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا۔ وہ
 نظریں جھکا کر بولی۔ ”فالٹو باتیں مت کرو۔ میں کوئی گاڑی
 روکنے کی کوشش کرتی ہوں۔“

وہ اس وقت عام سی ساڑی میں ملبوس تھی لیکن اس کا
 قیامت خیز حسن اچھے لباس کا محتاج نہیں تھا۔

مجھے دور سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔ میں جلدی
 سے سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ کانتا نے کچھ آگے بڑھ کر اس
 گاڑی کو روکنے کا اشارہ کیا۔ وہ گاڑی رے بغیر آگے بڑھ گئی،
 پھر اس کے بریک چرچرائے اور وہ ریورس گیز میں واپس
 آنے لگی۔

میں نے دیکھا، اس گاڑی میں سوٹ میں ملبوس ایک
 شخص سوار تھا۔ گاڑی بھی عام گاڑیوں سے مختلف تھی۔ میں
 نے اب تک پورے بھارت میں ہر طرف فیٹش ہی دیکھی
 تھی۔ انکا دکا دوسری گاڑیاں بھی نظر آ جاتی ہیں۔
 ”کیا بات ہے؟“ اس شخص نے پوچھا۔

”میرے بچے بہت بیمار ہیں، وہ دل کے مریض ہیں۔
 آج ہی انہیں انجائنا کا آپریشن ہوا ہے۔ میں انہیں لے کر الہ
 آباد جا رہی ہوں۔ آپ پلیز میری ہیلپ کریں۔“
 ڈرائیور نے میری طرف دیکھا۔ میں ان سے کچھ
 فاصلے پر بیٹھا ہوا کراہ رہا تھا۔

اچانک میری نظر اس شخص کے چہرے پر پڑی تو
 میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ وہ جتنی قیدیوں کا کیمپ
 کمانڈنٹ تھا اور مجھے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میرے چلنے میں
 کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بس سر پر اوٹو ٹی تھی۔

اس نے غور سے مجھے دیکھا، پھر دروازہ کھول کر ایک
 دم نیچے اتر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی تھا۔ اس نے
 اچانک مجھ پر فائر کر دیا۔ میں عین وقت پر قلابازی کھا کر
 پیچھے کی طرف چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا ریوالور
 نکال لیا اور انداز سے اس پر گولی چلا دی۔

میں فوری طور پر اس کی جیش قدی روکنا چاہتا تھا اور
 اسے احساس دلانا چاہتا تھا کہ میں بھی غیر مسلح نہیں ہوں۔
 میری چلائی ہوئی گولی اس کے سینے میں پیوست ہو
 گئی۔ وہ چند لمحوں کے پیچھے ڈولا پھر اوندھے منہ گر پڑا۔
 اس سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا ورنہ اب
 تک وہاں ایک مجمع ٹگ گیا ہوتا۔

میں نے اس کی لاش گھیت کر سڑک کے کنارے مگی ہوئی خود رو جھاڑیوں میں ڈالی۔ اس کا ریو اور اٹھا کر جب میں ڈالو اور کانتا سے کہا۔ ”جلدی کرو، گاڑی میں بیٹھو۔“ پھر میں گولی کی سی رفتار سے روانہ ہو گیا۔

”گاڑی آہستہ چلاؤ۔ اگر راستے میں روک لیں گے۔“ کوئی گاڑی مل گئی تو وہ شے میں روک لیں گے۔

میں نے گاڑی کی رفتار کچھ کم کر دی۔ دو تین منٹ بعد ہمیں سڑک کی بائیں جانب کچھ فاصلے پر کئی بیس کھڑی نظر آئیں۔ وہاں ارد گرد کچھ دکائی بھی نہیں اور خوائے والے بھی۔ کانتا نے بتایا کہ یہی لاری اڈا ہے۔ ہم وہاں رے بغیر سیدھے نکل گئے۔

”یہ گاڑی بھی ہمارے لیے خطرناک ہے کانتا!“ میں نے کہا۔ ”اس گاڑی کو بہت سے لوگ پہچانتے ہوں گے۔“

”ابھی تو اسی میں چلتے ہیں۔“ کانتا نے کہا۔ ”الہ آباد پہنچ کر اس گاڑی کو کہیں چھوڑ دیں گے۔“

سڑک کا ایک موڑ ٹھوکتی ہی مجھے فوجیوں کی ایک چوکی دکھائی دی۔

ان لوگوں نے بھی گاڑی کو دیکھ لیا تھا۔ میں ایک دم گاڑی واپس گھماتا تو وہ میری طرف ہے شے میں مبتلا ہو جاتے۔ ممکن ہے وہ میرا پہچان بھی کرتے۔

ایک بیریزنگ لگا راستہ مسدود کر دیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ باہر صرف دو ہی ستری تھے میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب آریا پاروالی بات ہے۔ ان لوگوں نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی تو میں ان دونوں ستریوں کو ہلاک کر کے آگے نکل جاؤں گا، پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

میں نے گاڑی بیریز کے پاس روک دی اور اپنا ریو اور نکال کر گود میں ڈال لیا۔ اسے میں سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں استعمال کر سکتا تھا۔

یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ گاڑی دیکھ کر سڑک کی دونوں جانب کھڑے ہوئے ستریوں نے مجھے زوردار انداز میں سیلیٹ کیا اور بیریز فوراً ہٹا دیا گیا۔

میں نے سر کے اشارے سے ان کے سلام کا جواب دیا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

”تھیں..... تھیں..... خرم.....؟“ کانتا نے حیرت سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن بول نہ پائی۔

”سب یہ اس گاڑی کا کمال ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا اور گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔

میں گاڑی کا نمبر دیکھ کر اپنے شے کی تصدیق کرنا چاہتا

تھا۔ میرا شہر درست نکلا۔ اس پر آرمی کا مخصوص نمبر موجود تھا۔ ہمارے فوجی افسروں کی سرکاری گاڑیوں پر بھی مخصوص قسم کے نمبر ہوتے ہیں۔

میں دوبارہ گاڑی میں بیٹھا تو کانتا نے پوچھا۔ ”کیا دیکھ رہے تھے خرم؟“

میں گاڑی کا نمبر دیکھ رہا تھا۔ ”گاڑی پر فوج کا مخصوص نمبر ہے۔ اس نمبر سے وہ لوگ دھوکا کھا گئے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتا۔“

”ایک تو تم لوگ اپنی بات چیت میں فارسی بہت بولتے ہو۔“ کانتا نے کہا۔

”فارسی؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”میں تو انتہائی سلیس اردو میں گفتگو کر رہا ہوں۔“

”اب یہی دیکھو، اس جیلے میں تم نے کتنے فارسی کے لفظ بولے ہیں۔ انتہائی، سلیس، گفتگو، کیا یہ فارسی نہیں ہے؟“

”لیکن ہم تو اسے اردو ہی سمجھتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اب اس بحث کو چھوڑو اور مجھے یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کہاں چھوڑوں؟“

”کیا مطلب؟“ کانتا نے حیرت سے کہا۔

”مطلب یہ کہ یہاں..... اس ملک میں تمہارا کوئی عزیز، رشتہ دار تو ہوگا؟ کوئی اور نہ کی تمہاری بہنیں تو موجود ہیں۔“

”تم مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو؟“ اس نے افسردگی سے کہا۔

”بات پیچھا چھڑانے کی نہیں ہے کانتا!“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”میری زندگی تو خود خطرے میں گھری ہوئی ہے۔ نہ جانے کب اور کہاں میری زندگی کا چراغ گل ہو جائے۔ ایسے میں تمہاری حفاظت کیسے کر سکتا ہوں؟“

”اس ملک میں میرا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔“ کانتا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”دو بیٹن ہیں لیکن وہ اپنے سسرال والوں کے ہاتھوں اتنی مجبور ہیں کہ مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتیں۔ تم ایسا کرو کہ مجھے کسی کنیا آشرم میں چھوڑ دو۔ الہ آباد میں ایسے آشرم موجود ہیں۔“

”کنیا آشرم؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”وہ کیا ہوتا ہے؟“

”وہاں لاوارث اور بیوہ عورتیں رہتی ہیں۔ ریتی کیا ہیں، بس اپنی زندگی کے دن پورے کرتی ہیں۔“ پھر وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”مسلمان اپنی بات کے دھنی ہوتے ہیں لیکن میرا خیال غلط تھا۔“

”میری کس بات سے تمہیں اندازہ ہوا کہ مسلمان ایسے نہیں ہوتے؟“ میں نے پوچھا۔

”پتا ہی نہ مارتے وقت تم سے وچن لیا تھا کہ تم میری رکھنا کرو گے اور تم نے ان سے کہا تھا کہ آپ کانتا کی فکر مت کریں۔ تمہیں یہ بات یاد ہے یا یہ بھی بھول گئے؟“

”مجھے سب کچھ یاد ہے کانتا!“ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”لیکن تم میری مجبور یوں کو سمجھو۔“

”تمہاری کیا مجبوری ہے؟ یہی نا کہ فوجی اور پولیس والے تمہارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ تو خشک ہے لگے رہیں۔ مجھے ساتھ رکھنے میں تمہارا نقصان ہی کیا ہے؟“

میں جواب میں اس سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ مجھے آرمی کی ایک اور چپک پوسٹ نظر آئی۔ وہاں دو جوان سڑک کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے تھے اور ان کا ایک افسر کچھ فاصلے پر کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ پہلے کی طرح یہاں بھی سڑک پر ایک بیریزنگ ہوا تھا۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنا ریو اور نکال کر گود میں رکھ لیا۔

گاڑی دیکھ کر کسی پر بیٹھا ہوا افسر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

میں مزید بول کلا گیا کہ اس نے شاید محسوس کر لیا ہے کہ گاڑی میں ان کے افسر کے بجائے کوئی اور ہے۔

اس نے اچانک بلند آواز میں کہا۔ ”اینٹیشن!“ یہ کہہ کر اس نے مجھے سیلیٹ کیا۔ دونوں ستری بھی لمبے بھر کو ”اینٹیشن“ ہو گئے پھر ان میں سے ایک نے جلدی سے سڑک پر لگا ہوا بیریز ہٹا دیا اور میں سہلانا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اچانک میری نظر ایک مائل اسٹون پر پڑی۔ الہ آباد تین کلومیٹر۔

میں نے کانتا سے کہا۔ ”ہم الہ آباد پہنچ گئے۔ یہ شاید آخری نا تھا۔ اب الہ آباد میں ہمیں یہ گاڑی چھوڑنا ہوگی۔“

اب سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کا سبب بھی میں سمجھ گیا۔ اس جنگی کیمپ کے علاقے سے لے کر الہ آباد تک اتنے فوجی ناگے تھے کہ لوگوں نے باہر نکلتا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ لوگ عام آدمی کے ساتھ بدسلوکی، بدتمیزی کرتے ہوں گے۔ وہ پاک آرمی تو تھی نہیں جسے لوگ سزا کھوں پر بٹھاتے ہیں۔ وہ بھارتی فوج تھی جو اپنے ظلم و تشدد اور بدسلوکی کی وجہ سے بدنام تھی۔

الہ آباد پہنچ کر ایک بڑی عمارت کے سامنے مجھے بہت سی گاڑیاں دکھائی دیں۔ میں نے بھی گاڑی انہی گاڑیوں کے ساتھ پارک کر دی اور رومال سے جی الامکان ہراس جیکہ کو صاف کر دیا جہاں میری آنکھوں کے نشانات ملنے کی توقع

تھی۔ پھر میں نے اپنا سامان سمیٹا اور ہم گاڑی سے باہر آ گئے۔

”ایک تو تمہارا یہ تھیلا اتنا گندہ ہے کہ.....“

”مجبوری ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب میں اپنے سامان کی گھڑی تو نہیں بنا سکتا۔“

”تم یہاں کے بازار سے کوئی چھوٹا موٹا سوٹ کیس تو خرید سکتے ہو۔“

”میں ابھی اس قسم کی کوئی عیاشی نہیں کر سکتا۔“

”تم نہ کرو۔ میں کروں گی۔ میرے پاس بھی دو ڈھائی ہزار روپے ہیں۔“

”دو ڈھائی ہزار؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”یہ میری بچت ہے۔ کئی ماہ میں جا کر یہ پیسے جمع ہوئے ہیں۔ چلو اب بازار کی طرف چلو۔“ کانتا نے کہا۔

وہ تھیلا واقعی بہت بدتم تھا لیکن میں اسے مجبوراً اٹھائے ہوئے تھا۔

کانتا نے بازار جا کر چند منٹ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس، اپنے لیے ایک چپل اور میرے لیے ایک نمروٹوٹی اور واسکٹ خرید لی۔ ایک دکان پر رک کر اس نے سینڈرو کی ایک ڈبیا بھی خریدی۔

وہاں ایک ریسٹورنٹ کے فیملی کیمین میں بیٹھ کر ہم نے نہ صرف چائے پی بلکہ میں نے اپنا سارا سامان اس سوٹ کیس میں منتقل کر دیا۔ کانتا نے مجھ سے واسکٹ اور نمروٹو کپ بیٹھے کو کہا۔

میں نے دونوں چیزیں ہٹن لیں۔ اس نے ڈبیا کھول کر ایک چنگی میں سینڈرو نکالا اور میری پیشانی پر لگا دیا۔

”یہ کیا کر رہی ہو؟“ میں بول کلا گیا۔

”اب ذرا آئیں میں اپنی صورت دیکھو۔“ کانتا ہنس کر بولی۔ ”بالکل کوئی ہندو بنیا لگ رہے ہو۔“

میں ہاتھ دھونے کے بہانے واش بیسن تک گیا۔ وہاں ایک آئینہ بھی لگا ہوا تھا۔

اس میں اپنی شکل دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ٹوٹی، واسکٹ اور تنک سے میری شخصیت میں حیرت انگیز تبدیلی آئی تھی۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں کیمپ سے بھاگا ہوا جنگی قیدی ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی مجھے روک کر باقاعدہ مجھ سے تفتیش کرتا۔

”ہم الہ آباد میں ٹھہرنے کے بجائے کہیں اور جائیں گے۔“ میں نے کانتا سے کہا۔ ”کیمپ کمانڈنٹ کی موت کا اب تک علم ہو چکا ہوگا۔ جلد ہی فوجی اس کی گاڑی بھی تلاش کر

لیں گے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہمیں الہ آباد میں تلاش کریں گے۔

”تو پھر کانپور چلتے ہیں۔“ کانتا نے کہا۔ ”وہاں پتا جی کے ایک بہت اچھے دوست رہتے ہیں۔ ہم ان سے.....“

”نہیں کانتا!“ میں نے کہا۔ ”میں اس وقت کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔“ اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھے رحمن صاحب نے بھی تو ایک صاحب کا پتا دیا تھا۔ ہم فوری طور پر ان کے گھر میں پناہ لے سکتے تھے۔ وہ قابل اعتبار آدمی ہوں گے، جب ہی تو رحمن صاحب نے ان پر بھروسہ کیا تھا۔

میں نے ایک سائیکل رکشا لیا اور پتا پوچھتا ہوا بدرالدین صاحب کے گھر جا پہنچا۔ میں نے انہیں رحمن صاحب کا رقعہ دیا تو انہوں نے بہت دالہ انداز میں میرا استقبال کیا اور مجھے گھر میں لے گئے۔

”خرم صاحب! رحمن صاحب نے تو یہ لکھا ہے کہ میں خرم کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ آپ کے ساتھ یہ لڑکی کون ہے؟“

میں نے مختصر انہیں کانتا کے بارے میں بتایا۔ کانتا اس وقت ان کی بیگم اور بیٹیوں کے ساتھ تھی۔

”بھئی، جب تک تمہارا دل چاہے تم یہاں رہو۔“ بدرالدین صاحب نے کہا۔ ”میں دولت مند تو نہیں ہوں لیکن میرا دل جذبات ایتنی سے مالا مال ہے۔ ایک مجاہد کی مدد کر کے مجھے ولی فوجی ہوگی۔“

ہم لوگ تقریباً دس دن وہاں رہے۔ پھر اچانک ہمیں وہاں سے بھی بھاگنا پڑا۔

ماستر جی کے کسی جاننے والے نے کانتا کو الہ آباد میں دیکھ لیا۔ وہ کٹر ہندو تھا اور جانتا تھا کہ ایک سٹل کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

اس نے کانتا کا تعاقب کرنے کی کوشش کی لیکن کانتا اسے غمازے کر گھر تک پہنچ گئی۔

اس نے مجھے یہ واقعہ بتایا تو میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔

میں نے اسی وقت بدرالدین صاحب سے کہا۔ ”اب ہمارے لیے خطرہ پیدا ہو گیا ہے اس لیے ہم یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔“ میں نے انہیں بھی اس آدمی کے بارے میں بتا دیا جس نے کانتا کا پیچھا کیا تھا۔

”میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ کے خاندان پر کوئی مصیبت آئے۔“ میں نے کہا۔

انہوں نے میرے بے انتہا اصرار پر مجھے جانے کی اجازت دے دی اور بولے۔ ”تم یہاں سے شاہ جہاں پور چلے جاؤ۔ وہاں سے نیپال کی طرف نکل جانا۔ اس بارڈر پر بھارتی اتنی سختی نہیں کرتے۔ ہاں، تم حلیہ وہی بنا لو جو تم نے یہاں آتے وقت بنایا تھا۔“

میں نے کرت پاجامہ اور واسکٹ پہن کر سر پر نہرو ٹوپی اوڑھی اور ماتھے پر تلک لگا کر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

چلتے ہوئے انہوں نے زبردستی میری جیب میں دو سو روپے ڈال دیے کہ تم بس یا ٹرین کے بجائے ٹیکسی میں سفر کرو گے تو زیادہ محفوظ رہو گے۔

ہم وہاں سے شاہ جہاں پور پہنچے۔ وہاں کانتا کی ایک دوست رہتی تھی۔ کانتا نے اس کے توسط سے کرائے پر معمولی سا ایک مکان حاصل کر لیا۔ اس نے اپنی دوست کو یہی بتایا تھا کہ میرے بچے بیمار ہیں، میں ان کا علاج کرائے یہاں آئی ہوں۔

کسی نے مجھ پر تو جرحی نہ دی۔ ہم نے اس مکان میں ایک مہینہ گزار دیا۔

ایک دن کانتا نے کہا۔ ”خرم! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں بھی تمہارے ساتھ پاکستان چلوں؟“

”ہو سکتا ہے لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ طریقہ یہ ہے کہ میں تم سے شادی کر لوں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں تم سے شادی بھی تو نہیں کر سکتا۔“

”کیوں؟“ کانتا نے پوچھا۔ ”کیا میں اتنی بُری ہوں؟ تم کسی اور کو چاہتے ہو؟“

”تم بہت خوب صورت ہو بلکہ سندر ہو کانتا! میں نے تو پہلے ہی دن تمہیں پسند کر لیا تھا لیکن.....“

”کیا لیکن لیکن کی رٹ لگ رہی ہے؟“ کانتا جھنجھلا کر بولی۔

”میں مسلمان ہوں اور.....“

”میں بھی مسلمان ہو جاؤں گی۔“ کانتا نے کہا۔ ”میں تمہارے مذہب سے اسی روز ماسٹر ہو گئی تھی جب تم نے صرف پتا جی کے کہنے پر مجھے سہارا دیا تھا۔ پھر ہم اتنے عرصے سے ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔ تم نے آج تک مجھے پریشانی نظر نہیں ڈالی۔“

”تم اتنی اچھی اور خوب صورت ہو کانتا کہ تمہیں دیکھ کر نظر ہی بھی پاک ہو جاتی ہیں۔“

”تو پھر مجھے بھی مسلمان کر لو خرم!“ وہ اچانک میرے

سننے سے آگلی۔ ”میں دل سے تمہارے مذہب کو پسند کرنے لگی ہوں۔“

میری زندگی میں پہلا موقع تھا جب کوئی حسین اور جوان لڑکی میرے اتنے قریب آئی تھی۔ میرا دل بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے اسے خود سے علیحدہ کر دیا اور کہا۔ ”اب تم مزید میرے ایمان کا امتحان نہ لو۔“

پھر کانتا کی ضد پر میں اسے مقامی مسجد کے ایک مولوی صاحب کے پاس لے گیا۔ انہوں نے کلمہ پڑھا کر کانتا کو مسلمان کیا اور انہوں نے ہی اس کا نام مریم تجوڑ کیا۔

پھر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے دوسرے ہی دن کانتا سے نکاح کر لیا۔

پھر ایک مہینہ تو یوں گزر گیا جیسے اک ہل۔ میں پورے مہینے رنگ اور روشنیوں کی بارش میں نہا رہا۔ ایک مہینے بعد ہمیں ہوش آیا کہ ہمیں یہاں سے نکلنا بھی ہے۔

میں نے وہاں سے نکلنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔

مشرقی پاکستان سے بڑی تعداد میں مہاجرین نیپال کے راستے بھارت میں آ رہے تھے۔ بھارت سرکار نے وہ بارڈر بھی سبک کر دیا تھا۔

انہی دنوں ایک رکشے والے سے میری ملاقات ہوئی۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں ایک سردار جی کا پتا بتایا جو لوگوں کو غیر قانونی طور پر بھارت سے پاکستان اور پاکستان سے بھارت بھیجتے تھے۔ ان کا پورا انیٹ ورک تھا۔

میں اس دن بہت خوش تھا۔ میں نے رکشا والے سے سردار جی کا پتا لے لیا۔ ممکن ہے اس میں رکشا والے کا بھی کچھ کمیشن ہو۔ سردار جی فی آدمی دو ہزار روپے لیتے تھے۔ دو ہزار کی رقم اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی لیکن کانتا نے بتایا کہ ہمارے پاس چار ہزار روپے ہو جائیں گے۔

دوسرے دن میں سردار جی سے معاملہ طے کرنے ان کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔

انہوں نے کہا۔ ”آج سے چار دن بعد میں کچھ ہندوؤں کو پاکستان بھیجوں گا۔ تم تین دن بعد مجھ سے ملو۔“

میں نے سردار جی سے پنجابی میں بات چیت کی تو وہ اتنے خوش ہوئے کہ مجھے ایک ہزار روپے کا ڈسکاؤنٹ دے دیا۔

پچیسے میں ساتھ لے کر گیا تھا۔ میں نے انہیں پیسے دینا چاہے تو انہوں نے انکار کر دیا اور بولے۔ ”میں پیسے اس

وقت لیتا ہوں جب بندے کو پاکستان کے لیے گاڑی میں سوار کر دیتا ہوں۔“

میں گھر لوٹا تو عجیب سی ایک ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ دروازہ چو پٹ کھلا ہوا تھا اور ہمارا مختصر سا سامان بکھرا ہوا تھا۔

مریم کی دوست نے بتایا کہ کچھ فوجی یہاں آئے تھے۔ وہ کانتا کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔

میرا گھر سونے لگا۔ مریم تو بہت نازکی لڑکی تھی، وہ بھارتی درندوں کا تشدد دیکھ کر برداشت کرتی۔

تھوڑی دیر بعد مریم آگئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور رخساروں پر انگلیوں کے نشانات ثبت تھے۔

”کیا بات ہے مریم! تم کہاں گئی تھیں؟“

”یہاں سے بھاگ جاؤ خرم!“ مریم سرگوشی میں بولی۔ ”ان لوگوں کو اب تک یہی شبہ ہے کہ دونوں فوجیوں اور پتا جی کو مارنے کے بعد تم مجھے اغوا کر کے لائے ہو۔ بھاگ جاؤ خرم! میری فکر مت کرو۔ میں خود پاکستان پہنچ جاؤں گی۔“

اچانک گھر میں دو آدمی داخل ہوئے۔ وہ اپنے حلیوں سے ملٹری انشٹی جنس کے لوگ لگ رہے تھے۔

”بس کرو اے!“ ان میں سے ایک نے کہا۔ ”اب شرافت سے ہمارے ساتھ چل۔“ اس نے اپنا ریوالور لہراتے ہوئے کہا۔

میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں بہت سہم گیا ہوں۔ ان کے نزدیک پہنچ کر میں نے اچانک ان میں سے ایک کے ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا۔ میں اس دوران میں اپنا خنجر بھی نکال چکا تھا۔ اس آدمی کے سینے سے پہلے ہی میرے خنجر کے ایک وار نے جہنم رسید کر دیا۔ دوسرے آدمی نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے بھی ٹھکانے لگا دیا۔

”تم پیچھے والی دیوار بھانڈ کر میری دوست کشمی کے گھر میں چلے جاؤ۔ وہاں سے فوجی دروازے کے ذریعے باہر نکل جانا۔“

”اور تم؟“

”میری فکر مت کرو۔ میں بھی جلدی پاکستان آ جاؤں گی۔“ پھر وہ بھاگی۔

”ہیلپ..... ہیلپ۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ بھارتی انشٹی جنس کو دھوکا دے رہی ہے۔ میں دیوار بھانڈ کر وہاں سے نکل آیا۔ پھر مجھے معلوم نہیں

کہ مریم کا کیا حشر ہوا۔ میں نے کچھ دن تو اسے تلاش کیا پھر تھک ہاکر مردار جی کے ذریعے پاکستان آ گیا۔ یہاں آ کر میں نے دوبارہ آری میں شمولیت اختیار کر لی۔ بعد میں میں نے اپنے کئی دوستوں کو بھارت بھیجا لیکن مریم کا کوئی سراغ نہ ملا۔ وہ نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ اب تو صرف اس کی یادیں رہ گئی تھیں۔ جو ریگ روڈ کی طرح مجھے اپنے ساتھ ساتھ اڑانے پھرتی تھیں۔

☆☆☆

ان واقعات کو چالیس..... برس بیت گئے ہیں۔ میں آری سے بریگیڈیئر کے عہدے سے ریٹائر ہوا تھا۔ میرے دو بیٹے فوج میں ہیں۔ بڑا چھوٹا میرے اور چھوٹا ابھی کپاٹیشن ہے۔ میں اسے کپٹن کہتا ہوں تو بے اختیار مجھے کپٹن وقار یاد آ جاتا ہے۔

اس کے بعد مجھے کپٹن وقار کی کوئی خبر نہیں ملی۔ نہ جانے وہ زندہ بھی تھا یا کسی بھارتی جیل میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔

احمد یار البتہ فوجیوں کے چنگل سے ایک مرتبہ پھر فرار ہو کر پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

فرار کے چار سال بعد اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے اسی نے تلاش کیا تھا۔

میں ان دنوں کھاریاں میں تھا اور میرے چچا تھا۔ اچانک ایک حوالدار میرے کمرے میں آیا اور مجھے زوردار سٹیوٹ کیا۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ وہ احمد یار تھا۔ ان چار برسوں میں وہ ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔

میں بے اختیار اپنی کرسی سے اٹھا اور اس سے بغل گیر ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ لہذا تو کا حوالدار اور رہا ہے۔

میں نے اسے خود سے علیحدہ کیا اور کہا۔ ”یار! تم اتنے لمبے چوڑے مرد ہو کر عورتوں کی طرح آنسو بہا رہے ہو؟“

”یہ تو خوشی کے آنسو ہیں سر!“ اس نے جواب دیا۔ پھر خنس کر بولا۔ ”خود آپ کیا کر رہے ہیں؟“

اس کے کہنے پر مجھے احساس ہوا کہ میں بھی آنسو بہا رہا ہوں۔

ہم دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ پھر احمد یار مجھ سے وقت فوقتاً ملتا رہا۔ وہ کپٹن وقار کو بھی تلاش کر رہا تھا لیکن اسے کامیابی ہوئی۔

اس نے جی ایچ کیو جا کر بھی کپٹن وقار کے بارے میں معلومات کیں لیکن اسے کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ یہ

مجھے ہوسکتا تھا کہ وقار وہاں سے فرار ہو کر پاکستان پہنچا ہو اور آری والوں کو اطلاع ہی نہ دی ہو لیکن وقار جیسے افسر سے ایسی امید نہیں تھی۔ اگر اسے فوجی ملازمت چھوڑنا ہی ہوتی تو وہ باقاعدہ طور پر ملازمت چھوڑتا۔ اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ وہ اس دنیا میں موجود ہی نہیں ہے یا پھر بھارت کی کسی جیل میں ہے۔

☆☆☆

پاکستان آنے کے بعد میں... کپٹن ہوا تو اباجی نے میری شادی ثمنین سے کرادی۔ میں اس شادی پر راضی نہیں تھا۔ مجھے ابھی امید تھی کہ مریم اگر زندہ ہے تو وہ مجھ تک ضرور پہنچے گی یا پھر اس کی طرف سے کوئی پیغام پہنچے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پانچ سال کے طویل انتظار کے بعد بالآخر میں نے ثمنین سے شادی کر لی۔ اسے بھی معلوم تھا کہ میں نے بھارت میں شادی کی تھی۔ میں نے اسے مریم کے بارے میں بتایا کہ اس نے میری خاطر کسی کسی قربانیاں دیں۔ ثمنین کا چہرہ تو پُرکشش ہے ہی اس کا دل بھی بہت خوب صورت اور کشادہ ہے۔ مریم کو یاد کر کے وہ بھی میرے ساتھ ساتھ افسردہ ہو جاتی ہے۔

ایک دن میں نے یونہی چیمبرے کو اس سے پوچھا۔ ”ثمنین! فرض کرو اگر مریم یہاں آجائے تو...؟“

”تو کیا؟“ ثمنین نے ہنس کر کہا۔ ”وہ آپ کی قانونی بیوی ہے۔ میں اسے گلہ لگا لوں گی۔“

”تم واقعی یہ بات سچے دل سے کہہ رہی ہو؟“

”بھی آزما بیچے گا۔“ ثمنین نے پُر عزم لہجے میں کہا۔

”میں احسان فراموش نہیں ہوں کہ اپنی محنت کو قبول نہ کروں۔ اس نے آپ کی جان بچائی ہے تو وہ آپ کے ساتھ ساتھ میری محنت بھی تو ہوئی۔“

☆☆☆

اس دن شدید گرمی اور جھمبہ تھا۔ میں لان میں بیٹھا تھا۔ اچانک آسمان سیاہ ہو گیا۔ مریم بھاگی ہوئی میرے پاس آئی اور بولی۔ ”پاپا! ابھی ابھی ٹی وی پر خبر آئی ہے کہ شدید آندھی کے ساتھ موسلا دھار بارش ہونے کا امکان ہے۔“

”ارے بیٹا! یہ ٹی وی والے بھی بے پرکی اڑاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بلکہ ٹی وی کی محکمہ موسمیات والے ہی غلط بتاتے ہیں۔ اگر انہوں نے آج آندھی کی پیش گوئی کی ہے تو یا تو وہ آئے گی ہی نہیں یا پھر ایک دو دن بعد آئے گی۔“

اچانک بارش ہونے لگی۔ میں لان سے اٹھ کر برآمدے تک پہنچنے پہنچتے چھاٹا مامی لگ گیا۔

میں نے اندر جا کر کپڑے تبدیل کیے اور ایک مرتبہ پھر برآمدے میں آ بیٹھا۔ مریم ملازموں کے بچوں کے ساتھ بارش میں نہا رہی تھی۔ وہ کالج میں پہنچ گئی تھی لیکن اس کی تحریکیں آج بھی بچوں والی تھیں۔ پھر شندھی ہوا کے جھونکے آنے لگے اور بارش کا زور ٹپٹ گیا۔

میرے ملازم کریم بخش نے آکر بتایا کہ کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

”تم نے نام نہیں پوچھا؟“ میں نے کہا۔

”میں نے پوچھا تھا صاحب لیکن انہوں نے کہا کہ میں تمہارے صاحب کا دوست ہوں۔ ان کے ساتھ ان کی فیملی بھی ہے۔“

”فیملی؟“ میں نے الجھ کر کہا۔

”جی ہاں، ان کی بیگم اور بیٹی بھی ان کے ساتھ ہیں۔“

”آپ سوالات ہی کیے جا رہے ہیں یا یہاں کو بارش میں بیٹھنے دیں گے؟“ ثمنین نے کہا۔ ”کریم بخش! تم ان لوگوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ اور ان کے لیے کچھ چائے پانی کا بندوبست کرو۔“ ثمنین نے حکم دیا۔ ”میں صاحب کے ساتھ آتی آتی ہوں۔“

میں ثمنین کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو سفید بالوں والے ایک بوڑھے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کی صحت قابل رشک تھی۔ چہرے پر دراڑیں بھی تھیں۔ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے؟

اس کے ساتھ اس کا بیٹا بھی تھا۔ اس کی عمر بھی پینتیس سے زیادہ ہی ہوگی۔ اس نے مجھے بہت ادب سے سلام کیا۔

اس کے ساتھ جو عورت تھی وہ البتہ چادر میں تھی۔ اس کا چہرہ بھی چادر میں چھپا ہوا تھا۔

”جی فرمائیے؟“ میں نے الجھ کر پوچھا۔

”بریگیڈیئر صاحب!“ اس نے خنس کر کہا۔ ”گلنا ہے آپ مجھے پیچھا نہ نہیں؟ آپ کیسے فوجی ہیں بریگیڈیئر صاحب!“ ان صاحب نے کہا۔ ”میں نے تو سنا ہے کہ فوجیوں کا حافظہ بہت زبردست ہوتا ہے۔ وہ خاص طور پر اپنے دوستوں اور دشمنوں کو بھی نہیں بھولتے۔“

”میں واقعی آپ کو نہیں پہچانتا۔“ میں نے ندامت آمیز لہجہ میں کہا۔

مجھے ان کی آواز البتہ کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔

”اے تو بریگیڈیئر ہو گیا۔“ ان صاحب نے اچانک بے تکلفی سے کہا تو میرے ہاتھ پر ٹھٹھکیں پڑ گئیں۔ ”لیکن تیرا ذہن ابھی تک کچا ہے، کپے کپٹین!“

”وقار سر!“ میں نے خوشی سے لہر لہجے میں کہا اور آگے بڑھ کر ان سے مل پٹ گیا۔ ”آپ کیسے ہیں سر!“ میں نے اور احمد یار نے تو آپ کو بہت تلاش کیا لیکن آپ کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔“

”مٹی بھی کیسے کچے؟“ وہ مسکرا کر بولے۔ ”میں پاکستان میں تھا ہی نہیں۔“

”آپ پاکستان میں نہیں تھے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”پھر آپ کہاں تھے؟“

”میں بھارت میں تھا۔“ کپٹن وقار کا یہ انکشاف سن کر مجھے شدید حیرت اور صدمہ ہوا لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔

”کیمپ سے فرار ہونے کے بعد آپ کہاں پہنچے تھے سر؟“

”میں کسی نہ کسی طرح الہ آباد پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن بھارتی انٹیلیجنس کی نظر میں آ گیا تھا۔ الہ آباد پہنچ کر میں نے انہیں ڈانچ دیا کہ میں شاہ جہاں پوری کی طرف فرار ہو گیا ہوں لیکن میں دوبارہ الہ آباد آ گیا۔ وہاں ایک مسلمان گھرانے نے مجھے پناہ دی۔ بھارت میں آج بھی بہت مسلمان ہیں لیکن اب ان میں وہ جذبہ نہیں ہے جو اس وقت تھا۔ میں نے بھارتی خفیہ ایجنسی کو ڈانچ تو دے دیا تھا لیکن وہ الہ آباد میں بھی کتوں کی طرح ہم لوگوں کی بوسہ چھتے پھر رہے تھے۔ میرے ساتھ ساتھ بھارتی فوجیوں کو بھارتی اور احمد یار کی بھی تلاش تھی۔ میرے میزبان نے مجھ سے درخواست کی کہ جب تک خطرہ مل نہ جائے، میں آپ کو باہر نہیں نکلے دوں گا۔ اس فراخ دل خاندان نے نہ صرف مجھے پناہ دی بلکہ اپنی بیٹی بھی دے دی۔ چنگوٹ میں نے وہاں شادی کر لی تھی۔ یہ شادی بھی بہت ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ فخر الدین صاحب کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ تم شادی تک تو رک ہی جاؤ۔ انہوں نے کچھ اس انداز سے بات کی کہ میں راضی ہو گیا۔

”برات والے دن فخر الدین صاحب بہت خوش تھے۔ برات امرودہ سے آئی تھی۔ عین نکاح کے وقت دولہا کے باپ اور خود دولہا نے ایسی شرانگاہ پیش کیں جو فخر الدین صاحب کے لیے قابل قبول نہیں تھیں۔ بات اس حد تک بڑھی کہ لڑکے کے باپ نے برات واپس لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ فخر الدین صاحب اس کی خوشامد کر رہے تھے، اس کے سامنے گونگڑا رہے تھے۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔“

”میں نے درشت لہجہ میں دولہا کے ماب سے کہا۔“

”میں نے کسی نہ کسی طرح الہ آباد پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن بھارتی انٹیلیجنس کی نظر میں آ گیا تھا۔ الہ آباد پہنچ کر میں نے انہیں ڈانچ دیا کہ میں شاہ جہاں پوری کی طرف فرار ہو گیا ہوں لیکن میں دوبارہ الہ آباد آ گیا۔ وہاں ایک مسلمان گھرانے نے مجھے پناہ دی۔ بھارت میں آج بھی بہت مسلمان ہیں لیکن اب ان میں وہ جذبہ نہیں ہے جو اس وقت تھا۔ میں نے بھارتی خفیہ ایجنسی کو ڈانچ تو دے دیا تھا لیکن وہ الہ آباد میں بھی کتوں کی طرح ہم لوگوں کی بوسہ چھتے پھر رہے تھے۔ میرے ساتھ ساتھ بھارتی فوجیوں کو بھارتی اور احمد یار کی بھی تلاش تھی۔ میرے میزبان نے مجھ سے درخواست کی کہ جب تک خطرہ مل نہ جائے، میں آپ کو باہر نہیں نکلے دوں گا۔ اس فراخ دل خاندان نے نہ صرف مجھے پناہ دی بلکہ اپنی بیٹی بھی دے دی۔ چنگوٹ میں نے وہاں شادی کر لی تھی۔ یہ شادی بھی بہت ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ فخر الدین صاحب کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ تم شادی تک تو رک ہی جاؤ۔ انہوں نے کچھ اس انداز سے بات کی کہ میں راضی ہو گیا۔

”برات والے دن فخر الدین صاحب بہت خوش تھے۔ برات امرودہ سے آئی تھی۔ عین نکاح کے وقت دولہا کے باپ اور خود دولہا نے ایسی شرانگاہ پیش کیں جو فخر الدین صاحب کے لیے قابل قبول نہیں تھیں۔ بات اس حد تک بڑھی کہ لڑکے کے باپ نے برات واپس لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ فخر الدین صاحب اس کی خوشامد کر رہے تھے، اس کے سامنے گونگڑا رہے تھے۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔“

”میں نے درشت لہجہ میں دولہا کے ماب سے کہا۔“

”میں نے کسی نہ کسی طرح الہ آباد پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن بھارتی انٹیلیجنس کی نظر میں آ گیا تھا۔ الہ آباد پہنچ کر میں نے انہیں ڈانچ دیا کہ میں شاہ جہاں پوری کی طرف فرار ہو گیا ہوں لیکن میں دوبارہ الہ آباد آ گیا۔ وہاں ایک مسلمان گھرانے نے مجھے پناہ دی۔ بھارت میں آج بھی بہت مسلمان ہیں لیکن اب ان میں وہ جذبہ نہیں ہے جو اس وقت تھا۔ میں نے بھارتی خفیہ ایجنسی کو ڈانچ تو دے دیا تھا لیکن وہ الہ آباد میں بھی کتوں کی طرح ہم لوگوں کی بوسہ چھتے پھر رہے تھے۔ میرے ساتھ ساتھ بھارتی فوجیوں کو بھارتی اور احمد یار کی بھی تلاش تھی۔ میرے میزبان نے مجھ سے درخواست کی کہ جب تک خطرہ مل نہ جائے، میں آپ کو باہر نہیں نکلے دوں گا۔ اس فراخ دل خاندان نے نہ صرف مجھے پناہ دی بلکہ اپنی بیٹی بھی دے دی۔ چنگوٹ میں نے وہاں شادی کر لی تھی۔ یہ شادی بھی بہت ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ فخر الدین صاحب کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ تم شادی تک تو رک ہی جاؤ۔ انہوں نے کچھ اس انداز سے بات کی کہ میں راضی ہو گیا۔

”برات والے دن فخر الدین صاحب بہت خوش تھے۔ برات امرودہ سے آئی تھی۔ عین نکاح کے وقت دولہا کے باپ اور خود دولہا نے ایسی شرانگاہ پیش کیں جو فخر الدین صاحب کے لیے قابل قبول نہیں تھیں۔ بات اس حد تک بڑھی کہ لڑکے کے باپ نے برات واپس لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ فخر الدین صاحب اس کی خوشامد کر رہے تھے، اس کے سامنے گونگڑا رہے تھے۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔“

”میں نے درشت لہجہ میں دولہا کے ماب سے کہا۔“

”میں نے کسی نہ کسی طرح الہ آباد پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن بھارتی انٹیلیجنس کی نظر میں آ گیا تھا۔ الہ آباد پہنچ کر میں نے انہیں ڈانچ دیا کہ میں شاہ جہاں پوری کی طرف فرار ہو گیا ہوں لیکن میں دوبارہ الہ آباد آ گیا۔ وہاں ایک مسلمان گھرانے نے مجھے پناہ دی۔ بھارت میں آج بھی بہت مسلمان ہیں لیکن اب ان میں وہ جذبہ نہیں ہے جو اس وقت تھا۔ میں نے بھارتی خفیہ ایجنسی کو ڈانچ تو دے دیا تھا لیکن وہ الہ آباد میں بھی کتوں کی طرح ہم لوگوں کی بوسہ چھتے پھر رہے تھے۔ میرے ساتھ ساتھ بھارتی فوجیوں کو بھارتی اور احمد یار کی بھی تلاش تھی۔ میرے میزبان نے مجھ سے درخواست کی کہ جب تک خطرہ مل نہ جائے، میں آپ کو باہر نہیں نکلے دوں گا۔ اس فراخ دل خاندان نے نہ صرف مجھے پناہ دی بلکہ اپنی بیٹی بھی دے دی۔ چنگوٹ میں نے وہاں شادی کر لی تھی۔ یہ شادی بھی بہت ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ فخر الدین صاحب کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ تم شادی تک تو رک ہی جاؤ۔ انہوں نے کچھ اس انداز سے بات کی کہ میں راضی ہو گیا۔

”برات والے دن فخر الدین صاحب بہت خوش تھے۔ برات امرودہ سے آئی تھی۔ عین نکاح کے وقت دولہا کے باپ اور خود دولہا نے ایسی شرانگاہ پیش کیں جو فخر الدین صاحب کے لیے قابل قبول نہیں تھیں۔ بات اس حد تک بڑھی کہ لڑکے کے باپ نے برات واپس لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ فخر الدین صاحب اس کی خوشامد کر رہے تھے، اس کے سامنے گونگڑا رہے تھے۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔“

”میں نے درشت لہجہ میں دولہا کے ماب سے کہا۔“

”میں نے کسی نہ کسی طرح الہ آباد پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن بھارتی انٹیلیجنس کی نظر میں آ گیا تھا۔ الہ آباد پہنچ کر میں نے انہیں ڈانچ دیا کہ میں شاہ جہاں پوری کی طرف فرار ہو گیا ہوں لیکن میں دوبارہ الہ آباد آ گیا۔ وہاں ایک مسلمان گھرانے نے مجھے پناہ دی۔ بھارت میں آج بھی بہت مسلمان ہیں لیکن اب ان میں وہ جذبہ نہیں ہے جو اس وقت تھا۔ میں نے بھارتی خفیہ ایجنسی کو ڈانچ تو دے دیا تھا لیکن وہ الہ آباد میں بھی کتوں کی طرح ہم لوگوں کی بوسہ چھتے پھر رہے تھے۔ میرے ساتھ ساتھ بھارتی فوجیوں کو بھارتی اور احمد یار کی بھی تلاش تھی۔ میرے میزبان نے مجھ سے درخواست کی کہ جب تک خطرہ مل نہ جائے، میں آپ کو باہر نہیں نکلے دوں گا۔ اس فراخ دل خاندان نے نہ صرف مجھے پناہ دی بلکہ اپنی بیٹی بھی دے دی۔ چنگوٹ میں نے وہاں شادی کر لی تھی۔ یہ شادی بھی بہت ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ فخر الدین صاحب کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ تم شادی تک تو رک ہی جاؤ۔ انہوں نے کچھ اس انداز سے بات کی کہ میں راضی ہو گیا۔

”بڑے میاں! تم شادی کرنے آئے ہو یا اپنے بیٹے کا سودا کرنے؟“

”تم کون ہو؟“ دولہا کا پچھ کر بولا۔

”تم اپنا یہ نام حجام اٹھاؤ اور یہاں سے ابھی نکل جاؤ ورنہ میں تمہیں اور تمہارے بیٹے کو اتنا ماروں گا کہ اس کی شکل بھی نہیں پہچانی جائے گی۔“

لڑکے کا باپ بھڑکھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”چل شکو! ایسے لوگوں میں ہمیں رشتہ نہیں کرتا۔“

”برائے اسی وقت واپس چلی گئی۔ فخر الدین صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

میں نے ان سے کہا۔ ”بچا جان! یہ شادی ہوگی اور ضرور ہوگی۔ اگر آپ کو منظور ہو تو۔“

”لیکن کس کے ساتھ؟“ فخر الدین صاحب نے حیرت سے کہا۔

”میرے ساتھ!“ میں نے کہا۔ یوں میری شادی ہوگئی۔

”پھر جنگی قیدیوں کی واپسی ہوئی لیکن پاکستان اور بھارت کے آمدورفت کے راستے بند ہی رہے۔ اسی دوران میں مجھے انگلینڈ جانے کا موقع مل گیا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا لیا اور لندن پہنچ گیا۔“

”سرا آپ لندن کے بجائے پاکستان آسکتے تھے؟“ میں نے کہا۔

”میں بالکل ایسا ہی کرتا۔“ وقار نے کہا۔ ”لیکن لندن میں مجھے اطلاع ملی کہ میرے تایا اور ان کے بیٹوں نے زمینوں پر قبضہ کر لیا ہے اور مجھے مردہ سمجھ لیا گیا ہے۔ میں نے انہیں خط لکھ کر بتایا کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ اس کا جواب آیا کہ زندہ ہو تو ثابت کرو۔ تم تو ہمارے لیے اسی دن مر گئے تھے جب تم نے بزدلوں کی طرح ہتھیار ڈالے تھے۔“

”میں اپنے ان تایا کا لاڈ لاتھا۔ وہ مجھے اپنے بیٹوں پر ترجیح دیتے تھے۔ ان کے اس رویے سے مجھے گہرا اصرام پہنچا اور میں نے بھی پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے لندن میں ایک چھوٹا سا اسٹور کھول لیا جو آج وہاں کا بہت بڑا ڈپارٹمنٹل اسٹور ہے۔ میں نے ایک سال بعد اپنی بیویوں کو بھی واپس بلا لیا۔“

”بیویوں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”میرا حافظہ تو واقعی جواب دے گیا ہے کچھ! وقار نے کہا۔ ”میں نے تجھے بتا دیا کہ میری بیوی بھی ہے اور ایک سال کا ایک بیٹا بھی۔“

”اب دونوں بیویاں میرے ساتھ رہتی ہیں۔ ماشاء اللہ میرے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ چاروں بیٹے کل کاروبار سنبھالتے ہیں اور میں سارا وقت اپنی بیویوں کے ساتھ گزارتا ہوں۔“

”یہ آپ کی کون سی بیگم ہیں؟“ میں نے پوچھا۔ ”نمبر ایک یا نمبر دو؟“

”نمبر ایک۔“ وقار نے سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن میری نہیں، یہ تمہاری بیوی ہے مریم۔“

اسی وقت بادل زور سے گر جا اور بجلی کا کڑا کسانا دیا۔ مجھے ایسا لگے جیسے یہ بجلی مجھ پر گری ہو۔

مریم نے اپنی چادر چہرے سے ہٹا دی تھی۔ وہ مریم ہی تھی۔ وہی بولتی ہوئی آنکھیں، وہی گھٹے بال جنہیں وقت کی گرد نے سفید کر دیا تھا۔

”کہہ دو کہ تم مریم کو بھی نہیں پہچانتے؟“

”میں... میں مریم کو کیسے بھول سکتا ہوں؟“ میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

”تمہیں آگے بڑھی اور مریم سے لپٹ گئی۔“ مریم باجی! آپ اتنے عرصے کہاں رہیں؟ تو آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مایوس ہو چکے تھے۔“

”اور یہ تمہارا بیٹا علی ہے۔“ وقار نے اس شخص کی طرف اشارہ کیا جو ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ مجھے ایسا لگے جیسے میری عمر پچیس سال کم ہوگئی ہو۔ وہ ہو بہو میری جوانی کی تصویر تھا۔ جب میں میجر تھا تو ایسا ہی تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا۔ ”ابو! ای! نے آپ کی اتنی تعریفیں کی تھیں کہ میں نے بغیر دیکھے آپ کو اپنا آئیڈیل مان لیا تھا۔“ وہ بری طرح آنسو بہا رہا تھا۔

میں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا۔

”بیٹا! تم کیا کر رہے ہو آج کل؟“

”ابو! میں الیکٹرانک انجینئر ہوں اور آج کل امریکا میں ہوں۔“ علی نے جواب دیا۔

”میں پنڈو دادن خان کی ماں نہیں ہوں۔“ مریم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”ورنہ ملی بھی آری میں افسر ہوتا۔“

اس پر وقار اور نمینہ نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ مریم بھی ہنسنے لگی اور میں بھی مسکرایا۔

اسی وقت میری بیٹی مریم کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ ”پاپا! آپ لوگ کیوں نہیں رہے ہیں؟ کیا کسی نے کوئی جوک سنایا ہے؟“

”مریم بیٹا! ادھر آؤ، میں تمہیں ان لوگوں سے

ملواؤں۔“

مریم کا نام نہ کر میری بیوی مریم چونک گئی۔

”اس کا نام بھی مریم ہے؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”ہاں مریم باجی!“ نمینہ نے کہا۔ ”آپ کی یاد میں انہوں نے اپنی بیٹی کا نام مریم رکھ دیا۔“

مریم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شاید یہ احساس تشکر کے آنسو تھے۔ میں نے اپنی بیٹی سے ان لوگوں کا تعارف کر دیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ ”واؤ! اب تو میری دودو ماما ہو گئیں اور ایک بھائی بھی مل گیا۔“ شاہد بھائی اور ارشد بھائی تو مجھے ہر وقت ڈانٹتے ہی رہتے ہیں۔ علی بھائی! آپ تو مجھے نہیں ڈانٹیں گے؟“

”نہیں گڑیا! بہنوں کو کون ڈانٹتا ہے؟“ علی نے کہا۔

”آپ لوگ باتیں ہی کرتے رہیں گے یا مہمانوں کو کچھ کھلائیں پلائیں گے بھی؟“ مریم نے کہا۔

”مہمان کون ہے بیٹا؟“ وقار نے کہا۔ ”یہ تو تمہاری ماما ہیں اور یہ بھائی، ہم تمہارے اکل ہیں۔“

”آئیے مریم باجی! میں آپ کو آپ کا کمرہ دکھا دوں۔“ نمینہ نے کہا۔ ”مریم بیٹا! بھائی کو ارشد کے کمرے میں لے جاؤ۔ ان کے لیے بھی کئی وقت نیا کمرہ سیٹ کرا دوں گی۔“

ان کے جانے کے بعد میں نے وقار سے پوچھا۔ ”سرا! مریم آپ کو کہاں مل گئی؟“

”مریم شاہ جہاں پور میں رہ رہی تھی اور وہاں کسی اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ اس نے پاکستان آنے والے مختلف لوگوں کے ذریعے تمہارے بارے میں معلوم کرنا چاہا لیکن تمہاری کوئی خبر نہ ملی۔ اس نے اپنے طور پر بھی جی انچ کیونکی کیلک لیکن وہاں سے بھی کوئی جواب نہ آیا۔ وہ بے چاری بیٹی مجھے ہی کہتی تھی کہ تم اس دنیا میں موجود ہی نہیں ہو۔ پھر اس نے اپنی توجہ کامرکز اپنے بیٹے کو بتالیا۔ اسے بہترین تعلیم دلوائی۔ انجینئرنگ کرنے کے بعد علی کو امریکا میں بہت بہترین ملازمت مل گئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے مریم کو بھی بلا لیا۔“

”مگر شہ مینے میں لندن سے انڈیا آیا تھا۔ انہی دنوں مریم بھی انڈیا آئی ہوئی تھی۔ وہ ایک دن یوٹیو ایڈا دیکھی۔ اس نے بتایا کہ میں نے خرم کے ساتھ کچھ دن الہ آباد میں اس ٹیلی کے ساتھ قیام کیا تھا۔ جانتے ہو وہ ٹیلی کون تھی؟ وہ میری سرال تھی۔ وہ میری بیوی نمینہ کے تایا تھے۔ جب انہوں نے تمہارا تذکرہ کیا تو میں نے مریم سے ملاقات کی۔“

میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں کل ہی پاکستان جاؤں گا اور خرم کو تلاش کر لوں گا۔ تم نہ جانے کن لوگوں کو خط بھیجتی رہی ہو؟“

مریم نے کہا۔ ”پھر میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔ اس بہانے میں ان کا ملک بھی دیکھ لوں گی۔“

”آپ لوگ کیا بھارتی پاسپورٹ پر آئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے پاس برٹش پاسپورٹ ہے اور مریم کے پاس امریکی؟“ وقار نے کہا۔

”آپ کے پہلے احسان کا قرض ہی ابھی باقی ہے سر جو آپ نے مجھے پکپ سے فرار کر کے کیا تھا۔ اب یہ آپ نے دوسرا احسان کر دیا۔“

”فکرمت کرو کچھ!“ وقار نے مسکرا کر کہا۔ ”میں سارے احسانات کا بدلہ اٹھا وصول کروں گا۔“ پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ”یار! مجھ بوڑھے کو بھی کہیں لینے بیٹنے کا ٹھکانا دے دو۔“ میں نے کریم بخش کو بلایا اور کہا۔ ”صاحب کے لیے شاہد کا کمرہ کھول دو۔“

اس رات کھانے پر سبھی بہت خوش تھے۔ میری بیٹی نے یہ اطلاع شاہد اور ارشد کو بھی دے دی تھی۔ وہ بھی اپنی بڑی اماں اور بڑے بھائی سے ملنے کو بے تاب تھے۔

نمینہ نے بہت فراخ دلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ مجھے اس کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ مجھے دھچکا تو اس وقت لگا جب میں رات کو مریم کے کمرے میں جانے لگا۔

نمینہ نے کہا۔ ”اب آپ اسی کے بیڈروم میں سوئیں گے؟“

”کیوں؟ تمہیں کوئی اعتراض ہے؟ وہ میری بیوی ہے۔“ یہ کہہ کر میں ہنستا ہوا چلا گیا۔

”نہیں تو۔“ نمینہ نے آہستہ سے کہا۔

میں کمرے میں پہنچا تو مریم مجھ سے لپٹ گئی اور اتنا روئی کہ رو رو کر نڈھال ہوئی۔

”مجھے امید نہیں تھی کہ میں اب کبھی تمہیں دیکھ سکوں گی۔“ اس نے کہتے ہوئے کہا۔ ”اللہ وقار بھائی کو ہمیشہ خوش رکھے کہ انہوں نے ہمیں بھر ملا دیا۔“

”ہماری زندگی میں سے چالیس سال نکل گئے تو کچھ ہوا۔ ہم اس کہانی کو وہیں سے شروع کریں گے جہاں پر ختم ہوئی تھی۔“ میں نے کہا۔

ہم دونوں رات بھر جاتے رہے اور ماضی کے قحط دہراتے رہے۔

مریم نے بتایا کہ پولیس والوں نے مجھے پکڑ لیا تھا لیکن میں نے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ خرم مجھے اغوا کر کے لایا تھا۔ دوسری صبح شمینہ کا منہ کچھ پھولا ہوا تھا، اسے صرف میں محسوس کر سکتا تھا۔

ناشتے کے بعد وقار نے کہا۔ ”اچھا کچھ لٹیفین! اب میرا کام تو ختم ہو گیا۔ میں آج یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”بھئی میری بیویاں میرے بغیر وہاں پریشان ہوں گی۔“

”انگل! پریشان تو وہ ہو ہی رہی ہیں۔“ مریم نے کہا۔

”دو چار دن اور سہی۔“ اس کی بات پر سب ہنسنے لگے۔ شمینہ بھی ہنسی لیکن میں جانتا تھا کہ اس کی ہنسی زبردستی کی ہنسی ہے۔

”چل بیٹا! تیرے کہنے سے میں دو دن اور رک جاتا ہوں۔“ وقار نے کہا۔

شام کو موسم کے تہر پھر خطرناک تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ آج ضرور آندھی آئے گی اور طوفانی بارش ہوگی۔

میں اس وقت اپنے بیڈروم میں ہی تھا۔ میں نے شمینہ سے کہا۔ ”شمینہ! تم تو کبھی تمہیں کہ تم کھلے دل سے مریم کو قبول کر لو گی پھر اب کیا ہو گیا؟“

”اس وقت مجھے یقین تھا کہ مریم کہیں مر کھ چکی ہے لیکن وہ تو تمہارے دل میں زندہ ہے۔ تم نے اپنی بیٹی کا نام مریم رکھا لیکن میں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔“

”اب تم کیا چاہتی ہو؟“ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”اب میں کیا چاہ سکتی ہوں؟“ شمینہ نے کہا۔ ”کاش! یہ کم بخت مریم اس وقت مر کھ گئی ہوتی تو۔۔۔۔۔“

”شمینہ!“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”بند کرو اپنی کواں۔“

اسی وقت مجھے ایسا لگا جیسے کھڑکی کے پاس سے کوئی بھاگتا ہوا گیا ہو۔ مجھے اس کی صرف ایک جھلک نظر آئی تھی۔ وہ مریم تھی۔ میری بیوی مریم!

میں دل ہی دل میں نادم ہو رہا تھا کہ اب میں اسے کس منہ سے مناؤں گا؟ شمینہ نے تو اپنی اصلیت دکھا دی تھی۔ مریم بھی کیا سوچ رہی ہوگی۔

میں نے سوچا آج رات میں اسے سمجھاؤں گا تو وہ سمجھ جائے گی۔ وہ شمینہ کی طرح اجد نہیں تھی۔

میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ اچانک مجھے گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔

”مریم اس طوفانی بارش میں کہاں گئی ہے؟“ میں نے شمینہ سے پوچھا۔

”کون سی مریم؟“ شمینہ نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”آپ کی بیوی یا بیٹی؟“

میں اسے کوئی سخت جواب دینے والا تھا کہ کریم بخش دستک دے کر اندر آ گیا اور بولا۔ ”صاب جی! وہ آپ کے مہمان چلے گئے۔“

”مہمان چلے گئے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”کیا وقار صاحب چلے گئے؟“

”جی صاب! ان کے ساتھ بیگم صاب اور علی صاحب بھی چلے گئے۔“

”کہاں؟“ میں نے چیخ کر پوچھا۔

”یہ تو مجھے معلوم نہیں صاب جی! بیگم صاب یہ خط آپ کو دے گئی ہیں۔“

میں نے جھپٹ کر خط اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ خط انگلش میں تھا کیونکہ مریم کو اردو نہیں آتی تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

”جان سے پیارے خرم! ہمیشہ خوش رہو۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں دوبارہ تمہاری زندگی میں آ کر تم پر اور تمہاری بیوی پر بوجھ بن جاؤں گی۔ حق تو اس نے میرا پیچھا نہ ہے۔ میں بھی اپنا حق جتا سکتی تھی لیکن میں تمہاری ہستی زندگی کو برباد نہیں کرنا چاہتی اس لیے تمہارے راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹ رہی ہوں۔ سمجھ لینا کہ مریم دوبارہ ملی ہی نہیں، سمجھ لینا کہ وہ اسی وقت کہیں مر کھ گئی تھی۔ تمہاری بیوی کی آرزو تو یہی تھی نا! مجھے تلاش کرنے کی کوشش مت کرنا۔ میں تمہیں بھی نہیں ملوں گی۔ اگر مل بھی گئی تو پہچانتے سے انکار کر دوں گی۔ تمہارا یہ احسان کیا کم ہے کہ تم نے مجھے اسلام جیسے سچے مذہب کی ترغیب دی۔ ایک بیٹے کی صورت میں اپنی نشانی دی۔ میرے لیے یہ دو سہارے بہت کافی ہیں۔

ہمیشہ کے لیے خدا حافظ۔

مریم جو بھی تمہاری تھی۔“

خط پڑھ کر میرے ذہن میں آنسوئیاں سی چلنے لگیں۔ پھر اتنی شدید آندھی آئی کہ سب کچھ کھٹ ہو کر رہ گیا۔

اس سے کہیں زیادہ شدید آندھی میرے اندر آئی تھی۔

میں بزدل تھا کہ مریم کو چھوڑ کر بھاگ آیا۔ مجھ میں اخلاقی جرأت بھی نہیں تھی کہ میں شمینہ کے ساتھ شادی سے انکار کرتا۔ میں تو ہوا کے دوش پر بہتی ہوئی ایسی ریت ہوں جو ہمیشہ ہواؤں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ میں ریگ روال ہوں۔۔۔۔۔ وہ ریگ روال جس کا کوئی ایک مسکن نہیں ہوتا۔

●◆●

عقلمند